فیہا کتب قیمۃ

مقالاتِ شروانی

یعنی

مضامین نثر کا مجموعہ

جو

ڈاکٹر نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا الحاج محمد حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی

نے

پینسٹھ سال (۱۸۸۲ء تا جون ۱۹۴۷ء) کے عرصہ میں لکھے اور اکثر اخباروں اور رسالوں و کتابوں
میں شائع ہوئے اور بعض اب صرف اس مجموعہ کے ذریعے سے شائع ہو رہے ہیں

زیر ادارۂ و نگرانی

محمد مقتدیٰ خاں شروانی

(مالک و منیجر شروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ چھپے)

مختصر فہرست

دیگر تصنیفات نواب صدر یار جنگ بہادر

ملنے کا پتہ۔ محمد مقتدیٰ خاں شروانی، شروانی پریس و بکڈپو، علی گڑھ

مقالاتِ شروانی

فہرستِ مضامین

نوٹ: (۱) اس فہرست کی ترتیب یقیناً نامانوس نظر آئے گی۔ وجہ یہ کہ مضامین کی ترتیب بلحاظ زمانہ تحریر رکھی گئی ہے۔ مگر چند در چند ناگزیر وجوہ سے کتابت میں یہ اسلوب قائم نہ رہ سکا۔ لہٰذا یہ نقص بذریعہ موجودہ ترتیب فہرست کے رفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۲) جن مضامین پر ستارہ (٭) کا نشان ہے وہ غیر شائع شدہ ہیں۔

محمد مقتدیٰ خاں شروانی
مرتب و طابع و ناشر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقالاتِ شروانی

پیش لفظ

حامداً و مصلیاً

ایام طالب العلمی میں کتاب مختصر المعانی علامۂ تفتازانی کی پڑھی۔ اُس میں علامہ کا یہ قول بلاغت کے بیان میں پڑھا:۔

"کمالِ بلاغت اس میں ہے کہ واقعات کے بیان میں جوہر بلاغت نمایاں ہوں، اس لئے کہ واقعہ نگاری میں بیان واقعات کے تابع ہے۔ لہذا میدان بیان تنگ ہے۔ افسانہ و خیالی مضامین کی نگارش میں بیان آزاد ہے اور فسانہ و مضامین تابع، لہذا میدان وسیع۔"
اس قول کو دل نے لیا۔ لکھنے کا شوق واقعہ نگاری میں پورا ہوا۔ افسانہ و خیالی مضامین لکھنے سے طبیعت کنارہ کش رہی۔

خودستائی معیوب ہے، تاہم بعض نکتہ سنج ارباب ذوق نے جو خیال میری تحریروں کی بابتہ ظاہر فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میں بحمد للہ کامیاب ہوا۔

اب نظر کو بڑھائیے۔ مقالات پڑھئے، خود فیصلہ کیجئے۔

محمد حبیب الرحمن خاں شروانی
(نواب صدر یار جنگ)

حبیب منزل علی گڑھ: ۱۷ شعبان المعظم ۱۳۶۵ھ
(۱۷ جولائی ۱۹۴۶ء)
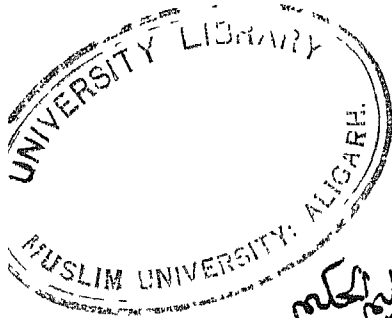
بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ربّ یسّر وتمّم بالخیر

سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم

لک الحمد وعلیٰ نبیک الصلوٰۃ وعلیٰ آلہ واصحابہ اولی الدرجاۃ

ایک جوان مرگ عزیز کی یاد میں

؎ اے ہمنفسان محفلِ ما
رفتید ولی نہ از دلِ ما

؎ باغبانِ دہر کشتِ عمر را آبے نداد
کاشتن دانست و پروردن نمی داند کہ چیست

یہ بات کہہ دینا کہ فلاں نوجوان لائق دنیا سے اُٹھ گیا کہنے کو تو دو لفظ ہیں مگر کوئی اُن بیچاروں کے شکستہ دل سے پوچھے جن کو وہ دنیا سے جانے والا ہمیشہ کے لئے بیقرار کر گیا۔ وہ بوڑھا باپ جو اُس نوجوان کو عصائے پیری سمجھ کر بہت سی آرزوئیں اپنے دل میں لئے بیٹھا تھا خوب جانتا ہے کہ اس نوجوان کا عدم کو جانا اُس کے دل و جان کے ساتھ کیا کر گیا اس کے مایوس دل میں یہ بات کبھی نہ گزرتی ہوگی کہ ایک روز اُس کے لخت جگر کو پیوند خاک کریں گے اور وہ صدمے اٹھانے کو جیتا رہے گا ہائے اُس نوجوان بیوہ کے دل پر کیا گزری ہوگی جس کی صدہا آرزوئیں پانی ہو کر آنکھوں سے نکل گئیں۔ اور بیسیوں امیدیں حسرت بن کر دل میں رہ گئیں جو پانی اُس کے غم دیدہ آنکھوں سے نکلا وہ آنسو نہیں بلکہ وہ پانی ہے جو اُس کی تمام عمر کی امیدوں پر پھر گیا۔ الحق ؎

این ماتم سخت ست کہ گویند جواں مرد

افسوس اُن بیچاروں پر کیسا صدمہ ہوا ہوگا جن کی بہت سی ضروریات کا وہ نوجوان کفیل تھا اور اب جو نگاہ اٹھا کر دیکھتے ہیں تو کوئی اُس کی نظیر نظر نہیں آتی جو اُن کے دُکھے ہوئے دل کو تسلی دے۔

جو حسرت ناک واقعہ اور قابل افسوس حادثہ بہت سے دلوں کو سوگوار بنا گیا وہ اخی محمد عبدالجبار خاں صاحب مرحوم کا انتقال ہے۔ کل کی بات ہے کہ اُن سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور آج اُن کے نام کے ساتھ مرحوم کا لفظ بیتاب کر رہا ہے۔ ؎

عبرت فزا مقام ہے دنیائے بے ثبات
کل جو محل تھا آج وہیں پر مزار ہے

جناب نے بعارضہ دق بعمر ستائیس[۲۷] سال عین شباب میں وفات پائی۔ فی الواقع اس مرض کی بنا اُس سال سے پڑی جس سال وبائے ہیضہ عام تھی۔ اُس سال سے توہمات فاسد ایسے پیچھے پڑے کہ آخر جان کے ساتھ گئے۔ موسم برسات میں فصلی بخار آیا اور وہی حرارت مزمنہ ہو کر مرض الموت بن گیا۔ اگرچہ ایک سال کے قریب حرارت نے ایک ساعت کو مفارقت نہیں کی مگر ضبط کو دیکھئے کہ وفات سے دو تین مہینہ پیشتر کے سوا کسی نے نہ جانا کہ یہ مرض مہلک جان کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ اوائل رجب میں معالجہ کے واسطے دہلی تشریف لے گئے۔ ابتداءً حکیم عبدالمجید خاں صاحب کا علاج رہا۔ آخر میں حکیم محمود خاں صاحب اور محمد حسین خاں صاحب سے رجوع کیا۔ ایام حیات کم باقی تھے کوئی علاج کام نہ آیا۔ بدقسمتی سے جس زمانہ میں مرحوم دہلی تھے اُسی زمانہ میں یہاں[۳] بھی ایک مریضہ کی حالت خطرناک تھی۔ اس لئے یہاں کے صاحبوں کو مرحوم کی طبیعت کا حال ٹھیک نہیں معلوم ہو سکا۔ اور مرحوم نے بھی مرض کو اپنی تحریروں میں خفیف ہی بتایا تاکہ اُن کے بزرگوں اور عزیزوں کو دوہری تشویش نہ ہو جائے۔ آخر ایک[۳] صاحب نے حالت صحیحہ سے یہاں آکر مطلع کیا۔ اُس وقت اضطراب سخت ہوا[۴] اور حکیم صاحب بغرض دریافت حال

---

[۱] نواب صدر یار جنگ بہادر کے برادر عم زاد تھے اس طرح کہ مولوی حاجی عبدالشکور خاں صاحب کے منجھلے صاحبزادہ تھے۔ اور دوسرے نواب صاحب کی حقیقی بڑی ہمشیران سے منسوب تھیں۔ محمد مقتدی خاں شروانی [۲] والدہ حاجی محمد صالح خاں صاحب مرحوم رئیس بھیکم پور ٹرسٹی و سنڈک مدرستہ العلوم و ممبر کورٹ مسلم یونیورسٹی۔ محمد مقتدی خاں شروانی۔ [۳] حاجی احمد سعید خاں صاحب رئیس بھیکم پور برادر اکبر نواب محمد مزمل اللہ خاں صاحب [۴] حکیم سعدالدین احمد صاحب مرحوم لکھنوی مولانا عبدالحلیم صاحب شرر مرحوم کے ماموں و خسر اور بھیکم پور میں.... [illegible] محمد مقتدی خاں شروانی

دہلی بھیجے گئے۔ انھوں نے جاکر دیکھا کہ مرض کام تمام کرچکا تھا اور وعدہ قریب آپہنچا تھا۔ انجام کار علاج دہلی کو بے سود سمجھ کر گھر لے آئے۔ یہاں حکیم اصغر حسین صاحب فرخ آبادی طلب کئے گئے انھوں نے مرض کو لاعلاج خیال کرکے دست اندازی نہیں کی اور ایک عذر معقول کرکے دوسرے روز ہی واپس تشریف لے گئے۔

مرحوم کے اخلاق وسیعہ اور لیاقت ذاتی جوق جوق آدمیوں کو عیادت کے واسطے کھینچ لاتی تھی اور جناب موصوف باآں ہمہ تکلیف و یاس ادنیٰ اعلیٰ سے بانبساط خاطر پیش آتے۔ استقلال کی تعریف جس قدر کی جائے بجا ہے۔ اس قدر مدت دراز میں کسی نے کبھی کوئی یاس کا کلمہ زبان سے نہیں سنا۔ بعضے صاحب مرض کا اشتداد دیکھ کر وفور شفقت سے ضبط نہ کرسکتے اور بے اختیار رو دیتے۔ اس رونے پر ہنسکر مرحوم پاس والوں سے پوچھتے کہ ان کو کیا ہوگیا ہے اور کیوں روتے ہیں۔ اللہ اکبر۔ آخر وقت اخیر آپہنچا۔ شعبان کی ۲۰ شب کو تین بجے سے حالت روی طاری ہوگئی۔ سو تنفس شروع ہوگیا۔ ۸ بجے ماء اللحم پلایا گیا اس وقت امید تھی کہ اجل کچھ گھنٹوں کی مہلت دے گی۔ مگر اذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃً ولا یستقدمون۔ پہاڑ ٹل جائے مگر آئی ہوئی نہ ٹلے۔ ۲۰ شعبان ۱۳۰۳ھ چہار شنبہ کو نو بجے وہ لائق نوجوان فخر خاندان اپنے بزرگوں عزیزوں دوستوں کے دل کا چین و آرام لے کر ہمیشہ کے واسطے دنیا کو خیرباد کہہ گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون اللھم اغفر لہٗ۔

مرحوم کو جو شوق و رغبت کاروبار ریاست سے تھی وہ بالضرور قابل مدح و تحسین تھی۔ اگر سرور تھا تو یہ تھا اور جو مسرت تھی تو یہ تھی۔ جناب ممدوح میں ایک صفت نہایت اعلیٰ درجہ کی تھی اور اگر زمانہ کے لحاظ سے خرق عادت کہی جائے تو بیجا نہیں یعنی میں نے کبھی ان کی زبان سے ابنائے جنس کی حاسدانہ برائی نہیں سنی۔ زمانہ موجودہ میں یہ مرض ایسا عام ہے کہ بہت کم لوگ اس مرض مہلک سے بچے ہیں۔
قریباً سب کا یہ برتاؤ ہے کہ جب کسی بھائی کی مدح کوئی زبان سے سنتے ہیں تو ان کا باطن ان کو مجبور کرتا ہے کہ کچھ زہر اگلیں اور بالضرور دو چار سچے جھوٹے عیوب ممدوح کے بیان کر دیتے ہیں۔ مرحوم کے اخلاق وسیعہ اور اوصاف ذاتیہ بہت روز تک ان کی نیک یاد لوگوں کے دلوں میں قائم رکھیں گے

اور یہی نام نیک زندگی کے مقاصد علیہ میں سے خیال کیا گیا ہی۔ مبارک ہیں وہ خوش قسمت لوگ جو اپنے صفات نیک سے بہت سے دلوں کو مضطرب چھوڑ جائیں۔ اے خدا مجھ کو دنیا سے ایسا ہی اُٹھانا۔ آمین بجاہ سید المرسلین۔

(غیر شائع شدہ)

کتاب فیوچر اوف اسلام

(ریویو)

یہ ریویو شاید بعض آدمیوں کو بے وقت معلوم ہوگا کیوں کہ کتاب ہذا کی شیوع کو اس نواح میں قریب یک سال کے ہوا۔ مگر جب وہ اس امر پر خیال کریں گے کہ اس دیر سے کوئی حرج نہیں ہوا تو غالباً بے وقت خیال نہ فرمائیں گے۔ اس کتاب کے مصنف مسٹر ولفرڈ اسکاون بلنٹ ممبر پارلیمنٹ انگلستان ہیں۔ مسٹر بلنٹ (جیسا کہ اس کتاب اور نیز دیگر روایات سے معلوم ہوتا ہی) ادب عربی اور کسی قدر مسائل اسلامیہ سے واقف ہیں۔ اس کتاب کا ترجمہ منشی سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی منصف حوالی علی گڑھ نے کیا ہی۔ منصف صاحب کی لیاقت اس ترجمہ سے معلوم ہوتی ہی اور چوں کہ مصنف کے خیالات زیادہ تر منصف صاحب کے سبب شائع ہوئے لہٰذا عام مسلمانوں پر اُن کا شکریہ واجب ہی۔

یہ کتاب دو دیباچوں اور پانچ باب پر منقسم ہی۔ دیباچہ اول بمقام قاہرہ جنوری ۱۸۸۲ء میں لکھا گیا ہی۔ اور دوسرا بمقام کلکتہ ''اجازت ترجمہ دیتے وقت جنوری ۱۸۸۴ء میں۔ دیباچہ اول میں اس کتاب کے جلد شائع کرنے کی وجہ اور گورنمنٹ انگلشیہ کو صلاح تالیف قلوب مسلمانان ہند اور اپنے قاہرہ جانے اور سلطنت عثمانیہ کی اخیر ساعت کی ضرورت اور مسلمانوں سے عذر وغیرہ وغیرہ امور بیان کئے ہیں۔ دیباچہ ثانی میں ترجمہ کی اجازت' اور اُس کے ساتھ ہی اس کا ترجمہ ہونے سے مسرت' کچھ خیالات کا واپس لینا سلطنت عثمانیہ کے قیام کی نسبت ایک نہایت ضعیف سی امیدا اور بعض واقعات مصر پر افسوس ہی۔ باب اول میں مصنف کی سیر جدہ' وہاں کے مسلمانوں کے حالات' تمام دنیا کے مسلمانوں کی مردم شماری

اور فرقہائے اسلامیہ کا بیان ہے۔ باب دوم میں خلافت کی بحث ہے۔ باب سوم میں یہ ذکر ہے کہ صحیح اور اصلی دارالحکومت مکہ ہے۔ باب چہارم کا یہ عنوان ہے "اسلام میں اصلاح"۔ باب پنجم میں اسلام کے ساتھ انگلستان کے تعلقات و اغراض ہیں۔ یہ کتاب بغرض اطلاع اپنے ہم ملکوں و نیز مطالعہ مسلمانوں کے لکھی گئی ہے۔

چونکہ پولیٹکل وقعت مسٹر بلنٹ کے خیالات کی خود مدبران انگلش یعنی انگریزی اخباروں میں کچھ نہیں، لہذا میرا ریویو اُن غلطیوں اور لغزشوں پر ہوگا جو مذہب اسلام کے بیان میں اُن سے ہوئی ہیں۔ باب اول صفحہ ۱۰ میں مسٹر بلنٹ کا یہ قول ہے کہ ہر فرقہ دوسرے فرقہ کو صاف صاف حدود اسلام میں داخل تسلیم کرتا ہے تحقیق سے خارج ہے۔ کیونکہ اہل سنت و جماعت شیعیان علی میں سے اُن اشخاص کو جو حضرت ابوبکرؓ کو غاصب کہتے ہیں اور اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تبرا جائز رکھتے ہیں (ان صفات سے شیعہ عاری شاذ بلکہ معدوم ہیں) کافر خیال کرتے ہیں مسٹر بلنٹ نے مردم شماری مسلمانوں میں فرقہ وہابیہ کو اہل سنت و جماعت میں سے خارج کیا ہے۔ صفحہ ۱۴ میں مذہب حنفی کی نسبت لکھا ہے وہ زیادہ تر اُس کے مویدوں کے مذاق کے موافق موضوع ہے گویا بالفاظ دیگر یہ کہنا ہے کہ وہ اصول اسلام کے موافق نہیں مذہب حنفی میں کوئی بھی مسئلہ ایسا نہیں جس کی سند حدیث صحیح یا آیت قرآنی سے نہ لائی گئی ہو۔ اس صورت میں اُس قول کے کچھ معنی نہیں۔ اسی صفحہ میں امتناع اجتہاد سے جو علماء ترک کی تقسیم کی ہے وہ بھی بیجا ہے، کیونکہ تمام علماء حنفی کا عام اس سے کہ وہ ترکی ہوں یا مصری ہندی ہوں یا ایرانی یہ مسئلہ مسلمہ ہے کہ اجتہاد بعد چوتھی صدی ہجری کے موقوف ہوگیا۔ اسی صفحہ میں یہ بھی ہے کہ مذہب حنفی نے منشیات کے استعمال اور ترکوں کی دیگر بداعمالیوں کو برداشت کرلیا ہے اگر اس کے یہ معنی ہیں کہ اس مذہب نے ان باتوں کے جواز کا فتویٰ دے دیا ہے تو یہ بالکل غلط ہے کیونکہ ان تمام باتوں کی حرمت آیات صریحہ اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے اور کوئی اجتہاد ایسے امور کو جو آیات صریحہ اور احادیث صحیحہ سے حرام ہوگئی ہوں حلال قرار نہیں دے سکتا اور کسی دوسری صورت میں اس مذہب پر کچھ الزام نہیں۔ صفحہ ۲۲ میں یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ شافعیوں کے برتاؤ کی تعریف لکھی ہے یہ مسئلہ چونکہ اجتہاد کے[1]

---

[1] اس نا تمام فقرہ سے بعد کا صفحہ گم تھا، اور باوجود سعی بلیغ دست یاب نہ ہوا نہ اصل کتاب زیر ریویو مل سکی کہ جوڑ ملا دیا جاتا۔

بیان[1] آیندہ سے (صفحہ ۲۷۷) ہوتی ہی جس سے یہ ثابت ہی کہ سلطنت عثمانیہ کو ملک حجاز سے صرف چار لاکھ روپیہ سالانہ ملتا ہی۔ اگر اس رقم کا بار بالکل حاجیوں ہی کے سر پر ڈالا جائے تو اُس تعداد حجاج کے بموجب جو مسٹر بلنٹ نے اسی باب میں لکھی ہی فی کس چار روپیہ کچھ آنے پڑتے ہیں جو کوئی بڑی تعداد نہیں اور باقی اقوال کی غلطی وہی لوگ خوب جانتے ہیں جو اُس پاک زمین کی زیارت کر آئے ہیں۔ علاوہ اس کے جتنے مسلمان اُس مقدس زمین سے پھر کر آئے ہیں اُن کو ہمیشہ یہی خواہش رہتی ہی کہ خدا پھر اُسی پاک زمین پر پہنچا دے۔ اگر اُن پر تمام یہ مصیبتیں پڑتیں تو کم سے کم عوام تو وہاں کا نام بھی کبھی نہ لیتے اور اگر شاذ و نادر کوئی قافلہ کا آدمی مدینہ کے راستہ میں لٹ بھی جائے اُس کو گورنمنٹ انگلشیہ کے انتظام اضلاع پشاور پر قیاس کر کے معاف رکھنا چاہیے (صفحہ ۳۶) جو تمہید سلطان سلیم خاں مرحوم کے لقب خلیفہ اختیار کرنے کی بیان کی گئی ہی اُس کی کوئی دلیل بیان نہیں کی گئی اور ایسا ہی وہ دعویٰ ہے جو صفحہ ۳۰ میں بابت مشابہت نام حضرت عثمانؓ خلیفہ ثالث اور سلطان عثمان خاں مرحوم بانی سلطنت عثمانیہ کے کیا گیا ہی۔ (صفحہ ۴۹) "معاویہؓ نے بمقابلہ خاندان علیؓ کے اپنا حق قائم کر لیا تھا" حضرت معاویہؓ نے بمقابلہ خاندان حضرت علی کے اپنا حق بزور شمشیر نہیں قائم کیا بلکہ حضرت امام حسنؓ نے بعد چھ مہینہ کی خلافت کے (صرف اس وجہ سے کہ بسبب اختتام تیس سال مدت خلافت کے اس کے بعد سلطنت شروع ہوتی تھی) اختیارات حضرت معاویہ کو دیدئے اور جو حق حضرت معاویہؓ نے خود حضرت علی کے مقابلہ میں (جنگ صفین میں) بزور شمشیر حاصل کرنا چاہا تھا اُس میں وہ ناکامیاب رہے (صفحہ ۵۲) کے اس الزام کا جواب کہ سلطان نے علما

---

[1] اس فقرہ سے پہلے کا مبیضہ کم تھا، اور باوجود سعی بلیغ دست یاب نہ ہوا۔ نہ اصل کتاب زیر ریویو مل سکی کہ جوڑ ملا دیا جاتا۔
محمد مقتدیٰ خاں

کو اصول اسلام میں مشغول رہنے سے باز رکھا تھا ہم جواب لکھ چکے ہیں علمائے ترک پر یہ اعتراض ہو کہ وہ
زبان عربی کو سمجھ نہیں سکتی ہو لہذا ہم چند علمائے ترک کے نام لکھتے ہیں اگرچہ اور بہت سے علمائے ترک
کے نام جن کی لیاقت قریباً تمام ممالک اسلام میں مسلّم ہی لکھ سکتے ہیں مگر بوجہ خوف طول صرف یہی لکھے۔
احمد بن سلیمان شہر با بن کمال پاشا شارح مصنف اصلاح و ایضاح استاد ابن حاجب صاحب کافیہ
و شافیہ خضر بیگ بن جلال رومی استاد خیالی صاحب حاشیہ شرح عقائد نسفی سلیمان چلبی بن وزیر خلیل
پاشا عبد الکریم رومی مؤلف حواشی تلویح وغیرہ فقیہ ترسوں رومی سید ابراہیم رومی علاوہ اس کے
دلائل ابتدائی سے استدلال نہ کرنا کبھی اس بات کا مؤید نہیں ہو سکتا کہ استدلال نہ کرنے والا علوم
عربیہ سے ناواقف ہی کیونکہ فخر الدین رازی علامہ قطب رازی سید شریف جرجانی علامہ تفتازانی
علامہ دوانی شیخ جلال الدین سیوطی و تمام مصنفین صحاح ستہ وغیرہ وہ لوگ تھے جن کا مثل اب مسلمانوں
میں پیدا ہونا اگر محال نہیں تو قریب بمحال ضرور ہی۔ مگر یہ بھی ائمہ اربع میں سے کسی ایک کے ضرور مقلد
تھے اور ابتدائی دلائل اور اصول سے استدلال نہیں کرتے تھے (صفحہ ۵) سلطان عبد المجید نے بہ سبب اپنے
بے موقع ارادوں کے مسلمانوں سے کافر کا خطاب حاصل کیا اور سب کو معلوم ہو کہ اس کا بیٹا مذہبی
قانون کا توڑنے والا قرار پاکر تخت سے اتار دیا گیا" مجھ کو حیرت ہو کہ مسٹر بلنٹ نے سلطان عبد المجید
خان کا بیٹا کیسے قرار دیا ہو آیا سلطان عبد العزیز خاں معزول مرحوم کو یا کسی اور کسی کو سلطان عبد العزیز
خاں مرحوم سلطان عبد المجید خاں مرحوم کے بھائی تھے نہ بیٹے اور کوئی سلطان اس الزام سے
معزول نہیں کئے گئے۔ ناظرین یہ نہ خیال کریں کہ میں بھی سلطان عبد العزیز خاں مرحوم کی معزولی اس
باعث سے سمجھتا ہوں کہ وہ مذہبی قانون کے توڑنے والے تھے بلکہ یہ سمجھتا ہوں کہ مدحت پاشا و
علمائے وقت نے اور وجوہ سے معزول کیا۔ (صفحہ ۶۰) اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ (یعنی سلطان عبد الحمید
خاں خلد اللہ ملکہ کی تخت نشینی) ایک نعمت غیبی معلوم ہوئی مگر سچے خیر خواہان اسلام خواہ مخواہ اس
کو ایک افسوسناک واقعہ سمجھتے ہیں ...... لیکن سوء اتفاق سے سلطان عبد الحمید نہ تو ایک نرے
درست تھے اور نہ طبیعت کے کمزور" ناظرین خیال کریں کہ یہ خیالات کس قدر مسلمانوں کا دل

دکھانے والے اور مسٹر بلنٹ کی بدخواہی پر سلطنت ٹرکی کی نسبت دال ہیں یہ امر کہ سلطنت ٹرکی کے
زوال سے مسلمانوں کا مذہبی نقصان بھی بہت بڑا ہوگا خلافت کے بیان میں ثابت ہو جاوے گا۔
(صفحہ ۴۳) "اور اس ارمنی خلیفہ کو...... اپنا پیشوا تسلیم کر چکا ہے" اب تک تو مسٹر بلنٹ اس بات پر زور
دے رہے تھے کہ سلاطین ترک قریشی نہیں لہذا قابل خلافت نہیں لیکن اب اُن کو یہ بات بھی ناگوار ہو گئی
کہ سلطان حال خلد اللہ ملکہ کو خلیفہ عثمانی لکھیں بلکہ ارمنی خلیفہ کہنے لگے (صفحہ ۶۶) میں مسٹر بلنٹ سلطان
حال خلد اللہ ملکہ کی نسبت تحریر فرماتے ہیں "بلکہ یہ نسبت معلوم النسب ہونے کے زیادہ تر حرم سرا
کی ایک پیداوار سمجھا جاتا ہے" یہ الفاظ ایسے ناشائستہ ہیں کہ کوئی تھوڑی سی تہذیب والا بھی کسی ہمسری کی
نسبت زبان سے نکال نہیں سکتا چہ جائیکہ مسٹر بلنٹ اور سلطان (امیر المومنین) شاید مسٹر بلنٹ کو ہمدرد
اسلام ہونے (جس کے وہ مدعی ہیں) ان الفاظ کی تحریر پر مجبور کیا ناظرین اس دعوے اور ان الفاظ کو اپنے
دل میں خیال فرمائیں۔ مسٹر بلنٹ نے اس بارہ میں کہ بعد زوال خلافت ٹرکی (خدا ایسا نہ کرے) خلافت
کہاں ہوگی عجیب عجیب خیالات ظاہر کئے ہیں کبھی ہندوستان میں دہلی و حیدرآباد کو دار الخلافہ قرار دیا
ہے کبھی محمد توفیق خدیو مصر کا استحقاق خلافت جتایا ہے کبھی ٹریپولی اور ٹیونس میں خلافت کا امکان ظاہر
کیا ہے اور آخر کار ان تمام منصوبوں کو توڑ کر اخیر بنیاد جس میں اسلام کی بہبودی بھی خیال کی ہے اس پر جمائی
ہے کہ خلافت مکہ میں قائم رہے گی میری رائے میں جس طرح کہ دہلی و حیدرآباد میں خلافت کا قائم ہونا ممکن
نہیں اسی طرح مکہ میں خلافت مکہ میں قائم نہیں رہ سکتی کیونکہ جس زمانہ میں کہ شرفائے مکہ خود مختار رہتے
اُس زمانہ میں بھی (جیسا کہ مسٹر بلنٹ کے اقوال سے بھی پایا جاتا ہے) بغیر امداد شاہان ہند مصر ترک ایران
وغیرہ اُس زمانہ کی اسلامی سلطنتوں کے بسر نہیں کر سکتے تھے اب سلطنت ہند زوال میں آگئی بزوال خلافت
ترک (مسٹر بلنٹ کے فرمانے سے) اصول موضوعہ اقلیدس کی طرح مان لیا گیا مصری گورنمنٹ بھی بعد
زوال خلافت ترک قائم نہیں رہ سکتی ایرانی سلطنت کو روس سے کب فرصت ملے گی جو وہ شریف مکہ کی
دستگیری کرے اور کوئی سلطنت اسلامی قائم نہیں خود ملک حجاز ایسا زرخیز نہیں جس سے کافی آمدنی ہو سکے پس
شریف مکہ کس طرح بعد خلیفہ ہونے کے ہماری اغراض کی حفاظت اُس وقت کر سکیں گے جبکہ ہم بوجہ پیدا

ہونے کسی مذہبی خطرہ کے اُن کی طرف رجوع کریں گے (مسٹر بلنٹ نے صفحہ ۶۵ میں لکھا ہے کہ اُس وقت بھی اگر کوئی عام اور سخت خطرہ مذہب کے لئے پیدا ہو تو مسلمان لوگ اپنی اغراض کی حفاظت کے لیے خلیفہ ہی سے رجوع لائیں گے) اور کس طرح شریف مکہ اپنے تئیں رقیبوں سے بچائیں گے اور اُن کو وہ کونسا حامی ملے گا جو اُن کو فرمانروایان یمن اور نجد کے پنجہ سے چھوڑا دے (صفحہ ۶۷) شریف مکہ کو اُس وقت تک کہ اُن کو کوئی حامی مل جائے اپنے تئیں فرماں روایان نجد کے اور ائمہ یمن کے حوالہ کر دینا پڑے گا) اور کیونکر شریف مکہ حاجیوں کے قافلوں کو ڈاکوا ور لوٹیروں سے محفوظ رکھیں گے اور کس قوت سے غیر مذہب والوں کی مداخلت سے ان پاک مقامات کو بچائیں گے اور بجز اس کے کچھ بھی نہ ہوگا کہ بہت جلد تباہ ہو جائیں اور نہ کوئی غیر جگہ کا آدمی بوجہ نہ ہونے امن کے حج کو جائیگا اور جس طرح ایام جاہلیت میں حجاز سب ملکوں سے بے تعلق تھا اُسی طرح پھر ہو جائے گا (یہ مضمون ۱۸ جمادی الآخر ۱۳۰۲ھ مطابق یکم فروری ۱۸۸۵ء کو لکھا گیا اور ۱۰ فروری اور ۱۴ اپریل کو شائع ہوا۔ اخبار مشیر قیصر لکھنؤ میں)۔

شحنۂ ہند کی خدائی فوجداری

تنگی سینہ دلم را بہ فغاں می آرد
ورنہ یا نالہ تو خاموشی فریادے است

اخبار شحنۂ ہند[1] کے دو پرچے اتفاقاً میری نظر سے گزرے اُن میں ریویو جو مشاعرہ کے رسالوں پر دیکھا تو نہایت حیران رہ گیا۔ منجملہ اور اعتراضوں کے جو منشی امیر احمد صاحب امیرؔ اور نواب مرزا خاں صاحب داغؔ پر کئے ہیں ایک یہ اعتراض بھی ہے کہ دل سینہ میں نہیں ہوتا۔ خدا نے فرمایا ہے۔ ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور۔ مگر افسوس ہے کہ مرزا داغ محل اعتراض ہی رہے اگرچہ میں انکی یعنوں میں پڑنا

---

[1] اخبار شحنۂ ہند ایک زمانہ میں میرٹھ سے ہفتہ وار نکلتا تھا۔ مولوی احمد حسین شوکت مرحوم اس کے اڈیٹر تھے۔ اور خود کو "مجدد السنہ شرقیہ" جانتے اور لکھتے تھے۔ محمد مقتدیٰ خاں شروانی۔

پسند نہیں کرتا مگر چونکہ اڈیٹر اخبار مذکور نے یہ دعویٰ کیا ہی کہ یہ اعتراض اُٹھ نہ سکے اور یہ بھی دعویٰ ہی کہ ہم اردو زبان کے مجتہد ہیں ریفارمر ہیں موجد ہیں لہٰذا میں اُن کے جواب لکھتا ہوں نہ اس غرض سے کہ مجھ کو شحنۂ ہند سے حسد ہی یا اس سبب سے کہ میں اُن اُستادوں کا شاگرد ہوں بلکہ محض اس غرض سے کہ اصلیت معلوم ہو جاسکے تاکہ ناظرین منصفانہ نظر ڈالیں۔

جناب امیر سلمہ ۵

در کریم پہ تا روز حشر راہ ملے
گناہگاروں میں چھپ چھپ کے ہر گناہ ملے

اعتراض: اوّل مصرعہ میں تائے تعلیلیہ کی جگہ تائے انتہائیہ کا بھی وہم ہوتا ہی کہ پس یہ مصرع یوں ہو در کریم پہ محشر میں تاکہ راہ ملے جواب اگر احتمال ہوتا ہی تو مصرع ثانی اُس کو دفع بھی کرتا ہی پس اصلاح کی کیا ضرورت ہی جناب امیر سلمہ ۵

وہ بت پرست ہوں میں جاکے دیر کے در پر
پکارتا ہوں کوئی بت خدا کی راہ ملے

اعتراض: دیر سے بت ملنے میں چنداں خوبی نہیں کعبہ سے بت ملے تو سبحان اللہ شعر یوں ہو ۵

وہ بت پرست ہوں میں جاکے کعبہ کے در پر
پکارتا ہوں کوئی بت خدا کی راہ ملے

جواب کہنے والے کی غرض یہ ہو کہ میرا مسلک صلح کل ہی کیونکہ میں جو کہ بت مانگتا ہوں کعبہ اور بت دونوں سے محبت ہوتا پایا کہ کعبہ نشیں دیر سے بت ملنے کیونکہ کعبہ نشیں ہو کر اگر بت مانگے تو کعبہ سے اُس کو نہایت محبت ہو جناب امیر سلمہ ۵

پڑا ہی ہجر میں یہ تفرقہ جو ڈھونڈے
تو میں کہیں مرا سایہ کہیں تباہ ملے

اعتراض لفظ "تباہ" حشو ہی علاوہ اس کے ایک سایہ کا تداخل ہی ذوق دہلوی بھی ایسا ہی لکھ گیا ہی ۵

پڑے تفرقے یہ جدائی سے تیرے
کہیں ہوں کہیں دل کہیں جاں کہیں ہے

حق یہ ہی کہ ہمارے منشی صاحب کو اردہ فکر سے مضامین چھین لینے کا خاصہ ملکہ ہی یہ بھی تو شعرا کی صفت ہی جو آپ تباہ حشو کیوں ہی کیا تباہ کہنے کے لفظ سے کہنے والے کی حالت زیادہ تباہ نہیں معلوم ہوتی غزل میں جس قدر ایسے الفاظ لائے جائیں گے اسی قدر زیادہ لطف پیدا ہوگا جب کسی استاد کا مضمون دوسرے استاد کے مضمون سے لڑ جائے تو کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا۔ خواجہ نظامی (خسرو شیریں) ؎

مرا لے کاشکے مادر نمی زاد
وگر میزادشیرم کس نمیداد

مولوی جامی (یوسف زلیخا) ؎

مرا لے کاشکے مادر نزاشے
وگر زادے بجز دیگر نداشے

خواجہ نظامی (سکندر نامہ) ؎

دو کار ست با فرّ و فرخندگی
خداوندی از تو زما بندگی

امیر خسرو (قرآن السعدین) ؎

اے صفتت بندتو از زندگی
از تو خداوندی زما بندگی

اسی طرح اور اساتذہ کے مضمون بھی باہم لڑے ہیں مگر ان پر گرفت نہیں کی گئی اور اسی کو توارد کہتے ہیں کیا آپ کو بھی اردہ فکر سے مضامین چھین لینے کا ملکہ ہی شوکت ؎

بنایا دو دو دل نے کیوں نیا چرخ
ستم کو جو کہ کافی آسماں تھا

ذوق دہلوی بھی کچھ ایسا ہی فرما گیا ہی ؎

۱۴و۱۵و۱۶

نہ کرتا ضبط میں نالہ تو پھر ایسا دھواں ہوتا
کہ نیچے آسماں کے ایک نیا اور آسماں ہوتا

تسلیم ؎

ہوئے جواں وہ جب ربط میں فتور آیا
شباب ساتھ لئے حسن کا غرور آیا

اعتراض نون غنہ کا اظہار مکروہ ہے یوں ہونا چاہئے ؎
ہوئے وہ جبکہ جواں ربط میں فتور آیا

جواب۔ نون غنہ کا اظہار ایک تسلیم ہی نے نہیں کیا بلکہ دوسرے اساتذہ نے بھی کیا ہے۔ مومن ؎
مدفون ہو وہ غنچہ دہن جو اصیبتا

آرزو ؎

یہ ناز یہ غرور لڑکپن میں تو نہ تھا
کیا تم جوان ہو کے بڑے آدمی ہوئے

اُردو میں تو بہت سے الفاظ میں نون غنہ کا اظہار کیا جاتا ہے جیسے پان وغیرہ تسلیم ؎
دلِ کلیم کے ہوتے ہوئے خدا کی شان
پسند جلوہ فروشی کو کوہ طور آیا

اعتراض[1] علاوہ اس کے خرید کا ذکر نہیں اور فروخت موجود نیا دوکان پر ٹھہرنے کا روادار نہیں
یہاں بانک لگا رہی ہیں کہ پورا تولنا یہ شعر یوں ہونا چاہئے تھا ؎
دل کلیم کی بھائی نہ خوش خریداری
پسند جلوہ فروشی کو کوہ طور آیا

جواب۔ جلوہ فروشی کے معنی اظہار جلوہ کے ہیں پس خرید کے ذکر کی کچھ ضرورت نہیں جلوہ فروشی

---

[1] یہ اعتراض کا ایک جز ہے۔

ترکیب فارسی ہے لہذا اساتذۂ فارسی کے اسناد لکھے جاتے ہیں جن میں فروخت موجود مگر خرید کا ذکر نہیں ملک الشعرا طالب آملی ؎

وقت سحر بنالہ نکوشد کسے چرا
مستی بلبلاں نہ فروشد کسے چرا

میرزا غالب دہلوی ؎

تنکا یتے نہ فروشی و جلوہ نخری
تو آشنائے گہ خواجہ و آشنائے تو کیست

مرزا بیدل عظیم آبادی ؎

بیدل گل رخسار بہیں جلوہ فروش ست
وقت ست کہ زخم دل ما تازہ کند چشم

جناب امیر سلمہٗ ؎

آنکھیں مرجانے کو کہتی ہیں وہ لب جینے کو
کہئے یہ حکم رہے کہئے وہ ارشاد رہے

اعتراض پہلے مصرع میں (وہ) حشو ہے علاوہ اس کے مرجانے کا تقابل جینا نہیں بلکہ جی جانا درست ہے ؎

آنکھیں گر مرنے کو کہتی ہیں تو لب جینے کو
کہئے وہ حکم رہے کہئے وہ ارشاد رہے

جواب ایسے الفاظ اساتذہ کے کلام میں بھی آئے ہیں پس اُن کا استعمال بیجا نہیں۔ مومن ؎

کیونکہ بدلے ہوئے تیور یہ تمہارے دیکھوں
کیونکر ان آنکھوں سے غیروں کے اشارے دیکھوں

گو مرجانے اور جی جانے کا تقابل صحیح ہو مگر اس مصرع میں تو جینا ہی چاہیے کیونکہ جی جانا مرے ہوئے کے واسطے استعمال کرتے ہیں زندہ سے نہیں کہہ سکتے کہ جی جاؤ اور چونکہ کہنے والا زندہ ہے اس سے یہ

خطاب نہیں کر سکتے۔ یہی حال مرنے اور مر جانے کا ہی جناب میرزا داغ سلمہٗ ؎

کے گھڑی چین سے تو اے ستم ایجاد رہے

تیرے سینہ میں جو میرا دل ناشاد رہے

دل سینہ میں نہیں ہوتا پہلو میں ہوتا ہی بعلاوہ اس کے اب "کے" متروک ہی۔ جواب ریفارمر صاحب کی اس تحقیق کے قربان دو شعر میں بتاتا ہوں ان میں بھی بجائے سینہ کے پہلو ہو جائے تو مناسب ہی۔ ذوق ؎ جس طرح دیکھے قفس سے باغ کو مرغ اسیر + جھانکتا ہی یوں تجھے دل سینۂ صد چاک سے۔

شیخ حزیں ؎ تنگی سینہ دلم را بہ فغاں می آرد

ورنہ با ناز تو خاموشی و فریا دیکے است

لفظ "کے" کے متروک ہونے کی نسبت وہی جواب کافی ہی جو آپ نے "بلبلے ماتھی" کی نسبت لکھا ہے غیر مناسب نہ ہوگا اگر دو چار اشعار معترض صاحب کے بغرض اظہار سلیقہ و طرز کلام لکھدئے جائیں افسوس کہ مغربی طرز جس کے شوکت بہت موید ہیں ان اشعار میں نظر نہیں آتی۔ غالباً میری نظر کا قصور ہی یا ایہا الذین آمنوا لم تقولون ما لا تفعلون شوکت کا کلام ؎

ہوا ہوں بسکہ گھٹ گھٹ کر غم ابروئے دلبر میں

بنے مدفن مرا بعد از فنا خنجر کے جوہر میں

یہاں تک ہم نے رکھا پردہ ناموس شہادت کا
کہ پانی ہو کے خون بھی مل گیا ہے آب خنجر میں

ستم کیسے ہے کہ اعضا جذب نظارہ سے سمٹے ہیں
کہ بعد از مرگ بھی ہوں دفن تیرے روزن در میں

عروج خاکساری سے بڑھا رتبہ یہ شوکت کا
کہ بام عرش پہ پہنچی ہے اس کی ایک ٹھوکر میں

راقم

منم واقف عذرا سے سخن

(مطبوعہ ۱۸ راگست ۱۸۸۵ء مشیر قیصر)

گنج مراد آباد ضلع اُناؤ

مجھ کو ایک عرصہ سے مراد آباد کی حاضری کی آرزو تھی۔ اور باعث آرزو اشتیاق قدم بوسی حضرت شبلی عصر جنید دہر مولانا فضل الرحمٰن صاحب مدظلہم تھا۔ چند بار قصد کیا لیکن محروم رہا۔ بارے اب کے آرزو پوری ہوئی اور شرف پابوسی موجب سربلندی ہوا۔ جمعہ ۲۰ رجب ۱۳۰۵ھ کو بقصد مراد آباد یہاں سے روانہ ہو کر کانپور پہنچا۔ اُستاذی مولانا عبد الغنی خاں صاحب (مرید حضرت شیخ) کی معیت تھی وہاں ایک وجہ خاص سے ایک روز توقف کرنا پڑا۔ دوسرے دن کانپور سے قصبہ بلہور میں آیا۔ یہاں سے پالکی میں سوار ہو کر مراد آباد کو چلا۔ راستہ میں تھوڑی دیر میں ایک ندی ایسن نامی پڑی۔ پھر کچھ دور جا کر گنگا ملی۔ صبح کا وقت ابر گھرا ہوا گنگا پر عجیب لطف دیتا تھا۔ دس بجے مراد آباد پہنچا۔ دریافت ہوا کہ اُس وقت حضرت درس حدیث میں مشغول تھے اس لئے بازار کے کنارہ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا تھوڑی دیر کے بعد مسجد کے اندر کے مقبرہ میں جا بیٹھا۔ یہ مقبرہ خدا جانے کس زمانہ کا ہے۔ بیچ میں ایک قبر بنی ہوئی ہے۔ دھوئیں کے سبب سیاہ ہو رہا ہے۔ ایک طرف سیتل پاٹی کا فرش پڑا تھا اس پر اور چند آدمی (جو حصول زیارت کے واسطے آئے تھے) بیٹھے ہوئے تھے۔ میں بھی جا بیٹھا۔ مولانا اگرچہ فاصلہ پر تشریف رکھتے تھے مگر یہاں اور یہاں سے باہر وہ رعب طاری تھا کہ کوئی فرد بشر آواز بلند بات کرنے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔ اور بے تکلف یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی زبردست حاکم کے باہر آنے کے منتظر ہیں۔ ایک گھنٹہ کے بعد شرف حضوری حاصل ہوا۔ حضرت چارپائی پر تشریف رکھتے تھے میں زمین پر بیٹھ گیا۔ کچھ تھوڑے سے دریافت حال کے بعد اشعار نعتیہ بہ کمال شوق و ولولہ پڑھنے لگے۔ چند منٹ کے بعد حجرہ میں تشریف لے گئے۔ مجھ کو بھی اندر آنے کے لئے ارشاد فرمایا۔ بزرگوں کے حالات بیان فرمائے۔ مثنوی شریف کے شعر پڑھے۔ الحق کہ مثنوی شریف کے شعر عجیب درد سے پڑھتے تھے منجملہ اور اشعار کے یہ شعر بھی تھا ؎

صحبت مرداں اگر یک ساعت ست
بہتر از صد خلوت و صد طاعت ست

کچھ عرصہ کے بعد استراحت کے واسطے رخصت فرمایا۔ حضرت کا قامت بلند، بدن دوہرا، رنگ گورا، داڑھی چھوٹی نہایت سفید، آواز بھاری اور باطنی کیفیت میں ڈوبی ہوئی۔ حضرت کا لباس ڈھیلا انگرکھا، ڈھیلا پاجامہ، دوپلڑی ٹوپی تمام سر کو ڈھکے ہوئے، کیمخت کا جوتا جس کی ایڑی بیٹھی ہوئی۔ حضرت کا حجرہ پرانا اور تنگ، ایک طرف چارپائی اُس پر فرد اور دری پڑی ہوئی (فرد اور دری دونوں نئے شاید پندرہ روز کے ہونگے) ایک طرف چوکی اُس پر کچھ مٹی کے برتن اور قلمدان۔ باقی جگہ میں شکستہ و کہنہ بوریا۔ بعد ظہر مسجد میں تشریف لاکر حدیث شریف کا درس فرمایا جس میں حاضر ہونے کی مجھ کو بھی عزت حاصل ہوئی۔ ایک گھنٹہ کے بعد حجرہ میں رخصت کے واسطے طلب فرمایا اور دعائے خیر کے بعد اجازت فرمائی۔ یہ مسجد (جس میں حضرت کا قیام ہے) نہایت پرانی اور مرمت طلب ہو رہی ہے۔ مسجد کے دروازہ میں داخل ہونے پر جانب راست ایک مقبرہ ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ اُس کے سامنے مغربی جانب کو چند قبریں، ایک کنواں اور کچھ دور حجرہ مبارک ہے۔ گرد کے مکان بھی کہنہ و ویران ہیں۔ غرض کوئی چیز اہل دنیا کی دلچسپی کی نہیں ہے۔ مگر صدہا امیر و غریب تونگر و مفلس آتے ہیں اور جاتے ہیں۔ ایک کشش ہے کہ سب کو کھینچتی ہے۔ کسی فن کا آدمی ہو جب تک خود ہم کو اُس میں مداخلت نہ ہو ہم نہیں جانتے کہ وہ کیسا ہے کامل یا ناقص، استاد یا اناڑی۔ اگر ہم اصول اقلیدس سے واقف نہیں تو اگر ایک شخص کسی مشکل شق کو حل کرے تو ہم یہی کہیں گے کہ کچھ لکیریں کاڑھتا ہے۔ اس کا کیا نفع ہے یا اس کا حل کس ذہن و دماغ کا کام ہے، یہ ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ ایسا ہی کچھ تصوف کا حال ہے۔ جب تک ہم صاحب حال نہ ہوئے یہ معما حل نہیں ہو سکتا، اور یہ مطلب صاف ہونا ممکن نہیں ہے۔ عوام کرامات کو دیکھتے ہیں مگر صوفیائے کرام نے کرامت کو "حیض" کہا ہے۔ حضرت کی خدمت میں پہنچ کر دو زبردست خیال میرے دل پر طاری ہوئے جن کے سبب یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں نے حضرت کا مرتبہ پہچان لیا لیکن یہ جانا کہ ہم میں اور اُن میں سوائے ظاہری مشابہت کے اور کوئی مشابہت نہیں۔ ہمارے خیالات سے ان کے خیال الگ اور ہمارے ارادوں سے ان کے ارادے جدا، ہمارے

مشاغل سے ان کے مشاغل علیحدہ ان کی امیدیں اور خوشیاں اور خوف اور مقصود او یہ آگ لکڑی کو جلاتی ہے
ہم بھی دیکھتے ہیں اور اُن کے بھی پیش نظر ہے لیکن ہم کیا سمجھتے ہیں اور ان کے ذہن میں کیا آتا ہے۔

اول خیال تو یہ تھا کہ مراد آباد دنیا میں ہے اور گاؤں نہیں قصبہ ہے لیکن حضرت کی مسجد میں ایک دوسرا عالم نظر آتا تھا۔ دنیاوی معاملات کا کوسوں پتا نہ تھا۔ خود حضرت کی گفتار و کردار اور وہاں کے اہل قیام کے احوال سے (عام اس سے کہ وہ چند گھنٹہ کے آئے ہوئے ہیں یا دو چار برس سے رہتے ہیں) یہ معلوم ہوتا تھا کہ کچھ ایسے لوگ ہیں جو تعلقات دنیا سے کنارہ کر آئے ہیں۔ حیدر آباد کے امیر کبیر نواب خورشید جاہ بہادر جو ۲۵ لاکھ کے معافی دار ہیں میرے پہنچنے سے صرف ایک روز پہلے وہاں آئے تھے۔ مگر اُن کا ذکر بھی نہ تھا اور نہ کوئی وقعت اُن کی کسی کے ذہن میں معلوم ہوتی تھی۔ حال آں کہ کانپور اور بلہور اُن کے تذکروں کی صدا سے گونج رہے تھے۔ اور ہر ایک سوسائٹی (خواہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ) ان کے تذکرہ کو اپنے جلسوں کا دلچسپ مبحث بنائے ہوئے تھی۔ پھر یہ کس کا اثر تھا؟ کیا مراد آباد کے پانی کا؟ ہرگز نہیں۔ وہاں کی خاک کا؟ ہرگز نہیں۔ وہاں کے در و دیوار کا؟ ہرگز نہیں۔ حضرت کے ہاتھ پاؤں کا؟ ہرگز نہیں۔ حضرت کے بالوں کا؟ ہرگز نہیں۔ البتہ اُس کیفیت کا اثر تھا جو حضرت کے قلب میں تھی۔ وہ کیفیت کیا تھی؟ اس سے کون واقف ہے اور کوئی کیا جانے۔ مریض کا بدن بخار سے جلتا ہے، مگر وہ سوائے اثر کے مؤثر کو نہیں جانتا۔ سبب کو مشخص کرنا طبیب کا کام ہے۔ ہم بدن پر ہاتھ رکھ کر گرمی محسوس کر سکتے ہیں مریض کو اپنا جسم گرم اور منہ کا مزہ تلخ معلوم ہوتا ہے لیکن یہ جاننا کہ یہ غلبہ صفرا کا نتیجہ ہے طبیب کا کام ہے۔

دوسرا خیال یہ تھا کہ خود میرا ذہن مجھ کو ذلیل سمجھتا تھا اور ہر چند حیرت سے غور کرتا تھا لیکن کوئی وقعت اپنی میرے ذہن میں نہیں آتی تھی۔ دنیاوی جلسوں میں لفٹنٹ کے دربار دیکھے رؤسا کے مجمع دیکھے۔ اہل علم کے مجلسیں دیکھیں مگر کہیں اپنے نفس کو اتنا بے حقیقت نہیں پایا۔ اپنے اعمال ذمیمہ اضیعہ پر خود نفس سخت ملامت کرتا تھا اور اپنی بے مائگی پر خود نفریں کرتا تھا۔ ہر شخص سے خواہ وہ کوئی ہو اپنے تئیں کم وقعت تصور کرتا تھا۔ غرض ایک عجیب خیال تھا کہ پورا بیان میں آنا مشکل ہے۔ وہاں سے

آنے پر یہ خیال ایسے رہے جیسے کہ کسی دلچسپ خواب کا صبح کو خیال اور لطف ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ کیفیت زائل ہوگئی اور چند لمحہ کے بعد پھر نفس امارہ "انا و لا غیری" اور "ہمچو ما دیگرے نیست" کے پھندے میں جا پھنسا۔ یہ خیال میرے نزدیک محض نئے اور نرالے تھے جو مدت العمر میں کسی جگہ اور کبھی پیدا نہیں ہوئے۔ اس سے قیاس چاہتا ہوں کہ وہ جگہ بھی کچھ اور جگہوں سے نرالی تھی۔ اللہ بس باقی ہوس۔ فقط

۲۵ رجب المرجب ۱۳۰۵ھ (غیر شائع شدہ)

اساتذۂ کرام

فارسی و عربی

(۱) بسم اللہ مولوی سید حسن شاہ صاحب رامپوری نے پڑھائی۔ موصوف کا ذکر تذکرہ کاملان رامپور مؤلفہ حافظ احمد علی خاں شوق اور انتخاب یادگار مؤلفہ منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی میں ہے۔

بسم اللہ کے چند روز کے بعد قطع تعلق ہوگیا اور رامپور چلے گئے۔

(۲) ان کے بعد میر فرزند علی صاحب متوطن مارہرہ نے پڑھایا۔ مولوی حسن شاہ صاحب نے صرف پارۂ عم پڑھایا تھا۔ باقی قرآن مجید میر صاحب نے پڑھایا۔ فارسی بہار دانش تک پڑھائی۔ خط کی مشق کرائی۔

(۳) میر صاحب کے بعد حکیم سلیم اللہ صاحب ساکن محلہ بنی اسرائیل کول (علی گڑھ) نے پڑھایا۔ سہ نثر ظہوری تک۔

(۴) میر فرزند علی صاحب کے پڑھانے کے زمانے میں عربی کا آغاز ہوا۔ مولوی سید اکبر صاحب سے رجو کا لوخاں ضلع اٹاوہ کے متوطن اور سادات ترمذی سے تھے۔ مولانا لطف اللہ صاحب کے شاگرد تھے۔ حدیث مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری سے پڑھی تھی۔ باوجود ولایتی ہونے کے اردو صاف صحیح بولتے تھے۔ تذکیر تانیث کی صحت

کا پورا اہتمام تھا۔ مولانا سہارنپوری کے درس میں افغانوں کو بوجہ اُن کی اردو زبان صاف نہ ہونے کے قرأت کی اجازت نہ تھی، مگر مولوی صاحب اس سے مستثنیٰ تھے۔

صحت موصوف کی اچھی نہ تھی، اس لئے تعلیم کم حاصل ہو سکی۔ صرف کے فارسی رسالے صرف میر، زبدہ تک پڑھائے۔ اس کے بعد

(۵) مولوی غلام محمد صاحب پنجابی مقرر ہوئے جو شاگرد تھے مولوی محمد لطف اللہ صاحب کے۔ نحو اپنے وطن میں اُس اہتمام سے پڑھی تھی جو اہل پنجاب کا اس فن کے پڑھانے میں ہے۔ مولوی صاحب نے شرح جامی تک نحو، شرح تہذیب و بدیع المیزان تک منطق پڑھائی۔ فقہ میں مالابد منہ، منیۃ المصلی، قدوری، کنز الدقائق پڑھیں۔ شرح جامی کی تعلیم کا پورا اہتمام کیا۔ ایک بار رامپور سے ایک مولوی صاحب آئے جو شرح جامی کے استاد سمجھے جاتے تھے۔ عم محترم مولوی عبدالشکور خاں صاحب مرحوم نے اُن کو مکتب میں میرا امتحان لینے کے واسطے بھیجا۔ "حاصل محصول" کی بحث میں امتحان لیا۔ یہاں سے جا کر عم محترم سے کہا کہ "لڑکا سمجھتا ہے"۔

(۶) مولوی غلام محمد صاحب پنجابی کے بعد مولوی عبدالغنی خاں صاحب (جو اجلّہ تلامذہ مولانا لطف اللہ صاحب سے تھے) تشریف لائے۔ قطبی سے پڑھانا شروع کیا۔ قطبی، میر قطبی، مختصر المعانی، ہدیہ سعیدیہ پورے اہتمام و کاوش سے پڑھائیں۔ مطالعہ کی سخت تاکید تھی۔ اس کی خامی پر تنبیہ فرماتے۔ فقہ میں ہدایہ اخیرین کتاب الرہن تک۔ منطق ملا حسن تک پڑھائی۔ اصول فقہ میں نور الانوار و توضیح تلویح مقدمات اربعہ تک پڑھی۔ حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح، تفسیر میں جلالین، تفسیر بیضاوی (سورۂ بقرہ تک) اسی کے ساتھ انگریزی کی تعلیم ہوتی رہی۔

(۷) اس زمانے کے بعد ۱۹۰۸ء میں علی گڑھ حاضر ہوا۔ مولوی لطف اللہ صاحب کی خدمت میں زانوئے تلمذ ادب سے تہ کیا۔ حمد اللہ، قاضی مبارک، میرزاہد رسالہ (مع غلام یحییٰ) مولانا سے پڑھا۔

(۸) شمائل ترمذی، ساڑھے نو پارے صحیح بخاری کے شیخ حسین صاحب عرب بھوپالی سے پڑھے۔ باقی روایات کی سند عطا ہوئی۔

(۹) حدیث التحایّاں فی اللہ الخ کی روایت حضرت پیر مرشد مولانا فضل الرحمٰن گنج مراد آبادی قدس سرہٗ نے (جو موصوف کو شاہ عبد العزیز صاحب سے پہونچی تھی) عطا فرمائی۔

(۱۰) چہل حدیث شاہ ولی اللہ صاحب کی قاری عبد الرحمٰن صاحب پانی پتی (تلمیذ شاہ اسحٰق صاحب مرحوم) سے پڑھی۔ باقی روایات کی سند دی۔

(۱۱) مکہ مکرمہ میں وقاری سید عبد الرحیم صاحب کو (جو مصر اور قراء کے دور سابق کی یادگار تھے) کلام مجید پورا سنایا۔

(۱۲) مدینہ طیبہ میں قاری حسن شاعر سے اُن کا رسالہ قرأت پڑھا۔ آخیر سبق مسجد نبوی میں پڑھایا اور سند قرأت عطا فرمائی۔

(۱۳) شیخ حبیب اللہ الشنقیطی سے حدیث مصافحہ و مشابکہ کی نیز دیگر مرویات کی سند حرم شریف میں حاصل ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔

انگریزی

(۱) مولوی غلام محمد صاحب کی تعلیم عربی کے زمانے میں ۱۸۸۳ء میں ماسٹر عبد الرشید خاں صاحب ساکن علی گڑھ تعلیم یافتہ محمڈن کالج سے انگریزی شروع کی جو ۱۸۸۵ء تک جاری رہی۔

(۲) ۱۸۸۶ء میں آگرہ جا کر باقاعدہ آگرہ کالج کے ہائی اسکول میں درجہ ہشتم میں داخل ہوا ۱۸۸۸ء تک یہ تعلیم جاری رہی۔

(۳) علاوہ اسکول کی تعلیم کے مسٹر ورٹن ہیڈ ماسٹر اور (۴) مسٹر کاکی سکنڈ ماسٹر سے انگریزی ادب حاصل کیا۔ وہاں سے علی گڑھ آکر (۵) مسٹر ہورسٹ ہیڈ ماسٹر محمڈن کالج ہائی اسکول اور (۶) مسٹر کیسے بن ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول علی گڑھ سے انگریزی ادب پڑھنے اور لکھنے کی مشق کی۔

تعلیم انگریزی کے دوران میں الحمد للہ کبھی تعلیم مذکور کو تعلیم عربی پر غلبہ نہیں ہوا بلکہ تعلیم عربی پوری توجہ کے ساتھ جاری رہی اسی وجہ سے انگریزی میں زیادہ ترقی نہ ہو سکی۔

سیاق

طریقۂ حساب کاغذات ریاست (جس کو اصطلاحاً سیاق کہتے ہیں) حبیب اللہ خاں ساکن بھیکن پور رد حبیب گنج سے سیکھا جو اس فن کے ماہر تھے۔ (غیر مطبوعہ)

خاندان

ہمارا خاندان شروانی ہے جو لودہی اور غلزئی کے بھائی شروانی کی اولاد میں ہیں۔ (سلطان بہلول لودہی کے وزیر اعظم عمر خاں شروانی تھے جن کا خطاب مسند عالی تھا) وہ ہمارے مورث ہیں۔ عمر خاں شروانی کے خاندان میں سلاطین لودیہ کی وزارت عظمیٰ کئی پشت تک قایم رہی۔

شیر شاہ سوری کے عہد میں اقتدار حاصل رہا۔ شیر شاہ نے ہمایوں بادشاہ کا اخراج ہندوستان سے کیا اور ہندوستان کی سلطنت پر قبضہ۔ اس وجہ سے مغل سلاطین پٹھانوں کے مخالف ہوئے اور فوج سے خارج کرکے اُن کو آوارہ کردیا۔ اکبر بادشاہ اور شاہجہاں کے عہد میں ہمارے بزرگ دلّی سے اس نواح میں آئے۔ اور زمینداریاں قایم کیں جو آج تک اللہ تعالیٰ کے فضل سے ترقی کے ساتھ قایم ہیں۔ ہمارے پردادا صاحب محمد باز خاں تھے۔ اُن کے تین صاحبزادے تھے۔ حاجی محمد داؤد خاں مورث نواب محمد فضل اللہ خاں بڑے۔ منجھلے محمد خاں زماں خاں ہمارے دادا۔ موصوف انتظام ریاست اور کاغذات ریاست میں ماہر تھے۔ شاہ عبدالعزیز صاحب سے بیعت تھی۔

مسائل اربعین رسوم شادی وغم کے متعلق شاہ محمد اسحٰق صاحب محدّث مرحوم سے لکھوا کر اُس کے مطابق خاندان کے رسوم کی اصلاح کی جو قریباً ایک صدی سے بفضلہ تعالیٰ آج تک قایم ہے۔ چھوٹے بھائی حاجی غلام محمد خاں دادوں کے مورث تھے۔ بھائیوں میں سے سب سے پہلے انھوں نے انتقال کیا۔ دادا صاحب مرحوم نے اُن کے فرزند محمد ہادی یار خاں صاحب کے بلوغ تک اُن کی ریاست کا کام کیا۔ خاں زماں خاں صاحب کے تین فرزند تھے۔ حاجی محمد ہدایت اللہ خاں جو عابد زاہد تھے انتظام ریاست میں ماہر علم و دست تھے شباب میں انتقال کیا۔ منجھلے حاجی محمد عبدالشکور خاں صاحب

عربی کے عالم تھے ملا حسن شمائل ترمذی وغیرہ کتابوں تک باقاعدہ تحصیل کی تھی انتظام ریاست میں پوری مہارت تھی۔ ۷۵ برس کی عمر ہوئی۔ علوم کے پورے خادم تھے۔ مدرسۂ لطفیہ علی گڑھ، دارالعلوم دیوبند سہارنپور، مدرسہ امدادیہ مراد آباد وغیرہ کی ہمیشہ خدمت کی۔ طلبہ کو وظائف دئے۔ سرسید کے ساتھ مل کر محمڈن کالج کی بھی خدمت کی، اگرچہ اُن کے عقائد کے خلاف رہے۔ آخر زمانہ میں حج کیا، زیارت مدینہ طیبہ سے مشرف ہوئے۔ واپسی میں بمقام جدہ رحلت کی، وہیں مدفون ہیں۔ چھوٹے بھائی محمد تقی خاں صاحب میرے والد تھے۔ ان بھائیوں کا باہمی اتفاق مشہور تھا، یہ ریاست ہمیشہ مشترک رہی۔

والد مرحوم کو مردانہ فنون، بنوٹ، لکڑی، ورزش، کشتی کا شوق رہا، نیز بندوق کے شکار کا۔ اسی کے ساتھ ادب اُردو سے ذوق تھا۔ شروع میں مجھ کو غالب کی انشا اردوئے معلی پڑھنے کے واسطے عنایت کی تھی اُسی سے مجھ کو ادب اُردو کا ذوق پیدا ہوا۔ والد مرحوم نے ایک کتاب سراپا معشوق اردو میں فراہم کرکے چھپوائی تھی، اس میں سر سے پاؤں تک جملہ اعضا کے متعلق اساتذہ کے اشعار جمع کئے تھے۔ اس کا قلمی نسخہ میرے کتاب خانہ میں بھی ہے۔ والد مرحوم کو غدر سے پہلے اور بعد دہلی جاتے، وہاں رہتے اور وہاں کے عمائد مثلاً مفتی صدر الدین خاں صاحب آزردہ اور حکیم احسن اللہ خاں صاحب وغیرہما سے ملنے کا اتفاق ہوتا رہا۔ اس وجہ سے خورونوش، نشست برخاست، لباس، ذوق صحبت میں پورا اثر دلی کی صحبت کا تھا۔ مجھ کو اپنے والد مرحوم اور عم محترم دونوں کی صحبت تربیت کا فیض حاصل ہوا۔ ادب، شکار، لباس اور خورونوش اور فنون مردانہ بنوٹ لکڑی وغیرہ کی مشق نتیجہ ہے والد مرحوم کی تربیت کا۔ والد مرحوم ہمیشہ دوپہر کا کھانا اپنے ساتھ کھلاتے تھے۔

علم عربی کی تحصیل اور پابندی مذہبی عم محترم کی نگرانی میں تربیت کا نتیجہ ہے۔ ریاست کے انتظام سے واقفیت مرحوم کی تعلیم و تربیت سے حاصل ہوئی۔ جزاھم اللہ تعالیٰ عنی خیر الجزاء۔

آمین یارب العالمین

(غیر مطبوعہ)

۱۹۵۷ء۔ محمد مقتدیٰ خاں شروانی۔

انتظام ریاست

(ریاست مشترکہ و خاص)

۱۸۹۳ء مطابق ۱۳۱۰ھ میں تعلیم کا سلسلہ ختم ہوا۔

گھر آکر ریاست کا کام سیکھنا اور دیکھنا شروع کیا۔ معاملات ریاست میں عم محترم مرحوم کی نظر بہت وسیع اور عمیق تھی۔ موصوف کی نگرانی میں کام کیا۔ علاقہ ہر دوئی میں اکثر قیام رہا۔ وہاں کاشتکاروں کی آراضی اور اس کے پیداوار کے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ کچھ کھیتوں کی مساحتیں کیں۔ اس زمانے میں نیل کا کاروبار پورے عروج پر تھا۔ اس کی کاشت کرائی۔ مال تیار کرایا پھر اسکو کلکتہ بھیجا۔ اسی سلسلہ میں ایک مرتبہ کلکتہ کا سفر کیا۔ ۱۹۰۵ء مطابق ۱۳۲۳ھ میں والد مرحوم کا انتقال ہوا۔ موصوف اپنے بھائی کے ساتھ ملکر ریاست کا کام کرتے تھے۔ دونوں بھائیوں کا اتفاق مشہور عام تھا۔ والد مرحوم کے انتقال کے بعد میں نے بھی عم محترم کے ساتھ مل کر کام کیا۔ اس اسلوب سے کہ پہلے موقعہ پر اُن کی خدمت میں میرا دلا حسین کارندہ کے زبانی عرض کی کہ اب بھی حضور اسی طرح ریاست کے مالک ہیں جیسے کہ والد مرحوم کی حیات میں تھے۔ اس سے جو تردد کہ والد کے انتقال سے عم محترم کی طبیعت میں پیدا ہو گیا تھا صاف ہو گیا۔ چنانچہ بھیکن پور صبح کو جا کر میں کام کرتا تھا قبل دوپہر واپس آتا تھا۔ والد مرحوم کا بھی یہی طرز عمل تھا۔ جولائی ۱۹۰۶ء مطابق ۱۳۲۵ھ اثنا سفر حجاز میں مراجعت کے وقت جدہ پہنچ کر عم محترم کی رحلت واقع ہوئی۔ اُس وقت عزیزوں اور حکام کی متفقہ مشاورت اور تحریک سے کل ریاست کا کام میرے سپرد ہوا تاکہ قرضہ ادا کیا جائے۔ بعد ادائگی قرضہ ریاست تقسیم ہو گئی۔ چونکہ عم محترم ریاست کے کارگزار تھے اس لئے قرضہ سب اُن کے دستخطی رقعوں کا تھا والد مرحوم کا ایک بھی نہ تھا۔

والد مرحوم کا اصول قرض کشی کے بالکل خلاف تھا اس لئے بھائی کی قرض کشی پر نہ صرف معترض تھے بلکہ بیزار تھے وقتاً فوقتاً اس کا شکوہ والد صاحب کی زبانی میں نے بھی سنا تھا۔

اپنے معتمد وکیلوں کی یہ رائے تھی کہ اگر میں قرضہ سے انکار کردوں تو میرے ذمہ قرضہ عائد نہیں ہوسکتا تھا۔ قرضہ سودی تین لاکھ روپیہ تھا جس کا سود ۹٪ اور ۱۲٪ سیکڑہ تھا۔

بفضلہ تعالیٰ میری طبیعت نے اس کو گوارا نہیں کیا کہ میں سبکدوش ہوکر سارا بار دوسرے عزیزوں کے ذمہ ڈالدوں۔ دو لاکھ روپیہ برادر عزیز عبدالجلیل خاں کے ذمہ تھا اور ان کی ریاست کا حصہ گورنمنٹ کی جانب سے میرے ٹھیکہ میں تھا۔ اس طرح مجھ کو ۵ لاکھ روپیہ سودی ادا کرنا تھا۔ ہم مرحوم کی فیاضی مشہور روزگار تھی۔ نیک کاموں میں مثل عربی مدارس اور دوسری تعلیم گاہوں کے اہل حاجت کی خدمت وغیرہ میں بے دریغ روپیہ صرف فرماتے تھے۔ یہ فضل ربانی تھا کہ کام ہاتھ میں لیکر تمام مصارف خیر جاری رکھے اور سارا قرضہ مثل پانی کے بہہ کر بہت آسانی سے ادا ہوگیا۔ یہ حضرت پیر مرشد قدس سرہٗ کی دعائے خیر کا نتیجہ تھا۔

ساڑھے چھ برس اس نہج سے ریاست کا انتظام جاری رہا۔ بالآخر بعض عزیزوں کو یہ طریقہ گوارا نہ رہا۔ اور ریاست کی تقسیم انھوں نے چاہی۔ نواب مزمل اللہ خاں مرحوم کو درمیان میں ڈالا۔ شروع میں مجھ کو یہ ناگوار ہوا، خصوصاً نواب صاحب کی وساطت لیکن بالآخر میری یہ رائے قرار پائی کہ میری کارگزاری یا عدم کارگزاری، دیانت یا خیانت اگر کھل سکتی ہے تو اسی طریقہ سے لہذا میں نے بھی تقسیم پہ آمادگی ظاہر کردی اور نواب صاحب مرحوم کل شرکاء کی جانب سے ثالث باضابطہ قرار پاگئے۔ موصوف نے بہت محنت سے ثالثی کے فرائض انجام دئے۔ اپنے فیصلہ میں میری دیانت کا اعتراف کرکے کل شرکاء کے حصے تقسیم کردئے۔

تقسیم کے بعد بھی چونکہ قرضہ باقی تھا لہذا اکثر حصہ اپنی اپنی جائداد کا شرکاء نے میرے ہی قبضہ میں چھوڑا تاکہ میں اُن کا قرضہ ادا کردوں۔ چنانچہ قرضے ادا ہونے کے بعد اُن کی جائدادیں اُن کے سپرد کردی گئیں۔

ان عزیزوں کے سوا خاندان کے اور عزیزوں کے بھی سودی قرضے اس طور پر ادا کئے کہ اُن کو اپنے پاس سے رقم دے کر سودی قرضے کے بار سے سبکدوش کرایا اور اُن کی جائدادیں اپنے یہاں رہن

رکھ کر ریزہ ریزہ آمدنی سے اپنا قرضہ بلا سود وصول کر لیا۔ یہ جائدادیں تین ضلعوں میں پھیلی ہوئی تھیں علی گڑھ
ایٹہ، بلند شہر۔ مدیون مسلمان سنی شیعہ اور ہندو سب تھے۔ جب قرضہ ادا ہو گیا فوراً جائداد واگزاشت
کر دی بعض دفعہ ایسا ہوا کہ باوجود تھوڑا قرضہ رہ جانے کے بلحاظ ضرورت مدیونان جائداد چھوڑ دی
بقیہ رقم قرضہ معاف کر دی۔ والحمد للہ تعالیٰ علیٰ ذلک۔ اس طرح قریباً کل ۶ لاکھ قرضہ سودی ادا کیا گیا
اس کے بعد پھر میں نے اپنی جائداد ذاتی کا انتظام کیا اور بفضلہ تعالیٰ وافر جائداد کا اضافہ ہوا
جس کی قیمت کم و بیش ۶ لاکھ روپیہ ہوئی۔ بہت سے جھگڑے جو عرصہ دراز سے چلے آتے تھے پاک
وصاف ہو گئے۔ (غیر مطبوعہ)

تقسیم ترکہ کی برکت

عام خیال غلط یہ ہے کہ تقسیم ترکہ مسلمانوں کی جائدادوں کے فنا ہونے کا باعث ہے۔ تقسیم
در تقسیم سے بڑی بڑی جائدادیں ریزہ ریزہ ہو کر فنا ہو جاتی ہیں۔ واقعات ذیل کی روشنی میں
اس خیال کو جانچو۔

اس وقت ریاست بھیکم پور کا جمع خرچ نقدی بابتہ ۱۲۴۱ف پیش نظر ہے۔ جس کو ایک سو تین
برس کا زمانہ گزر گیا۔ یہ وہ وقت ہے کہ محمد باز خاں صاحب مرحوم رئیس[1] بھیکم پور کا ترکہ تقسیم نہ ہوا
تھا اور تینوں[2] فرزند ان کے مشترکہ ریاست پر قابض تھے۔ اس طرح دادوں بھیکم پور۔
حبیب گنج کی کل ریاستیں یک جا تھیں۔ محمد باز خاں مرحوم کا انتقال ۱۲۳۵ف میں ہوا۔ غفرلہ۔
۱۲۴۱ف میں مندرجہ جمع خرچ مذکور کل مواضعات ریاست حسب ذیل تھے۔
زمینداری مال ضامنی و کنکٹہ وغیرہ کل ۶۵ آمدنی یک لکھ ۱۱۱۰۰۰ مگر ممکن ہے کہ محمد باز خاں
صاحب کے[5] ترکے میں چھ سات برس کے زمانے میں کچھ اضافہ کر لیا گیا ہو۔ بہرحال خاں صاحب
موصوف کا ترکہ اس سے زیادہ نہ تھا۔

۱و۲و۵ ملاحظہ ہو صفحہ ۳۲

۶ بہبرے ۳۰ فرزادا

یہ ترکہ تین فرزندوں پر تقسیم ہوا۔ منجھلے صاحبزادہ محمد خان زمان خاں صاحب مرحوم کے حصے میں بائیس ۲۲ موضع آئے حسب ذیل زمینداری سترہ ۱۷ مال ضامنی پانچ اُن کی کل آمدنی عسہ سالانہ تھی۔ مال وسوایہ وغیرہ ملا کر بسال تمام میزان [illegible] تھی۔ مالگزاری کم وبیش سولہ ۱۶ ہزار روپیہ منافعہ اکیس ۲۱ ہزار محمد خان زمان خاں صاحب کا ترکہ تین ۳ فرزندوں اور ایک دختر پر تقسیم ہوا۔ بڑی دختر نے حصہ لینے سے انکار کر دیا۔

محمد خان زمان خاں صاحب اور اُن کے فرزندوں نے ریاست کو برابر ترقی دی۔ نتیجہ یہ کہ اب اُن کے ورثار کے قبضے میں ۸۰ دیہات ہیں آمدنی ایک فرزند کے ترکے کی بفضلہ تعالیٰ اُن کی آمدنی کے پنج گونی ہے اور دیہات زمینداری ۳۶ - فالحمد للہ علیٰ ذالک حمداً کثیراً طیباً مبارکاً فیہ

دوشنبہ ۹ غرہ جمادی الآخر سنہ ۱۳۵۶ھ ۱۹۳۷ء

مگر بلکہ آمدنی اس حصے کی محمد باز خاں صاحب کی ریاست کی آمدنی سے زیادہ ہے۔ یہی حال محمد باز خاں صاحب مرحوم کے باقی دو فرزندوں کے ورثار کی جائداد کا ہے۔ دونوں فرزندوں کے ترکے نے ترقی عظیم کی ہے۔ آمدنی اور تعداد جائداد اضعافاً مضاعفاً ہے۔

(غیر شائع شدہ)

سفرنامۂ مصر و روم و شام

اے ہمنفس از بہر دل زار بگو
افسانۂ آں شبے کہ با یار گذشت

ڈیر ایڈیٹر۔ سفر در وطن فن تصوف کا ایک مشہور مسئلہ ہے۔ اہل باطن پر تو اس کا انکشاف ہوتا ہی ہے۔ لیکن ہم ظاہر بیں اس کے معنی کی فہم سے قاصر ہیں اور ہے بھی یوں کہ ہم کیونکر سمجھ سکتے ہیں کہ گھر میں آرام سے مسہری پر دراز ہوں اور سیر کر رہے ہوں قسطنطنیہ کی مگر اپنے مخدوم علامہ شبلی کے فیضان

۵۳ ملاحظہ ہو صفحہ ۳۲

توجہ سے ہم نے بھی اس واردات کا مشاہدہ کیا اور گھر سے ایک قدم باہر رکھنے کے بغیر قسطنطنیہ،
بیت المقدس، بیروت اور قاہرہ وغیرہ کی دلآویز کیفیتیں اپنی آنکھ سے دیکھ لیں۔ اگر آپ علامہ
موصوف کا سفرنامہ پڑھیں تو یہ حال آپ پر بھی منکشف ہو سکتا ہے۔ تکلف برطرف، جس سفرنامے کا اشتیاق
دلوں کو مدت سے وقفِ تمنا اور محوِ آرزو کر رہا تھا اب طبع ہو کر شائع ہوا ہے اور حالاتِ مصر کے
اعتبار سے یہ کہنا بالکل حق بجانب ہوگا کہ ایک عزیز مصرِ معنی بازار میں فروخت کو آیا ہے۔ علامہ شبلی
کی اصل غرض اس اولوالعزمی سے ٹرکی، شام، مصر کے تعلیمی حالات کا دریافت کرنا اور وہاں کے
ایشیائی علوم کے نایاب کتاب خانوں کی سیر تھی۔ انہوں نے اپنی قابلِ مدح غرض کو نہایت
جانفشانی اور تحقیق سے پورا کیا اور جو کچھ دیکھا اس کو بسط و شرح سے اس سفرنامے میں درج کیا
ہے۔ مختلف فنون کے مدارس کے حالات یعنی اُن کا سالانہ صرف، تعلیم، طلبہ کی تعداد، بورڈنگ ہوس
کا انتظام اور تربیت کا طریقہ۔ ان تمام امور کو نہایت مستند طور پر بیان کیا ہے۔ پرانے کتب خانوں
کے حالات اور اُن کی عزیز الوجود کتابوں کی کیفیت بھی مفصلاً مذکور ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہر شہر کے
تمدن اور دلچسپ مقامات سے بھی بحث کی گئی ہے۔ اس سفرنامے کی فہرست میں قریباً، عنوان
مندرج ہیں۔ میں ناظرین باتمکین کو یقین دلا سکتا ہوں کہ ہر ایک عنوان کو دیکھ کر یہی دل چاہتا ہے
کہ سب سے اول اسی کو پڑھنا چاہیئے۔ بعض بطور نمونہ یہ ہیں۔ قسطنطنیہ کی موجودہ حالت اور تمدن
تعلیم کی حالت۔ فوجی کالج۔ ترکوں کی علمی حالت۔ کتاب خانے۔ سیرگاہیں۔ سلطان کا نماز جمعہ میں
آنا۔ اور فوجوں کا ملاحظہ سے گزرنا۔ ترکوں کے اخلاق و عادات و طرز معاشرت۔ عورتوں کی
تعلیم و تربیت وضع۔ لباس۔ غازی عثمان پاشا کی ملاقات، تمغہ و فرمان سلطانی کی نقل، بیروت۔
بیت المقدس۔ قاہرہ وغیرہ

جو خوبی اس سفرنامہ کے ساتھ مخصوص ہے وہ یہ ہے کہ یہ اسلامی دیار اُس نگاہ سے دیکھے
گئے ہیں جو اُن کے شایانِ حال ہیں۔ اس زمانے میں سفر کرنے والے اور حالات سفر لکھنے والے بہت،
مگر وہ قسطنطنیہ اور قاہرہ کو اسی دلچسپی اور نظر سے دیکھتے ہیں جو اس زمانے کا اقتضا ہے۔ پس وہ اپنے

مذاق کے مطابق ان شہروں کی سیر کے نتائج اخذ کرتے ہیں۔ اس تاثیر سے محض بیلے خبر رہتے ہیں جو اُس دیار کا ہر ایک ذرہ ایک مسلمان دل پر کرتا ہے۔ ہمارے نامور سیاح نے ایک محقق مسلمان کی نظر سے ان ممالک کو دیکھا اور مسلمانوں کی دلچسپی کا بیحد سامان اپنے سفرنامے میں فراہم کردیا ہے دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان اسلامی شہروں کی قدیم اسلامی تاریخ خود مستند مسلمان مورخوں کے بیان کے مطابق جابجا درج ہے۔ اور وہ یہی ہے کہ علامہ ممدوح سے بڑھ کر یہ کام کون کرسکتا ہے۔ اس سفرنامہ کو پڑھ کر آپ دریافت کرسکتے ہیں کہ جو مقامات پولٹیکل دنیا میں بے انتہا امپارٹنٹ خیال کیے جاتے ہیں اور ہر ایک عظیم الشان سلطنت اُن کو رشک کی نظر سے دیکھ رہی ہیں وہ صدیوں سے صدیوں تک شجاعان اسلام کے قدموں کے نیچے پامال رہی ہیں یہ سفرنامہ عمدہ کاغذ کے ۲۳۵ صفحے پر بہت نفیس چھپا ہے اور عمر[illegible] میں علی گڑھ محمڈن کالج کے پتہ سے علامہ شبلی صاحب سے مل سکتا ہے۔

(اخبار آزاد کانپور مورخہ ۱۷ اگست ۱۸۹۴ء)

لـه نیز بانیٔ ریاست۔ محمد مقتدیٰ خاں شروانی۔

۲ـه (۱) حاجی محمد داؤد خاں مرحوم جدّ نواب محمد فضل اللہ خاں مرحوم۔

(۲) محمد خاں زماں خاں مرحوم جدّ نواب صدر یار جنگ بہادر مدظلہٗ۔

(۳) حاجی غلام محمد خاں مرحوم جد رؤسائے دادوں۔ محمد مقتدیٰ خاں شروانی۔

۳ـه (۱) حاجی محمد ہدایت اللہ خاں مرحوم۔ انھوں نے کوئی اولاد نرینہ نہیں چھوڑی۔

(۲) مولوی حاجی محمد عبدالشکور خاں مرحوم جدّ موجودہ رؤسائے بھیکم پور قدیم۔

(۳) محمد تقی خاں مرحوم پدر نواب صدر یار جنگ بہادر مدظلہٗ۔

محمد مقتدیٰ خاں شروانی

الفاروق

(تبصرہ)

اے آتشِ فراقت دلہا کباب کردہ
سیلابِ اشتیاقت جانہا خراب کردہ

الفاروق کی آمد آمد کا آوازہ مدّت سے ملک میں بلند تھا۔ پبلک کا شوق وقفِ انتظار تھا۔ خلیفۂ ثانی کی لائف کی عظمت و اہمیت علامہ مصنف کے پیشِ نظر تھی اور اُن کی دقیقہ سنج نظر موادِ تحریر کی تلاش میں سرگرم۔ جن باتوں کو آج نگاہیں ڈھونڈتی ہیں وہ گزشتہ تاریخوں میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتیں۔ ہندوستان میں جو تاریخی مصالحہ ہے وہ اس عظیم الشان کام کے لئے کافی نہیں۔ مصنف کی تشنگیٔ طلب سمندر طے کرکے اُن کو ٹرکی کے دار الخلافہ میں لے پہنچی جہاں اُنھوں نے نایاب کتاب خانے چھان ڈالے۔ وہاں سے اُن کا شوق اپنے عزیز کی تلاش میں مصر لایا۔ غرض یہاں انتظار تھا، وہاں مصروفیت۔ ادھر تعجیل تھی اُدھر تاخیر۔ معرکۂ طلب نگاہوں نے جب پبلک کی اس بے چینی کو محسوس کیا تو اُن کو موقع ہاتھ آیا۔ دیکھتے دیکھتے "سیرت الفاروق" "الفاروق" (اول) تالیف ہوئیں، چھپیں، بازار میں آئیں، اور اپنی اپنی قسمت کے مطابق فروخت بھی ہوئیں۔

جب یہ سیمیائی جلوے محو ہوئے اور صبحِ کاذب کی دھندلی روشنی کا فور ہوگئی تو صبحِ صادق نور افشاں ہوئی جس نے نگاہوں کو پُر نور اور دماغوں کو روشن کر دیا۔ ہم بعض مذکورہ بالا کتابیں پڑھ چکے تھے۔ لہٰذا الفاروق کو دیکھ کر ہم نے بے تامل کہا: "دیر آید درست آید"۔ اور جب ہم نے اُس میں اُن کتابوں کے حوالے دیکھے جو قسطنطنیہ میں مصنف کی نظر سے گزری تھیں تو ہماری زبان سے بے ساختہ نکلا ~ مصرعہ

دیر آمدہ، زراہِ دُور آمدہ

الفاروق کو غور و تامل سے پڑھنے کے بعد ہمارے تمہیدی الفاظ شاعرانہ مدح سرائی نہیں معلوم

ہوں گے، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ جس قدر کہنا چاہئے تھا اُس سے کم کہا گیا۔ حضرت فاروق اعظم کی لائف (جن کا ذرّہ جنرلوں کی شمشیر سے زائد پُر اثر اور جن کی سادہ عظمت قیصر و کسریٰ کے جاہ و جلال سے بڑھ کر تھی) شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کی قلم سے نکلے تو کیا اُس کا غلغلہ اور انتظار اُس سے کم ہو سکتا ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا؟

الفاروق جس قسم کے مادّہ سے صورت پذیر ہوئی ہے وہ اعلیٰ درجہ اور اول قسم کا ہے۔ تاریخ طبری، کتاب الخراج، عقد الفرید، مقریزی، بلاذری، فتوح البلدان وغیرہ وہ کتابیں ہیں جو مسلمانوں کے فن تاریخ و جغرافیہ کی جان ہیں اور ان سے زائد معتمد کتابیں (جہاں تک علم ہے) اس وقت عالم میں موجود نہیں۔ یہ کتابیں مصنف کے قابو میں ہیں۔ اور جہاں جس پہلو سے مناسب معلوم ہوتا ہے وہ علامۂ روزگار ان سے کام لیتا ہے۔ قدیم معتبر تاریخیں، جدید تحقیق واقعات کے اصول، ان دونوں عنصروں کو ملا کر مؤلف الفاروق نے ایک تازہ دلفریب شکل پیدا کی ہے جو ایشیا اور یورپ دونوں کے قابو سے فرداً فرداً خارج تھی۔ اور جس کی نسبت خود مولانا نے فخریہ لہجے میں فرمایا ہے ؎

پیکرے تازہ کہ خواہم بہ عزیزاں بنمود
لختے از ذوقِ خودش نیز تماشا کردم

ہمارے مخدوم نے الفاروق لکھ کر نہ صرف تاریخ اسلام پر ایک احسان کیا ہے بلکہ خود مذہب اسلام کی حقانیت کی ایک صاف و روشن بُرہان عالم کے سامنے پیش کی ہے۔ انصاف اور غور کی نظر اگر الفاروق پر ڈالی جائے تو یہ بطور بدیہی سمجھ میں آتا ہے کہ حضرت فاروق اعظم ایک اعلیٰ نمونہ کمال و صفات انسانی کے تھے۔ اس خیال کے بعد دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان قوٰی کو کس نے کمال کی شگفتہ کیا اور کس طرح اُن کی بُو فضائے عالم میں پھیلی۔ نہ وہ کسی یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ تھے، نہ عرب کے ایام جاہلیت کی سوسائٹی ایسی تھی جس کے سانچے میں ایسے باکمال انسان ڈھلتے۔ واقعات صاف شہادت دے رہے ہیں کہ یہ اُس ذاتِ قدسی کی تعلیم و تربیت کا اثر تھا جو انسانوں کو کامل بنانے اور خداوند حقیقی کے مظاہر قدرت کو ظاہر کرنے کے لئے مبعوث ہوئی تھی۔ اور خداوند عالم نے بواسطۂ نبوت خود اُس کو

کامل بنایا تھا۔ ایسے انسان گزرے ہیں جو خود اپنی طبیعت کے زور سے بادشاہ بن گئے ہیں، اپنی قوت کے بل پر سپہ سالار بن کر فاتح عالم ہوئے ہیں۔ لیکن تیمور اور نپولین کے حالات پڑھ کر صاف عیاں ہوتا ہے کہ وہ طبیعت کی ایک لہر تھی جو ایک جانب کو بہائے گئی۔ وہ بہت سی خوبیوں اور بہت سے نقائص کے مجموعے تھے۔

فاروق اعظم پر جس پہلو سے نگاہ ڈالو، امامت کے اعتبار سے، بادشاہی کے لحاظ سے، سپہ سالاری کی حیثیت سے، مقنن و مدبر کی نظر سے، اخلاق انسانی کی بنا پر، غرض ہر شکل میں اور ہر طرح دیکھو۔ خوب دیکھو۔ موافق نگاہ سے دیکھو۔ مخالف بن کر جانچو۔ قصہ مختصر جہاں تک دیکھا جائے دیکھو۔ سوائے خوبی کمال کے اور کچھ نظر نہ آئے گا۔

حق یہ ہے کہ صحابہ کرام حضرت سرور عالم صلعم کی ہدایت کے ایک اعلیٰ اور زبردست شہادت تھے اور آپ کی قوت تربیت کی ایک سچی تصویر۔ آپ کے فیضانِ صحبت سے حضرات ابوبکر، عمر، عثمان، علی، ابوعبیدہ ابن جراح، سعد ابن ابی وقاص، عبدالرحمن ابن عوف، خالد ابن ولید، معاذ ابن جبل، زید ابن ثابت وغیر ذالک جیسے انسانی کمالات کے مختلف نمونوں کا پیدا ہونا ایک قوی اور مستحکم ثبوت آپ کے من جانب اللہ مبعوث ہونے کا ہے اور اسی کا نام معجزہ ہے۔

الفاروق دو حصوں پر منقسم ہے جن کی مجموعی تعداد پانسو (۵۰۰) صفحے سے زائد ہے۔ حصہ اول کے شروع ہونے سے پیشتر ایک تمہید ہے جس میں اسلامی تاریخ اور اس کے مختلف زمانوں کی حالت سے بحث کی ہے۔ معتبر تاریخوں کے نام، متقدمین و متاخرین کی طرز تحریر و تحقیق کا تفاوت بیان کیا ہے۔ فن تاریخ پر ایک عام نظر ڈالی ہے۔ اس کے اصول و فروع بتائے ہیں اور ظاہر کیا ہے کہ مؤرخ کے کیا فرائض ہیں اور یورپ کے مؤرخ کس قسم کی بے اعتدالی کر جاتے ہیں۔

تمہید کے بعد حصہ اوّل شروع ہوتا ہے۔ اور اس میں حضرتِ عمر کے نسب، ولادت، سن رشد، قبولِ اسلام، ہجرت، سنہ یکم ہجری سے وفاتِ حضرتِ سرورِ عالم صلعم تک کے حالات، سقیفۂ بنی ساعدہ، خلافت حضرت ابوبکر، ولیعہدی اور خلافت و فتوحات کا ذکر ہے۔

اس ضمن میں مصنف کو دو معرکۃ الآرا اختلافی مسئلے طے کرنے پڑے ہیں۔ ایک حدیث قرطاس دوسرا سقیفۂ بنی ساعدہ۔

حدیث قرطاس کا خلاصہ یہ ہی کہ حضرت سرورِ عالم صلعم نے وفات سے چار روز پیشتر قلم اور دوات طلب کی اور فرمایا کہ میں تمہارے لئے ایسی چیز لکھوں گا کہ تم آیندہ گمراہ نہ ہو۔ اس پر حضرت عمر نے لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ آنحضرت کو درد کی شدت ہی اور ہمارے لئے قرآن کافی ہی۔ حاضرین میں سے بعض نے کہا کہ (معاذ اللہ) رسول بہکی باتیں کرتے ہیں۔ کسی نے کہا دوات قلم لے آؤ۔ کسی کی رائے ہوئی کہ نہ لانا چاہیے۔ غرض قیل و قال بڑھی اور آپ نے پریشان ہو کر سب کو اٹھا دیا۔ یہ حدیث اسلام کے دو زبردست گروہوں کے مباحثہ کا صدہا برس سے نشانہ ہو رہی ہی۔ ایک گروہ اس کو خلیفۂ ثانی کے خلاف کام میں لانا چاہتا ہی۔ دوسرا فریق ثابت کرتا ہی کہ اس میں کوئی امر خلافِ شرع یا ادب نہ تھا۔ شاہ عبد العزیز صاحب نے "تحفہ" میں اس کی نسبت بارہ صفحے لکھے ہیں۔ جو لوگ شاہ صاحب مرحوم کی دانی عبارت اور شگفتگی مضامین سے واقف ہیں وہ خیال کر سکتے ہیں کہ کیا موتی پروئے ہوں گے اور کیسی گل کاری کی ہوگی۔ لیکن ہمارے علامہ نے نئے پیرایہ میں استدلال کیا ہی اور درایت کے سادہ اصول سے واقعہ کو جانچا ہی۔ لوگوں کو اُن کا بیان روکھا اور پھیکا معلوم ہوگا۔ مگر "انصاف بالائے طاعت است"۔ انھوں نے دو بڑے زبردست پہلو اختیار کئے ہیں۔ اور پوری صفائی سے اس گتھی کو سلجھایا ہی۔ اس موقع پر یہ امر قابل ذکر ہی کہ ہر فن کے مؤلف کا ایک فرض منصبی ہوتا ہی۔ متکلم کا فرض منصبی اور ہی۔ فقیہ کا اور۔ اور مورخ کا اور۔ جب ایک ہی واقعہ ان سب کے سامنے پیش ہوگا تو ہر ایک کی نظر اُس پر مختلف پہلوؤں سے پڑے گی۔ ایک مورخ کسی واقعہ کو صرف اُس کی واقعیت کے اعتبار سے جانچے گا۔ یا یوں کہو کہ جانچنا چاہئے۔ جو مورخ آج تاریخ لکھے وہ اُن سادہ اور زبردست اصول سے قطع نظر نہیں کر سکتا جنھوں نے فن تاریخ کو بام عروج پر پہنچا دیا ہی اور جو تاریخ نگاری کی جان ہیں۔ پس الفاروق کو تاریخ کی حیثیت سے دیکھنا چاہئے نہ فقہ یا کلام کی کتاب کی حیثیت سے؛ اور اس کے مؤلف کو محسنین یا معترضین کے واسطے مورخین کی بزم میں لانا چاہئے نہ کہ مفتیوں کے دار الافتا میں۔

سقیفۂ بنی ساعدہ (جہاں حضرت ابوبکر کی خلافت کا فیصلہ ہوا) حدیثِ قرطاس سے بھی زیادہ معرکہ خیز ہے۔ مؤلف الفاروق نے اس موقع پر بھی پوری آزادی رائے سے کام لیا ہے اور کسی طرح اپنے اُس فرض کو ترک نہیں کیا جو مورخ ہونے کی حیثیت سے تھا۔ اس بحث کے ہر ایک پہلو کو پولیٹکل سائنس کے اصول سے جانچ کر واقعہ کے اصلی پہلو دکھا دئے ہیں۔

معمولاً کسی کتاب کی جلد اول و ثانی کے مابین کوئی فصل نہیں ہوتا لیکن الفاروق کی دونوں جلدوں کے بیچ میں اتنا فاصلہ ہے کہ ایک عالم نظر آتا ہے اور کہہ سکتے ہیں کہ دونوں میں بُعد المشرقین ہے۔ ہماری مراد اُس نقشہ سے ہے جو "دنیائے اسلام" کے نام سے دونوں جلدوں کے بیچ میں چھپا ہے۔ جب ہم اُس کو کھولتے ہیں تو اُس کا مشرقی حصہ جلد اول پر اور مغربی حصہ جلد ثانی پر آ جاتا ہے۔ اسی لئے ہم نے اُس کو بعد المشرقین سے تعبیر کیا ہے۔ یہ نقشہ فی نفسہٖ ایک عجیب چیز ہے اور جنہوں نے جن پروفیسروں نے مرتب کیا ہے اُن کی جانفشانی اور دقیقہ سنجی لائق ہزار آفریں ہے۔ کسی بڑے مضمون کی عبارت کے اختصار کی تعریف بیان کریں تو معمولاً کہتے ہیں کہ "دریا کو کوزہ میں بند کر دیا ہے" لیکن یہ مثل نقشہ کے بارہ میں عموماً اور اس نقشہ کے مقابلہ میں خصوصاً ناچیز ہے۔ نقشہ میں (دریا کیا چیز ہے) فٹ بھر کاغذ میں (بلکہ اُس سے کم میں) سمندر بند ہوتے ہیں، بلکہ بر و بحر۔

اس نقشہ میں کھاری پانی کے سمندروں سے گزر کر فتوحات اسلامیہ کے جانفزا سمندر موجزن ہیں۔ اور جس طرح دنیا کے سمندروں میں رنگ کا امتیاز ہے۔ کوئی اسود ہے، کوئی احمر۔ اسی طرح اس نقشہ میں مختلف عہد کی فتوحات کے سیلاب اپنے اپنے رنگ سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ اور ایک نگاہ میں حضرت سرورِ عالم صلعم خلیفۂ اول سے ثالث تک کا اور بنی امیہ کے عہد اور اُس کے مابعد کی فتوحات کی حد معلوم ہو جاتی ہے۔ اس نقشہ کی مدد سے عرب کی گزشتہ تاریخ عمدہ طور پر سمجھ میں آ سکتی ہے۔ شمس العلماء سید علی بلگرامی نے بھی ایک نقشہ "تمدنِ عرب" میں شامل اس کے دیا ہے۔ لیکن الفاروق کا نقشہ اُس سے زائد مفید اور زیادہ معلومات کا مخزن ہے۔ کاش یہ نقشہ بڑا چھاپ کر دیوار کے آویزاں کرنے کے لائق بنایا جائے۔

جلد ثانی (جیسا کہ خود مصنف نے دعویٰ کیا ہی) مصنف کی سعی و محنت کی تماشا گاہ ہی۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ حضرت فاروق اعظم کی عظمت کی پوری تصویر ہی۔ جس شخص کو یہ نہ معلوم ہو کہ یہ کتاب حضرت عمر کے حالات میں ہی وہ حصۂ ثانی کی فہرستِ مطالب دیکھے تو سمجھے گا کہ یہ کسی انیسویں صدی کے مہذب و منتظم سلطنت کے محکموں کی فہرست ہی۔ کیا یہ کم تعجب خیز امر ہی کہ شائستگی نے جو وسعت حکومت کے مفہوم میں آج پیدا کی ہی اور اُسی وسعت کی بنا پر جو جو محکمے جزو سلطنت قرار پائے ہیں، وہ سب نہیں تو اُن میں سے اکثر ایک منتظم شکل میں حضرت عمر نے اپنی ۱۰ سالہ حکومت میں قائم فرما دئے تھے۔ اور نہ صرف قائم فرمائے بلکہ اُن کے فیض بخش نتائج عالم کو دکھلا دئے ؟!

علامۂ مصنف کو سب سے اول اُن کی قوتِ دماغی اور جامعیت خیال پر آفریں کہنی چاہئے کہ اُنھوں نے فاروق اعظم کی لائف کا ایسا وسیع اور جامع خاکہ اپنے ذہن میں قائم کیا، یا بہ الفاظ دیگر اُن کی عظمت کو اصلی ہیئت میں دیکھا۔ اُس کے بعد مصنف کی تلاش و تجسس کی داد دینی چاہئے کہ جس قدر عنوان قائم کئے اُن کو پوری نکتہ سنجی اور موشگافی کے ساتھ معمور کیا اور واقعات کی مدد سے ہر بحث کا حق ادا کر دیا۔

اس جلد میں آغاز کرتے ہوئے مصنف نے فتوحاتِ فاروقی پر ایک نظر ڈالی ہی اور جن واقعات کو ختم کر آئے ہیں اُن کو ایک اور نگاہ سے دیکھا ہی۔ اول اسباب فتوحات سے بحث کی ہی۔ اس بحث میں مصنف نے اپنے آپ کو زور طبع کی مدد سے اُس طوفان کے مقابلہ میں قائم رکھا ہی جس میں اکثر ابنائے زمانہ کی رائیں بہتی پھرتی ہیں یعنی جو کچھ یورپ کہے سب آمنّا و صدّقنا۔ اور دعویٰ یہ کہ ہم نے یورپ سے آزادی خیال و تحقیقات کا سبق حاصل کیا ہی۔ محقق مصنف نے فتوحاتِ فاروقی کے اُن اسباب کی نسبت جو یورپین مورخ لکھتے ہیں یہ بتایا ہی کہ اُن میں طباعی کی ملمع سازی واقعات کے عنصر پر غالب ہی اور پھر اپنی رائے کے مطابق اسباب قائم کئے ہیں۔ جو شخص ان دونوں بیانِ اسباب کا موازنہ کریگا وہ مصنف الفاروق کی دقتِ نظر کا ضرور قائل ہوگا۔ اس بحث سے فارغ ہو کر حضرت عمر کا اُن فاتحین سے مقابلہ کیا ہی جو عالم میں (مثل سکندر اعظم) مشہور ہیں۔ اور ثابت کر دکھایا ہی کہ اُن میں ایک بھی فاتح حضرت فاروق

سے برتر اور بہتر فاتح نہ تھا۔

بحثِ فتوحات کے بعد سلسلۂ انتظامِ سلطنت کو شروع کرتے ہیں۔ اوّل نوعیتِ حکومت سے بحث ہو کہ خلیفۂ ثانی کی حکومت کا انداز شخصی سلطنت کے اصول پر تھا یا جمہوری سلطنت کے۔ اس بیان میں یہ امر حیرت خیز ہو کہ حضرت عمر کی سی زبردست طبیعت اور پرزور رائے کا فرماں روا کیا عام رائے کا قدر شناس اور جمہوری حکومت کے اصول کا پابند تھا اور نہ صرف پابند بلکہ شخصیت اور غلامی رائے کو مٹانے والا اور طبائع کو آزادی رائے کا سبق سکھانے والا تھا۔

اسی سلسلہ میں حضرت عمر کی مختلف حیثیتوں کی مجالس شوریٰ کے حالات ہم پڑھتے ہیں۔ یہ مجالس اپنے اپنے ارکان اور اپنے اپنے مسائل بحث کے لحاظ سے باہم ممتاز تھیں۔ ان میں بعض ایسی بھی تھیں جن میں رعایا کے قایم مقام طلب کئے جاتے تھے اور ان سے مشورہ لیا جاتا تھا۔ اس بیان کی جان یہ ہو کہ خلیفہ کے حقوق کسی طرح عامۂ رعایا سے ممتاز نہ تھے اور ان کی ذات کسی قانونی اثر سے مستثنیٰ نہ تھی۔ نوعیت حکومت کے بعد انداز حکومت کا بیان ہے، اور اس میں تقسیم ملک، عہدہ داران ملکی، ان کے فرائض کا امتیاز، ان کی تنخواہیں، رشوت کے انسداد کے طریقے، ان کے جرائم کی تحقیقات کے لئے کمیشن کا تقرر، ان تمام امور سے مفصل بحث کی ہو۔

نظام حکومت کے بعد صیغۂ محاصل ہو۔ اس میں یہ دلچسپ ذکر ہو کہ اس طریقۂ خراج کے موجد عرب میں حضرت عمر ہیں۔ اسی ضمن میں عراق، شام و مصر کے صوبوں کے بندوبست کا ذکر ہو۔ بندوبست کے ذکر میں ہر صوبہ کے جداگانہ اصول بندوبست، اقسام اراضی اور پیداوار کو ملحوظ رکھنے، لگان کی شرح، مالگزاری کی ترقی، اور پیمائش اراضی اور اس کی صحت میں امام ابو یوسف کی یہ شہادت کہ "اراضی کی پیمائش اس احتیاط سے کی گئی جس طرح ریشمی کپڑا ناپا جاتا ہے" کا مفصل بیان ہو۔ خوبی بندوبست اس سے ثابت کی ہو کہ حضرت عمر کے بندوبست کے بعد افتادہ زمینیں آباد ہو گئیں اور پیداوار زراعت میں محسوس ترقی ہو گئی۔ اس دیدہ ریزی اور جانکاہی کے بعد بھی فرمانروا کو یہ احتیاط تھی کہ ہر سال صوبہ سے دس دس معتمد آدمی دارالخلافہ میں طلب ہوتے اور ان سے چار مرتبہ حلفاً پوچھا

جاتا کہ وصول مالگزاری میں رعایا پر سختی تو نہیں ہوئی ۔ یہ کیسی عجیب بات ہے ۔ بلکہ خوبی انتظام کا اعلیٰ ثبوت ہے کہ جس قدر خراج عراق وغیرہ صوبوں سے حضرت عمر کے بابرکت عہد میں وصول ہوا اُس قدر نہ حجاج کی سختی وصول کر سکی نہ مامون کے زمانہ کا امن ۔ خلیفۂ ثانی کے عہد میں محاصل عراق دس کروڑ اٹھائیس لاکھ درہم تھے ۔ حجاج نے دو کروڑ آٹھ لاکھ وصول کئے اور خلیفۂ مامون کے عاملوں نے پانچ کروڑ اڑتالیس لاکھ ۔ مصر کا خراج آج کل کے حساب سے پانچ کروڑ چھ لاکھ روپیہ سالانہ تھا ۔ صیغۂ محاصل میں خلیفۂ ثانی نے جو اصلاحیں فرمائیں اور کاشتکاروں کے حقوق جس طرح مضبوط کئے اور تعلقہ داری و زمینداری کے قدیم ایرانی طریقہ کو قایم رکھا اُس کا بیان بھی مفصل طور پر ہے ۔ صیغۂ محاصل کے بیان کا تتمہ یہ ہے کہ ترقی و استحکام زراعت کے واسطے ذرائع آبپاشی مہیا کئے گئے ، نہریں کھدوائیں ، تالاب کھدوائے ، بند بنوائے ۔ اور اس تمام سلسلہ کو محکمہ کی شکل میں منتظم فرمایا ۔ یہاں تک کہ پانی کی تقسیم کے دہانے تک اپنی ہی منظوری سے بنوائے ۔ علامہ مقریزی کا بیان ہے کہ صرف ملک مصر میں ایک لاکھ بیس ہزار مزدور برابر اس محکمہ میں کام کرتے تھے ۔ اور اُن کے مصارف خزانہ خلافت سے ادا ہوتے تھے ۔

صیغۂ محاصل کے بعد صیغۂ عدالت ہے ۔ رومن امپائر کے بارہ اصول کارروائی اور حضرت عمر کے قواعد کا موازنہ کیا ہے ۔ بسیط طور پر محکمۂ عدالت کے جزئیات کی تفصیل لکھی ہے اور دکھایا ہے کہ کس طرح انصاف میں عملاً اصول مساوات مرعی رکھا جاتا تھا ۔ حضرت عمر کا جو فرمان اصول عدالت کی نسبت نقل کیا ہے اُس کی عبارت سے ایک موقع پر جو مطلب مصنف نے اخذ کیا ہے وہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا ۔ اُس فرمان کی عبارت یہ ہے ۔ "واجعل لمن ادعى بينة امداً ينتهي اليه فان احضر بينة اخذت له بحقه والا وجهت القضاء عليه" ۔ اس کا ترجمہ یہ کیا ہے "جو شخص ثبوت پیش کرنا چاہے اس کے لئے ایک میعاد مقرر کرو ۔ اگر وہ ثبوت دے تو اُس کا حق دلاؤ ۔ ورنہ مقدمہ خارج" ۔ آگے چل کر اس عبارت سے حسب ذیل دو اصول مستخرج کئے ہیں (۶) مقدمہ کی پیشی کی ایک تاریخ معین ہونی چاہیئے (۷) تاریخ معینہ پر اگر مدعی علیہ حاضر نہ ہو تو مقدمہ یک طرفہ فیصل کیا جائے گا ۔ معلوم نہیں اصول نمبر (۷) کہاں سے ماخوذ ہے ۔ اس امر کا لحاظ رہے کہ فرمان مذکور کی ماقبل یا مابعد عبارت کو اس اصول سے کوئی تعلق نہیں ۔

عدالت کے بعد افتا اور افتا کے بعد پولیس و فوجداری کا ذکر ہے۔ اس صیغہ میں حضرت عمرؓ کے عرب میں جیل خانہ ایجاد کرنے کا ذکر ہے۔ اُن کی خلافت سے پیشتر عرب میں کہیں جیل خانہ نہ تھا۔ یہ بھی مذکور ہے کہ عادی مجرموں کو جلاوطنی کی سزا بھی ملتی تھی جو کسی جزیرے کو بھیج دئے جاتے تھے۔

پولیس و فوجداری سے فارغ ہو کر ایک اور اہم صیغہ کا حال مصنف نے بیان کیا ہے یعنی خزانہ اور اس کے انتظامات، اُس کے افسر، مفصلات کے خزانوں اور خزانوں کے مکانوں کا مفصل حال تحریر کیا ہے۔ اس محکمہ کا ایجاد بھی عرب میں حضرت عمرؓ نے فرمایا۔

خزانہ کے بعد پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ ہے۔ اس میں اُن نہروں کے حالات ہیں جو علاوہ آبپاشی کے اور اغراض کے لئے تیار ہوئیں۔ مثلاً ایک نہر ابی موسیٰ تھی جو دجلہ سے نو میل مسافت طے کر کے بصرہ میں آئی تھی۔ اور اُس سے وہاں کا گلی کوچہ سیراب ہوتا تھا۔ ایک نہر خود امیر المومنین کے نام سے مشہور تھی۔ ۱۸ھ ہجری کے قحط عرب میں مصر سے غلہ بوجہ بعد مسافت دیر میں آیا اس لئے رفع قحط کے بعد خلیفہ ثانی نے وسائل آمد و رفت کو زیادہ آسان کرنے کی تدبیر فرمائی۔ دریائے نیل سے ۶۹ میل طویل ایک نہر نکال کر بحر قلزم سے ملا دی۔ اس طرح جہاز نیل سے سیدھے بحر قلزم میں آجاتے تھے۔ یہ بات کیسی تعجب کی ہے کہ اسی عہد مبارک میں گورنر مصر نے اس عظیم الشان کام کا ارادہ کیا تھا جو انیسویں صدی میں فرانس کے ایک نامور انجینیر کے ہاتھ سے پورا ہوا یعنی حضرت عمرو ابن العاص نے نہر کے ذریعہ سے بحر روم و بحر قلزم کو ملا دینے کا ارادہ کیا تھا۔ نہر کا موقع تجویز کیا گیا، پیمائش کی گئی۔ مگر بعض پولیٹیکل مصلحتوں نے اُس کی تیاری ملتوی رکھی

نہروں کے بعد مفید عام عمارتوں کا حال ہے جن میں دار الامارہ، دفتر وغیرہ شامل ہیں۔ عمارتوں کے بعد سڑکیں ہیں۔ اور سڑکوں سے ہم اُن شہروں میں پہنچتے ہیں جو حضرت عمرؓ نے آباد کئے۔ ان بابوں کے ختم ہونے کے بعد فوجی محکمہ کا حال ہے۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں اس محکمہ کا وجود ہونا معمولی بات تھی کیونکہ وہ فتوحات کا زمانہ تھا۔ لیکن حیرت خیز وہ انتظام تھا جو آج سے تیرہ سو برس پیشتر اس محکمہ کا کیا گیا۔ الفاروق میں اس صیغہ کے مختلف شعبوں اور انتظاموں کا بیان پورے اٹھائیس صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ ملک کو جس طرح فوجی حیثیت سے حضرت عمرؓ نے تقسیم فرمایا اور مختلف مواقع پر فوج کے صدر مقامات مقرر فرمائے اُن کی تشریح

اور اُن کے وجوہ اسباب سے بسیط و دقیق بحث کی ہی۔ فوجی بارکوں، فوج کے دفتر، کمسریٹ، فوجی چھاؤنیوں، بحری قلعوں، لائٹ[1] ہوسیز، فوجی حفظانِ صحت، محکمۂ خبر رسانی، وغیرہ سبھی باتیں تو لکھ ڈالی ہیں۔ یہ امر کیسا دلچسپ ہے کہ حضرت عمر کے جرّار لشکر میں بہادرانِ راجپوت بھی شامل تھے۔ ہندوستان کے جاٹ شاہنشاہ فارس کی فوج میں ملازم تھے۔ جب ایران عرب کے قبضہ میں آیا تو یہ فوج بھی حلقہ بگوش ہوئی اور بصرہ میں آباد کی گئی۔ اپنے موقع پر اسٹڈ (stud) کا بھی بیان ہی۔ ہر فوجی صدر مقام کے متعلق بڑے بڑے اصطبل ہوتے تھے جن میں چار چار ہزار گھوڑے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ اُن کے واسطے وسیع شاداب چراگاہیں ہوتی تھیں۔ داغ کا طریقہ بھی رائج تھا۔ اس محکمہ میں یہ ایجاد ہوئی کہ اس سے قبل قبائل عرب نسل کے بارہ میں گھوڑیوں کی خوبی اور اصالت کی پروا نہیں کرتے تھے۔ حضرت عمر نے اس پر لحاظ فرمایا اور خالص عربی گھوڑیوں کے مہیا کرنے کی ترغیب دی۔ آج جو لوگ عربی گھوڑوں پر سوار رہتے ہیں اُن کو خلیفۂ ثانی کے اہتمام کا ممنون ہونا چاہیے۔ الفاروق کا یہ حصہ کسی پٹھان مورّخ کی قلم کا جولانگاہ بننا چاہیے تھا۔ مگر سچ ہی کہ علامہ مصنف نے اس بحث کا بھی پورا حق ادا کیا ہی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ اُن کا دماغ برسوں حضرت فاروق کے حالات کی تفتیش میں مصروف رہا ہی اس لئے اُن کے ہیرو (Hero) کے صفات کا پرتو اُن کے دماغ پر پڑا اور وہ جنگی مطالب [illegible] اور صفائی سے لکھ سکے، ورنہ ایک مدرسہ کے مولوی کو اس مضمون کا لکھنا دشوار بلکہ ناممکن ہوتا۔

جنگی تہذیب صیغہ کے حالات پڑھ کر ہم مذہبی حالات پر پہنچتے ہیں۔ اور ان حالات کی ترقی اور شگفتگی اس آشفتگی کو رفع کرنے والی ہی جو جنگی حالات سے اعتدال پسند خیالات میں پیدا ہوتی ہی۔ اسی سلسلہ میں اشاعت اسلام، اُس کے طریقے، اور اُس کے اسباب مسطور ہیں۔ جو بیانات قرونِ اولیٰ کی اشاعتِ اسلام کی نسبت غیر مذہب والوں کے دماغوں میں غلط فہمی سے جمی ہوئی تھی اُس کو بہت کچھ (بلکہ بالکل) پروفیسر آرنلڈ نے اپنی بیش بہا تصنیف کے ذریعہ سے محو کر دیا ہی۔ تاہم الفاروق سے بھی بہت سی مثالیں اُس کی تردید کے لئے ملتی ہیں۔ حضرت عمر کا ایک غلام مسلمان نہ تھا۔ انھوں نے ہر چند اس کو اسلام لانے کی ترغیب

---

[1] روشنی کے مینار (Light house)

دی، مگر وہ ایمان نہ لایا۔ آخر خلیفۂ ثانی نے مایوس ہو کر فرمایا "لا اکراہ فی الدین" یعنی دین کے معاملہ میں کسی پر جبر نہیں کر سکتے۔

متفرق انتظامات کے سلسلہ میں سب سے مشہور سنہ ہجری کا تقرر ہے جو آج تک موافق و مخالف میں رائج ہے۔ اس زمانہ میں یہ بات عجیب معلوم ہوگی کہ اُس وقت تک عرب میں دستاویزوں پر صرف مہینہ لکھا جاتا تھا، سنہ لکھنے کا رواج نہ تھا جس سے حساب کے وقت عجیب دقت پیش آتی تھی۔ اسی ضرورت نے حضرت عمر کی توجہ تقرر سنہ کی طرف مائل کی۔ اسی باب میں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ محکمۂ مردم شماری اور اُس کا دفتر بھی ایک محدود شکل میں قائم تھا۔

انتظامات متفرق کے ختم ہونے پر ایک نہایت اہم بحث شروع ہوتا ہے، یعنی ذمیوں کے حقوق۔ جو انصاف پسند اس مضمون کو پڑھیں گے وہ بے ساختہ بول اُٹھیں گے کہ اسلام سے پیشتر اور اسلام کے بعد کبھی کسی قوم نے غیر قوموں کو وہ حقوق نہیں دئے جو اسلامیہ قرون اُولیٰ میں بخشے گئے۔ انتہا یہ ہے کہ ذمی بغاوت کرتے اور بر خلافِ خلافت سازشیں۔ اس پر بھی اسلام کا رحم قہر سے مبدّل نہ ہوتا۔ اور سزا دینے میں رعایت کا پہلو اور ترحم کا خیال پیشِ نظر رہتا۔ شام کے ایک شہر عربسوس کے باشندے رومیوں سے سازش رکھتے تھے اور ممالکِ اسلامیہ کی خبریں اُن کو پہنچاتے۔ خلیفۂ ثانی کو اس کی اطلاع ہونے پر دارالخلافہ سے یہ سزا تجویز ہوئی کہ اُن کی جائداد، زمین اور مویشی اور جو اسباب ہے سب کی فہرست مرتب کر کے ہر ایک کی دونی قیمت دی جائے اور ادائے قیمت کے بعد اُن سے کہدیا جائے کہ ہمارے ملک سے باہر چلے جائیں۔ اگر اس پر وہ عذر کریں تو چال چلن کی درستی کے لئے اُن کو ایک سال کی مہلت ملے۔ مہلت پر معاملہ ٹھہرا۔ مگر خوئے بدکجا اور کہاں جاتی ہے۔ انھوں نے پھر وہی حرکت کی اور سال کے ختم ہونے پر جلا وطن کر دئے گئے۔

حضرت عمر کے ایک جلیل القدر حاکم نے حمص کے ایک ذمی سے غصہ میں صرف یہ لفظ کہدئے۔ "اخزاک اللہ" (خدا تجھ کو رسوا کرے)، جب غصہ فرد ہوا تو اس قدر ندامت اُن کو ہوئی کہ دربارِ خلافت میں اپنا استعفا بھیج دیا اور وجہ استعفا یہ لکھی کہ نہ میں ملازم ہوتا نہ یہ حرکت مجھ سے سرزد ہوتی۔ اسی باب میں جزیہ کی بحث ہے۔ مگر اُس کا حق رسالہ جزیہ میں ادا ہو چکا ہے۔ اس لئے یہاں ہم کو اُس کی نسبت کچھ کہنا نہیں ہے۔

غلامی کا رواج جن تدابیر سے حضرت عمر نے کم کیا اور غلاموں کو احرار کے رتبے بخشے، ان کو جدا بیان کیا ہے۔ اور اس بیان میں ایک وسیع اور عام غلط خیال کی تردید کی ہے جو حضرت شہر بانو کی نسبت پھیلا ہوا ہے۔

حضرت عمر کی اُس صفت کے لئے جو عام طور پر مشہور ہے (یعنی انصاف اور سیاست) علامہ مصنف نے جداگانہ باب باندھا ہے۔ اُس میں حیرت خیز امر یہ ہے کہ کس طرح بدون جبر یا قہر کے حضرت فاروق کی وہ ہیبت اعلیٰ سے ادنیٰ تک چھائی ہوئی تھی جس نے سلاطین عالم کے جلال پست کر دئے تھے۔ حضرت عمر کے رعب اور اثر کی داستان اس راز کی حل کرنے والی ہے کہ اصلی ہیبت اور عظمت اصول انصاف کی پابندی میں ہے۔ حضرت عمر نے جو اصول یا قانون جاری فرمایا اول اُس پر اپنے نفس اور اپنے اعزا اور اقربا کو پابند کیا۔ کسی قانون کے توڑنے کی سزا اغیار کے لئے ایک حصہ تھی تو اپنی اولاد کے لئے دو حصے۔ اُن کی اسی تعلیم کا اثر تھا کہ (جہاں تک ہم کو علم ہے) حضرت عمر کی اولاد کے دل میں کبھی خلافت یا حکومت کا خیال نہیں سمایا حالانکہ اور خلفا کی اولاد اس سے مستثنیٰ نہیں رہی۔

ان تمام حالات کے پڑھنے کے بعد خواہ مخواہ دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایک شخص واحد یہ سارے کام کیونکر انجام دیتا تھا جب کہ نہ آج کل کی سی آسانی وسائل آمد و رفت میں تھی نہ اُن کو شائستہ اور آسودہ ملک حکومت کے لئے ملا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ علامہ شبلی بیان کرتے ہیں کہ ہر کام وقت پر انجام پاتا تھا۔ بڑے مشاغل چھوٹے چھوٹے مشاغل کے اوقات پر دعوی نہیں کر سکتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فاروق اعظم کام کرنے کی قوت خداداد رکھتے تھے۔ اور اُن کا ایک گھنٹہ دوسرے کام کرنے والوں کے ہفتوں یا مہینہ کی برابر تھا۔

امامت و اجتہاد کا باب ایسا دقیق و بسیط ہے کہ اُس کو بھی من اوّلہ الیٰ آخرہ پڑھنے سے اُس کا نقشہ ذہن میں آسکتا ہے۔ لہٰذا ہم اُس کے لطف کو بالکلیہ ناظرین الفاروق کے لئے محفوظ رکھتے ہیں۔

امامت و اجتہاد سے فارغ ہو کر حضرت عمر کے ذاتی حالات لکھے ہیں۔ اس باب میں اُن کی مذہبی زندگی اور عبادات کے حال بھی ہم پڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ کا ایک سچا اور فرماں بردار بندہ اپنے دینی فرائض کو کیسی سرگرمی سے ادا کر رہا ہے جو اُس کے واسطے زیبا ہے۔ یا بہ الفاظ دیگر یہ کہا جائے کہ اُس

پاک بندے سے اُس کی قوت ایمانی (کانشنس) وہ عہد سچائی کے ساتھ پورا کرا رہی ہو جو اُس نے اسلام لاکر اپنے مالکِ حقیقی سے کیا تھا۔ جو لوگ اس زمانہ میں مذہب اور اُس کی پابندی سے بھڑکتے ہیں وہ حضرت عمر کی مذہبی لائف سے یہ سبق حاصل کر سکتے ہیں کہ "جس قدر مذہب اسلام کی پابندی کی جائے گی اُسی قدر انسان پاک باطن، فیاض اور ہمدردِ خلائق بنے گا۔ اور اپنے فرائض کے ادا کرنے کی کوشش کرے گا۔" جو لوگ پابندیٔ مذہب کو تنگ خیالی اور درشتیٔ طبیعت کا سرچشمہ مان رہے ہیں وہ حضرت عمر کے اُس برتاؤ کو دیکھیں جو وہ غیر مذہب رعایا سے برتتے تھے۔ اور اُس شفقت کے حالات پڑھیں جو اُن کو غلاموں کے حال پر تھی۔ اور یہ بھی سُن لیں کہ حضرت عمر وہ شخص ہیں جن کی نسبت آنحضرت نے فرمایا ہے۔ "اشدھم فی امر اللہ عمر" کہ تمام میری امت میں خدا کے احکام میں سخت تر عمر ہے۔ اُن کی شدتِ فرمانبرداری یہ تھی کہ انھوں نے اپنی آہنیں طبیعت کو خدائے تعالیٰ کے احکام کی بجا آوری میں موم سے زیادہ ملائم کر لیا تھا۔ جو لوگ ہم میں آج کل اپنے ادّعا کے بموجب کاروباری بن رہے ہیں وہ احکام مذہبی کے نہ بجا لانے کے لئے کثرتِ کار کو ایک خاصہ اور معقول عذر تصور کر رہے ہیں اور اس غلطی میں پڑے ہیں کہ نماز روزہ کی پابندی اُن لوگوں کا کام ہے (یا انھیں سے ہو سکتی ہے) جو مذہبی آدمی بن جائیں اور دنیا سے کچھ کام نہ رکھیں۔ ان لوگوں کو حضرت عمر کے مشاغلِ خلافت اور کثرتِ عبادت کے حالات ملا کر غور سے پڑھنا اور اپنی رائے پر غور کرنا بیجا نہ ہوگا۔

حضرت عمر کی گوناگوں قابلیتوں کا ثبوت اس سے بھی ملتا ہے کہ باوجود ایک مدبّر و مذہبی پیشوا ہونے کے اُن کو اشعار کا خاصہ ذوق تھا۔ ہزاروں شعر اُن کو یاد تھے۔ شعرائے جاہلیت میں سے زہیر وغیرہ کے کلام کی نسبت جو رائیں انھوں نے ظاہر فرمائی ہیں بڑے بڑے ادیب اُن کو آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ پھر کیسے لطف کی بات ہے کہ شاعری اُن کی حق پسند نظر کے سامنے آکر فیض سے محروم نہ رہی جو مخربِ اخلاق طریقہ شعرائے عرب میں جاری تھا کہ شریف عورتوں کا نام لیکر تشبیب قائم کرتے تھے اُس کو حضرت عمر نے ترک کرا دیا، اسی طرح ہجو گوئی کو جرم قرار دیا۔
سب سے آخر میں اولاد اور ازدواج کا ذکر ہے اور اس پر الفاروق ختم ہوتی ہے۔ خاتمہ میں اُن

واقعات کی بنیاد پر جو مذکور ہو چکے اپنے ہیرو کی نسبت مصنف نے رائے لکھی ہو اور اس کا عنوان یہ بلیغ و بے نظیر شعر قرار دیا ہو ؎

لیس من اللّٰہ بمستنکر   ان یجمع العالم فی واحد

یعنی خدا کی قدرت سے یہ کیا بعید ہو کہ تمام عالم ایک فرد میں سما جاوے۔

خلاصہ یہ کہ حضرت عمر کی اصلی تصویر دکھانے کی علامہ مصنف نے کوشش کی ہو۔ اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ وہ اپنی کوشش میں بہت کچھ کامیاب ہوئے ہیں۔ جو لوگ اہل اسلام کا سچا نمونہ اور صفات انسانی کا ایک زبردست مجموعہ دیکھنا چاہتے ہیں وہ الفاروق پڑھیں۔

اس کتاب کو تمام و کمال پڑھ کر مختلف وجوہ سے ہم کو یہ تمنا رہی کہ مسودہ پر مصنف کی ایک نظر اور پڑ جاتی تو خوب ہوتا۔ اس موقع پر اگر ہم چند الفاظ الفاروق کی طرز ادا کی نسبت کہیں تو شاید بیجا نہ ہوگا۔ الفاروق جس زمانہ کی تصویر ہو وہ اسلام کا مذہبی زمانہ تھا۔ اور اول سے آخر تک جن مسلمانوں کا ذکر اس میں ہے وہ مقتدائے مذہب اور آسمان عظمت کے ستارے تھے۔ متاخرین کی طرز یہ ہو کہ جب ایسے بزرگوں کا نام لکھتے ہیں تو کچھ مدحیہ کلمات اور دعائیہ فقرے ضرور اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ مذہبی مسائل پر بحث کا ایک خاص اسلوب مقرر ہو چکا ہو جس میں متکلم اپنے خیال کو ایسی پست آواز میں ظاہر کرتا ہو کہ گویا قعر چاہ میں سے آواز آرہی ہو۔ متقدمین کی روش اس سے جداگانہ تھی۔ صحابۂ کرام اور تابعین کے محض نام اُن کی تحریروں میں آتے تھے۔ بہت ہوا تو سارے بیان میں ایک دو جگہ رضی اللہ عنہ لکھدیا۔ لیکن ہر جگہ ان ناموں کے آخر میں نہیں۔ جو بات اُن کو حق معلوم ہوتی ہو صاف بے لوث کہہ جاتے ہیں۔ جو شخص متقدمین کی کتابوں کو پیش نظر رکھے اور اُن کی طرز تحریر سے آشنا ہو جائے ناممکن ہو کہ اس کے قلم سے اُسی قسم کی عبارت نہ نکلے۔ الفاروق کی تحریر میں جو آزادی ہو وہ بالکل نہیں تو اکثر طرز متقدمین کا پرتو ہو۔ کون کہہ سکتا ہو کہ متقدمین، متاخرین کے مقابلہ میں کم ادب شناس یا مرتبہ سنج تھے۔ مگر اُن کی طرز میں عرب اور اسلام کی سادگی تھی۔ یہ سادگی خراسان و ہندوستان کی آب و ہوا میں بہت کچھ بدل گئی۔ مخاطب جب واحد ہو (خواہ کسی مرتبہ کا ہو) تو عرب کے قاعدے کے بموجب ضمیر و صیغہ اُس کے واسطے واحد ہوگا۔ ہندوستان کے اہل

ادب نے مفرد کی جگہ عربی میں اس موقع پر جمع کا صیغہ استعمال کیا ہی۔ لیکن یہاں پر سمجھ لینا چاہئے کہ وہ عرب اور عربی کا قاعدہ تھا۔ ہماری زبان اردو کا طریقہ وہ نہیں ہی۔ ہم اگر کسی مخاطب کے مقابلہ میں (باستثنائے اپنے چھوٹوں کے) واحد کی ضمیر یا صیغہ استعمال کریں تو یا تو تذلیل و تحقیر معلوم ہوگی یا پہاڑی بولی۔ اگر یہ کہیں کہ تو نے یہ کام نہیں کیا یا مولوی رحیم بخش آیا تھا تو اول سے مخاطب کی ذلت اور دوسری سے سرحدی پہاڑیوں کی بولی معلوم ہوتی ہی۔ شرفائے دہلی اپنے سائیس و نفر کو بھی اس طرح مخاطب نہیں کرتے۔

حیف ہی کہ اہل مطبع نے اس کتاب پر کچھ رحم نہیں کیا۔ اس کثرت سے غلطیاں ہیں کہ طبیعت الجھتی ہی۔ غلط نامہ ہرگز ان غلطیوں کی تلافی نہیں کر سکا۔ بلکہ باقی ماندہ غلطیوں کو گویا غلط نامے نے مضبوط کر دیا۔ عربی عبارتیں جابجا غلط ہیں۔ زیادہ افسوسناک ناموں کا غلط چھپنا ہی۔ الفاروق کی مقبولیت یہی غلط نام زبانوں اور قلموں سے نکلوائے گی اور اس طرح ہمارا لٹریچر گویا غلط ہوتا رہے گا۔ نقشہ ایسی بری طرح لگایا ہی کہ جلدبندی پر اس کا محفوظ رہنا مشکل ہی۔ کاش انگریزی کتابوں کی طرز پر لگایا جاتا۔

الفاروق کی نسبت ہم بہت کچھ لکھ چکے لیکن انصاف یہ ہی کہ اس کی عظمت کے مقابلہ میں بہت کم کہا گیا۔ تاہم ہم نے اپنے معزز ناظرین کا بہت وقت صرف کیا۔ حرج اوقات کی معافی چاہ کر ہم رخصت کے طلبگار ہیں۔ فقط

(رسالہ معارف اعظم گڑھ۔ ماہ جولائی ۱۸۹۹ء)

حیاتِ جاوید

(تبصرہ)

"حیاتِ جاوید" اس کتاب کا نام ہی جو نادرۂ روزگار خواجہ الطاف حسین صاحب حالی نے جواد الدولہ عارف جنگ ڈاکٹر سر سید احمد خاں مرحوم کے حالات میں لکھی ہی۔ اگر کوئی شخص دنیا میں بڑے بڑے کام کرکے اس شوق میں جان دے دے کہ اس کو ایسا نامور بیاگرفر (Biographer) ملے گا جیسا سر سید کو ملا، تو ہمارے خیال میں یہ کہنا حق بجانب ہوگا کہ اس نے سستا سودا خریدا۔ جو صاحب درد حیاتِ جاوید کو دیکھے گا وہ اس جانفشانی اور کاوش کا اعتراف ضرور کرے گا جو خواجہ

صاحب نے اس لائف کے لکھنے میں کی ہی۔ کئی برس مسلسل محنت کی۔ مہینوں وطن چھوڑ چھوڑ کر علی گڑھ قیام کیا۔ ہندوستان سے لے کر انگلستان تک اپنے ہیرو کے حالات بہم پہنچانے کی جستجو کی۔ سرسید کی تصانیف کے ہزاروں صفحے پڑھے۔ جو موانع اور عوائق اس کام کے کرنے میں پیش آئے ان کا مردانہ مقابلہ کیا تب یہ کتاب مرتب کر کے پبلک کے ملاحظہ میں پیش فرما سکے۔ اردو لٹریچر کی جہاں نااہل مؤلفوں اور مترجموں کے ہاتھوں مٹی پلید ہو رہی ہی، جہاں شہرت طلب و زرپرست طبیعتیں اپنے ذاتی اغراض کے نشہ میں چور ملک اور قوم کے دل و دماغ اور روپے کی غارتگری میں مصروف ہیں، وہاں شکر ہی کہ کچھ نہ کچھ ایسی تصانیف بھی شائع ہوتی رہتی ہیں جن پر اعلیٰ سے اعلیٰ لٹریچر فخر کر سکتا ہی۔ قوم کا مذاق جب تک بگڑا ہوا رہے گا اور جب تک ہم میں داستان امیر حمزہ اور بوستان خیال کے پڑھنے کا اثر باقی ہی اس وقت تک مخرب اخلاق ناول اور بے سر و پا تاریخی ترجمے زیادہ قدر پاتے رہیں گے اور ان تصانیف کی کماحقہٗ قدر نہیں ہوگی جو باعتبار اپنی صفات اور مؤلفوں کی جانکاہیوں کے قابل قدر ہیں۔ لیکن اگر قوم کا مذاق پاک ہونے والا ہی، اگر اردو داں پبلک علم دوست بننے والی ہی تو ضرور ایک روز "پوت کی دکان مانند پڑے گی اور جوہری بازار چمکے گا"۔ (اگرچہ جرمن سلور کا رواج اور گلٹ کی مقبولیت اس زمانہ کے دور ہونے کی پیشین گوئی کر رہی ہی) گو یہ ڈنکا ہندوستان کے چاروں کونوں میں بج رہا ہی کہ علمی مذاق کی گرم بازاری ہی اور متاع علم ہاتھوں ہاتھ بک رہی ہی۔ مگر واقعات یہ سبق دیتے ہیں کہ یہ غلغلہ آواز دہل سے زیادہ وقیع نہیں اور اس ڈھولک کی آواز سے مثل یہ ہی جو بازاروں میں گھٹیا نیلام کرنے والے پیٹا کرتے ہیں۔ ان ڈھولکوں کی آواز پر خریدار جمع تو ہو جاتے ہیں لیکن جب مال پر نظر ڈالتے ہیں تو سوائے بوسیدہ چیزوں اور شکستہ بستہ سودے کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ تاہم تھوڑے بہت گرفتار دام ہو کر اپنے صیادوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہی رہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک جو لوگ اپنے نفع کی غرض سے موجودہ حالات میں ناکارہ ناول اور بے سر و پا تاریخی رسالے قوم میں شائع کر رہے ہیں وہ ایسے گناہِ عظیم کے مرتکب ہو رہے ہیں جو کسی طرح لائق معافی نہیں ہو سکتا۔

یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اخباری دنیا میں حیاتِ جاوید کی طرف سے کیوں اس قدر سناٹا ہی اور جو جماعت سرسید، خواجہ حالیؔ اور اردو لٹریچر ان تینوں کے نہایت راسخ عقیدتمند ہیں انھوں نے کتاب مذکور کسی

حیثیت سے بھی قابلِ التفات نہیں سمجھا۔ اگر اشاعتِ تصانیف کے علم کا ذریعہ صرف اخبار ہوتے تو شاید حیاتِ جاوید کے شائع ہونے کا علم بھی پبلک کو نہ ہوتا۔ سب سے زیادہ تعجب انسٹیٹیوٹ گزٹ پر ہی۔ ہمارے نزدیک "معارف" سے حیاتِ جاوید کا ریویو نقل کرنا اور خود نہ لکھنا اخبار مذکور کی شان کے خلاف تھا۔

حیاتِ جاوید کے دو حصے ہیں۔ ایک میں سرسید کی زندگی کے حالات ہیں اور یہ حصہ ۳۲۰ صفحہ پہ ختم ہوتا ہی۔ دوسرے حصہ میں سرسید کی لائف، اُن کی تصانیف اور اُن کے کاموں پر ریویو کیا گیا ہی اور یہ حصہ بقول علامہ شبلی مؤلف کی محنت کا تماشا گاہ ہی۔ اِس حصہ کے ۵۰۰ صفحے ہیں۔

حصۂ اول کے شروع میں سرسید کے خاندان کا ذکر آتا ہی اور اُس کے ضمن میں دہلی مرحوم کے اخیر دورِ زندگی کی ایک دلکش جھلک پیشِ نظر ہو جاتی ہی۔ ان واقعات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ محبت وارتباط، خلوص و نیک دلی، اُمنگ اور زندہ دلی، علمی ذوق، مردانہ فنون غرض وہ تمام اوصاف جو سوسٹی کے واسطے روح و رواں ہیں دارالسلطنت کی سوسٹی میں اُس وقت بھی موجود تھے۔ ان واقعات کو پڑھ کر جب ہم قیاس کی مدد سے اکبری اور شاہجہانی دور کی سوسٹی میں جاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہی کہ عرب کی صداقت، ایران کی زندہ دلی، توران کی جوانمردی اور ہندوستان کی رنگینی نے سوسٹی کے رنگ میں ایک عجیب دلفریبی و دلکشی پیدا کر دی تھی۔ اُس کی نسبت یہ خیال کرنا کہ وہ محض تیرہ و تاریک غیر منتظم مجمع تھا انصاف کا خون کرنا اور اپنی کم علمی کا ثبوت دینا ہی۔ سید صاحب اور اُن کے خاندان کی صورتیں اس امر کی زندہ شہادت تھیں کہ اعیانِ دارالسلطنۃ میں ہنوز اُس تنومندی اور تندرستی کا اثر باقی تھا جو مردانہ فنون اور سپاہیانہ مشاغل کے اثر سے پیدا ہوئے تھے۔ صرف سید صاحب کا خاندان ہی ایسا نہ تھا اور خاندان بھی ایسے ہی قوی و تندرست افراد پیش کر سکتے تھے۔ چنانچہ نواب محمد میر خاں، نواب احمد بخش خاں کے خاندان اور شریف خانی خاندان کی مثال کافی ہی۔

سید احمد خاں کی لائف کے ابتدائی حصہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہی کہ جن صفات نے اُن کو "سر سید احمد خاں بہادر" بنایا اور اُن کو اوجِ ترقی تک پہنچایا اور جن صفات کی مدد سے انھوں نے اپنی پژمردہ قوم میں ہلچل ڈال دی اور شائستہ قوموں سے اپنی عظمت منوا کر چھوڑی ہی، اُن کی بنیاد دارالسلطنت کی قدیم سوسٹی

ڈال چکی تھی اور اس طرح سرسید قدیم سوسائٹی کے فرزند رشید تھے، نہ کہ جدید کے۔ سرسید کو قدیم سوسائٹی میدان میں بھیج کر جدید سوسائٹی سے مبارز طلب کر رہی ہے اور یہ خدا کو علم ہے کہ کب تک ہمارے کالج اور اسکول ایسا جوان مرد پیدا کرنے میں کامیاب ہونگے۔

سرسید کی لائف اس امر کا قطعی فیصلہ ہے کہ جب تک جدید تربیت کے ساتھ قدیم اوصاف مسلمانوں میں پیدا نہیں کئے جائیں گے اُس وقت تک تعلیم جدید، دُھن کے پکے مسلمان پیدا نہیں کر سکتی اور نیز اس امر کا کہ جب تک جدید تعلیم کی برقی قوت کے زور سے قدیم صفات کے اکڑے ہوئے جسم میں حرارت پہنچا کر حرکت پیدا نہ کی جائے اُس وقت تک وہ کارآمد نہیں ہو سکتیں۔ جو لوگ سرسید احمد خاں کے قدر دان ہیں امید ہے کہ وہ اس نصیحت کو کم توجہی اور بے پروائی سے نہ سنیں گے جو اُن کی لائف پُر شوکت آواز میں سنا رہی ہے۔ مؤلف لائف ہذا نے جو حالات سرسید کے خاندان کے لکھے ہیں اُن کے دیکھنے سے خاندان مذکور کی مجموعی صفت یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ لوگ دُھن کے پختہ اور آزاد منش ہوتے تھے۔

سرسید کا بچپن (جیسا کہ خود مؤلف نے لکھا ہے) معمولی بچپن ہے۔ ہمارے خیال میں اُن کی تعلیم اُس زمانے کی معمولی تعلیم سے بھی کم ہے۔ عربی میں شرح ملا، شرح تہذیب، میبذی، مختصر معانی اور مطوّل ما انا قلت تک پڑھی۔ اور یہ بھی طالبعلمانہ نہیں بلکہ نہایت بے پروائی اور کم توجہی سے۔ جو جوان ہوتے ہوتے نسیاً منسیاً ہو گئی اور ۲۹ برس کی عمر میں پھر اُس کے از سر نو تازہ کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ مذکورہ بالا کتابیں پڑھنے کے بعد انھوں نے اپنے خاندانی علم ریاضی کی جانب توجہ کی اور حساب کی معمولی درسی کتابیں اقلیدس کے چند مقالے، ہیئت میں شرح چغمینی اور ایک آدہ رسالہ متوسطات کا اور آلات رصدیہ برجندی اور چند اور رسالے رصد کے متعلق پڑھے۔ طب بھی شرح اسباب اور نفیسی تک پڑھی۔ اس نصاب پر ایک نظر ڈالنی ضروری ہے کیونکہ اس سے آیندہ اہم نتائج پیدا ہونگے۔ ظاہر ہے کہ اس نصاب میں جو کچھ تعلیم (سوائے ریاضی کے) تھی وہ سب محض سرسری اور ابتدائی تھی۔ یہ امر خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ درس "علم ادب" سے قریباً اور "علوم دینیہ سے" قطعاً خالی تھا۔ ۲۹ برس کی عمر میں (جبکہ وہ دہلی میں منصف تھے) اُن کو پڑھنے کا شوق ہوا اور "جو کتابیں ابتدا میں کم توجہی اور بے پروائی سے پڑھی تھیں اور اب بالکل نسیاً منسیاً

ہو گئی تھیں اُن کو از سرِ نو غور اور توجہ سے پڑھا۔ مولوی نوازش علی مرحوم (جو دہلی میں مشہور واعظ تھے اور تمام درسی کتابیں پڑھاتے تھے) اُن سے کچھ پچھلی پڑھائی کو تازہ کیا۔ اور کچھ فقہ میں مثل قدوری و شرح وقایہ اور اصولِ فقہ میں شاشی، نور الانوار اور ایک آدھ اور کتاب پڑھی۔ مولوی فیض الحسن مرحوم سے مقاماتِ حریری کے چند مقامے اور سبعہ معلقہ کے چند قصیدے پڑھے اور مولانا مخصوص اللہ سے (جو شاہ عبدالعزیز کے بھتیجے اور شاہ رفیع الدین کے خلف الصدق تھے) حدیث پڑھنی شروع کی۔ مشکوٰۃ اور ایک حصہ جامع ترمذی کا اور کسی قدر اجزا صحیح مسلم کے پڑھے۔ اور پھر قرآن مجید کی سند لی۔ بس اس سے زیادہ (جیسا کہ سرسید خود اقرار کرتے تھے) اُستاد سے انھوں نے کچھ نہیں پڑھا"۔

اس تعلیم میں بھی عربی لٹریچر برائے نام تھا۔ اور ہر چند فقہ و حدیث کی بعض کتابیں ہیں لیکن "عقاید" اور "تفسیر" کی ایک سطر بھی نہیں ہے۔

سرسید کی ملازمت کا دور ابتدا سے شاندار و رفیع تھا۔ وہ جس میدان میں گئے مردانہ اور جس راہ سے گزرے آزادانہ۔ اسی مردانگی اور آزادی کی وجہ سے ہر صیغہ پر (جس میں وہ رہے) اُن کا کچھ نہ کچھ احسان ہے۔ یہ بات سرسید کی لائف میں بے نظیر ہے کہ باوجود ملازمت کے تعلقات کے (جن کو وہ نہایت کاوش اور جانفشانی سے انجام دیتے تھے) اس جوانمرد نے مفید اور محنت طلب کاموں سے کبھی جی نہیں چرایا اور علمی مشاغل کو کبھی فراموش نہیں کیا۔ دورانِ ملازمت ہی میں انھوں نے بہت سے ایسے کام کیے جن میں سے ایک بھی معمولی آدمی کی عمر بھر کی کارگزاری کا نتیجہ ہو سکتا تھا۔ مثلاً آثار الصنادید کی تالیف، آئین اکبری کی تصحیح، تاریخ بجنور اور تبیین الکلام وغیرہ کی تصنیف۔ عالمانہ حیثیت سے نکل کر عاملانہ صیغہ میں آئیے تو یہاں بھی سرسید کے کارناموں کی آب و تاب آنکھوں کو روشن کرے گی۔ مرادآباد کے ضلع میں قحط کا انتظام، غدر ۵۷ء کی کارگزاری وغیر ذلک امور اس کے بیّن ثبوت ہیں۔ غدر میں اور اس کے متصل جو خدمت گورنمنٹ اور ملک کی انھوں نے کی اُس سے سرکار اور رعایا دونوں کے دل میں ان کی عظمت کا سکّہ بیٹھ گیا۔ سید صاحب کے جن جن حالاتِ زندگی سے حیاتِ جاوید میں بحث کی گئی ہے وہ اس قدر کثیر اور مختلف النوع ہیں کہ اُن کے اجمالی ذکر سے بھی یہ مضمون طویل ہو جائے گا مع ہذا مولوی حمید الدین صاحب

سلیم اپنے ریویو میں ہم کو اس کام سے فارغ کر چکے ہیں لہذا ہم حصّہ اول کے متعلق اسی قدر لکھ کر دوسرے حصہ کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔

دوسرا حصہ (جس کو ہم نے مؤلف کی محنت کا اصلی تماشاگاہ بتایا ہی) سرسید کی لائف، اُن کی تصانیف اور اُن کے کاموں پر ریویو ہی۔ اُس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ علامہ مؤلف نے نہایت غور اور فکر کے ساتھ سرسید کے ہر ایک کام کو (خواہ عملی ہو یا علمی) دیکھا ہی۔ اُن کی تصانیف کے ہزاروں صفحے پڑھ کر اُن کے مضامین کے ماسٹر بنے ہیں اور اس کے بعد پوری کاوش سے اُن پر ساڑھے پانسو صفحوں میں اس طرح ریویو کیا ہی کہ اُس کے مطالب بالاجمال اور اُن کے محاسن بالتفصیل ناظرین کے سامنے آشکارا کر دیے ہیں۔ قصہ مختصر سرسید کی ساٹھ برس کی جانفشانیوں کے کارنامے صفحات کاغذ پر یوں نمایاں کر دیے ہیں جیسے ایک زبردست مصور میلوں میں پھیلے ہوئے معرکہ کی تصویر چند انچ کاغذ پر مشاہدہ کرا دیتا ہی۔ اگرچہ سرسید کی تصانیف کے مختلف موضوع ہیں مگر سب سے زیادہ اہم اور عظیم سبجکٹ مذہب ہی اور اُن کی مذہبی تصانیف میں سب سے زیادہ مہتم بالشان تصنیف "تفسیر قرآن" ہی۔

ہم اس ریویو میں تھوڑی سی بحث تفسیر اور اُس رائے پر کرنا چاہتے ہیں جو مؤلفِ حیاتِ جاوید نے اُس کی نسبت ظاہر کی ہی۔ ہماری بحث کا اصل اصول یہ تنقیح ہی کہ "آیا سرسید کو تفسیر لکھنے کا حق اور منصب حاصل تھا یا نہیں"۔ اس تنقیح کا فیصلہ کرنے سے بیشتر ایک نظر ہم کو سرسید کے عربی علوم کے مبلغ اور اُن مشاغل پر ڈالنی چاہیے جن میں وہ تفسیر لکھنے سے پیشتر مصروف تھے۔ سرسید نے جو کچھ بچپن میں کم توجہی اور جوانی میں شوق سے پڑھا اُس کی تفصیل ہم حیاتِ جاوید کے حوالے سے اوپر بیان کر چکے ہیں اور یہ بھی بتا چکے ہیں کہ عربی لٹریچر کی تحصیل کالعدم اور تفسیر و عقائد کی تحصیل معدوم تھی۔ عربی لٹریچر کی تعلیم صرف مقاماتِ حریری کے چند مقاموں اور سبعہ معلقہ کے سات قصیدوں میں سے چند قصیدوں میں محدود تھی۔ اُن کی لائف میں کہیں اس بات کا ثبوت نہیں کہ انھوں نے پھر کبھی اُس کی تکمیل کی جانب توجہ کی ہو۔ بلکہ اس کے برخلاف یہ ثبوت ملتا ہی کہ بوقتِ ضرورت انھوں نے دوسروں کی مدد کا سہارا لیا۔ چنانچہ خطباتِ احمدیہ کی تصنیف کے زمانہ میں ایک عربی عالم کو اس غرض سے ملازم رکھا تھا کہ وہ ایسے اشعارِ جاہلیت کے فراہم کرے جن

میں اُس عہد کے عربوں کی رسوم بد کا ذکر ہو (دیکھو حیات جاوید حصہ دوم صفحہ ۱۲۵) ایک اور موقع پر جب انھوں نے تفسیر کبیر کی ایک عبارت ولایت سے مولوی مہدی علی خان صاحب سے منگوا بھیجی ہی تو لکھا ہی کہ اُس میں جو لغات مشکل ہوں اُن کے معنی لکھ دیئے جائیں۔ فن تفسیر کی ایک سطر بھی ان کی درسی کتابوں میں شامل نہیں۔ اور اس بات کا پتہ بھی نہیں چلتا کہ انھوں نے کوئی زمانہ اپنا فن تفسیر کے مطالعہ میں صرف کیا ہو یا تفسیر سے قبل انھوں نے کوئی تصنیف ایسی شائع کی ہو جو اُن کے مفسر ہونے کی شاہد ہو۔ مکتب چھوڑنے کے بعد وہ سرکاری ملازمت میں در آتے ہیں۔ اور کار منصبی کو نہایت کوشش سے مجتہدانہ انجام دیتے ہیں۔ سرکاری کام سے جو وقت بچتا ہی اُس کو وہ ادبا ہم اور محنت طلب کاموں میں صرف کرتے ہیں۔ اُن کے مشاغل مسلسل ملاحظہ کیجئے۔ اس میں ۱۸۳۸ء سے لیکر جو اُن کی آغاز ملازمت کا زمانہ ہی ۱۸۷۶ء تک (جبکہ انھوں نے تفسیر لکھنی شروع کی) سلسلہ وار وہ مشاغل مذکور ہیں جو سرکاری کام کے علاوہ وقتاً فوقتاً رہے۔

۱۸۳۹-۴۱ء — ترتیب[۱] دفتر کا دستور العمل بنانا۔ جام جم[۲] اور انتخاب الاخوین[۳] تالیف کیا۔

۱۸۴۲-۴۶ء — تالیف[۱] جلاء القلوب بذکر المحبوب۔ تحفۂ حسن[۲]۔ تسہیل[۳] فی جر الثقیل۔

۱۸۴۷-۵۴ء — عربی کتابیں جن کو بھول گئے تھے پھر تازہ کیں۔ کچھ جدید پڑھیں۔ تالیف[۱] آثار الصنادید[۲] فوائد الافکار۔ قول[۳] متین در حرکت زمین۔ کلمۃ[۴] الحق۔ راہ[۵] سنت در رد بدعت۔ نمیقہ[۶] فی بیان مسئلہ تصور شیخ۔ سلسلۃ[۷] الملوک۔ ترجمہ[۸] آغاز کیمیائے سعادت۔ سید[۹] الاخبار کے مضامین سے مدد۔

۱۸۵۴-۵۷ء — "دو کام نہایت سخت محنت کے کئے" یعنی بجنور[۱] کی تاریخ لکھی اور آئین[۲] اکبری کی تصحیح کی

۱۸۵۷-۶۳ء — غدر کے مصائب اور خیر خواہی۔ اسپیشل کمیشن میں نشست۔ فارسی مدرسہ قائم کیا۔ تعلیم کے بارہ میں رائے لکھی۔ تالیف مشہور رسالہ اسباب بغاوت ہند رسالہ لائل محمڈنز آف انڈیا۔ رسالہ تحقیق لفظ نصاریٰ۔ تبیین الکلام۔ انتظام قحط ضلع مرادآباد۔ تصحیح تاریخ فیروز شاہی۔

سنہ ۱۸۶۳-۶۶ء علی گڑھ سئینٹفک سوسئٹی کی عمارت بنوائی۔ برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم کی۔ سئینٹفک سوسیٹی اخبار نکالا۔

سنہ ۱۸۶۷-۶۸ء ہومیوپیتھک علاج کی حمایت۔ اردو زبان کی حمایت۔ رسالہ احکام طعام اسلام

سنہ ۱۸۶۹-۷۰ء سفر ولایت۔ انگلستان کی تعلیم و ترقی پر غور کیا۔ خطبات احمدیہ لکھی۔

سنہ ۱۸۷۱-۷۵ء تہذیب الاخلاق۔ کمیٹی خواستگار تعلیم مسلمانان۔ کمیٹی خزینۃ البضاعۃ۔ ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو۔ محمدن کالج قائم کیا۔

سنہ ۱۸۷۶-۷۷ء پنشن لی اور محمدن کالج کے کام میں لگ گئے۔ تفسیر القرآن لکھنا شروع کی۔

مذکورہ مشاغل کی نوعیت پر غور کرنے سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ ان میں سے اکثر ایسے تھے جن میں وقت اور محنت دونوں کو پورے طور پر صرف کرنا پڑا ہوگا۔ دوم یہ کہ سرسید کی تصانیف ماقبل غدر سررشتہ و قانون، سیرت و تاریخ، تصوف اور مذہبی مناظرہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ بعد غدر ان مباحث میں پالٹکس اور تعلیم کا اضافہ اور ہوگیا۔ کوئی رسالہ یا کتاب تفسیر یا ادب سے تعلق نہیں رکھتی۔ نہ حیات جاوید سے کہیں اس امر کا سراغ ملتا ہے کہ سرسید نے تفسیر کا مطالعہ باقاعدہ کیا ہو۔ ہاں اس کا ثبوت ہے کہ ان کی نظر اس فن میں نہایت محدود تھی۔ کیونکہ یہ کھلا ہوا راز ہے کہ ہمیشہ ایک نہ ایک اسسٹنٹ ان کے پاس روایت کشی کے واسطے رہا۔ خلاصہ یہ کہ سنہ ۱۸۷۶ء سے پیشتر ہم سرسید کو اس رنگ میں دیکھتے ہیں کہ فن تفسیر سے ان کو کوئی لگاؤ نہیں اور سنہ ۱۸۷۶ء کے بعد وہ مفسر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، تفسیر لکھتے ہیں، اصول تفسیر مدون کرتے ہیں۔ واقعات بالا سے صاف یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تفسیر لکھنے کا کوئی منصب سرسید کو حاصل نہ تھا اور ان کا تفسیر لکھنا اپنی قوت سے زائد کام کرنا تھا اور ایسا کام قابل اعتماد نہیں ہو سکتا۔

سرسید کی لائف پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی ثابت ہو سکتا ہے کہ ان کی طبیعت میں اثر قبول کر لینے کا مادہ بہت تھا اور ہر رنگ کو ان کی طبیعت جلد اخذ کر لیتی تھی۔ ابتدائے شباب میں ہم ان کو رنگین دیکھتے ہیں۔ بڑے بھائی کا انتقال ہوتا ہے اور وہ دفعتہً ملائے خشک بن جاتے ہیں۔ دارالسلطنت کی سوسائٹی میں جو جو رنگ پیدا ہوتے جاتے ہیں ان کو یکے بعد دیگرے لے لیتے ہیں۔ ایک وقت بدعتی ہیں،

دوسرے وقت وہابی ہیں۔ آج ایک تصنیف لکھی کل اُس کو خود لغو اور بیہودہ بتا دیا۔ غدر کے مصائب دیکھ کر ہجرت کا عزم کر لیتے ہیں پھر مسلمانوں کی مدد پر عزم راسخ ہو جاتا ہے۔ غدر کے بعد انگریزی سوسائٹی کا رنگ مرغوب ہوتا ہے۔ اور یکے بعد دیگرے ترقی کی منازل طے ہوتی ہیں۔ تبیین الکلام میں جن عقائد کو برحق مانتے ہیں تفسیر میں انھیں کو فضول اور مہمل قرار دیتے ہیں۔ مثلاً تبیین الکلام میں نزولِ وحی کی نسبت لکھا ہے۔ "وحی وہ چیز ہے جس سے خدا کی مرضی نامعلوم باتوں میں کھل جاتی ہے اور یہ بات کئی طرح پر ہوتی ہے۔ اول یہ کہ خدا سے اُس کا پیغام سنا جائے۔ دوسرے یہ کہ خدا کا فرشتہ اپنی صورت میں آوے اور خدا کا پیغام پہنچا دے۔ تیسرے یہ کہ فرشتہ خدا کا آدمی کی صورت میں بن کر آوے اور خدا کا پیغام پہنچا دے ...... پانچویں یہ کہ خدا کی طرف سے دل میں خدا کا کلام ڈالا جاوے۔ ہم مسلمانوں کے مذہب کے بموجب مطلق وحی کا آنا صرف انبیا پر ہی منحصر نہیں ہے (دیکھو تبیین الکلام صفحہ ۱۶۰ مقدمۂ ثانیہ) تفسیر میں نزولِ وحی کی کیفیت دیکھئے۔ "خدا اور پیغمبر میں بجز اُس ملکۂ نبوت کے جس کو ناموسِ اکبر اور زبانِ شرع میں جبرائیل کہتے ہیں اور کوئی ایلچی پیغام پہنچانے والا نہیں ہوتا۔ اُس کا (پیغمبر کا) دل ہی وہ ایلچی ہوتا ہے جو خدا پاس پیغام لیجاتا ہے اور خدا کا پیغام لاتا ہے۔" دیکھو تفسیر القرآن صفحہ ۲۹ مطبوعہ ۱۲۹۵ھ ہجری) تبیین الکلام میں پانچ طریقے نزولِ وحی کے بتائے اور "ہم مسلمانوں" کا لفظ کہہ کر یہ ظاہر کر دیا کہ خود اُن کا عقیدہ بھی یہی تھا۔ تفسیر میں صرف پانچواں طریقہ قائم رکھا باقی سب رد کر دیئے۔ یا مثلاً تبیین الکلام میں فصاحت کو قرآن مجید کا معجزہ بتاتے ہیں (دیکھو تبیین الکلام صفحہ ۱۶۴) تفسیر میں فصاحت کے معجزہ ہونے سے انکار کرتے ہیں (دیکھو تفسیر القرآن صفحہ ۳۲، ۳۳ مطبوعہ ۱۲۹۵ھ) یا مثلاً تبیین الکلام کی مذکورۂ بالا عبارت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُس وقت اُن کا یہ عقیدہ تھا کہ فرشتے انسانی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ تفسیر میں اُس کی تردید کرتے ہیں (دیکھو تفسیر القرآن صفحہ ۴۶، ۴۷ مطبوعہ ۱۲۹۵ھ) واقعات یہ ثابت کرتے ہیں کہ سرسید کی تفسیر اُسی مادۂ قبول اثر کا نتیجہ تھی۔ تبیین الکلام لکھنے کے وقت اُنھوں نے وہ تصانیف بہم پہنچائیں جو دہریوں نے انجیل کے برخلاف لکھی تھیں اور اُن کے مطالب سے آگاہی حاصل کی۔ ۱۸۶۹ء میں وہ ولایت کا سفر کرتے اور وہاں کے خیالات سے کما حقہٗ واقف ہوتے ہیں۔ سر ولیم میور کی "لائف آف محمد" کا جواب لکھتے اور اُن اعتراضوں سے واقف ہوتے ہیں جو سر ولیم میور نے

نے اسلام پر کیے ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں میں کسی قدر انگریزی پھیلتی ہے۔ سرسید کی سالہا سال کی آزادانہ
تحریروں کا اثر محسوس ہوتا ہے اور مسلمانوں کو شرعی مسائل میں شبہے پیدا ہوتے ہیں۔ پے در پے کامیابیاں
سرسید کو اپنی رائے پر پورا اعتماد کرنا سکھاتی ہیں۔ علمائے ہندوستان نئے خیال کے مسلمانوں کے شبہات
رفع کرنے کی جانب نہ متوجہ ہوتے ہیں اور نہ اُن کو رفع کر سکتے ہیں۔ ان تمام امور کا اثر سرسید کی حساس
طبیعت پر سخت پڑتا ہے۔ اور وہ خود تفسیر لکھنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اب اس کو انسانی فطرت کا قصور کہو
کامیابی کا نشہ سمجھو، یا ہمدردی اسلام خیال کرو کہ وہ اس امر کے محسوس کرنے سے قاصر رہتے ہیں کہ میں
اس میدان کا مرد نہیں اور جس کام پر ہاتھ ڈالتا ہوں اُس کے کرنے کے لئے میرے پاس سوائے زورِ
عقل کے اور کوئی مصالحہ موجود نہیں۔ حقیقتہً یہ تعجب خیز امر ہے کہ جس فن کی باقاعدہ اسٹڈی انھوں نے ساری
عمر نہیں کی اُس میں تصنیف کرنے کے واسطے وہ کس طرح تیار ہوگئے! سید صاحب کو جو جو رکاوٹیں اس راہ
میں پیش آئی ہیں ان سب پر انھوں نے جہاں تک ممکن تھا زور آزمائی کی ہے۔ سب سے زیادہ مجبور کرنے
والا فن حدیث تھا اور انھوں نے حتی المقدور اس فن کو غیر معتمد قرار دینے میں کوشش اٹھا نہیں رکھی۔ فرض کیجئے ہم
اس کو تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر سکتے ہیں کہ مفسر کو علوم شرعیہ میں ماہر ہونے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس
کو ایک ساعت کے واسطے تسلیم نہیں کر سکتے کہ قرآن کا مفسر ایسا شخص ہو سکتا ہے جو عربی کا ادیب نہ ہو۔
سید صاحب نے اپنی تفسیر کی بنا اس پر قائم کی ہے کہ جہاں کلام مجید کی عبارت آج کل کے خیالات کے خلاف
ہو وہاں حقیقی معنی چھوڑ کر مجاز اور استعارہ قرار دیا جائے۔ ہم یہ دریافت کرتے ہیں کہ یہ تمیز کہ کہاں استعارہ
اور مجاز ہے اور کہاں حقیقت سوائے ادیب کے دوسرا شخص کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں اور جب سید صاحب
ادیب نہ تھے تو پھر کس طرح انھوں نے مجاز اور حقیقت کا فرق سمجھ لیا۔ لطف مزید یہ ہے کہ وہ اختلاف
کرتے ہیں ایسے ادیب مفسروں سے جیسے علامہ زمخشری وغیرہ ہیں۔ فطرتِ انسانی کے عجیب کرشمے ہیں
سید صاحب نے بڑے زور شور سے علمائے اسلام پر جا بجا یہ حرف رکھا ہے کہ وہ حکومت، اپنی گردوپیش
کی سوسائٹی، عوام مسلمین کی رضا جوئی اور تقلید کے اثر سے متاثر ہو کر حقیقت سے دور جا پڑے تھے لیکن
افسوس کہ اُن کو یہ حس نہیں تھی کہ یہی مذکورۂ بالا اثر خود اُن کے خیالات، رائے اور قلم پر پورے طور سے مسلط

ہورہے تھے - وہ اس امر کے مدعی تھے کہ زمین و آسمان میں جو کچھ اسرار الٰہی اور رموز ربّانی ہیں وہ سب اُن کی عقل پر روشن ہیں (کیونکہ وہ ہر ایک آیتِ کلام مجید کے معنی کو اپنی عقل کی کسوٹی پر کستے ہیں جو مطابق عقل ہوں اُن کو لیتے ہیں جو خلاف ہوں اُن کو رَد کرتے ہیں) لیکن شیام بہاری کے جعل کا راز اُن کی عقل پر نہیں کھلتا - کالج کے غبن کے کھُل جانے پر وہ اس امر کا تو اقرار کرتے ہیں کہ جعلی چکوں کا روکنا (جب تک کہ اُن کا علم نہ ہو) اختیار بشر سے باہر ہے - لیکن اس امر کے کبھی قائل نہیں ہوتے کہ اسرار الٰہی کے انکشاف میں بھی عقل کی رسائی محدود ہے اور اُس کے کُل رازوں کا سمجھ لینا اختیار بشر سے خارج ہے - مؤلفِ حیاتِ جاوید نے بالائی باتیں تفسیر کے متعلق بیان کی ہیں - مثلاً جدید تفسیر کی ضرورت، موجودہ علمائے عربی کا اس میدان کا مرد نہ ہونا، سید صاحب کا اس کام کو محض حمایت اسلام کی غرض سے انجام دینا، وغیرہ تک - لیکن اصل تنقیح یعنی یہ کہ "سرسید میں مفسر بننے کے اوصاف جمع تھے یا نہیں" حیاتِ جاوید اور نیز معارف کے مضمون میں (جو خواجہ صاحب نے تفسیر مذکور کی بابت لکھا تھا) اچھوتی رہی ہے - ہمارے خیال میں سرسید کی تفسیر نگاری کی مثال بعینہٖ ایسی ہے کہ ایک طوفان خیز سمندر میں جہاز کو ایسا کپتان لے جائے جو نہ کسی بحری مدرسہ کا تعلیم یافتہ ہو نہ کسی ماہر استاد کی صحبت میں اُس نے جہاز رانی سیکھی ہو اور محض ضرورتِ وقت پر لحاظ اور اپنی عقل پر بھروسا کر کے جہاز کو لے کر چل کھڑا ہو ظاہر ہے کہ ایسے جہاز کا انجام کیا ہوگا!!!

خواجہ صاحب نے دیباچہ میں لکھا ہے: "ہم کو اس کتاب میں اُس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے چالیس برس برابر تعصب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے - تقلید کی جڑ کاٹی ہے - بڑے بڑے علماء و مفسرین کو للکارا ہے - اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے - قوم کے پکے پھوڑوں کو چھیڑا ہے اور اُن کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں - جس کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا ہے تو دوسرے نے زندیق خطاب دیا ہے اور جس کو پالٹکس کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرور Time Server سمجھا ہے تو کسی نے نہایت راستباز لبرل (LIBRAL) جانا ہے - ایسے شخص کی لائف چپ چاپ کیونکر لکھی جا سکتی ہے - ضرور ہے کہ اُس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اُس کا کھرا پن ٹھوک بجا کر دیکھا جائے - وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی

کی بنیاد ڈالی ہی۔ اس لئے مناسب ہی کہ سب سے پہلے اُسی کی لائف میں اُس کی پیروی کی جائے اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ اگرچہ سرسید کے معصوم ہونے کا نہ ہم کو دعویٰ ہی اور نہ اُس کے ثابت کرنے کا ہم ارادہ رکھتے ہیں۔ لیکن اس بات کا ہم کو خود بھی یقین ہی اور ہم چاہتے ہیں کہ اوروں کو بھی اس کا یقین دلائیں کہ سرسید کا کوئی کام سچائی سے خالی نہ تھا اور اس لئے ضرور ہی کہ اُن کے ہر ایک کام کو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ کیونکہ سچ ہیں اور صرف سچ ہی میں یہ کرامت ہی کہ جس قدر اُس میں زیادہ کرید کی جاتی ہی اُسی قدر اُس کے جوہر زیادہ آب و تاب کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔"

دیباچہ کتاب حصۂ دوم کا عنوان یہ قرار دیا ہی "سرسید کی لائف۔ اُن کی تصانیف اور اُن کے کاموں پر ریویو" لہذا ایک نظر اس پر ڈالتا ہی کہ آیا کہاں تک پکے پھوڑے چھیڑے گئے اور کہاں تک ریویو کے سخت پہلو کا حق ادا کیا گیا۔ ہم کو حیاتِ جاوید حرف بہ حرف پڑھنے کے بعد اس امر کا افسوس سے اعتراف کرنا پڑتا ہی کہ جس پرزور قلم سے مذکورۂ بالا فقرہ نکلا ہی اُس کا سارا زور یا سرسید کی حمایت میں صرف ہوا ہی یا مخالفین کے لتاڑنے میں۔ پکے پھوڑوں کو چھیڑنے کی جگہ وہ اُس سے بچکر نکل گیا ہی۔ چھوتا ہوا سونے کو تاؤ نہیں دیا گیا جس سے اُس کی کھوٹ الگ ہو جاتی اور کُندن نکھر جاتا۔ نکتہ چینی کی نسبت یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ اُس سے حیاتِ جاوید قریباً خالی ہی۔ ہمارے خیال میں سرسید نے اردو لٹریچر میں جو آزادی اور نکتہ چینی کی روح پھونکی ہی وہ قومی زندگی کی اساس ہی۔ اُس کو قائم رکھنا اور ترقی دینا ہر ایسے قلم کا فرض ہونا چاہیے جو قومی مضامین کے میدان میں در آئے۔ اور قوم میں جو تھوڑی بہت عادت سرسید نے کڑوے گھونٹ پینے کی ڈالی ہی اُس کو مدّاحی کی چاٹ سے بھلا دینا مرحوم کی ایک بہت بڑی خدمت کی قدرشناسی کے خلاف ہوگا۔ اگر قوم کے یہ ذہن نشین نہ ہو کہ اُس میں کچھ آہنی قلم ایسے بھی ہیں جو بخلاف مصوّر کے موقلم کے ظاہری اُمور کی تہ میں پہنچتے اور فاسد مادے کے موقع پر نشتر بن کر اندر پیر جاتے ہیں، اُس وقت تک قوم سیدھی نہیں چل سکتی۔ کیا انگلستان میں جانسن جیو فرے جیسے آزاد خیال ریویو نگار پیدا نہ ہوتے تو انگریزی لٹریچر موجودہ ترقی کی منزل پر پہنچتا؟ ہرگز نہیں۔ کیا ہم کو وہ جواب یاد نہیں ہی جو ایک آزاد عرب نے خلیفہ ثانی کو اُس وقت دیا تھا جب انھوں نے یہ فرمایا تھا کہ اگر میں غلطی کروں تو مجھ کو روک دینا۔ وہ

جواب یہ تھا کہ اگر آپ ٹیڑھے چلیں گے تو ہم آپ کو نوکِ شمشیر سیدھا کر دیں گے تلوار کا دور گیا اور بجائے اُس کے آہنی قلم کا دور دورہ ہی۔ حیف ہی کہ اگر لوہے کا قلم مُوقلم بن جائے اور نشتر کے موقع پر رنگ آمیزی کرنے لگے۔ لائف تاریخ کا جزو ہی۔ تاریخ کے کیا معنی ہیں؟ واقعات کی حکایت اور جو کچھ واقعہ ہوا اس کا بیان۔ آنے والی نسلیں اُس کمی کو پورا نہیں کر سکتیں جو وقائع نگاری میں معاصرین کی قلم سے رہ جائے۔ بیشک آیندہ نسلوں کو ٹھنڈے دل سے بے لگاؤ فیصلہ کرنے کا موقعہ بمقابلہ معاصرین کے زیادہ ملتا ہی۔ لیکن جن واقعات کو معاصر بیان نہ کریں اُن کو وہ کس طرح پیدا کر سکتے ہیں اور ظاہر ہی کہ جب جج کے سامنے کل واقعات نہ ہوں تو اُس کا فیصلہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ دیکھو دنیا کے بڑے بڑے ملک اور بڑی بڑی قومیں ایسی ہیں جن کے حالات عدم کی کالی چادر میں لپٹے ہوئے ہیں۔ اب لوگ ہر طرف ٹٹولتے ہیں۔ تاریک غاروں میں گھستے ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھتے ہیں۔ اور سمندر کی تہ میں غوطہ لگاتے ہیں مگر مدعا ہاتھ نہیں آتا۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ معاصرین نے واقعات نہیں لکھے۔

حیاتِ جاوید کو من اولہ الی آخرہ پڑھنے کے بعد اُس پر رائے قائم کرنی درست ہو سکتی ہی۔ اُس میں ایک سطر بھی ایسی نہیں جس کو کرٹسزم (criticism) سے تعبیر کر سکیں۔ جہاں اشد ضرورت نکتہ چینی کی پیش آتی ہی وہاں اس فرض کو یوں ادا کیا ہی۔ اول تفسیر کو لیجیے۔ تفسیر جیسا معرکۃ الآرا مسئلہ ہی وہ ظاہر ہی اور سرسید کی تفسیر کی حالت یہ ہی کہ اب تک خود اُن کے بڑے بڑے ذی استعداد دوستوں نے اُس کو تسلیم نہیں کیا۔ تفسیر کے محاسن میں تو مؤلف حیاتِ جاوید نے ۲۳ صفحے لکھے ہیں لیکن جرح کے موقع پر یہ عبارت لکھ کر چھوڑ دی ہی۔ "گر چونکہ اُس میں بمقابلہ علوم جدیدہ کے ایک نئے علم کلام کی بنیاد ڈالی گئی ہی اور صدہا مقامات میں جمہور مفسرین سے اختلاف کیا گیا ہی اور ہر ایک آیت کے معنی ایک خاص اصول کے موافق بیان کیے گئے ہیں اس لیے ممکن نہیں کہ مفسر کے بیان میں کچھ لغزشیں نہ ہوئی ہوں لیکن ایسی مستثنیات سے تمام تفسیر کی خوبی زائل نہیں ہو سکتی"۔ یہ کسی جگہ مثالاً بھی نہیں بتایا کہ فلاں فلاں مقام پر لغزشیں ہوئی ہیں۔ (۲) غبن کا مقدمہ دیکھیے۔ تمام واقعہ کو بیان کر کے لکھا ہی۔ "اُن کا کلرک انگریزی کی تحریروں پر بلا تامل دستخط کر دینا کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں ہی۔ تمام دفتر سرکاری و غیر سرکاری میں اسی طرح

ماتحتوں پر اعتماد کیا جاتا ہی کیونکہ اگر اُن پر ایسا اعتماد نہ کیا جائے اور خواہی نخواہی اُن کے کام کو مشتبہ سمجھا جائے تو ہرگز کام نہیں چل سکتا" کلرک مذکور غبن کے معاملہ میں ایک بار سزا پاچکا تھا۔ سرسید کے دوستوں نے اُس کی طرف سے ہوشیار رہنے کی بار بار نصیحت کی تھی۔ وہ جس ٹھاٹھ سے رہتا تھا اور جس اللّے تللّے سے خرچ کرتا تھا روز روشن کی طرح ہویدا تھا اس پر بھی اُس کی طرف سے مشتبہ ہونا خواہی نخواہی کا اشتباہ نہیں کہا جاسکتا (۳) وفات کا واقعہ جس پیرایہ میں بیان ہوا ہی اُس کو پڑھ کر ایک مورخانہ طبیعت کا آدمی (جو اصل حال سے آگاہ ہو) کانپ اُٹھے گا۔ کیا وہ واقعہ بے نتیجہ تھا جس کے بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی؟ کیا اُس سے سوچنے والی طبیعتیں عبرت کا سبق حاصل نہیں کرسکتیں؟ کیا وہ "سوء مزاج" کا نتیجہ تھا؟ (۴) ٹرسٹیز بل (Trustees Bill) کو ملاحظہ کیجیے۔ آج تیرہ برس کے گزر جانے کے بعد تجربہ اور مشاہدہ نے اُس کے سارے پہلو ملک و ملت کے سامنے آشکارا کر دئے۔ سرسید کے انتخاب کی غلطی روز روشن کی طرح ہویدا ہوگئی۔ لیکن آج بھی وہی پُرانا استدلال اُس کی تائید میں پیش کیا جاتا ہی جو تیرہ برس پیشتر سرسید کی جانب سے پیش ہوا تھا۔ شاید تیرہ[۱۳] برس پیشتر وہ کچھ سنگین اور وقیع معلوم ہوتا ہو لیکن اب تو وہ پارٹی فیلنگ سے زیادہ باوقعت نہیں۔ یہ استفسار کیا جاسکتا ہی کہ جب تیرہ[۱۳] برس کے تجربہ نے اُس رائے کو بیکار و بے سود ثابت کر دیا، یوروپین اسٹاف بدظن تھا اور یوروپین اسٹاف کی جائز خواہشوں کا لحاظ کالج کا مہتم بالشان اصول ہی۔ لیکن ۹۶-۱۸۹۵ء کے بعد اس بات کا تجربہ ہو جانے پر کہ ۱۸۸۹ء کی کارروائی عمدہ نتائج پیدا نہیں کرسکتی اُس کی اصلاح کی کیا فکر کی گئی۔ کیا یوروپین اسٹاف سارے ٹرسٹیوں سے بدظن تھا؟ کیوں نہیں نواب محسن الملک یا دوسرے ٹرسٹی کو جوائنٹ سکرٹری مقرر کیا گیا؟ مابعد کے واقعات ثابت کرچکے ہیں کہ یوروپین اسٹاف نواب صاحب پر اعتماد کرسکتا تھا۔ بجائے اس کے کہ اصلاح کی جاتی اُس کو اور زیادہ مضبوط کیا گیا۔ (۵) اسسٹنٹ سکرٹری کا جدید عہدہ قانون کو ترمیم کرا کر قائم کیا گیا اور اُس پر سید محمد احمد خاں بہادر مقرر کئے گئے۔ اس میں ذرہ برابر شبہ نہیں رہا ہی کہ اگر مسٹر بیک جیسا زبردست پرنسپل سرسید کی وفات کے بعد کالج میں نہ ہوتا تو ۱۸۸۹ء کی کارروائی کالج کا خاتمہ کرچکی تھی۔

(٦) حیاتِ جاوید میں صرف کریٹسزم (criticism) کی کمی ہی نہیں بلکہ اپنے ہیرو کے محاسن نمایاں کرنے میں حدِ مناسب سے زیادہ توغّل کیا گیا ہے۔ مثلاً پبلک اسپیکنگ کے بیان میں اتنا کہنا حق بجانب تھا کہ سرسید ہندوستان کے اعلیٰ اسپیکروں میں تھے۔ اُردو میں اُن سے بڑھ کر اسپیکر اب تک کوئی نہیں ہوا۔ مؤلفِ حیاتِ جاوید کو اس قدر تعریف کافی نہیں معلوم ہوئی۔ اور انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ تمام ہندوستان میں کوئی اسپیکر سرسید سے بڑھ کر نہیں ہوا۔ اس بلندی تک اپنے ہیرو کو پہنچانے کے واسطے اُن لوگوں کو ہٹایا ہے جو سدِ راہ تھے۔ جو ہندوستانی انگریزی میں اعلیٰ اسپیکر ہوئے ہیں اُن کو یوں گھٹایا ہے کہ وہ برک اور پٹ کی بنائی ہوئی سڑکوں پر چلتے ہیں۔ یہ نہیں خیال فرمایا کہ غیر زبان میں اعلیٰ اسپیکر ہونا بہ نسبت اپنی زبان کے اعلیٰ اسپیکر ہونے کے زیادہ مشکل ہے۔

٧۔ اس امر کے ثابت کرنے کے واسطے کہ جو خدمت اسلام کی سرسید نے کی وہ تیرہ سو برس کے عرصہ میں کسی نے نہیں کی تمام پچھلے علما کے پچھلے کاموں کو یوں دبایا ہے کہ "اُن کے علمی مشغلوں میں کوئی فکر اور خلجان خلل انداز نہ تھا۔ وہ معاش کی طرف سے فارغ البال تھے۔ وہ قوم کی خدمت کرتے تھے سلطنت اُن کی خدمت کرتی تھی۔" افسوس ہے کہ واقعات اس رائے کا ساتھ نہیں دیتے۔ واقعات یہ ثابت کرتے ہیں کہ جیسے جانگداز خلجان اور روح فرسا افکار اُن کی راہ میں حائل تھے ویسے اب ہندوستان میں ڈھونڈے بھی نہیں مل سکتے۔ اگر اس مسئلہ پر کوئی صاحب مفصل بحث دیکھنا چاہیں تو ہمارے رسالہ "علمائے سلف" میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔ علمائے سلف کی نسبت خود سرسید کے خیالات بھی واقعات پر مبنی نہیں معلوم ہوتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا سے لیکر انتہا تک وہ سارے علما کو ایک ہی انداز کا سمجھے ہوئے تھے۔ اور جو خلافِ شان حالات انھوں نے بچشم خود دیکھے یا بعض علما کی نسبت سنے انھوں نے قاطبۃً کل علما سے اُن کو بدگمان کر دیا تھا۔ وہ جا بجا علما کی نسبت یہ ریمارک کرتے ہیں کہ اُن کے جو کچھ خیالات تھے وہ اگلوں کی تقلید پر مبنی تھے اور دوسروں کی پیروی کی عادت نے خود اُن کی قوتِ فیصلہ کو معطل کر دیا تھا۔ حالانکہ یہ ریمارک قرونِ اولیٰ کے علما کی نسبت ہرگز صحیح نہیں۔ انھوں نے جو کچھ کیا اور لکھا سب مجتہدانہ۔ اُن بزرگوں کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا رواں رواں آزاد تھا۔ یہ بات مسلّم

ہی کہ چار سو برس تک مسلمانوں کی تاریخ میں اجتہاد کا دَور رہا اس کے بعد تقلید شروع ہوئی اور سو[۱۰] سوا سو[۱۲۵] برس کے بعد تقلید کی جکڑ بند ایسی سخت ہوتی گئی کہ آخر قوتِ فیصلہ سلب ہوگئی اور علما لکیر کے فقیر رہ گئے۔ اس صورت میں دورِ اول کے بیانوں سے اس بنا پر بے توجہی کرنا کہ وہ آبائی تقلید کا نتیجہ ہیں درست نہیں ہی۔ یہ خیال بھی سرسید کا عموماً علمائے اسلام کی نسبت پایا جاتا ہی کہ اُن بزرگوں کو حکومت کا خوف اور عوام کا پاس و لحاظ اظہارِ حق سے مانع تھا۔ میرے نزدیک ایسا خیال کرنا اُن بزرگوں کی سچی عظمت کو گھٹانا ہی۔ کیا امام احمد بن حنبل نے مامون الرشید کے خوف سے مسئلہ خلقِ قرآن میں حق کو چھپایا؟ کیا وہ پابجولاں بغداد کے بازاروں میں تشہیر نہیں کئے گئے؟ کیا اگر مامون الرشید کو چندروز بھی اجل اور مہلت دیتی تو امام ممدوح کے قتل میں کچھ کسر باقی تھی؟ کیا امام اعظم نے خلیفہ منصور سے اختلاف کرکے دُرّے نہیں کھائے؟ کیا اُنھوں نے جیل خانہ میں وفات نہیں پائی؟ کیا سعید ابنِ جُبیر کو حجّاج سے سفاک کا جبروت اظہارِ حق سے روک سکا؟ کیا وہ شہید نہیں کئے گئے؟ کیا سعید ابن المسیّب نے دُرّوں کی مار نہیں کھائی؟ کیا خواجہ حسن بصری نے ابنِ ہبیرہ گورنر کوفہ کو بیدھڑک ملامت نہیں کی؟ کیا امام ابنِ طاوٗس نے خلیفہ منصور کو دنداں شکن جواب بیباکانہ نہیں دیا؟ یہ اور ایسے ہزاروں واقعات ثابت کررہی ہیں کہ خوف یا طمع کبھی ان جوانمردوں کی رائے کو نہیں دبا سکی۔ کالی بھیڑ کس گلہ میں نہیں ہوتی۔ بہت سے لوگ زمرۂ علما میں ایسے بھی گزرے ہیں جو خوف اور طمع کا شکار ہوگئے۔ لیکن اُن کے ایسا کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ سب ایسے ہی تھے۔ حیاتِ جاوید میں سرسید کا ایک اور قول اسی قسم کا نقل کیا ہی۔ "اصل یہ ہی کہ قدیم زمانہ میں جبکہ علما نے اس قسم کی رائیں لکھیں علم ایک نہایت محدود فرقہ میں تھا جس کو وہ خاص خاص لوگوں کے سوا اوروں میں شائع کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اور تمام لوگ اعلیٰ و ادنیٰ علوم کے ادنیٰ ادنیٰ مسائل سے بھی بے بہرہ تھے۔" افسوس ہی کہ سرسید جیسے محقق کے قلم سے ایسے الفاظ نکلیں۔ ہم مسلمانوں کی قدیم تاریخ دیکھتے ہیں تو واقعات اس کے خلاف پاتے ہیں۔ معتبر تاریخ شاہد ہی کہ قدیم زمانہ میں جبکہ علما نے اس قسم کی رائیں لکھیں ایک ایک اُستاد کے حلقۂ درس میں تیس تیس چالیس چالیس ہزار آدمی جمع ہوتے تھے۔ مکان اور کوچے جب تنگی کرنے لگے تو اساتذہ کو وسیع میدانوں میں بلند چبوتروں پر بیٹھکر درس دینا پڑا۔

اُستاد کی آواز شاگردوں تک پہنچانے کے لئے تین تین سو مستملی کھڑے ہوتے تھے۔ ابو مسلم نے جب بغداد کے ایک میدان میں درس حدیث دیا تو اُن کے مجمع میں چالیس ہزار دواتیں شمار ہوئی تھیں۔ تیسری چوتھی صدی ہجری میں غزنین سے لیکر اندلس تک علم پھیلا ہوا تھا۔ افغانستان۔ خراسان۔ فارس۔ ماوراءالنہر عراق۔ شام۔ حجاز۔ مصر۔ اُندلس۔ صقالیہ۔ تیونس۔ اور مراقش۔ غرض ایشیا۔ افریقہ۔ اور یورپ تینوں برّاعظم مسلمانوں کے علوم سے روشن ہورہے تھے۔ شہروں اور قصبوں سے گزر کر دیہات تک میں علم کی گرم بازاری تھی۔ جو علما مقتدائے دین اور رُکن اسلام مانے گئے ہیں وہ باعتبار توطن صدہا مقامات کے رہنے والے اور بلحاظ نسل بیسیوں نہیں بلکہ سینکڑوں خاندانوں سے تعلق رکھنے والے تھے۔ آزاد اور غلام، آقا اور نوکر، امیر اور غریب، مرد اور عورت دیندار اور دنیادار سب ہی دولتِ علم سے مالا مال تھے۔ ان واقعات کے ہوتے ہوئے کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ قدیم زمانہ میں علم ایک نہایت محدود فرقہ میں تھا۔ جس کو وہ اپنے خاص خاص لوگوں کے سوا اوروں میں شائع کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اور تمام لوگ اعلیٰ وادنیٰ علوم کے ادنیٰ ادنیٰ مسائل سے بھی بے بہرہ تھے۔ کاش کوئی ہم کو بتائے کہ نہایت محدود فرقہ کون سا تھا جس میں علم قدیم زمانہ میں محدود تھا۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ مسلمانوں کا بنارس اور روم کون سا شہر تھا؟!

(۸) مؤلف حیاتِ جاوید نے سرسید کے مخالفین کے لتاڑنے میں اعتدال سے زیادہ سرگرمی کا اظہار کیا ہے۔ یہاں تک کہ اُن کی نیت پر بھی بیجا حملہ کیا ہے۔ سرسید کے مخالفین میں ایسے بھی تھے جنھوں نے نیک نیتی سے مخالفت کی۔ ہم بعض ایسے بزرگوں سے واقف ہیں جو سرسید کے مذہبی خیالات کے سخت مخالف تھے۔ اُن سے ہمیشہ خلوت وجلوت میں مباحثہ کرتے رہے اور اس کے ساتھ ہی باقی اور تمام کوششوں میں اُن کے اول سے آخر تک مُمِد ومعاون رہے خواہ وہ کام سینٹفک سوسیٹی کی شکل میں تھا یا کالج اور کانفرنس کی صورت میں۔ کالج کے نازک وقتوں میں آڑے آئے اور اب تک اُن کاموں کی مدد میں سرگرم ہیں۔ کیا ایسے مخالفین کے ہوتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں نے سرسید کے مذہبی خیالات سے اختلاف کیا اُن کی نیت بخیر نہ تھی! ہم کو اس میں بھی کلام ہے کہ سرسید کے جو احباب

عربی کے عالم ہیں اُن میں سے کسی نے بھی تفسیر کو مانا ہو۔ خود نواب محسن الملک بہادر نے سرسید سے اس بارہ میں کھلّم کھلاً مخالفت کی اور طرفین کا مباحثہ عرصہ تک اخبار میں شائع ہوتا رہا۔ اس مباحثہ میں نواب صاحب نے تفسیر کو "تفسیر القول بما لا یرضیٰ بہ قائلہ" کا خطاب دیا تھا۔ اور جب تک یہ امر پایۂ ثبوت کو نہ پہنچا دیا جائے کہ یہ تفسیر محض سرسید کے زورِ طبع کا شگوفہ نہیں ہے بلکہ اسلوب کلام الٰہی اور داب ادب عربی کے موافق ہے اُس وقت تک یہی خطاب اُس پر صادق آتا رہے گا۔

(۹) کالج کے حالات میں مذہبی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے حیاتِ جاوید میں لکھا ہے "مذہبی تعلیم و تربیت بھی اس کالج کی خصوصیات میں ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ یہ شاخ جیسی کہ ایک محمدن کالج میں ہونی چاہئے ابھی تک اُس درجہ پر نہیں پہنچی لیکن اس کا الزام سرسید یا کالج کے منتظموں پر عائد نہیں ہوتا۔ اول تو دو مذہبی کمیٹیاں جو شیعہ اور سنی دونوں کی مذہبی تعلیم کی نگرانی اور انتظام کے لئے جدا جدا مقرر تھیں اور جن سے سرسید نے لوگوں کی بدگمانی کے خیال سے خود علیحدگی اختیار کی تھی انھوں نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی۔ دوسرے دُنیوی تعلیم کے کورس جو یونیورسٹی وقتاً فوقتاً مقرر کرتی ہے وہ اس قدر مشکل اور طویل الذیل ہوتے ہیں کہ اُن کے پورا کرنے میں طلبا کو دوسری طرف متوجہ ہونے کا بہت ہی کم موقع ملتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر اُن پر مذہبی تعلیم کا زیادہ بوجھ ڈالا جائے تو دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو وہ کالج چھوڑ دیں گے یا یونیورسٹی کے امتحانوں میں کامیاب نہ ہوسکیں گے با ایں ہمہ جس قدر مسلمانوں کی مذہبی تعلیم و تربیت کا اہتمام اس کالج میں کیا جاتا ہے اور جس کی تفصیل سالانہ رپورٹوں میں ہمیشہ چھپتی ہے ہندوستان کے کسی کالج میں اُس کا وجود نہیں"۔ ہم کو تعجب ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب جیسے آزاد خیال کے قلم سے یہ لفظ کیونکر نکلے ہیں۔ افسوس ہے کہ حیاتِ جاوید میں اس قسم کے استدلال کی کمی نہیں ہے۔ جو حالت مذہبی تعلیم کی کالج میں عہدِ سرسید میں رہی اُس پر "اہتمام" کا لفظ میں نہیں خیال کرسکتا کس طرح صادق آسکتا ہے۔ مؤلف نے ایک چھوٹا سا جزئیہ بھی ایسا بیان نہیں کیا جس سے یہ ثابت ہوتا کہ مذہبی تعلیم کا "اہتمام" تھا۔ بڑی سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اُس کی تفصیل سالانہ رپورٹوں میں ہمیشہ چھپتی ہے۔ ہم نے سرسید کے عہد میں سالانہ رپورٹوں میں قریباً اتنا ہی مضمون مذہبی تعلیم کی بابت پایا کہ "سنی طالبعلموں

کا سُنی استادوں نے اور شیعہ طلبا کا شیعہ استادوں نے امتحان لیا"۔ اول تو یہ طریقہ ہی قابلِ غور ہے
کہ جو پڑھائے وہی امتحان لے۔ اس سے قطع نظر کیجئے تو یہ کبھی نہیں دکھایا گیا کہ نتیجۂ امتحان کیا رہا؟ کتنے
طلبا شریک امتحان ہوئے؟ کامیاب طلبا کی تعداد فیصدی کیا رہی؟ یہ کہنا جو کمی تعلیم دینیات میں رہی اُس
کا الزام سرسید کے ذمہ دو وجہ سے نہیں آسکتا۔ اول یہ کہ دو مذہبی کمیٹیاں شیعہ سنی طلبا کی تعلیم مذہبی
کے انتظام و نگرانی کے لئے جدا جدا مقرر تھیں۔ دوسرے یہ کہ یونیورسٹی کی تعلیم کا بار اس قدر ہے کہ مذہبی
تعلیم کا بار طلبا اٹھا نہیں سکتے" ہمارے ناقص خیال میں درست نہیں۔ اول دلیل کے جواب میں یہ پوچھا
جاسکتا ہے کہ آیا کبھی سرسید نے ان کمیٹیوں کی پروا کی یا اُن سے کام لیا؟ اگر انھوں نے کام نہیں کیا تو
سرسید نے کبھی اجلاسِ ٹرسٹیاں میں اُن کی شکایت پیش کی؟ کبھی اُن کا جلسہ طلب کیا؟ جو جگہیں موت کے پنجہ
نے خالی کیں اُن کو معمور کیا گیا؟ حق یہ ہے کہ کام نہ کرنے کے الزام کے لئے وہ تھے اور کام کرنے والے
اور تھے۔ افسوس ہے کہ ہم کالج کے نقصان کے خیال سے اس بحث کی تفصیل زیادہ نہیں کرسکتے تاہم ہمارا
کانشنس اس کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ سرسید کے عہد سکریٹری شپ اور مسٹر بیک کی پرنسپلی کے زمانہ میں
کالج میں جو چیز سب سے زیادہ غیر اہتمام بالشان تھی وہ مذہبی تعلیم تھی۔ بجائے اس کے کہ اس تربیت
سے مذہب کی حرمت ذہن نشین ہوتی وہ ایک عمدہ پالیسی کے پیرایہ میں دماغوں میں جاگزیں ہوتا
تھا۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ کالج کی جس مذہبی تعلیم کو سراہا جاتا ہے وہ کیا چیز تھی؟ سرسید تحریر اور تقریر
میں ہمیشہ مذہب کے سرگرم حامی رہے۔ لیکن عالمِ عمل میں آئیے تو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ مذہب کیا تھا
جس کے سرسید اس قدر حامی تھے۔ دوسری دلیل کا یہ جواب ہے کہ یونیورسٹی کی تعلیم کا بار بیشک زیادہ
ہے تاہم اُس قدر تعلیم مذہب میں جو کالج میں سرسید کے زمانہ میں تھی ترقی ناممکن نہ تھی۔ یہ کہنا کہ محمڈن کالج
سے بڑھ کر کسی کالج میں تعلیم مذہبی کا اہتمام نہیں ہے کالج کی مذہبی تعلیم کی وقعت نہیں بڑھا سکتا۔ ہندوستان
کے کالج عموماً سرکاری ہیں یا مشنریوں کے یا ہندوؤں کے۔ ان کے مقابلہ میں اگر مسلمانوں کی مذہبی
تعلیم محمڈن کالج میں زیادہ ہوئی تو اُس کی حقیقی فضیلت ثابت نہیں ہوئی مع ہذا ہم کو اس میں کلام ہے کہ
اسلامیہ کالج لاہور کے مقابلہ میں دینیات کا زیادہ اہتمام محمڈن کالج میں تھا۔ مؤلف حیاتِ جاوید نے

بعض علمائے دیوبند پر اس بنا پر اعتراض کیا ہو کہ انھوں نے کمیٹی دینیات کی ممبری قبول نہیں کی لیکن یہ کہیں نہیں بتایا کہ جن علما نے ممبری قبول کی اُن سے کیا کام اس کے سوا لیا گیا کہ محمدن کالج میں اہتمام دینیات کے نہ ہونے کا ذمہ دار اُن کو قرار دیا جاسکے؟!

ہماری یہ رائے ہو کہ سرسید کی لائف ایک ایسے زبردست آزاد نگار قلم کا کام ہو جو نفرت و محبت دونوں سے بری ہو اور اُمید ہو کہ اگر مسلمانوں میں تعلیم کی اصلی ترقی ہوئی تو سرسید کی متعدد لائفیں لکھی جائیں گی اور اُن کے واسطے حیاتِ جاوید بنیاد کا کام کرجائے گی۔ یہ افسوس البتہ ہو کہ جو واقعات رہ گئے اُن کو آئندہ لائف نگار پیدا نہ کرسکیں گے۔

حیاتِ جاوید میں بعض فروگزاشتیں قابلِ لحاظ رہ گئی ہیں۔ مثلاً حلیہ میں ناک کے بھاری پن کا ذکر نہیں حالانکہ ایک مدبر کے حلیہ کا یہ ایک ضروری جز ہو۔ سرسید کی شادی کا ذکر نہیں۔ احباب کے بیان میں یہ ذکر نہیں کہ سرسید نے احباب کس طرح پیدا کئے۔ نواب محسن الملک کا ابتدا اً بقصدِ جنگ آنا اور پھر سرسید کے سامنے ہتھیار ڈال دینا ایک دلچسپ واقعہ ہو۔ اسی طرح اور دوستوں کے بھی ابتدائی حالات ہونگے اس ذکر کے لکھنے کی اس وجہ سے بھی ضرورت تھی کہ اس عہد میں لیڈر بننے کا سودا ہر دماغ میں ہو مگر ان صفات سے لوگ عموماً بے خبر اور بے بہرہ ہیں جو ایک آدمی کو لیڈر بنا دیتی ہیں۔ فقط

۹ر فروری سنہ ۱۹۰۲ء

امیر خسرو کا بچپن

"نقارخانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہو" یہ ایک مشہور مثل ہو۔ اولوالعزم پرانے کُلیوں کو توڑتے اور نئے کُلیے قائم کرتے ہیں۔ طوطئ ہند (امیر خسرو) کے کمال نے مثل بالا کا عکس آئینۂ ہمت میں دیکھا ہو۔ اُن کے واسطے یہ کہنا پڑتا ہو کہ "طوطئ ہند کی آواز نقارخانۂ گردوں میں کون نہیں سنتا" جہاں جاؤ ان کا کمال بلند آوازہ ہو۔ جس طرف کان لگاؤ اُن کا کلام سامعہ نواز ہوتا ہو۔ صوفیا کی مجلس میں حاضر ہو،

بزمِ شعرا میں جاؤ، پرانے کلبوں کی طرف جا نکلو، موسیقی کے جلسوں میں بیٹھو گیت گانے والیوں کے
پاس سے گزرو، لطیفے، کہہ مکرنیاں وغیرہ سنو، ہر جگہ خسرو یا کھسرو کا نام سنو گے۔ زمانہ بدلا تو مذاق بھی
بدل گئے۔ ہم کسی باکمال کا نام یا کلام سنتے ہیں تو اُس کے حالات کا تفحص اور شوق دل میں پیدا ہوتا
ہے۔ سوسائٹی بے خبر، بیشتر کتابیں خالی، دل کی آرزو دل ہی میں رہ جاتی ہے۔ جس طرح ایک تازہ پودا
پانی نہ ملنے سے خشک ہو جاتا ہے اُسی طرح یہ عزیز شوق مدد نہ پہنچنے سے افسردہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ قیامت
یہ ہے کہ جن اہلِ کمال کے نام مقبولیت کی برکت سے زیادہ روشن ہیں اُنھیں کے حالات پر تاریکی کے
زیادہ پردے ڈالے ہیں۔ امیر خسرو کی مقبولیت مُسلّم۔ تصوف کی کتابیں پڑھو، تذکرے دیکھو، معدودے
چند واقعات پاؤ گے۔ اُن واقعات سے اُس مذاق و واقعہ سنج کی سیری نہ ہوگی جو حال کی سوانح عمریاں
دیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔ اسلاف میں باکمال بھی تھے وقائع نگار بھی۔ پھر یہ کیا غضب ہے کہ ایسے زندہ جاوید
کملا کے حالات لحدِ فنا میں سو رہے ہیں۔ حال یہ ہے کہ گزشتہ تین چار صدیاں ہم پر ایسی گزری ہیں
جن میں خیالی و ذہنی مضامین کی حکومت ہمارے دماغوں پر رہی ہے۔ علوم میں معقولات، فنون میں
شاعری، رات دن انھیں کا چرچا تھا۔ اور ان دونوں کو واقعات سے بہت کم مناسبت ہے۔ اس زمانہ
کی اعلیٰ سے اعلیٰ تصنیف پڑھو اُس کا سرمایۂ ناز ذہنی موشگافی پاؤ گے جس کے لئے اپنا خیال اور
دماغ کافی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ طبیعتیں حقائق سے غیر مناسب ہو گئیں۔ مذاق، واقعات سے آشنا نہ رہے۔
تاریخی سرمایہ کو طاقِ نسیان میں پڑے پڑے فنا کی دیمک چاٹ گئی۔ خلاصہ یہ کہ پچھلوں نے اگلوں کی
کمائی ڈبو دی اور ڈبو کر فنِ تاریخ سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ قیامت ہے کہ ابنِ بطوطہ اور ابنِ جبیر کے نام اور
کام یورپ نے عرب و عجم کو سنائے اور دکھائے تب ہم کو یہ خبر ہوئی کہ ہم میں بھی "یہ سرمایۂ نازش" تھا۔
ہندوستان میں بہت سے علمائے نامور گزرے ہیں۔ مگر اُن کے حالات میں کوئی تذکرہ یا طبقات کی کتاب
نہیں ملتی۔ اگر آزاد بلگرامی سبحۃ المرجان لکھ کر تھوڑی بہت جان نہ ڈال دیتے تو اُن کا نام بھی زندہ نہ رہتا۔
شعرا کا حال سب سے زیادہ تباہ ہوا۔ یہاں ازل سے نام و نشان سے دشمنی چلی آتی ہے۔ تذکروں میں
مسجّع اور مقفّیٰ عبارت بہت، نام اور تخلص کی رعایت سے مملو فقرے مسلسل، لیکن سلسلۂ واقعات معدوم

تذکرہ حالات مفقود- اس ظلمت کدہ میں جب کسی طرف سے روشنی کی کرن آجاتی ہے تو آنکھیں سی کھل جاتی ہیں، دل نورِ مسرت سے روشن ہو جاتا ہے-

یہ تو مشہور ہے کہ امیر خسرو کے چار دیوان ہیں تحفۃ الصغر[1]، وسط الحیات[2]، غرۃ الکمال[3]، بقیہ نقیہ[4]- ان چاروں کا خلاصہ (دیوانِ خسرو کے نام سے) ہندوستان کے ایک مشہور مطبع نے چھاپا ہے۔ عبرت کی آنکھیں ان اربعہ عناصر کو دیکھ کر آٹھ آٹھ آنسو روتی ہیں۔ کلام کو ایسا مسخ کیا ہے کہ اصلی خط و خال کا نشان باقی نہیں۔ مطبوعہ نسخہ کو کسی صحیح مجموعہ سے ملا کر پڑھئے تو اصلیت جلوہ گر ہو-

تحفۃ الصغر کا ایک قدیم قلمی نسخہ حال میں میرے ہاتھ آیا ہے۔ دیباچہ میں مصنف نے اپنی ابتدائی شاعری کے کچھ حالات لکھے ہیں جو بڑی حد دلچسپ ہیں۔ تنہا خوری پسندیدہ نہیں۔ مخزن کے خوانِ نعمت پر اس کا لب لباب چنتا ہوں ۔ ع

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

عبارت صنائع بدائع سے مرصع نہ ہوتی تو لفظی ترجمہ پیش کرتا جس سے حال و قال دونوں کا لطف حاصل ہوتا۔

اس چھوٹے سے دیوان میں ۱۶ برس کی عمر سے ۱۹ برس تک کا کلام ہے۔ ابتداءً امیر خسرو کا تخلص سلطانی تھا۔ وہی اس مجموعہ میں جا بجا نظر آتا ہے۔ کہیں کہیں خسرو بھی ہے۔ قصیدہ، غزل، رباعی، قطعہ، ہر قسم کا کلام پاؤ گے۔ تصوف، تغزل، مدح، ظرافت کا بھی ہر رنگ موجود ہے۔ ہجو نام کو نہیں۔ اقسام کلام کا شمار حسب ذیل ہے قصائد ۳۴، ترجیع بند ۲، ترکیب بند ۲، قطعات ۲۳، غزلیات (غیر مرتب) ۸۷، مثنوی ۱، رباعیات ۲۰۵۔ قصائد میں بعض قصیدے سلطان علاؤالدین کی مدح میں ہیں یہ غالباً الحاقی ہیں۔ اس لئے کہ سلطانِ ممدوح ۶۹۵ھ ہجری میں تخت نشین ہوا اور اس وقت امیر خسرو کی عمر ۴۳ برس کی تھی۔

خلاصہ: دیباچہ میں جو حالات آپ ابھی پڑھیں گے ان کے سوا یہ دو چار اور معلوم ہو سکتے ہیں۔

امیر خسرو[5] ۶۵۲ھ میں مومن آباد پٹیالی (ضلع ایٹہ ممالک متحدہ) میں پیدا ہوئے۔ پانچ برس کے تھے

---

[5] سالِ پیدائش قران السعدین کے ان اشعار سے واضح ہوتا ہے ۔ آنچہ بتاریخ ز ہجرت گزشت + بود سن شش صد و ہشتاد و ہشت (۶۸۸)
سالِ من از دو گر بپرسی + راست بگویم ہمہ شش بود و سی - ۶۸۸ - ۳۶ = ۶۵۲ھ

کہ دارالکمال دہلی پہنچے۔ باپ کا سایہ کم سنی میں سر سے اٹھ گیا۔ نانا نے تربیت کی۔ یاوریِ طالع دیکھو۔ اُس زمانہ میں حضرت سلطان نظام الدین اولیاؒ کا قیام اُن کے نہالؔ میں تھا۔ انھوں نے لڑکپن میں ہی شرف بیعت حاصل کیا۔ نیز منزل سخن کی ہدایت پائی۔ مرشدِ کامل نے آغاز ہی میں یہ گرُ تلقین فرما دیا تھا۔ "بہ طرزِ صفاہانیاں بگو" (یعنی عشق انگیز و زلف و خال آمیز) ابتداءً جو شعر کہتے وہ حضرت کے ملاحظہ میں پیش کرتے۔ دیوانِ مبتدی و منتہی حضرت نے خود ان کو پڑھایا اور اُس کے رموز و اشارات ذہن نشین فرمائے۔ اس فیضان نے کلامِ خسرو میں وہ سوز و گداز پیدا کر دیا کہ آج تک جو سُنتا ہے دل تھام لیتا ہے (یہ حالات سیر الاولیا اور سیر العارفین سے ماخوذ ہیں)۔

خلاصہ دیباچہ تحفۃ الصغر

بندہ خسرو عرض پرداز ہے کہ عنایت ایزدی سے میں نے بارہ برس کی عمر میں بیت و رباعی کہنی شروع کی۔ فضلا و بلغا روزگار اُن کو سُنکر تعجب کرتے تھے۔ اُن کے تعجب سے میرا شوق اُبھرتا تھا۔ وہ بزرگ میری قابلیت دیکھ کر ترغیب دیتے تھے۔ میرا یہ عالم تھا کہ کثرتِ شوق کے اثر سے شام سے صبح تک چراغ کے سامنے مثل قلم سرنگوں رہتا تھا اور رات کو مطالعہ میں مصروف۔ یہاں تک کہ نظر میں دقت پیدا ہوئی۔ اور کلام کی باریکیاں خیال میں آنے لگیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھا کہ ابنائے جنس میری طبیعت کے امتحان لیتے تھے امتحان سے میرا دل گرماتا تھا۔ اور دل کی گرمی زبان میں روانی پیدا کرتی تھی۔ اس وقت تک کوئی استاد نہ ملا تھا جو دقائق کی راہ بتاتا، قلم کو بے راہ رَوی سے رُوکتا، نقائص کو دور کر کے کمال کا جلوہ دکھاتا۔ پس میں نوآموز طوطی کی طرح اپنے ہی خیال کے آئینہ کے سامنے بیٹھا بیٹھا مشق سخن کرتا تھا اور سخن سنجی سیکھتا تھا۔ اسی طرح آہنِ دل کی صیقل گری اپنی ہی قوتِ بازو سے کرتا رہا۔ استادوں کی تصانیف کا مطالعہ ہمیشہ کرتا تھا۔ حتیٰ کہ مذاق لطف کرم و ذوقِ سخن سے آشنا ہوا۔ انوری و سنائی کا کلام دیکھتا اور فہم کو روشنی پہنچاتا۔ جو عمدہ نظم نظر آتی اُس کا جواب لکھتا۔ جس دیوان کا مطالعہ کرتا اُسی کے انداز پر شعر کہتا۔ ایک عرصہ تک خاقانی کے دامنِ دولت سے لپٹا رہا۔ جو الفاظ اُس کے کلام میں مغلق تھے ان کی تعلیق کی یعنی

لہ قدیم دلّی کا ایک دروازہ "منڈا دروازہ" کے نام سے مشہور تھا۔ اُس کے پاس ہی امیر خسرو کے نہال کا مکان تھا۔ اُس کا موقع اب بی بی نور کے مقبرے کے قریب متصل درگاہ حضرت قطب صاحبؒ۔ ۱۲

نوٹ لکھے) اگرچہ مغلق اشعار کو حل کرتا تھا تاہم بمقتضائے نو عمری کماحقہٗ حقائق کلام واضح نہ ہوتے تھے۔ ہرچند میری ہمت آسمان پیما تھی لیکن استاد کے کلام کا پایہ اتنا بلند تھا کہ میرے فہم کی رسائی وہاں تک نہیں ہوتی تھی۔ بااین ہمہ عاقبۃ الامر استاد کی پیروی سے طبیعت بڑھنے لگی۔ چونکہ میرے کلام کا کوئی مرجع نہ تھا ہر استاد کے رنگ میں کہتا تھا۔ اس لئے اس مجموعہ میں متقدمین و متاخرین سب کا رنگ موجود ہے۔

حاصل کلام میرے والد نے تحصیل علم کے واسطے مکتب میں بٹھایا۔ یہاں یہ حال تھا کہ قافیہ کی تکرار تھی۔ میرے استاد مولانا سعدالدین خطاط مشق خط کی تاکید کرتے تھے۔ میں اپنی ہی دھن میں تھا۔ وہ بیٹھے پر ڈورے لگاتے مجھ کو زلف و خال کا سودا تھا۔ انتہا یہ کہ اسی سن میں وہ شعر و غزل کہنے لگا جس کو سنکر بزرگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ صبح کے وقت میرے استاد کو خواجہ اصیل نائب کوتوال نے خط لکھنے کے لئے بلایا۔ میں دوات قلم لے کر ہمراہ ہوا۔ اس عزیز کے گھر میں خواجہ عزیزالدین نظر بند تھے۔ خواجہ موصوف عالم تبحر اور دریائے سخن کے شناور تھے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو وہ مطالعۂ کتاب میں مصروف تھے۔ اثنائے مطالعہ میں جب کسی مضمون پر گفتگو کرتے تو منہ سے موتی بکھرتے۔ اور جواہر آبدار زبان سے نکلتے۔ میرے استاد نے ان سے کہا "یہ میرا ذرا سا شاگرد اس بچپن میں نظم کا بے حد شائق ہے۔ شعر پڑھتا بھی خوب ہے۔ کتاب اس کو دے کر امتحان لیجئے" خواجہ عزیز نے فوراً کتاب مجھکو دیکر سنانے کی فرمائش کی۔ میں نے اشعار ترنم آمیز لہجہ میں پڑھنے شروع کئے۔ اس کے اثر سے آنکھیں پرنم ہوگئیں۔ ہر طرف سے تحسین کی آواز آنے لگی پھر میرے استاد نے کہا کہ "پڑھنا سن لیا۔ اب کوئی بیت پیش کرکے جودت طبع کی آزمائش کیجئے" خواجہ ممدوح نے چار غیر متناسب چیزوں کے نام لیکر کہا ان کو نظم میں موزوں کرو۔ وہ نام موٗ، بیضہ، خربزہ، تیر تھے۔ میں نے اسی جلسہ میں یہ رباعی موزوں کرکے سنائی۔ رباعی

ہر موئے کہ در دو زلف آں صنم ست — صد بیضۂ عنبریں در آں موئے ضم ست
چوں تیر بداں راست دلش زیرا کہ — چوں خربزہ دندانش درونِ شکم ست

جس وقت میں نے یہ رباعی پڑھی خواجہ نے بہت ہی آفریں فرمائی۔ اور نام پوچھا۔ میں نے کہا۔ "خسرو" باپ کا نام پوچھا۔ میں نے کہا "لاچین" کہا لاچین ترک خطا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ بیشک

ترک ہی۔ دریافت کیا تم درم خریدۂ ناصری[1] ہو؟ عرض کی سلطانی شمسی[2] ہوں (سلطانی اشرفی کو کہتے ہیں۔ درم خریدہ کی کیسی رعایت ہی) فرمایا چونکہ تمہاری نسبت سلطانی ہی لہذا سلطانی اپنا تخلص رکھو۔ اس کے بعد بہت سی باتیں میرا دل بڑھانے کو کہیں اور فن کے متعلق بہت سی دقیق باتیں تلقین کیں جن کو میں اپنے دل میں رکھتا گیا۔ اُس روز سے میں نے اپنا تخلص سلطانی رکھا۔ اس دیوان میں یہ سکہ بہت رائج ہی۔ اُس کے بعد میں باریک مضامین کے پیچھے پڑا رہا۔

یہ سب کچھ ہوا مگر زمانہ لڑکپن کا تھا اس لئے کلام کبھی جمع کرنے کا خیال نہیں کیا۔ میرا بھائی تاج دین زاہد (جس کی باریک بیں طبیعت مشاطۂ طرۂ اشعار ہی) اُن اشعار کو فراہم کر لیتا تھا اور جو کچھ میں نے ۱۶ برس کی عمر سے ۱۹ برس کی عمر تک کہا اُس کا ایک مجموعہ اُس نے بنایا۔ میں نے اُس کو دیکھ کر کہا "یہ پانی میں ڈبو دینے کے قابل ہی"۔ اُس نے نہ مانا۔ اور فرمایش کی کہ اس کو مسلسل کر دو۔ چنانچہ میں نے ہر حصۂ کلام پر ایک شعر اُس کے عنوان کے طور پر لکھ کر لگا دیا۔ یہ میرا ایجاد ہی۔ مجھ سے پیشتر کسی نے یہ سلسلہ قائم نہیں کیا۔ اس دیوان کا نام تحفۃ الصغر ہی۔ سچ یہ ہی کہ ہر چند اوراقِ باطل جمع ہیں۔ میدان نشیب و فراز سے معمور تھا اور دیا نو میں لنگ تھی۔ میں نے بہت چاہا کہ بادپائے قلم کو جنبش نہ کرنے دوں لیکن دوستوں نے نہ مانا۔ عموماً سب اور خصوصاً بھائی تاج دین برابر مصر رہی۔ میں ہوں اس تاجِ بلند گوہر کے سلکِ محبت میں سرفراز رہا ہوں اور اخوت کے اثر نے ہم دونوں کو بے مبالغہ برادرانِ توام کی مثال بنا دیا ہی۔ خدا ہمارے بھائیوں کی تعداد میں ترقی دے ؎

بسکہ جانم یگانہ شد با او
در گمانم۔ کہ این منم۔ یا او

اُس کا مقصد یہ تھا کہ یہ دفتر پریشان کسی شمار میں آ جائے۔ میں کہتا تھا کہ لوگ اعتراض کریں گے۔ وہ کہتا تھا کہ دانا یہ دیکھ کر (جیسا کہ نام سے ظاہر ہی) کہ یہ بچپن کا کلام ہی اعتراض نہ کرے گا۔ نادان کے اعتراض کا لحاظ کیا! میں کہتا تھا کہ اس میں شتر و گربہ (رطب و یابس) بہت ہی۔ اس کا جواب تھا کہ لوگ

---

[1] اشارہ بجانب سلطان ناصر الدین ۱۲ [2] اشارہ بجانب سلطان شمس الدین التمش ۱۲

اس کو تعویذ بنا کر شوق سے بازو (بازو کی چوہیا) پر باندھیں گے۔ غرض برادر موصوف کے اصرار سے اس مجموعہ کو یارانِ خوب شمائل کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ امید ہے کہ بطیب خاطر قبول فرمائیں گے۔

نظرے خوش گزرے آپ نے دیباچہ کا خلاصہ ملاحظہ فرمایا۔ دیکھنے کے قابل یہ بات ہے کہ امیر خسرو کو کشورِ سخن کا تاج دار کس چیز نے بنایا۔ فطری مناسبت، کثرت مطالعہ، ولولۂ شوق، اصلی سبب تھے۔ سوسائٹی کا قابل ہونا، ہمسروں کی چھیڑ چھاڑ، بزرگوں کی نقادی و شفقت، یارانِ ہمدم کی ہمت افزائی، ان سے ان اسباب کو قوت پہنچی اور سب کے مجموعی زور نے تختِ خسروی پر جا بٹھایا۔ جب جوہر قابل بنکر دربار سلاطین میں پہنچے تو "خانِ شہید" شاہزادہ محمد سلطان پسر غیاث الدین بلبن سے قربت ملی جو خود سخن سنج و نقادِ فن تھے۔ قران السعدین میں امیر خسرو نے اپنی ترقی کا جو گُر لکھا ہے وہ ہر راہروِ منزلِ کمال کے واسطے توشہ بن سکتا ہے ؎

هر چه ستایش کنندم مرد ہوش | گرچه بود راست نیارم بگوش
زانکه چو زیں فن بغرور اوفتم | ترسم ازیں مرتبه دور اوفتم
چرب زبانی بنود سود مند | طفل بود کش بفریبی به قند
آنکه شناسندهٔ ایں گوہر ست | گر همه نفریں کندم درخور ست

وانکه به تقلید نشست اندریں
نشنوم از خود کندم آفریں

(رسالہ مخزن بابت ماہ مئی ۱۹۰۴ء)

غزل فارسی

حسنِ اتفاق کا کرشمہ دیکھو۔ حکومتِ عرب سے عجم کا آزاد ہونا اور فارسی لٹریچر کا ادبِ عربیہ کی حکمرانی سے نکلنا ساتھ ساتھ ہوا۔ عجمی فرماں روا فتوحِ عرب کی روح کے حلقہ بگوش رہے یعنی انھوں نے مسلمان رہ کر سلطنت کی۔ اسی طرح فارسی شاعری جانِ نظم عروض و قافیہ میں عربی شاعری کے تابع فرمان رہی۔ صورت کو چھوڑ کر معنی کو دیکھو تو متنبی اور خاقانی اپنی بلند پروازیوں میں خیالات کے ایک ہی آسمان سے تارے توڑ کر صفحۂ کاغذ کو منور کرتے ہیں۔ دولت شاہ نے اپنے تذکرے میں شعرائے فارسی کے دور قائم کئے ہیں۔ مقدمہ میں متنبی وغیرہ شعرائے عرب کا ذکر کیا ہے اور اس طرح فارسی شاعری کی ابتدا کو عربی شاعری کی انتہا سے ملا کر سلسلہ مسلسل کر دیا ہے۔ فہم انسان کی نارسائی دیکھئے۔ جس چیز کے آغاز کی تلاش میں الجھتی ہے انجام کار قیاس کی بھول بھلیوں میں سرگردانی اٹھاتی ہے۔ یہی حال فارسی شاعری کی ابتدا کا ہے۔ بہرام گور کا عالم سرخوشی میں پہلا مصرع کہنا، یعقوب لیث کے چھوٹے سے بچے کی زبان سے موزوں مصرعے کا نکل جانا مٹے سے نشان ہیں جو پیک خیال کو منزل مقصود تک نہیں پہنچا سکتے۔ قیاس کی مکر چاندنی سے نکل کر واقعات کی صبح صادق کے نور میں آؤ تو رودکی کا دلکش ترانہ سامعہ نواز ہوتا ہے۔

اس پُرشکوہ قافلہ کی قافلہ سالاری ابوالحسن[1] رودکی کی قسمت میں تھی۔ دربار سامانی کی عظمت کے جہاں اور ساز و سامان تھے وہاں ملک الشعرا رودکی کا طمطراق بھی تھا جس کی جلو میں دو سو زرین کمر غلام چلتے تھے۔ قلندر مزاج شعرا اگرچہ ہمیشہ رودکی کی شوکت کے خیال میں رہے لیکن یہ دلکش خواب پھر بہت ہی کم نظر آیا۔ ظاہر ہے کہ اس اوج موج میں مواجی خیال کے حوصلے قصیدے ہی کے میدان میں نکل سکتے تھے۔ ہجری چوتھی صدی کا آغاز رودکی کا دور ہے۔ اس زمانہ سے سعدی کے زمانہ تک (وقات

---

[1] ابوالحسن عبداللہ رودکی سمرقندی مادح امیر احمد نصر سامانی والی بخارا۔ وفات نصر سامانی ۳۳۱ ہجری

سدی سنہ ۶۹ ہجری) قصیدے کا دَور اور زور سمجھنا چاہئے۔ اس چار سو برس کے عرصے میں قصیدے نے نشو و نما کے مختلف مدارج طے کئے۔ بچپن سے لڑکپن، لڑکپن سے جوانی، جوانی سے کہولت، کہولت سے بڑھاپا۔ زندگی کی یہی منزلیں ہیں۔ یہی منازل قصیدے کو پیش آئیں۔ خاقانی[۱] کا زمانہ (چھٹی صدی ہجری کا درمیانی حصہ) قصیدے کے شباب کا زمانہ تھا۔ دورِ شباب زور شور کا زمانہ ہے۔ اس وقت کے قصائد مبالغہ کے زور میں طوفان سے بھی بڑھ چڑھ کر ہیں۔ جوانی اور جنون کا ڈنڈا ملا ہوا ہے۔ شباب قصیدہ کی مداحی ستایش کا جنون ہے۔ ممدوح زمین پر ہے وہ آسمان پر بتا رہے ہیں۔ ہاتھ کے اشارے سے دکھاتے ہیں۔ کوئی نہ دیکھے تو ہاتھ سے اُس کا منہ اوپر کو اٹھا دیتے ہیں۔ نہ مانے تو دلیل سے سمجھاتے ہیں، اس پر بھی نہ سمجھے تو ہجو سے سمجھاتے ہیں۔ سلح خانے کی چھت سے ہمیشہ چرخ ہفتم کے فرشتے تنگ رہے۔ اگر پایہ اتنا اونچا نہ ہو تو مریخ و وزنیزے کہاں رکھے جاتے۔ ڈربی کی گھوڑ دوڑ میں تیزی رفتار کا معیار سکنڈ اور منٹ ہیں۔ ہمارے شعراء کے ممدوحوں کے گھوڑے صدہا برس ہوئے اس ریکارڈ کو توڑ چکے ہیں۔ یہ چند منٹ اور سکنڈ میں "اسکائی ریس" (sky race) کا دَور پورا کرتے ہیں۔ وہ چشم زدن میں دَورِ فلک سے باہر نکل جاتے ہیں۔ مبالغہ کے مضامین پر خواہ ہنسو خواہ سوسائٹی کے مذاق سے عبرت حاصل کرو لیکن شکوہِ کلام، قوتِ ادا، زورِ بیان اور روانیِ سخن کو دیکھ کر تم بے اختیار آفرین کہہ اٹھو گے۔ شباب کے بعد پیری ہے۔ پیری میں شباب کی باتیں خواب کی باتیں ہیں۔ مرزا غالب بہادر شاہ کی مدح میں وہی مضامین صرف کرتے ہیں جو عنصری نے سلطان محمود کی ستایش میں باندھے تھے۔ یہ خیال کا خواب نہیں تو کیا ہے۔ بیان میں سحر کی تاثیر ہے۔ غالب و قاآنی کی جادو بیانی قصیدے کے ناتواں جسم میں پھر روحِ جوانی پھونک گئی۔

قصیدہ جس قدر منجھتا گیا اُسی قدر اس میں سے مغلق الفاظ، دشوار ترکیبیں اور مشکل مضامین چھٹتے گئے۔ جہاں قصیدے کی سرحد غزل سے ملی ہے وہاں قصیدے کی صفائی غزل کی روانی سے ہم دوش ہے۔ شعراء کے چوتھے طبقہ میں کمال اصفہانی ہے جس کو دربارِ کمال سے "خلاق المعانی" کا خطاب ملا ہے۔ اُس کے

---

[۱] خاقانی شروانی وفات سنہ ۵۸۲ ہجری ۱۲۰

قصیدے کی صفائی تیغ اصفہانی کے جوہر کو شرماتی ہے۔ اسی طبقہ میں غزل گویوں کے امام شیخ سعدی جلوہ فرما ہیں۔ اُن کا کلام کالملح فی الطعام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کا دیوان "شعرا کا نمکدان" کہلایا۔ صفائی کلام کے علاوہ غزل کے لئے شکستگی و خستگی بھی درکار ہے۔ جب غزل کے فروغ کا زمانہ آیا تو شکستگی و خستگی کے اسباب بھی پیدا ہوگئے۔ ساتویں صدی میں تاتار سے ایک سیلابِ بلا اُمڈا جو عجم کو تاخت تاراج کرتا ہوا نکل گیا۔ یہ ایک قہر تھا جس نے سارے کارخانے درہم برہم کر دیئے۔ دربار لٹ گئے۔ تاجداروں کے سر کٹ گئے۔ گرمیٔ ہنگامہ کافور ہوئی اور ہر طرف افسردگی چھا گئی۔ اس سے بہتر وقت غزل کے فروغ کے واسطے کون سا ہو سکتا تھا ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

یہی زمانہ ہے کہ شیراز سے غزل کا ترانہ بلند ہوا۔ جس طرح ملکی سلطنت بدلی اُسی طرح کشورِ سخن کا انقلاب ہوا۔ خلافت کا چشم و چراغ مستعصم بغداد میں شہادت سے سرخرو ہوا۔ اصفہان میں کشورِ قصیدے کے تاجدار کمال اصفہانی کو سعادت شہادت نصیب ہوئی۔ عبرت کا تماشا دیکھو جس قتلِ عام نے قصیدے کا تاج اتارا اُسی نے غزل کو تختِ اقبال پر بٹھایا۔ یہی تاتاریوں کا ہنگامہ تھا جس نے سعدی کی طبیعت میں افسردگی و شکستگی پیدا کی۔ اس طرح زوالِ قصیدہ اور کمالِ غزل ایک ہی سبب کے دامن سے وابستہ ہیں۔ سعدی کے سینے میں عشق کا سوز اور دماغ میں حکمت کا نور پنہاں تھا۔ سوزِ غزل کے پردے میں چمکا۔ حکمت کی بو گلستاں بوستاں میں مہکی۔

عام طور پر شیخ سعدی غزل کے مجتہد اول مانے گئے ہیں۔ تلاش اس کو غلط ثابت کرتی ہے تقدم کا شرف خواجہ سنائی غزنوی کو حاصل ہے۔ خواجہ ممدوح دوسرے طبقہ میں ہیں۔ اُن کے معاصر خاقانی و انوری کی غزل قصیدے کا اُترا ہوا خاکہ ہے۔ لیکن خواجہ کی غزل میں وہ صفائی اور ملاحت ہے جو آگے چل کر حافظ اور سعدی کا حصہ ہو گئی۔

یہ ضرور ہے کہ سعدی سے پہلے غزل قصیدے سے دبی ہوئی تھی۔ شیخ کے زورِ طبع نے اُس کو اتنا

بلند کر دیا کہ اُس نے قصیدے کو دبا لیا۔ امیر خسرو نے سوز و گداز کو چمکایا۔ حسن دہلوی نے لطافت سے اُس کا حسن دوبالا کیا۔ سعدی کے بعد سلمان ساوجی اور عبید زاکانی باکمال قصیدہ گو گزرے ہیں انھوں نے قصیدے کو اُبھارا لیکن پھر اُس کا رنگ نہ جما۔ دولت شاہ نے سلمان ساوجی کے دَور کو غزل گویوں کا دور لکھا ہے۔ قصیدے کے ساتھ ہی ساتھ مثنوی بھی عالمِ وجود میں آئی ہے۔ لیکن عجب بات ہے کہ قصیدے کے عہد میں قصیدے سے اور غزل کے دور میں غزل سے دبی رہی۔ دَورِ اوّل میں اساتذۂ مثنوی فردوسی، سنائی، عطّار، خاقانی، مولانائے روم اور نظامی وغیرہ گزرے ہیں۔ دورِ ثانی میں سعدی، خسرو، جامی، خواجو، فیضی، ظہوری، زلالی وغیرہ۔ مثنوی کا اشکال اس سے واضح ہوتا ہے کہ ابتدا سے انتہا تک مشکل سے تین چالیس مثنوی گو ایسے نکلیں گے جو شہرت کے دربار میں باریاب ہوئے ہوں۔ حال آں کہ قصیدہ اور غزل کے استاد صدہا مشہور ہیں۔

ہم نے تفحص کے بعد غزل کے بارہ دور قائم کئے ہیں۔ ہر دور میں جن اساتذہ کا دَور دورہ رہا اول اُن کے نام تقدیم و تاخیر کی ترتیب سے لکھے ہیں۔ پھر ہر ایک کے کلام کا نمونہ دکھایا ہے۔ اور اپنی فہم ناقص کے مطابق ہر دور کی خصوصیتیں جتائی ہیں۔ خاتمۃ الباب شیخ علی حزیں ہیں۔ بنارس جا کر اُن کی قبر دیکھو۔ بیکسی کہہ رہی ہے کہ باغِ سخن کا بلبل، زار نالیوں سے چور، حسرتِ بہار کو دل سے لگائے یہیں سو رہا ہے۔ پتھر کا دل ہوگا جو سنگِ مزار کے اشعار پڑھ کر بے تاب نہ ہو جائے گا۔ اشعار ؎

زباں دانِ محبت بودہ ام دیگر نمی دانم ہمیں دانم کہ گوش از دوست پیغامے شنید این جا

حزیں از پائے رہ پیما بسے سرگشتگی دیدم سرِ شوریدہ بر بالینِ آسایش رسید این جا

دلِ حزیں سے یہ مضمون غزل کا مرثیہ بن کر نکلا ہے۔ جو جوشِ جنون صدہا برس فارس، عراقِ عجم، خراسان، ماوراء النہر اور ہندوستان کی خاک چھانتا رہا آخر ٹھنڈا ہو کر کاشی کی سرزمین میں خاک میں مل گیا۔ اگر یہ سچ ہے کہ بنارس میں قیدِ حیات سے آزاد ہونے والے پھر جنم نہیں لیتے تو مان لو کہ اب قیامت تک غزل فارسی اسی قبر کی مجاور رہے گی۔ ظاہری اسباب کی تیکھی چتون بھی یہی اشارہ کرتی ہے۔ لوحِ مزار کا آخری شعر اسی انجام کی خبر دے رہا ہے۔ شعر ؎

روشن شد از وصالِ تو شبہائے تارِ ما

صبحِ قیامت است چراغِ مزارِ ما

دَورِ اوّل۔ ابوالفرج رونی۔ منوچہری دامغانی۔ مسعود سعد سلمان۔

دَورِ دوم۔ عبدالواسع جبلی۔ خاقانی شروانی۔ انوری ابیوردی۔ ادیب صابر۔ خواجہ سنائی غزنوی
ظہیر فاریابی۔ سیف الدین اسفرنگی۔

دَورِ سوم۔ نظامی گنجوی۔ شاپور نیشاپوری۔ خلاق المعانی کمال اصفہانی۔ پوربہائی جامی۔

دَورِ چہارم۔ خواجہ فریدالدین عطار نیشاپوری۔ مولانا جلال الدین رومی۔ شیخ سعدی شیرازی۔ اوحدی
مراغی۔ عراقی ہمدانی۔ ہمام تبریزی۔ امیر خسرو دہلوی۔ خواجہ حسن دہلوی۔ خواجو کرمانی۔

دَورِ پنجم۔ سلمان ساوجی۔ حسن متکلم ناصر بخاری۔ خواجہ حافظ شیرازی۔ کمال خجندی۔

دَورِ ششم۔ سید نعمت اللہ قدس سرہٗ۔ سید قاسم انوار قدس سرہٗ۔ خواجہ عصمت بخاری۔ کاتبی۔
شیخ آذری۔

دَورِ ہفتم۔ شاہی سبزواری۔ امین ترلابادی۔ درویش قاسم تونی۔ طاہر بخاری۔

دَورِ ہشتم۔ مولانا جامی۔ خواجہ آصفی۔ ہلالی استرآبادی۔ اہلی خراسانی۔ بنائی ہروی۔ سہیلی

دَورِ نہم۔ بابا فغانی شیرازی۔ لسانی شیرازی۔ میلی ہروی۔ غزالی مشہدی۔ وحشی یافقی۔ محتشم کاشی۔
ولی دشت بیاضی۔

دَورِ دہم۔ نقی کمرہ۔ ملک قمی۔ ظہوری ترشیزی۔ شفائی اصفہانی۔ نظیری نیشاپوری۔ عرفی شیرازی
فیضی اکبرآبادی۔ ثنائی مشہدی۔ شاپور طہرانی۔ طالب آملی۔ اسیر شہرستانی۔

دَورِ یازدہم۔ صائب تبریزی۔ سلیم طہرانی۔ کلیم ہمدانی۔ صیدی طہرانی۔ شوکت بخاری۔ طاہر قزوینی
نصرت مشہدی۔ عالی شیرازی۔

دَورِ دوازدہم۔ (خاتمۃ الباب) شیخ علی حزیں لاہیجانی۔

دورِ اوّل - ابوالفرج رونی - منوچہر دامغانی - مسعود سعد سلمان -

ابوالفرج رونی (مادح ابو علی سیمجور تھا - جو قبل ظہور دولت سلطان محمود سلاطین سامانیہ کی طرف سے صوبہ خراسان میں گورنر تھا - وفات ابو علی سیمجور ۳۸۷ھ ہجری) ؎

بیامدی صنما بر دو پای بنشستی — دلم ز دست بروں بردی و درون خستی
نہ مست بودی و پنداشتم کہ چوں مستاں — ہمی بہ حیلہ شناسی بلند را ز پستی
سہ روز شد پس ازاں تا ز دردِ فرقتِ تو — نہ ہوشیاری دانم کہ چیست نہ مستی
درست گشت کہ جانِ منی بدیں معنی — کہ تا ز من بگسستی بہ من نہ پیوستی
بہ جانِ جاناں اگر تو بدستِ خویش دلم — چنانکہ بردہ امروز باز نفرستی

ولہ

چہ دلبری چہ عیاری چہ صورتی چہ نگاری — نہ گاہ خلوت جفتی نہ وقت عشرت یاری
بغمز عقل گدازی بچنگ چنگ نوازی — بوعدہ روبہ بازی بہ عشوہ شیر شکاری
چو بوسہ خواہم رنگی چو صلح جویم جنگی — چہ راست رانم لنگی چہ خوست این کہ تو داری
نہ سوزی و نہ بسازی نہ کاہی و نہ فزائی — نہ بندی و نکشائی - چہ دیو دست سواری
شگفت یوسف روئی چرا نہ یوسف خوئی — بلے قرینہ روئی - ولیک گرگ بیاری

منوچہر دامغانی (سلطان محمود غزنوی کے زمانہ میں تھا) جلوس سلطان محمود ۳۸۷ھ وفات ۴۲۱ھ ہجری ؎

بارخت ای دلبر عیار یار — نیست مرا نیز دگر بار بار
دو رخ رخشان تو گلنار گشت — بر دلِ من ریختہ گلنار نار
چشم تو خونخوارہ ہر جادوے — ماندہ ازاں چشمک خونخوار خوار
بندہ ہوادار و ہواخواہ تست — بندہ ہوا خواہ وفادار دار
داد کن ای کودک بردار جور — مہر پیش آر و بردار دار
ای تو دل آزار و من آزردہ دل — دل شد از آزار دل آزار زار

ولہ

اے باعدوے ما گزرندہ زکوے ما — اے ماہروے شرم نہ داری زروے ما

نامم نہادہ بودی بہ بدخواہ جنگجو — با ہر کسے ہمی گلہ کردی زخوے ما

جستی و یافتی دگرے بر مراد دل — رستی زخوے ناخوش و از گفتگوے ما

اکنوں بجوے اوست رواں آب عاشقی — آں روز شد کہ آب گزشتے بجوے ما

گویند سرد تر بود آب از سبوے تو — گرم است آب ما کہ کہن شد سبوے ما

اکنوں کہ کام دل خویش یافتی — چندیں بہ خیرہ خیرہ چہ گردی بکوے ما

مسعود سعد سلمان جرجانی - (مادح سلطان محمود و مسعود و ابراہیم غزنوی) جلوس سلطان مسعود سنہ ۴۲۱ھ وفات سنہ ۴۳۲ھ - جلوس سلطان ابراہیم سنہ ۴۵۱ھ وفات سنہ ۴۸۱ھ سنہ ۵

آمد آہستہ با کرشمہ و ناز — دوش نزد من آن نگار طراز

زلف پر پیچ بر شکستہ بہ گل — چشم پر خواب سرمہ کردہ بناز

بر نہادہ برابروان چوگان — تیر غمزہ بچشم تیر انداز

گفتمش چوں روی بنومیدی — جنگ مانند ما کرد آغاز

اے نیاز مرا نیاز بہ تست — ورچہ دارد بمن زمانہ نیاز

من چو پرداختم بمہر تو دل — تو زمانے بوصل من پرداز

ولہ

اے سلسلۂ مشک فگندہ بقمر بر — خندیدہ لب پر شکر تو بہ شکر بر

چوں قامت تو نیست سہی سرو خراماں — چوں چہرۂ تو نیست گل لعل ببر بر

چنداں غم و اندوہ فراز آمدہ در دل — کاندودہ شدہ اندہ و غم یک بدگر بر

دل شد سپر جاں زنہیب فرۂ تو — تا چوں فرۂ زخمے زند آخر بہ جگر بر

تا ہجر نشستہ است بہ نزدیک تو ساکن ‏ ‏ ‏ ‏ این وصل سراسیمہ بماندہ است بدر بر

بر تو گزرم رشتے بتابی ہمی از من ‏ ‏ ‏ ‏ گوئی کہ ندیدی تو مرا جز بگزر بر

من بر تو ہمی ہر چہ کنم دست نیابم ‏ ‏ ‏ ‏ اے رشکِ قمر دست کہ یابد بقمر بر

دورِ اوّل کے جن اساتذہ کی چند غزلیں ملیں درج کی گئیں، نمونۂ انداز کے لئے کافی ہیں۔

ریویو | عبارت و معنی دونوں پر غور کیجئے۔ مطلع ہے غزل کے کل شعر ہم قافیہ و ہم ردیف ہیں۔ مقطع نہیں۔ بندش اور الفاظ کی ترکیبِ لفظی صاف کہہ رہی ہے کہ قصیدہ گویوں کا کلام ہے۔ نزاکت و لطافت استعارہ و مجاز جو جانِ غزل ہے معدوم ہے۔ جوش و ولولہ اور سوز و گداز بھی نہیں۔ ان صفات کے پیدا ہونے کے دو بڑے سبب ہیں۔ ایک تصوف، دوسرا سوسائٹی کا رنگ۔ تصوف ان شعرا میں نہ تھا۔ سوسائٹی سپاہ کے نعروں اور ہتھیاروں کی جھنکار سے گونج رہی تھی۔ نزاکت کہاں باریاتی۔ سوز و گداز کو مصروفِ کارزار سپاہی زنانہ کیا جانتے۔ وہ لوگ سومنات کو دارالشرک ہونے کے لحاظ سے قابلِ فتح جانتے تھے۔ رہا اس میں سوز و گداز یا حسن کا جلوہ دیکھنا یہ نازک خیالی متاخرین کے حصہ میں آئی۔ غالب کہتے ہیں ؎

بہ سومناتِ خیالم در آ ے تا بینی

روان فروز بر دوش ہائے زناری

ابو الفرج رونی اور منوچہری کی غزلیں پڑھ کر جب مسعود سعد سلمان کی غزل میں یہ شعر نظر آتا ہے ؎

زلف پُر پیچ بر شکستہ بگل

چشم پُر خواب سرمہ کردہ بناز

تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک چٹیل میدان کے بعد کوئی سبزہ زار آنکھوں کے سامنے آگیا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ استعارہ و تشبیہ و لطافت غزل کے واسطے کہاں تک ضروری ہے۔ مسعود کا زمانہ سلطان ابراہیم بن مسعود کے عہد تک رہا۔ یہ عہد بمقابلہ سلطان محمود و مسعود کے آسائش کا عہد تھا۔ سلجوقیوں سے صلح ہو گئی تھی۔ ابراہیم کے حوصلے اتنے بلند نہ تھے جو محمود و مسعود کی طرح سوسائٹی میں تلاطم برپا رکھتے۔ غالباً اسی

آسایش دامن کا رنگ مسعود سعد سلمان کی غزل میں جھلک رہا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ایک مصروفِ کارزار سوسائٹی کو جس قدر سوز و گداز و محبت کے مضامین پر غور کرنے کی فرصت مل سکتی ہے اُسی قدر سرمایہ اس دور کی غزل میں ہے۔ ان غزلوں کے انداز سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دشتِ قفچاق کا سیدھا سادہ ترکمان اپنے محبوب سے بات چیت کر رہا ہے۔ مضامین کو دیکھو تو سمجھ جاؤ گے کہ جو مضامین غزل کے لئے روح رواں ہیں وہ اُس عہد میں پیدا ہو چکے تھے۔ معشوق کی جفاکاری، بیوفائی، وعدہ خلافی، مست ناز ہونا، رقیبوں کے ساتھ اختلاط، عاشق صادق سے بیگانگی، ہرجائی ہونا، فراق کے ستم، وصال کی آرزو، سوزِ عشق، عشاق کی وفاداری، اخلاق، آزردگی، خستگی، انتظار، زمانہ کی دشمنی، اشک باری، جامہ دری، بے صبری، زرد روئی ان کی آنکھ کی تشبیہ ابر سے۔ چشم معشوق کی خونخوارگی، بدمستی، پُرخوابی، جادوگری، تیر افگنی، بیماری، مژگاں کی تیراندازی۔ ابرو کی کمان و چوگان سے تشبیہ۔ رخ کی تشبیہ گل لالہ و ماہ سے لب کی صفات: پرشکر۔ لب لعل مثل شراب (مرجان)، ہونا زلف کے اوصاف: مشک و عنبر و قیر۔ نامۂ گنہگاراں[1]۔ آشفتگی۔ پیچ پیچ۔ قد کی سرو سہی سے۔ رفتار کی کبک دری سے۔ معشوق کے خطاب۔ ترک، نگار، کودک، پسر، دوست، لعبت، بت، صنم، صفاتِ معشوق: کمر بستہ ہونا، دلبر، عیار، حور لقا، نازنین، پریرو، سیم ذقن، پستہ لب، بنفشہ مو، سوار۔ (قاصد) کبوتر، باز۔

آج لوگ ایشیائی شاعری کے مضامین کو آن نیچرل (Unnatural) بتاتے ہیں۔ تم اوپر کے مضامین کو غور سے دیکھو۔ عہد محمود و مسعود کا تصور باندھو۔ خراسانیوں کی افتاد مزاج اور رسوم پر نگاہ ڈالو۔ غزنین اور خراسان کی جغرافیائی حالت سوچو پھر انصاف سے کہو کہ ان میں کون سی بات آن نیچرل ہے۔

جب معشوق کی نگاہِ گرم دل میں زخم پیدا کر دے تو ایک جنگجو جو رات دن تیر و شمشیر کے زخم لگاتا کھاتا رہا ہو اُس حالت کو تیغ زنی و تیر افگنی سے بڑھ کر کس پیرایہ میں بیان کر سکتا ہے وہ

---

[1] دیکھو زلف کی تشبیہ "نامۂ گنہگاراں" سے کیا اشارہ کر رہی ہے۔ ۱۲

بنفشہ کا پیچ و تاب، کبک دری کی مستانہ خرامی، سرو کی راستی، گل و لالہ کی رعنائی رات دن دیکھتے رہتے تھے۔ پھر اگر ان چیزوں کو وہ اپنے کام میں لائے تو قانونِ فطرت کی رُو سے کس جُرم کے مرتکب ہوئے۔ درباروں کا شکوہ، مشک و عنبر، مرجان وغیرہ تکلف کے سامان ہمہ وقت پیش نظر رکھتا تھا انھوں نے ان کا نام لیا تو کیا بُرا کیا۔ اصل یہ ہے کہ خود ہماری نیچر بدل گئی۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔ اس دور کا کلام جہاں تک ہم نے دیکھا اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ حسبِ ذیل مضامین اس وقت تک غزل میں نہیں آئے تھے۔

واعظوں پر پھبتیاں، اُمورِ دین کا استخفاف، معجزات کی بے ادبی، مے و میخانہ، دَیر و بتخانہ، لوازم آتش پرستی، بلبل و گل، شمع و پروانہ، انداز و ادا، لب کی صفت میں آبحیات و زندگی بخشی۔ آنکھ کی تعریف میں قاتل و کشتن خط و خال وغیر ذالک۔

یہ دَورِ غزنین و بخارا میں گزرا ہے جو فقہ وغیرہ علوم دینیہ کے اور علماء کے اثر کے مرکز تھے۔ سلطان محمود و مسعود کے حالات پڑھو۔ تو معلوم ہو گا کہ دونوں پر عُلماء کی صحبت کا کیا اثر تھا۔ اس حالت میں جو باتیں خلافِ دین تھیں وہ بآسانی قلم سے نہیں نکل سکتی تھیں۔ گل و بلبل چمنستانِ غزل میں آنے کے لئے غالباً بہار شیراز کا انتظار کر رہے تھے۔ شمع و پروانہ بزم عیش و عشرت کے لوازمے ہیں۔ میدان جنگ میں عیش و عشرت کہاں۔ لب کی حیات بخشی آنکھوں کا قاتل ہونا۔ نزاکت و لطافت کے جوہر ہیں جو متاخرین کی جانگاہیوں سے چمکے۔ دَورِ اوّل میں ان مضامین کا نہ ہونا ہماری شاعری کی حد درجہ نیچرل ہونے کی دلیل ہے۔

(رسالہ اُردوئے معلیٰ کانپور جلد ۲ نمبر ۶
ماہ جون سنہ ۱۹۰۴ء)

اُردو غزل

اُردوئے معلیٰ کے گزشتہ نمبر میں (اُردو) غزل گوئی پر ایک مضمون شائع ہوا ہی۔ مجھ کو اُس کے اُس حصے سے بالکل اتفاق ہی کہ غزل نظم کا ایک ضروری جزء ہی اور جو لطف وہ اپنی نوعیت خاص سے دل کو بخشتی ہی وہ قطعہ یا مثنوی یا قصیدے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ غزل کو ایک ایسی کیاری تصور کیجئے جس میں رنگ رنگ کے خوشنما پھول کھلے ہوئے ہوں اور ہر پھول کی دلفریبی دامن دل کو اپنی طرف کھینچتی ہو۔ جو لطفِ خاص ان کیاریوں کے دیکھنے سے حاصل ہوگا وہ اُن کیاریوں کے نظارے سے حاصل نہیں ہوگا جن میں ایک ہی طرح کے پھول ہوں۔ تفنّن انسان کی زندگی کو گوارا رکھنے کا ایک ذریعہ ہی۔ کیا نئے مفتی یہ فتویٰ صادر کریں گے کہ میز پر بس ایک قسم کا کھانا مہمانوں کے سامنے لایا جائے۔ کیسا ہی مزیدار کھانا ہو۔ دو وقت متواتر کھلا کر مہمانوں کے چہرے دیکھئے کہ میز پر وہ شگفتگی و رغبت سے آتے ہیں یا بددلی اور افسردگی کے ساتھ۔

جس طرح فارسی شاعری کی ابتدا عربی شاعری کی انتہا سے جا ملی ہی اسی طرح ابتدائے اُردو شاعری انتہائے فارسی غزل سے ہمدوش ہی۔ شیخ علی حزیں اور میاں ولی کا ایک زمانہ ہی۔ اگلے اساتذۂ اردو کبھی کبھی طرح بھی فارسی غزل کی انتخاب کرتے تھے۔ مثلاً:

(فارسی) ؎ گر فتیم بجا نان سر راہے گاہے　　او ہم از لطف نہان داشت نگاہی گاہے

(اردو) ؎ سرسری اُن سے ملاقات ہی گاہے گاہے　　محفلِ غیر میں گاہے سر راہے گاہے

اُس زمانے کے اُردو کے اُستاد اردو فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اکثر متقدمین (بلکہ بعض متاخرین) نے اُردو فارسی دونوں دیوان مرتب و مدوّن کئے۔ اس اختلاط اور ربط و ضبط کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ فارسی غزل کی پیروی اردو غزل کرے۔ اور شیراز و اصفہان کے ترانوں کی صدا دہلی اور لکھنؤ کے مشاعروں میں گونجے۔ تم اُردو شعرا کی نکتہ سنجی اور قوت بیان کی جس قدر

چاہو تعریف کرو لیکن اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ وہ علم و فضل میں کامل نہ تھے۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ اُن کے
دماغ ایسے زبردست اور پُر قوت نہ تھے کہ ایجاد و اختراع پر قادر ہوتے۔ ایجاد کا دروازہ بند تھا
تو تقلید کی شاہ راہ کھلی ہوئی تھی۔ جو مضامین انھوں نے فارسی غزل میں دیکھے انھیں کو علوم متعارفہ
قرار دے کر اردو غزل کی شکل پیدا کی۔ غزل میں چار چیزیں ہو سکتی ہیں۔ مضمون، خیال، زبان، طرزادا۔
اردو غزل میں مضامین قریباً فارسی غزل کے ہیں۔ خط و خال، زلف و کمر، ناز و کرشمہ، وحشت و افسردگی
شکستگی و خستگی، شمع و پروانہ، بلبل و گل، قیس و لیلیٰ اور فرہاد و شیریں۔ یہ تمام مضامین فارسی غزل کے
ہیں۔ اور اردو غزل کی بساط بھی اتنی ہی ہے۔ خیال کی ترقی اور وسعت، قوتِ دماغ کے تابع ہے جو
ممارستِ علوم سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ معلوم ہے کہ ممارستِ علوم اردو شعرا کے حصے میں نہیں آئی۔ لہذا
قوتِ خیال کے کرشمے اردو غزل میں بہت کم ہیں۔ اب صرف دو چیزیں رہ گئیں۔ ایک زبان، دوسرے
طرزادا۔ بس انھیں دو میدانوں میں اردو کے جوہر کھلتے ہیں اور حق یہ ہے کہ اُن کی آب و تاب دیکھ کر
جوہری حیران و ششدر رہ جاتے ہیں۔ میر و مرزا سے لیکر ذوق و اسیر تک بلکہ داغ و امیر تک
نظر ڈالو وہی خیال و مضمون پاؤ گے۔ فرق ہے تو زبان اور طرز ادا کا۔ ایک ہی خیال و مضمون پر
سوسائٹی کے تغیر سے جو اثر پڑا ہے وہ البتہ مختلف طبقوں میں محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً مصحفی و جرأت
کے یہاں مستی اور رندی پاؤ گے۔ متاخرین کے یہاں نہیں ہے۔

فارسی غزل کو دیکھو۔ مضامین اس میں بھی قریباً متحد ہیں لیکن یہاں سے وہاں ایک بات زائد ہے،
یعنی خیال۔ اس خیال کی نیرنگی نے غزل فارسی کو ایک ایسا شاہد رعنا بنا دیا ہے جس کے جلووں کی انتہا نہو۔
جب دیکھو ایک نیا جلوہ دیدہ افروز ہوگا۔ اور پہلا جلوہ دوسرے سے اتنا ممتاز ہوگا کہ یہ سمجھنا مشکل
ہو جائے گا کہ آیا یہ وہی آفتِ روزگار ہے جو پہلے جلوہ گر تھا یا اور ہے۔ مولانائے روم، عطار، سعدی،
خسرو، حافظ، فغانی، شفائی، نظیری، عرفی، ملک قمی، ظہوری، طالب آملی اور حزیں کے کلام کو غور
سے دیکھو تو صاف صاف عیاں ہو جائے گا کہ ہر چند یہ سب (باعتبار سخن) ایک ہی آسمان کے تارے
ہیں لیکن اُن کے بروج و منازل ایک دوسرے سے اس قدر بعید و متفاوت ہیں کہ گمان ہوتا ہے کہ ع

ہر یکے را آسمانے دیگر است

ایک کی روشنی کا رنگ دوسرے سے اتنا ممتاز ہو کہ ہر ایک کو دیکھ کر بے ساختہ زبان سے نکلتا ہو کہ یہ نیا رنگ ہو۔ یہ خیال کی وسعت و نیرنگی اُن کے علم وفضل کا کرشمہ تھا۔ شفائی کے کمال فلسفہ کو نیر باقر داماد نے مانا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا سند ہو سکتی ہو۔ پچھلی چند صدیوں میں بہت کم فضلا ایسے ہوئے ہونگے جو ملّا جامی کے ممنونِ احسان نہ ہوں۔ سعدی کے کمال کا سلسلہ اُس سرچشمہ تک پہنچتا ہو جو لبِ دجلہ علوم کے دریا بہا رہا تھا یعنی نظامیہ بغداد۔ علیٰ ہذا القیاس غزل فارسی میں جس چیز نے شورِ محشر برپا کر رکھا ہو وہ تصوف ہو۔ فارسی غزل گویوں میں بہت سے باکمال ایسے ہوئے ہیں جن کے سینوں میں عشق کی حقیقی آگ شعلہ زن تھی۔ یہ شعلے جب منہ سے باہر آئے غزل کہلائے۔ خواجہ سنائی، مولانائے روم، شیخ عطار، شیخ نعمت اللہ ولی، سید قاسم انوار قدس سرہم وہ بزرگ ہیں جو بزمِ اُنس اور انجمن سخن دونوں کے صدر نشین تھے۔ ان سے نیچے طبقے میں باعتبار تصوف سعدی، خسرو جامی وغیرہ ہیں۔ ایک طبقہ وہ تھا جو (بظاہر) اہلِ باطن نہ تھا لیکن قوتِ خیال کی مدد سے تصوف کے جوہر اپنے کلام میں چمکا گیا مثلاً نظیری۔ کملائے اُردو میں میر درد علیہ الرحمۃ ایسے گزرے ہیں جو عشق حقیقی کے لذت چشیدہ تھے۔ ورنہ بہت سے ایسے تھے جن کو غالباً عشق مجازی سے بھی مناسبت نہ تھی۔

فارسی غزل کو جس پائے کے مُربی ملے وہ اردو کو کہاں نصیب ہوئے۔ میر علی شیر اور مرزا عبدالرحیم خانخاناں تو بہت اعلیٰ مثالیں ہیں کم و بیش ہر ایک دربار باقاعدہ مُربی فن تھا۔ عہد محمود سے زمانہ شاہجہاں تک ملک الشعرا دربار کا ایک باضابطہ رکن نظر آتا ہو۔ فرمانروا کا اثر شعرا کے دماغ پر کیا پڑتا تھا اُس کو دیکھنا چاہتے ہو تو فیضی، طالب آملی، کلیم ہمدانی کو دیکھو۔ اکبر کی جامعیت، جہانگیر کی رنگینی، شاہجہاں کے زہد کا جلوہ ان کے کلام میں دیکھ کر تم پہچان لوگے کہ کون کس کے دربار کا ملک الشعرا تھا۔

اُردو شاعری کو مُربی نہ دلی میں ملا نہ لکھنؤ میں۔ دربارِ دہلی میں سخنوری تھی حوصلہ پیدا کرنے کا سامان نہ تھا۔ دربار لکھنؤ میں دولت تھی دماغِ سخن نہ تھا۔ کمالِ سلطنت کے زمانے میں شاعرِ کامل فن (شیخ ناسخ) دشتِ غربت کی خاک چھانتا پھرا۔ البتہ دونوں جگہ کی سوسائٹی میں جان تھی۔ جو کچھ ہوا اسی کی

برکت ہے۔ دربار باندہ اور رامپور میں بھی کچھ جھلک دکھا گئے۔ لیکن تربیتِ فن کچھ اور ہی اسباب چاہتی ہے۔
حیدرآباد (خدا اُس کو آباد رکھے) غالباً اس غرض کے واسطے موضوع نہیں ہوا۔

قصہ مختصر اسباب جو کچھ ہوں غزل اُردو میں خیال بہت ہی محدود اور کمزور ہے اور اُس کو وسعت
اور ترقی دینے کی اشد ضرورت ہے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ جو غزل اُردو کہے وہ پریشاں روزگار، خمیدہ کمر،
دیوانہ، افسردہ دل، زندگی سے بیزار، ہجراں نصیب ہی ہو۔ یہ کیا فرض ہے کہ جس پر اُردو شاعر فریفتہ ہو
وہ زمانے بھر کا عیار، ازلی ظالم، بیوفا، ہرجائی، غرض صفاتِ مذمومہ کا مجموعہ ہو۔ کیا سخن سرائی زلف
کے پیچ و خم اور دہن کے عدم میں ایسی گم ہو گئی کہ اب اُس کو وہاں سے نکلنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ اگر
ہجراں میں لذتِ درد ہے تو کیا وصل میں لطف و نشاط نہیں۔ پھر کیوں اُس کو برباد ہی رکھا۔ کیا لازم ہے
کہ جب صبح ہو تو قیامت ہی آئے۔ کیا وہ صبح عالم امکان میں نہیں جو سرورِ وصل سے سرشار دماغ پر جلوہ
گستر ہو۔ کیا واجب ہے کہ ہم وہی وہی ادائیں دیکھیں جو اُن آنکھوں کو نظر آئیں جو ایک سانس میں بارہ سَو
سے زائد ڈنڑ پیلتے تھے۔ کیا شیخ جی کی پگڑی اُتار کر دھول جمانے کے سوا اور کوئی دل لگی دنیا میں نہیں ہے
جو ہم بھی طبیعت کو خوش کرنے کے واسطے شیخ ہی جی کی تلاش کرتے پھریں۔

خلاصہ کلام۔ خیال کو تقلید کے دائرہ تنگ سے نکالنا چاہئے۔ جو جس عالم کا جلوہ دیکھے اُسی کا جلوہ دکھائے
ہاں۔ آزادیِ خیال کے یہ معنی نہیں کہ گھوڑے کی لگام اُتار کر اُس کو چھوڑ دو کہ باولوں کی طرح بھاگتا پھرے
بلکہ یہ مطلب ہے کہ جس طرح استاد چابک سوار کی تعلیم کے بعد گھوڑے اپنی اپنی رفتار کے جوہر دکھاتے
ہیں اسی طرح تربیت آشنا اور با مذاق خیالوں کو اپنا اپنا رنگ دکھانے کی اجازت دو۔ یہ اصرار
مت کرو کہ بڑے میاں سر ہلاتے ہوئے قدم قدم گھوڑے کو لے گئے تھے لہٰذا ہم بھی اُسی ہیئت کذائی
سے اُسی راستے پر انھیں کے نقشِ قدم پر چلائیں گے۔ روشِ رفتار سیکھو اُن سے چلو اُن میدانوں میں
جو تمہاری نگاہ کے سامنے ہیں۔ "پائے مرا لنگ نیست ملکِ خدا تنگ نیست"

شعرائے فارسی کو جو موقعے وسعتِ خیال کے ملتے گئے اُن سے وہ خوش اسلوبی کے ساتھ نفع
اٹھاتے رہے۔ عہدِ غزنوی و سلجوقی کی معرکہ آرائیوں کی یادگار تیغِ چشم۔ کمانِ ابرو۔ تیرِ نظر۔ ترکِ چشم فارس

کی دلفریبوں کی بہار، گلزار کے تلازمے، مینا کے لوازمے، آتشکدوں کے پرکالے، ترسا زادہ، مغبچہ، ہندوستان کا خراج، بت کدہ، بیت و صنم، برہمن، سومنات، زنار، برشگال، ستی، ہندو۔ خیال شاعری کی قوت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک دو ہاتھ کا ڈورا (زنار) کیسے کیسے دلکش و دلفریب تماشے دکھلا گیا۔

جب یہ حالت اساتذۂ فارسی کی رہی تو کیا وجہ کہ ہم اس عمدہ صفت میں اُن کی پیروی نہ کریں۔ جو میدان مغربی روشنی نے ہم کو دکھائے ہیں کیا وجہ ہے کہ اُن کے گل بوٹے سے ہم کاشانہ ادب کو آراستہ نہ کریں جب کہ باغوں میں صدہا پھول دلربا یانہ انداز دکھلا رہے ہیں تو کیا سبب کہ ہم دامن خیال میں گل و یاسمن اور لالے کے سوا اور کوئی پھول چن کر نہ رکھیں۔ گلاب جب ایک ہزار رنگ میں جلوہ فرما ہے تو ہم کیوں صرف گل سرخ کے بلبل بنے رہیں۔

اس امر کی بھی ضرورت ہے کہ ہمارے غزل گو بھاکھا کے لٹریچر سے واقفیت حاصل کریں اور اُس کے مضامین لطیف کو سلیقہ اور تمیز کے ساتھ اُردو میں لائیں۔ بھاکھا میں محبت کے بعض مضامین ایسے لطیف اور پاکیزہ ہیں کہ ذوق سلیم کو آئینہ حیرت بنا دیتے ہیں۔ تصوف کی روح اُردو غزل میں پھونکنی چاہیئے۔ جو دل و دماغ اس بادۂ مرد افگن سے سرشار نہ ہوں وہ خواجہ میر درد، شاہ نیاز احمد صاحب اور شاہ تراب علی صاحب کے دیوان دیکھ کر جوش بیان و خیال کا سبق سیکھ سکتے ہیں۔ لیکن یہ یاد رہے کہ توکل و قناعت وغیرہ کے وہ مضامین جو قال میں آکر آدمی کو نکما کر دیتے ہیں اور اپاہج بنا دیتے ہیں ہرگز مسائل تصوف نہیں۔ اُن سے احتراز چاہیئے۔

ایسے مضامین اور الفاظ سے پرہیز لازم ہے جن سے امرد پرستی کا رنگ جھلکتا ہو۔ فارسی اور اردو غزل کا مکروہ وہ حصہ ہے جو مضامین امرد پرستی کا جلوہ دکھلاتا ہے۔ رقابت کا مفہوم بھی جہاں تک ممکن ہو کم کرنا چاہیئے۔ اس کی لے اس قدر بڑھ گئی ہے کہ بے حمیتی کے درجے تک پہنچ گئی ہے۔ ایک اور حصہ ہے جو قابل حذف ہے یعنی شکایت زمانہ، آسمان کو گالیاں دینا، اپنی حالت کو یاس کے مرتبے میں خوار و خستہ ظاہر کرنا۔ یہ مضامین جوہر مردانگی کو مٹاتے اور دلوں میں افسردگی پیدا کرتے ہیں۔ اور

اس زمانے میں (جب کہ دلوں کو ابھارنے اور اُن میں اُمنگ پیدا کرنے کی شدید ضرورت ہی) بالخصوص ان مضامین کو یک قلم قلمزد کر دینا واجب ہی۔ وہ مضامین بھی جن سے انبیا کی توہین اور معجزات کی تحقیر ہوتی ہی ضرور ترک کر دینے کے لائق ہیں۔ یہ مضامین دل میں سُو ادب اور بدزبانی کی خصلت پیدا کرتے ہیں۔ اور اس طرح انسان ایک عمدہ صفتِ ادب سے محروم ہو جاتا ہی۔

آخر میں یہ کہہ دینا ضرور ہی کہ زبان اور اصول نظم میں ہم کو اساتذۂ فن کی تقلید لازمی طور پر کرنی چاہیئے اور جو زحمت اس میں ہو اُس سے بچنے کے لئے فضول حیلے نہیں تراشنے چاہئیں۔ انتخاب مضامین اور ان کو ادا کرنے میں ذوقِ سلیم اور خوش اسلوبی سے کام لینا چاہیئے۔ یہ نہ ہو کہ خس و خاشاک کا انبار چمنستانِ غزل میں کر دیں، اور اُس کی مزخرف صورت دیکھ دیکھ کر محض اس خیال سے خوش ہوں کہ ایک نئی شکل نکل آئی۔ فقط

(رسالہ اردوئے معلی کانپور
جلد ۳ نمبر ۲۔ ماہ اگست ۱۹۰۴ء)

رپڑی ضلع مین پوری

شکوہ آباد ضلع مین پوری کی تحصیل میں جمنا کا کنارہ خوبی منظر اور حسن سواد کے اعتبار سے نظر فریب عالم رکھتا ہی۔ لطف شکار اُس کی دلچسپیوں کو دوبالا کر رہا ہی۔ اُس شعر کا لطف نہیں بھولتا، جو وہاں سے ایک عزیز نے دعوت شکار کے عنوان پر لکھ بھیجا تھا ؎

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف
بامید آنکہ روزے بشکار خواہی آمد

عرصے کا انتظار اور متعدد و عدون کا ٹلنا دوسرا مصرع کس خوبی سے ادا کر رہا ہی۔ صدہا برس سے بارش کا پانی کنارۂ مذکور کی چھاتی پر آرے چلا رہا ہی جن کے اثر سے ہزاروں چاک اُس کے سینے پر نظر آتے

ہیں۔ اس طرح جو نشیب و فراز پیدا ہوا ہی اُس نے کناروں کو پہاڑوں کا نمونہ بنا رکھا ہی۔ ان کھڈوں میں چکارہ ہرن کا چڑھنا اُترنا وادیوں میں دلآویز رفتار سے دوڑنا نظم کی جیتی جاگتی تصویر ہی۔ گزشتہ سرما کے چند روز میں نے اس میدان کے شکار میں صرف کئے۔ ایک روز چکارہ اور لومڑی کی تلاش صحرا نوردی و بادیہ پیمائی میں مشغول کئے ہوئے تھی کہ ایک ایسا منظر نظر کے سامنے آگیا جو اپنی نوعیت میں گرد و پیش کے عالم سے بالکل ممتاز تھا یعنی رفیع الشان عمارت کے کھنڈر دور سے نظر آنے لگے۔ نگاہ کے ساتھ دل اُن کی طرف متوجہ ہوا اور توجہ نے استفسار حال کیا۔ معلوم ہوا کہ قصبہ ریڑی ہی۔ یہ سن کر شکار کے خیالات دماغ سے جدا ہونے لگے اور اُن کی جگہ شوق آثار قدیمہ لینے لگا۔ موقع پر پہونچکر ایک وسیع قبرستان ملا جس میں صدہا سنگین اور پختہ قبریں بنی ہوئی تھیں، شہر خاموشاں کا سکوت اور وقار ہمیشہ دلوں پر اثر کرتا ہی۔ لیکن ان کے سکوت کی تاثیر گرد و نواح کے سناٹے کے ساتھ مل کر بہت زیادہ قوی ہوگئی تھی۔ قیامت یہ کہ اُن کی خاموشی صدائے صبر آزمائی دے رہی تھی۔ قبروں کی حالت، سنگ مزار کی صفائی و موزونی کہتی تھی کہ ہم ذی مرتبہ لوگوں کی آرام گاہ ہیں۔ مگر گمناموں کے نام پوچھو تو خاموش۔ بیسیوں قبریں دیکھیں، کتبہ اور کتابہ نام کو نہ ملا۔ آخر نگاہ شوق اُس احاطے کی طرف بڑھی جو وسط گورستان میں بنا ہوا ہی اور جس کے اندر کے گنبد گویا صلائے زیارت دے رہے تھے۔ شوق اس خیال سے بیچین ہوا کہ اس میں ضرور بے نشانوں کا نام و نشان ملے گا۔ وہاں پہنچکر دیکھا کہ ایک وسیع احاطہ قبروں سے معمور ہی غربی حصے میں دو سنگین روضے بنے ہوئے ہیں۔ ان کی جالیاں سنگ سرخ کی ہیں اور گنبد گچ کے گنبدوں کا بھاری پن اُس طرز عمارت سے ملتا ہوا ہی جو عہد مغلیہ سے پیشتر مسلمانوں میں رائج تھی۔ جالیوں کے نفیس جال اور بیل بوٹے سنگ تراشی کے عمدہ نمونے ہیں، ہر ایک گنبد کے نیچے دو یا تین پختہ قبریں ہیں۔ شرقی روضے کی پشت پر جنوب کی جانب پختہ فرش پر قبریں ہیں۔ منجملہ اُن کے ایک قبر کا اعتقاد سب سے زیادہ دلوں کو گرویدہ کئے ہوئے ہے ناکامی یہی بن گئی جب یہاں بھی لب گور پر مُہر سکوت دیکھی، یعنی با ایں ہمہ اہتمام لوح مزار نقش مدعا سے سادہ تھے فاتحہ پڑھی اور مایوس باہر نکل آیا۔ نکلتے نکلتے ایک پختہ دیوار نظر آئی، جاکر دیکھا تو عیدگاہ کا قبلہ رُخ

پردہ تھا۔ اُس وقت کی مسرت بیان کے امکان سے باہر ہی جب اُس دیوار پر بڑا سا سنگین کتبہ نظر آیا۔ خط کی گنجلکی اب بھی شوق کی سدِ راہ تھی۔ آخر اینٹوں کے ایک انبار پر چڑھ کر شنکاریا رٹی نے پڑھنا شروع کیا۔ کسی لفظ کو کوئی نکالتا تھا اور کسی لفظ کو کوئی۔ جب کوئی مشتبہ لفظ صاف ہوتا تو ایک نعرۂ مسرت بلند کیا جاتا، بالآخر سارا کتبہ پڑھ لیا گیا کوشش کا پھل ذیل کی عبارت ہی:

"بناے این بقعہ شریف بتوفیق یزدانی و تائید سبحانی و فضل ربانی در عہد خلافت سکندر الثانی علاء الدنیا و الدین المخصوص بعنایت اللہ رب العٰلمین ابو المظفر محمد شاہ السلطان ناصر امیر المومنین و نوبت ایالت بندہ کمینہ خداے گانی کافور سلطانی یقبل منہم و احسن اللہ جزائہم فی المنتصف من شہر المبارک رمضان عظم اللہ حرمتہ سنۃ احدی عشر و سبعمائتہ (۷۱۱ھ)"

اس عبارت سے واضح ہوگا کہ چھ سو گیارہ برس ہوے سلطان علاء الدین خلجی کے عہد میں اُس کے سربرآوردہ امیر ملک کافور (فاتح دکن) نے یہ عیدگاہ بنوائی تھی سارا حصہ فنا ہو گیا، یہ دیوار قائم ہی بارش کے ہزاروں حملے اُس پر ہوئے ہیں، تاہم وہ قدم جمائے میدان میں کھڑی ہی پلاستر اکثر جگہ سے اُکھڑ گیا ہی۔ مگر کسی اینٹ نے اپنے موقعہ سے جنبش نہیں کی گردن پر نیلی چینی کی تختیاں لگی ہیں، اُن کے نیلے رنگ کی آب و تاب صاف کہہ رہی ہی کہ کاریگر نے ابھی ہاتھ اٹھایا ہی۔ عیدگاہ نے تو دل خوش کیا لیکن روضوں میں آرام کرنے والوں کے حال پر سے پردہ نہ اُٹھا۔ ریڑی والوں سے پوچھا تو جوش خوش اعتقادی بہت کچھ ظاہر کیا، لیکن حال اس سے زیادہ نہ کہہ سکے کہ پختہ فرش والی قبر فتا شاہ کی ہی۔ باقی رہا یہ امر کہ وہ بزرگ کون تھے، کب تھے، کس سلسلے کے تھے، یہ کچھ نہ کھلا۔ یہاں سے چلے آنے پر بھی تلاش کی خلش دل میں رہی کتابیں دیکھیں واقف کاروں کو خط لکھے ٹھیک پتہ نہ چلا جو پندرہ یا بندرہ یا پانچ مہینے کی تلاش کے بعد ایک بزرگ سید علیم الدین صاحب امام آستانہ سلطان نظام الدین اولیا دہلی کی توجہ سے حال معلوم ہوا اور جیسا دل چاہتا تھا ویسا ہی معلوم ہوا۔

جن بزرگواروں کے وہ مزار ہیں اُن کا اصل مسکن برناوہ ضلع میرٹھ تھا۔ وہاں کے ایک بزرگ علاؤ الدین چشتی نے اگلے زمانے میں "چشتیہ بہشتیہ" ایک کتاب لکھی ہی۔ اس میں ریڑی کے مزاروں کا

حال بھی درج ہی اُس کی عبارت فارسی کا خلاصہ متعلق مقام یہ ہی:

مخدوم شیخ بدرالدین صاحب ولایت حضرت ابو ایوب انصاری کی اولاد میں ہیں جو جلیل القدر صحابی تھے۔ یہ حضرت نصیر الدین چراغ دہلی کے خلیفہ تھے، سو برس سے زیادہ عمر پا کر ۸۰۴ھ ہجری میں رحلت کی۔ ان کا مزار برناوہ کے متصل ہینڈن ندی کے کنارے پر ہی۔ اُن کے صاحبزادہ نصیر الدین بزرگ تھے۔ یہ اپنے والد کے خلیفہ اور مرید ہیں۔ ۱۱ ذی الحجہ روز یکشنبہ کو ۸۴۹ھ ہجری میں ان کا انتقال ہوا۔ شیخپورہ (راپڑی) کے مزار میں ان کی قبر بڑے سنگ سرخ کے گنبد کے نیچے ہے۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ علاء الدین عرف بدہن وفات ۲۰ شوال ۸۷۶ھ ہجری روز دوشنبہ۔ ان کی قبر اپنے والد کی قبر کے متصل سنگ سرخ کے گنبد کے نیچے ہے۔ دوسرے شیخ فرالدین عرف شیخ فدو۔ وفات ۱۴ شوال ۸۳۵ھ ہجری۔ ان کی قبر احاطے کی شمالی دیوار کے متصل اپنے والد کے مزار کے پس پشت واقع ہی۔ ان کا آستانہ زیادہ مشہور ہی۔

بزرگان بالا کے علاوہ شیخ زکی الدین، قاضی عبد الملک (جو قاضیان برناوہ کے جدّ اعلیٰ ہیں) خواجہ ابو اعلیٰ وغیرہ بزرگوں کی قبریں بھی اس احاطے میں ہیں۔ دونوں گنبدوں کے بیچ میں مخدومہ جہاں بنت شیخ ابو الاعلیٰ کی قبر ہی۔ انتہیٰ خلاصہ چشتیہ بہشتیہ۔

شیخ فدو علیہ الرحمۃ کی قبر کا جو نشان مذکور ہوا اُس سے معلوم ہوتا ہی کہ شرقی گنبد شیخ نصیر الدین کے مزار کا ہی، اور غربی اُن کے صاحبزادہ شیخ علاء الدین کے مزار کا۔ قصبہ سے مغربی جانب ایک شکستہ وسیع مسجد ہی جو کسی زمانے میں جامع مسجد تھی، اس کی چھت اور محرابیں شکستگی کی نذر ہو چکی ہیں۔ مگر کتبہ کے ٹکڑے مسجد کے ایک گوشہ میں رکھے ہیں، ان کی عبارت باوجود سعی پوری نہیں پڑھی گئی۔ جو کچھ پڑھی گئی اُس سے مفہوم ہوا کہ سلطان محمد شاہ غازی کے زمانے میں یہاں ہندوؤں سے سخت معرکہ پڑا تھا (اس معرکے نے غالباً مذکورۂ بالا گورستان کی آبادی میں معتدبہ حصہ لیا ہوگا) شکرانۂ فتح میں میں بت خانہ توڑ کر اُس کی جگہ یہ مسجد بنائی گئی۔ فاتح کا نام نظام الملک لکھا ہی۔ مسجد کی عبارت میں بتخانہ کے پتھر جابجا نظر آتے ہیں۔ قصبہ ریڑی کا ذکر (بنام رایری) ابن بطوطہ نے سفرنامے کی جلد

دوم میں اور ابوالفضل نے آئین اکبری میں (بضمن صوبۂ آگرہ) کیا ہے۔

آج یہ قصبہ ویران اور تباہ ہے۔ تاہم سادات، شیوخ اور پٹھانوں کے خاندان اس میں آباد ہیں اور جہاں تک سنا گیا انھوں نے اپنے نسب کو محفوظ رکھا ہے ایک شخص کی زبانی یہ سنکر دل کو خاص مسرت ہوئی کہ وہ شروانی پٹھان تھا۔ اس سے بھی زیادہ خوشخبری یہ تھی کہ ہمارا کالج اپنا فیض اس ویرانہ کو بھی پہونچا رہا ہے۔ تعلیمی حالت دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہاں کا ایک لڑکا کالج میں پڑھتا ہے۔ دیوبند کی برکت بھی پیچھے نہیں رہی۔ وہاں کے ایک صاحب مدرسۂ مذکور میں فارغ التحصیل ہوئے ہیں افسوس ہے کہ وہ اس زمانے میں باہر تھے ورنہ نیاز حاصل کرتا۔

(رسالہ علی گڑھ منتھلی۔ ماہ جولائی سنہ ۱۹۰۴ء)

دیباچۂ غرّۃ الکمال امیر خسرو

(ریویو)

یہ امر مسلم ہے کہ خسرو اقلیم سخن امیر خسرو کا خزانہ کلام شمار سے باہر تھا۔ نسل تیموریہ کے ایک فرمانروا کے کتاب خانے میں امیر ممدوح کے لاکھ سے زیادہ شعر موجود تھے۔ جب نئے کلام کی آمد موقوف ہو گئی تو اس کو دعویٰ ہوا کہ اب اس سے زائد نہیں ہے۔ اگر ہے تو کوئی لائے اور انعام لے۔ انعام کے شوق میں لوگ تلاش کر کر کے نئے نئے مجموعے لاتے جو آیا یہاں موجود ملتا۔ جب دعویٰ فیصلہ پر تھا تو ایک ضخیم جلد آئی جو شاہی کتاب خانے میں نہ تھی۔ بادشاہ کو کلیۂ خسروی کے سامنے سر جھکانا پڑا اور اس نے تسلیم کیا کہ امیر با کمال کا کلام حد شمار سے خارج ہے۔ داغستانی نے لکھا ہے کہ امیر خسرو کے تین دیوان ہیں۔ تحفۃ الصغر، وسط الحیوٰۃ، غرّۃ الکمال۔ لکھنؤ میں جو دیوان خسرو چھپا ہے اس کے دیباچے میں فرماتے ہیں "اب تک میرے چار دیوان ہو چکے ہیں تحفۃ الصغر، وسط الحیوٰۃ، غرّۃ الکمال، بقیۂ نقیہ

یہ مجموعہ انھیں عناصر سے صورت پذیر ہوا ہی۔ اس کے بعد جو کلام موزوں ہوگا وہ پانچواں دیوان ہوگا"

خاکسار کو ایک قلمی مجموعہ ملا ہی جس کا نام "نہایۃ الکمال" ہی جس میں دیباچہ، قصائد، غزل وغیرہ سب کچھ ہی۔ ممکن ہی کہ یہ پانچواں دیوان ہو۔ دیباچہ میں اس کا ذکر نہیں کہ کون سا دیوان ہی۔ اس کے سوا میرے یہاں ایک اور ضخیم قلمی نسخہ ہی۔ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ مستقل مجموعہ ہی یا عطر مجموعہ۔ لکھنوی نسخہ کی بعض غزلیں اس میں ہیں (جو مختلف دیوانوں کی ہیں) لیکن اس کی بیسیوں غزلیں اس میں نہیں[1]۔

تحفۃ الصغر ہاتھ آیا تو اُس کے دیباچہ کا خلاصہ ناظرینِ مخزن کی نذر کیا گیا۔ اب خوبیِ قسمت سے غرۃ الکمال کا دیباچہ دستیاب ہوا ہی۔ شوق کہتا ہی کہ اس کے جواہرات بھی مخزن کو بھیج، اگرچہ جوہری سات سمندر پار علم کے موتی رولنے چلا گیا لیکن جواہر خانے کا دروازہ کھلا ہوا ہی ؎

ہنوز آں ابر رحمت دُر فشاں ست
خم و خمخانہ با مُہر و نشاں ست

خدا اس خزانہ کو معمور رکھے۔ غریب الوطن دوست کی فشانی ہی۔ دیباچۂ غرۃ الکمال کے نو صفحے ہیں۔ عبارت اوّل سے آخر تک مرصع اور رنگین ہی۔ مگر دربارِ خسروی کا یہ آداب ہی کہ مرصع اور رنگین عبارت کا خلعت واقعات کو عطا ہوتا ہی۔ کارچوبی پوشاک خیالی پیکر کو نہیں پہنائی جاتی۔ حمد کے بعد نعت ہی۔ نعت کے بعد پیر کی مدح۔ پھر سلسلۂ سخن یوں آغاز فرماتے ہیں کہ "انسان کا سرمایۂ ناز نطق ہی، اور نطق قدرتِ الٰہی کا برگزیدہ نمونہ"۔ اسی سلسلے میں لکھتے ہیں کہ "دیکھو بہرا اور گونگا چونکہ فیضِ سخن سے محروم ہی لہذا کسی بزم میں توقیر نہیں پاتا۔ طوطی اور شارک (مینا) حال آں کہ جانور ہیں مگر انسانی کلام کی نقالی کی بدولت وہ قدر پاتے ہیں کہ انسان کی خوش بیانی کی مثال اُن سے دی جاتی ہے"۔ نمونۂ عبارت ملاحظہ کیجئے:۔

"طوطی[2] کہ حیوانِ غیر ناطق است بسببِ نطقِ عاریتی درجۂ یافتہ است کہ اربابِ الباب جملہ

---

[1] بقیہ نقیہ ثابت ہوا۔ [2] ترجمہ۔ طوطی جو ایک حیوانِ غیر ناطق ہی اُس کا درجہ عارضی گویائی کی وجہ سے اتنا بلند ہی کہ سارے عقلا، فاضلوں اور فصیحوں کی گویائی کو اُس کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں، اور اُس کا پنجرا سرداروں کے یہاں (باقی نوٹ برصفحہ آئندہ)

فصحائے عالم و فضلائے عالم را نسبت سخن بر و میکنند و مدام قفس عزت او را دہ بالیں گاہ سراں و پائیں جائے سروراں باآئین کنت مکانے بلند از زبانی میدارند - و در سواد ہندوستان کہ خیال بہشت در آئینہ جلئے پر طاؤسانِ او بتواں دید - مرغیست کہ آنرا شارک میگویند و در خراسان سارہ میخوانند - و ایں خبر سائر در طوطیانِ جہاں طیراں نمودہ کہ زبان آموزاں ماہر چہرہ ہائش چناں باز میکنند کہ ....
بہ سخن شیریں شکر خواری می شود کہ پیش او بلبلاں را گاہ شکر خائی زبانِ شیریں در کام گرفتہ میگردد بلکہ سخن در دہاں .... باز ہم در ..... ہندوستان زنّار داراند ...... زبانِ ایشاں بر بیان منطق الطیر در افواہ اُفتادہ - چنانچہ در معرفت بانگ زاغ کتابہا ساختند و چیزے از مغیبات ازاں سواد میتوانند کہ بخوانند و از تیزی زبانِ کنجشک بالقطع فالے می گیرند و می گویند کہ بیشتر موافق و مقابل می افتد و بعضے مردمانِ ناقصِ عقل کہ از مرتبہ عاقلی غافل اند ایشاں را بجہتہ بیان منطق مرغے کہ میگوید و نمیداند کہ چہ میگوید شب و روز پرستش و پرستش میکنند و ہر روایتے کہ آں بیخبراں ازیں علم می آرند آں جمع غیر سلامت وجوہ نحو آں میکنند و بہ تعلم و تلمذ بہ پذیرند"

آگے یہ کہہ کر کہ انسان کیسا سادہ لوح ہی کہ باوجود نطق اصلی کے نقلی گویائی پر فریفتہ ہو جاتا ہے فرماتے ہیں

قطعہ

گر بود بہتر زگفت آدمی گفتِ دگر ۔۔۔ کے خدائے پاک مردم را خطابِ قُل کُند

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) سر بلند ہی - ملک ہندوستان میں جس کے طاؤس کے پر بہشت کا جلوہ دکھاتے ہیں ایک پرند ہی جس کو شارک (مینا) کہتے ہیں اور خراسان میں اُس کا نام سارہ ہی - یہ امر تمام دنیا میں مشہور ہی کہ ماہر لوگ اُس کو ایسی اچھی طرح بولنا سکھاتے ہیں کہ بلبل اُس کے سامنے بولنا بھول جاتا ہی -

ہندوستان میں ایک گروہ ہی جس کی نسبت یہ مشہور ہی کہ وہ پرندوں کی بولی سمجھتا ہی - چنانچہ اُس نے کوّے کی آواز پر کتابیں لکھ ڈالی ہیں جن سے وہ غیب کا حال بیان کرنے کا دعویٰ کرتا ہی - چڑیا کی آواز سے شگون لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اکثر ٹھیک اور صحیح ہوتا ہی - اور بعض بے عقل کہ جو اپنے مرتبہ سے ناواقف ہیں اُن کو جانوروں کی بولی سمجھنے والا سمجھ کر رات دن اُن کی پرستش اور پرستش میں مصروف ہیں حالانکہ جن جانوروں کی وہ بولی ہی اُس کو وہ جانور خود نہیں سمجھتے کہ وہ کیا کہتے ہیں اور جو کچھ وہ نافہم بک دیتے ہیں یہ بے عقل اُس کی تاویل گڑھتے ہیں اور اُن کی شاگردی اختیار کرتے ہیں -

نیک نشناسد چو مردم قیمت گفتار خویش — فالِ میموں گیرد از پرّنده و غلغل کند
ناسپاسی میکند شاعر کہ با گفتِ چناں — ہر زماں وصفِ بیانِ قمری و بلبل کند
آدمے آسے شناہا چنداں خورشی ہرکہ خورد — خوبرو با آں چناں رخسارہ میلِ گل کند
نعمتِ کلّیست نطق و گر بداند قدر آں — جزو نیز و بندہ شکرِ نعمتِ آں کل کند

فضیلتِ نطق ثابت کرکے اُس کی دو قسمیں کی ہیں۔ نظم و نثر۔ نثر پر نظم کی ترجیح کے جو دلائل لکھے ہیں اُن میں ایک یہ بھی ہی کہ موسیقی سا فنِ لطیف نظم کا محتاج ہی۔ نظم نہ ہو تو ترنّم کے نغمے بھی بے لطف ہیں۔ کلیات میں یہ مضمون کیسے پاکیزہ پیرائے میں ادا کرتے ہیں ؎ قطعہ

مطربے می گفت خسرو را کہ اے گنجِ سخن — علمِ موسیقی زجنسِ نظم نیکو تر بود
زانکہ ایں علمیست کز دقت نیاید در قلم — واں نہ دشوار است کاندر کاغذ و دفتر بود
پاسخش گفتم کہ من در ہر دو معنی کاملم — ہر دو را سنجیدہ بر وزنے کہ آں بہتر بود
فرق من گویم میانِ ہر دو معقول و درست — تا دہد انصاف کاں از ہر دو دانش ور بود
نظم را علمے تصور کن بہ نفسِ خود تمام — کو نہ محتاجِ سماع و صوتِ خنیاگر بود
گر کسے بے زیر و بم نظم فرو خواند رواست — نے بہ معنی ہیچ نقصاں، نے بہ لفظ اندر بود
ور کند مطرب بسے ہاں ہاں و ہوں ہوں در گرد — چوں سخن نبود ہمہ معنی او ابتر بود
نائے زن را ہیں کہ صوتے دارد و گفتار نے — لاجرم در قول محتاجِ کسے دیگر بود
پس دریں صورت ضرورت صاحبِ صوت و سماع — از برائے شعر محتاجِ سخن پرور بود
نظم را حاصل۔ عروسے داں و نغمہ زیورش — نیست عیبے گر عروسِ خوب بے زیور بود

سلسلۂ بالا میں متقدمین شعرا میں مولانا رضی الدین نیشاپوری اور مولانا ظہیر الدین فاریابی کے علم و فضل کی مدح کرتے ہیں اور متاخرین میں مولانا شہاب الدین مہمرہ اور مولانا بہاء الدین بخاری کی۔ اس بحث کو ختم کرکے نظم فارسی کا نظم عربی سے موازنہ کیا ہی۔ یہ تسلیم ہی کہ عربی اپنی خوبیوں میں پارسی پر فائق ہی۔ لیکن نظم پارسی نظم عربی سے بہتر ہی اور اس کی تین دلیلیں ہیں: (اول) شعر کی جان وزن ہی۔

اور اشعارِ فارسی کا وزن عربی نظم کے وزن سے زیادہ لطیف اور کامل ہے۔ کیونکہ جو زحف عربی شعروں
کے وزن میں جائز ہے وہ اگر فارسی شعر میں لے آئیں تو ناموزوں ہو جائے۔ فارسی نظم ایک حرف بلکہ
ایک حرکت کے تغیر سے غیر موزوں ہو جاتی ہے۔ عربی نظم میں حرف بلکہ لفظ کا تغیر بھی کھپ جاتا ہے۔ جو
خوبی وزنِ فارسی میں ہے عربی کیا عبری وغیرہ میں بھی نہیں۔ واقف کار جانتے ہیں (دوسری دلیل) عربی
زبان اپنی وسعت کے لحاظ سے بے پایاں ہے، ایک معنی کے لئے ہزار لفظ اور ایک لفظ کے لئے دس معنی جس کے قبضہ میں
یہ خزانہ ہو وہ کسی موقع پر تنگ دست نہیں ہو سکتا۔ فارسی میں برعکس ہے۔ یہاں ایک لفظ کے ایک سے زائد
معنی بہت کم ہیں۔ انصاف سے دیکھئے پارسیوں کو کس قدر دشواری نظم میں مطلب ادا کرنے میں ہے اور
عربی دانوں کو کس قدر آسانی ہے (تیسری دلیل) ہم عرب عربا (خالص عرب) کے کلام سے بحث کرتے
ہیں۔ وہاں قافیہ ہی قافیہ ہے۔ اگرچہ اہلِ فارس نے عربی نظم میں ردیف کو داخل کیا ہے لیکن اُن کا کلام
ٹکسالی نہیں۔ فارسی میں قافیہ کے ساتھ ردیف بھی ہے۔ اور ردیف نظم کے لئے سرمایۂ آرائش و زیبائش
ہے۔ خلاصہ یہ کہ عربی شعر میں کیا باعتبار وزن اور کیا بلحاظ وسعتِ زبان و ترکِ ردیف ہر طرح آسانی
ہے۔ بایں ہمہ خوبیِ معنی کے لحاظ سے فارسی شاعری عربی شاعری سے بالاتر ہے۔ اس وقت پر یہ اعتراض
نہیں کرنا چاہئے کہ شعرِ عربی کا رتبہ اس لئے بلند ہے کہ اُنہیں سے کلامِ ربانی کی تائید ہوتی ہے اور نہ یہ
کہ خود کلامِ ربانی اسی زبان میں نازل ہوا ہے۔ کیونکہ میں خود یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ہمارا کلام اس مقام
میں بمقابلہ عربی محض پوچ اور ہیچ ہے ؎

دراں مقام کہ از شرعِ مصطفیٰؐ گوئیم
نعوذ باللہ کہ از شاعری سخن رانم

لیکن یہ موقع شرعی بحث کا نہیں۔ اربابِ معنی کو مضامینِ خاقانی کی بلندی، کلامِ انوری کی روانی،
سیدِ حسن، نظامی و ظہیر کی نظم کا حسن پیشِ نظر رکھ کر انصاف فرمانا چاہئے۔ مقامِ دعویٰ سے مقامِ انصاف
میں آئیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ہم لطفِ زبانِ عربی کے قائل ہیں۔ وہ لطفِ نظمِ فارسی کے وزن کو مانیں۔
ایک لطیف کا مقابلہ دوسرے سے ہو گیا۔ ہمارے یہاں خیالات بدیع ہیں، ان کے یہاں تخیلات رفیع

یہ دونوں بھی برابر رہی۔ ہماری ردیف کے مقابلہ میں وہ کوئی خوبی نہیں نہیں کرسکتے۔ لہذا پارسی شعر کو فوقیت رہی۔ سلسلۂ کلام دراز ہوچکا۔ دیباچہ میں اس سے زیادہ گنجائش نہیں۔ لیکن ایک مضمون جو دل میں چبھ رہا ہے بے اختیار زبانِ قلم پر آتا ہے۔ یہ بات ثابت ہے کہ پارسیوں کو شاعرانہ طبیعت کے لحاظ سے عربوں پر ترجیح ہے۔ اگر عرب کا شاعر کامل و فصیح ملک فارس میں جائے تو ممکن نہیں کہ وہ زبان پارسی میں بات چیت بھی صحیح اور درست طور پر کرسکے۔ معانی اہل فارس کا استنباط کرنا یا پارسی نظم و انشا پر قادر ہونا تو دوسری بات ہے۔ اس کے برخلاف پارسی کا شاعر اپنے ملک میں عربی ادب و فضل حاصل کرکے شعر عربی کہہ سکتا ہے۔ بلکہ عربی الفاظ کو معانی پارسی سے ربط دے کر ایسا عمدہ مجموعہ تیار کرسکتا ہے کہ جو منصف مزاج دونوں فنوں سے واقف ہوگا وہ بے اختیار آحسنت کہہ اٹھے گا۔ اور اگر شاعر مذکور ملکِ عرب میں جا پہنچے تو وہاں کے فصحا کو اس کے علم و فضل کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ زمخشری[۱] خوارزم کا باشندہ تھا، عرب میں علامہ مشہور ہوا۔ سیبویہ[۲] جو مجمل چھوڑ گیا تھا اس نے مفصل کر دیا۔ ہندوستان کے باشندے طباعی میں تمام عالم سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ عرب، خراسانی، ترک، ہندو وغیرہ جو ہندوستان کے اسلامی شہروں میں (مثلاً دہلی، ملتان، لکھنؤ) نہ اُن شہروں میں جو ہندوؤں کے مرکز ہیں (مثل گجرات، مالوہ، دیوگیر) آگئے اور تمام عمر یہاں کی زبان سیکھنے ناممکن ہے کہ اُس کو صحیح اور درست بول سکے۔ اپنے ہی ملک کے انداز پر گفتگو کرے گا۔ عرب عربی پر قادر ہوتے ہیں۔ جب یہاں کی بولی بولتے ہیں بھرم کھل جاتا ہے۔ ہندو خواہ شہر کے باشندے ہوں خواہ گانو کے۔ دہلی میں آکر رہتے اور زبان پارسی سیکھتے ہیں لیکن ماہر ہرگز نہیں ہوتے۔ خراسانی، عراقی شیرازی، اور ترک کی جودتِ طبع زبان ہندی کے آگے سر جھکا دیتی ہے۔ اور وہ بیچارے ہر چند کوشش کرتے ہیں، لیکن جب بولتے ہیں منہ کی کھاتے ہیں۔ جو اہلِ قلم ہندوستان کے اسلامی شہروں (خصوصاً دہلی) میں نشو و نما پاتے ہیں وہ ہر ملک کی زبان بولتے اور اُس میں نظم و نثر لکھنے پر قادر ہوتے ہیں۔ جس دیس میں پہنچ جائیں اُسی کی روش پر چل سکتے ہیں۔ یہ بات تجربے سے ثابت ہوچکی ہے کہ ہم میں بہت سے ایسے

---

[۱] علامہ زمخشری۔ مصنف تفسیر کشاف و مفصل وغیرہ [۲] نحو کا امام مشہور ہوا جو اس فن کے موجدوں میں شمار ہے۔

ہیں جنھوں نے ملک عرب دیکھا بھی نہیں۔ تاہم زبانِ عرب کو اس فصاحت کے ساتھ حاصل کیا کہ بلغائے عرب اُن کے مرتبہ کو نہ پہنچ سکے۔ اور بہت سے تارک (مقابل ترک جیسے عجمی مقابل عربی) ایسے[1] دیکھے ہیں کہ انھوں نے زبانِ ترکی ہندوستان میں سیکھ کر وہ گویائی حاصل کی کہ اس گروہ کے فصحا ان کی زبان میں گرہ زنگ رہ گئے۔ زبان پارسی کی یہ کیفیت ہے کہ ہرچند وہ پارس سے یہاں آئی ہے لیکن سوائے ماوراءالنہر کے (جہاں کی پارسی ہندوستان کی پارسی کے مطابق ہے) کسی ملک کی پارسی کے الفاظ درست نہیں۔ خراسانی "چہ" کو "چی" اور بعضے "کجا" کو "کجو" کہتے ہیں کتاب میں۔ دیکھو "چہ" اور "کجا" لکھا جاتا ہے۔ اور الفاظ صحیح وہی ہیں جو کتابی ہوں۔ اُن کے یہاں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو اس کسوٹی پر کھوٹے ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ہندوستان کی فارسی دریائے سندھ کے کنارے سے سمندر کے کنارے تک یکساں اور دری (خالص اور ٹکسالی) فارسی[2] ہے۔ ہندوستان کی زبان[3] کا یہ حال ہے کہ ہر سو کوس پر اور بولی جاتی ہے۔ پارسی اس چار ہزار کی میل میں ایک ہی ہے۔ اور پھر اس خوبی کے ساتھ کہ گفتگو کتابی زبان کے موافق ہے (اس مقام پر دیباچہ کی عبارت مشکوک ہے) کی طرح نہیں ہے جو "کردہ" کو "کردہ کن" اور "کردہ ہیں" بولتے ہیں ... سیستانیوں کے مثل جو ہر لفظ کے آخر میں "ہیں" ضرور بڑھاتے ہیں۔ جیسے "گفتہ ہیں" اور "رفتہ ہیں" ولایت کے آنے والے علما و فصحا (عوام اوباش کا ذکر نہیں) دہلی کی فارسی کی مدح کرتے ہیں۔ اور اہل دہلی ان کی زبان پر ہنستے ہیں۔ یہاں کی زبان پر وہ گرفت نہیں کر سکتے اس لیے کہ یہاں کی زبان نرم شگفتہ (موزون) و لطیف و نظیف (پاک) و درست و فصیح ہے۔ لطف یہ ہے کہ ہم سب کی بولی بولتے ہیں ہماری بولی کوئی نہیں بول سکتا۔ جو ہماری زبان پر کلام کرے اُس پر میرا یہی دیباچہ حجت ہے۔

---

[1] امیر خسرو کی مادری زبان ترکی تھی۔ [2] آگے چل کر تم دیکھو گے کہ ملتان سے لے کر بنگالے کی انتہا تک امیر خسرو مختلف مقامات میں رہے تھے لہذا انھوں نے جو کچھ لکھا ہے کہ لکھا ہے سنی سنائی بات نہیں لکھ دی۔ ہندوستان پر مسلمانوں کے حملے اگرچہ عہد سلطان محمود سے (چوتھی صدی ہجری کے آخر میں) شروع ہو گئے تھے لیکن مستقل سلطنت قطب الدین ایبک نے آغاز صدی ہفتم میں قائم کی۔ امیر خسرو نے جس زمانہ میں دیباچہ لکھا ہے وہ ساتویں صدی کا آخری زمانہ تھا۔ یہ مسلمانوں کی سلطنت کا غایت اقتدار تھا کہ سو برس سے کم عرصہ میں ٹکسالی فارسی پنجاب سے انتہائے بنگالہ تک مادری زبان بن گئی۔

[3] معلوم ہوتا ہے کہ آج سے چھ سو برس پیشتر بھی ہندوستان میں کوئی عام زبان نہ تھی۔ اگر تھی تو فارسی تھی

گو بیا و ببیں و دم درکش
گر دگر گوں بود قلم درکش

اہل دہلی کی زبان کی خوبی جسے تسلیم نہ ہو اُس کو میرے سامنے لے آؤ تاکہ اُس کا دعویٰ سرِ تسلیم خم کر دے۔

اس سلسلے کے بعد لکھا ہے کہ شعر و سخن پر اس بنیاد پر اعتراض کرنا کہ اُس میں ہجو و ذم وغیرہ مذموم مضامین ہوتے ہیں بجا نہیں۔ اس لئے کہ قابل مذمت یہ مضامین ہیں، نہ نظم۔ کمال فن کی مدح سرائی میں سیف الدولہ و متنبی کا یہ لطیف لطیفہ درج کر گئے ہیں کہ مشہور ہے کہ سیف الدولہ متنبی کے سامنے شعرا کی فلاکت اور بے سر و سامانی پر طعن کر بیٹھتا تھا اور مال کی بحیثیت مربی کمال ہونے کے تعریف کیا کرتا تھا۔ ایک روز سیف الدولہ حمام میں تھا متنبی کو بھی بلا بھیجا۔ دونوں لنگی باندھے ہوئے تھے۔ خلوت تھی اور امیر کی طبیعت شگفتہ۔ زندہ دل شاعر کو فی البدیہ ایک مضمون سوجھا عرض کی جہاں پناہ! اس وقت آپ کی اور بندے کی یہ حالت ہے کہ سوائے ایک لنگی کے کچھ پاس نہیں متنبی تو اب بھی متنبی ہے۔ مگر حضور غور فرمائیں کہ کتنے پانی میں ہیں" سیف الدولہ متنبی کی سیف زبانی سے کٹ گیا اور بل کھا کر کہنے لگا۔ "أَنَسِيتَ قِرْبَتَكَ" یعنی کیا تو اپنی مشک بھول گیا؟ (متنبی کی نسبت مشہور ہے کہ سقا تھا) متنبی نے برجستہ کہا "أَنسَانِي قُرْبُكَ" یعنی آپ کے تقرب نے بھلا دی۔ جواب کی آب داری غصے کی جلتی آگ پر پانی کا کام کر گئی۔

شعرا کی تین قسمیں قایم کی ہیں: (اوّل) صاحب طرز خاص و جدید جیسے حکیم سنائی، انوری، ظہیر و نظامی۔ چوں کہ خاقانی، مجیر (بیلقانی) کا اور کمال اصفہانی رضی الدین نیشاپوری کا اور معزی مسعود سعد سلمان کا تتبع کرتے ہیں اس لئے اس قسم سے خارج ہیں۔ (دوم) جو متقدمین یا معاصرین میں سے کسی کی طرز کے پیرو ہوں۔ (سوم) جو پرائے مال کو تاکیں۔ اول استاد ہیں، دوسرے شاگرد، تیسرے غارت گر۔ جس باکمال میں چار شرطیں جمع ہوں وہ استاد مانا جائے گا۔ پہلی شرط یہ ہے کہ اُس کی طرز اوروں سے ممتاز ہو۔ دوسری یہ کہ اُس کے کلام کی عذوبت و سلاست شعرا کی طرز پر ہو نہ کہ واعظوں اور صوفیوں کے انداز پر۔ تیسری یہ کہ کلام خطا سے پاک ہو اور چوتھی یہ کہ ادھر اُدھر کے پیوندوں سے اپنا مرقع آراستہ نہ کرے (یعنی اوروں کے مضامین نہ اڑائے)۔

شاگرد تین طرح کے ہوتے ہیں۔ شاگرد اشارت[1] شاگرد عبارت[2] اور شاگرد غارت[3]۔ شاگرد اشارت

کی یہ صورت ہی کہ مبتدی کا شعر وزن سے گر جائے یا مضمون خبط ہو جائے تو اُستاد دانا اشارہ کر دے کہ اس کو یوں اور یوں باندھو (معلوم ہوا کہ اصلاح کی اتنی ہی حد ہی) یوں ہی اشاروں اشاروں میں مبتدی فن کی باریکیاں سمجھنے لگتا ہی۔ شاگرد عبارت وہ مبتدی ہی کہ اُستادوں کی پیروی کرے اور اُن کے کلام میں جو لفظ اور معنی دیکھے اُن کو اپنے کلام کا نمونہ قرار دے۔ شاگرد غارت وہ حریف ہیں جو خود کچھ کرنے کی ہمت نہیں رکھتے مگر مصنف بننے پر مرتے ہیں۔ یہ لوگ اُستادوں کے خزانہ سے مال نکال کر اپنے ویرانے میں رکھتے اور دوسروں کے قطرہائے خون کو اپنا جگر گوشہ بناتے ہیں۔ خدا ایسے سیلے شریوں کے شر سے بچائے۔ یہ نہ سمجھنا کہ اُستادی اور شاگردی کی بحث میں نے اس لئے اٹھائی ہو کہ مجھ کو اُستادی کا دعویٰ ہی۔ حاشا میں نے جو شرطیں اُستادی کی قرار دی ہیں اُن میں سے بعض مجھ میں موجود نہیں۔ وجہ یہ کہ میرے کلام کے بہت سے شعبے ہیں اور وہ اربعہ عناصر سے مرکب ہیں۔ وعظ اور حکمت یہ جو کچھ میں نے لکھا ہی اُس میں سنائی و خاقانی کی پیروی کی ہی اور یہ انداز بوجہ بلندی آگ سے مشابہ ہی جو عالم بالا کی طرف میل رکھتی ہی۔ تخلص (قصیدہ) اور خلاصۂ خیال میں طرز رضی و کمال اختیار کی ہی جو روانی اور صفائی میں پانی سے ملتی جلتی ہی۔ غزل اور مثنوی میں سعدی اور نظامی کے قدم بقدم ہوں۔ اس روش کو بلحاظ لطافت و شادابی ہوا سے مناسبت ہی۔ میرے کلام کا حصہ مقطعات رباعیات معما و لغز۔ خود میرے وجودِ خاکی کا غبار ہی جو اس لحاظ سے خاک ہی کہ اُس میں بہت سے جواہرات چھپے ہوئے ہیں۔ میری نثر بھی میری ہی طبیعت کا جوہر ہی اور نثر کے معاملے میں کسی کا ممنونِ احسان نہیں ہوں۔ خلاصۂ کلام یہ ہی کہ اُستادی کی چار شرطوں میں سے پہلی شرط یعنی صاحب طرز خاص ہونا مجھ میں موجود نہیں۔ میں خود کہہ چکا ہوں کہ میں نے بہت سے اساتذہ کا تتبع کیا ہی۔ دوسری شرط کہ کلام خطا اور قصور سے پاک ہو اس کا بھی مجھ کو دعویٰ نہیں۔ بندے کی نظم اگرچہ رواں ہی لیکن غزل اور لغز (جیسا کہ) میں جا بجا لغزشیں بھی ہیں۔ "نظم بندہ اگرچہ بیشتر رواں است اما جا بجا در غزل و لغز لغزید نی ہم ہست"۔ دونو مذکورۂ بالا شرطوں کی نسبت مجھ کو اقرار ہی کہ پایۂ استادی تک میری رسائی نہیں۔ رہی تیسری شرط یعنی کلام شاعرانہ ہو نہ واعظانہ و صوفیانہ۔ مجھ کو دعویٰ ہی کہ میرا کلام شاعرانہ ہی صوفیانہ اور نہ واعظانہ

نہیں ہے۔ چوتھی شرط کہ مرقع دوزدی نہ ہو، یہ بھی مجھ میں موجود ہے۔ میں نے آج تک دوسروں کے متاع نہیں تاکے۔ قصہ مختصر میں مالک طرز خاص نہیں۔ خطا سے میرا کلام پاک نہیں۔ میرا کلام اسلوب شعرا کے مطابق ہے۔ سرقہ میں نے نہیں کیا۔ بس استادی کی دو شرطیں مجھ میں ہیں، دو نہیں ہیں۔ میں نے اپنا محاکمہ خود کر دیا کہ سند استادی نصف میرے قبضہ میں ہے، نصف نہیں ہے۔ ع

ناتمام ناتمام ناتمام[لہ]

خلاصہ وجہ تالیف دیباچہ

ایک روز میں شب کو بیٹھا ہوا چمن سخن کی سیر کر رہا تھا۔ اپنے ہی کلام کا ایک گلدستہ (جو بہار جوانی کا شگوفہ ہے) ہاتھ میں تھا۔ ع

ربیعُ العمرِ اَیّامُ الشباب

یعنی جوانی بہار زندگانی ہے۔ کبھی اُس کے پھول پتے سے اپنا دل نہال کرتا اور کبھی اُس کو ترنم میں ادا کر کے بلبل کا دل شاد۔ غرض کبھی لکھتا کبھی پڑھتا۔ اسی عرصے میں برادرم علاء الدین شاہ کاتب (گویا اُسی کی شان میں حضرت علیؓ نے فرمایا تھا ”علیکم بحسن الخط فانّہ من مفاتیح الرزق“) خوشخطی سیکھو کہ روزی کی کنجی ہے) آ پہنچا۔ تھوڑی دیر تماشہ دیکھتا رہ کر پوچھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے حال کہا۔ سُن کر بولا کہ تمہارے تازہ کلام کا ایک انبار میرے پاس جمع ہے جو ہنوز غیر مرتب ہے۔ اول اُس کو مرتب کر دو پھر اور کلام کی فکر میں پڑنا۔ میں نے ٹالا لیکن اُس نے نہ مانا۔ باصرار کہا ”اول سواداتے کہ بر من است بیاض کن بعد ازاں منشآت پیشینہ کہ منسیات شدہ است بداں بپیوند۔ پس ضابطہ و رابطہ برآں بہند۔ بعد آں چنانچہ روے ”تحفۃ الصغر“ و ”وسط الحیوٰۃ“ را بہ محاسنِ دیباچہ مزین گردانیدہ جمال ”غرہ“ را نیز بہ دیباچہ کمال بیارائے۔“ یعنی ”جو مسودے میرے پاس ہیں پہلے اُن کو صاف کر دو پھر انہیں میں پرانی تحریریں جو طاق نسیاں کی نذر ہو چکی ہیں ملا دو۔ اُس کے بعد ایک ضابطہ اور رابطہ اُن پہ باندھو یہ سب ہو چکے تو ”تحفۃ الصغر“ اور ”وسط الحیوٰۃ“ کی طرح ”غرہ“ کو بھی دیباچہ سے آراستہ کرو۔

لہ یہ مضمون جتنا اوپر نقل ہوا پہلی قسط تھی جو مخزن ماہ دسمبر ۱۹۰۴ء میں شائع ہوا۔ باقی ماندہ مضمون مخزن ماہ فروری ۱۹۰۵ء میں شائع کیا گیا اور وہ اب آگے چلتا ہے۔

آخر مجھ کو اپنے دوست کی فرمایش ماننی پڑی۔ اور دوسرے ہی روز صبح کو مسودوں کا تھیلا کھول کر ترتیب شروع کردی۔ شبانہ روز محنت کرکے دو ہفتے کے بعد یہ مجموعہ تیار کردیا۔ (تا بعد دو ہفتہ این ماہ چاردہ را کہ غرۃ کمالش خوانند آراستگی تمام برآوردم) ؎

ترا ماہ ست این کہ خورشید ہست پر نور
بنامیزد چہ گویم چشم بد دور

مرتب ہوتے ہی شائقین کے مطالعہ میں پہنچا اور ہر طرف سے تحسین و آفرین کی صدائیں آنے لگیں جب دیوان مرتب ہو کر سخن شناس دوستوں کی نظر سے گزر لیا اس وقت میں نے یہ دیباچہ لکھ کر لگا دیا۔

اسی بیان میں کہتے ہیں کہ مثنوی قران السعدین کلیاتِ ہذا کا ایک حصہ ہے۔ مثنوی مذکور ۳۶ برس کی عمر میں امیر خسرو نے تالیف کی تھی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ چالیس برس کے سن سے پہلے تین دیوان خسروی تیار ہو چکے تھے۔ تحفۃ الصغر (۱۹ برس کی عمر تک کا کلام) وسط الحیوٰۃ اور غرۃ الکمال۔

دیباچہ تالیف لکھ کر اُن صنائع کلام کا ذکر کیا ہے جو خود اُن کی ایجاد ہیں۔ فرماتے ہیں کہ جو ایجادیں تحفۃ الصغر اور وسط الحیوٰۃ میں آ چکی ہیں وہ اُن کے علاوہ ہیں۔ حیف بے مائگی صنائع کی دقت اُس پر کاتب کی عنایت۔ بے غایت۔ میں باوجود مطالعہ مکرر اُن کا مفہوم مشخص نہ کر سکا۔ اس لئے یہ جواہرات ناظرینِ مخزن کے سامنے نہیں سجا سکتا۔ معمّے کی نسبت لکھا ہے کہ متقدمین یا تو حساب ابجد سے معمّا کہنے میں کام لیتے تھے یا ایسی مغلق اور مبہم ترکیبیں استعمال کرتے تھے جن سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ بس یہ معمّا ہے۔ مولانا بہاء الدین بخاری کی طبّاعی نے اسلوبِ معما ایسا پیدا کیا کہ شعر اپنے مطلب اور مضمون میں بنفسہ تمام ہو۔ اسی ضمن میں بعض الفاظ بر سبیل ایہام ایسے بھی آ جائیں جن سے کوئی نام پیدا ہو جائے۔ میں نے یہ تصرف کیا کہ مضمونِ شعر ایسا لطیف و نفیس ہو کہ سننے والوں کو معمّے کا گمان بھی نہ ہو۔ جب تماشا نظر کاوش کرے تو کسی لفظ عربی کے ترجمہ فارسی سے یا بالعکس نقشِ مدعا صورت پذیر ہو جائے۔ فصل صنائع میں بعض اشعار ایسے لکھے ہیں جو عربی فارسی دونوں میں پڑھے جا سکتے ہیں، علیٰ ہذا القیاس ہندی اور فارسی۔ یہ بھی لکھا ہے کہ ایک رسالہ "مصحف" نامی میں نے ایسا تصنیف کیا جو عربی فارسی دونوں بانوں

میں پڑھا جاتا ہے۔ فرماتے ہیں کوئی یہ نہ سمجھے کہ مجھ کو عربی شعر کہنا نہیں آتا۔ پھر اثباتِ دعویٰ کے واسطے تھوڑا سا اپنا کلام عربی نقل کرتے ہیں۔ آخر خود ہی انصاف کرتے ہیں کہ "حقیقت ایں است کہ ایں طریق نیک نمیدانم"۔ سلسلے میں سلسلہ پیدا کرکے کہتے ہیں کہ میں نے چند جزو ہندی نظم کے بھی لکھ ڈالے ہیں۔ تین دیوان ترتیب دینے کا ذکر کرکے کہتے ہیں مجھ سے پہلے شاہانِ سخن میں سے کسی کے تین دیوان نہ تھے (دیوان کے ایک معنی دربار بھی ہیں) مسعود سعد سلمان[1] کے البتہ تین دیوان ہیں۔ ایک عربی، دوسرا فارسی، تیسرا ہندی۔ صرف فارسی میں تین دیوان سوائے میرے کسی کے نہیں ہیں۔ دیوانِ اول تحفۃ الصغر جو بچپن کا کلام ہے، دوسرا وسط الحیوٰۃ عنفوانِ شباب کا ذخیرہ ہے، تیسرا یہ "غرۃ الکمال"۔ میرے نزدیک کلام غرۃ الکمال ہی ہے۔ پہلا دیوان اس لئے جداگانہ مرتب کر دیا ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ بچپن کا کلام ہے اور وہ حرف گیری سے باز رہیں۔ دوسرا اس واسطے فراہم کیا کہ "اوساطِ مردم را پسند کنم"۔

در ذکر سرگذشت خویش و پیوستن به ملوک و سلاطین و مشهور گشتن

میرے والد سیف شمسی (منسوب بہ سلطان شمس الدین التمش) نہایت بہادر اور صف شکنی میں شہرۂ روزگار تھے۔ باوجود اس کے نہایت کم سخن تھے۔ ترک کی نسبت مشہور ہے کہ "ترک در خواب فرشتہ است"۔ مگر وہ بیداری میں بھی فرشتہ تھے۔ ایسے فرشتے خواب میں نظر آئیں تو آئیں۔ نہایت پاکباز اور باخدا تھے۔ خود تو محض اُمّی تھے لیکن اُن کی ہمت اس طرف متوجہ رہی کہ مجھ کو (یعنی امیر خسرو کو) کچھ آجائے۔ جو تھوڑی بہت مجھ میں قابلیت ہے وہ انھیں کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ اُن کو شہادت کی بہت تمنا تھی۔ خداوند تعالیٰ نے اس سعادت سے اُن کو سرخرو فرمایا ؎

گزشت

"سیف" از سرم برفت و دلِ من دو نیم ماند
دریائے من رواں شد و "دُرِّ یتیم" ماند

---

[1] مسعود سعد سلمان کا زمانہ عہد سلطان محمود غزنوی سے سلطان ابراہیم کے عہد تک ہے۔ فتح ہندوستان کے آغاز میں مسعود کا ہندی زبان پر اتنا قادر ہو جانا کہ صاحبِ دیوان بن گیا مسلمانوں کی علم دوستی اور وسعتِ خیال کی روشن دلیل ہے۔ یہ بیان خلافِ واقعہ نہیں ہو سکتا۔ دیکھو۔ البیرونی کی "کتاب الہند" زبردست ثبوت موجود ہے ۱۲

"فرشتہ" نے بجائے "برفت" کے "گزشت" لکھا ہے اور یہی زیادہ موزوں ہے)۔

میری عمر اس وقت سات برس کی تھی۔ (دیکھو۔ ذرا سے بچے کے دماغ پر داتا باپ نقش تربیت جما چکا تھا) اس صغر سن میں جبکہ دودھ کے دانت ٹوٹتے تھے میرا کلام نمونۂ دُرافشانی تھا۔ "دراں صغر سن کہ دنداں می افتاد سخن می گفتم و گہر از دہانم می ریخت"۔ (کیا اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ نظم میں کچھ ہوں ہاں کرتے تھے۔ سات برس کا بچہ باتیں کرے تو کیا لکھنے کی بات ہے) والد کے بعد نانا[۵۱] کفیل تربیت ہوئے۔ نانا نہایت با اقبال اور صاحب اقتدار تھے۔ اگرچہ لفظ "سلطانی" سے محروم تھے مگر حقیقت میں سلطان وہی تھے۔ اُن کی فراخ حوصلگی نے تمام ہندوستان قابو میں کر رکھا تھا۔ تخت کی آڑ میں کل کام وہی کرتے تھے۔ مفسدوں کا منہ بند رکھنے کے واسطے بعض خدمات بھی اُنھوں نے لے رکھی تھیں۔ دو سو ترکی اور دو سو ہندی غلام اور دس ہزار سوار اُن کی سرکار میں تھے۔ سال بہ سال کثرت سے کلاہ و قبا اُن کے توشہ خانے سے تقسیم ہوتیں۔ باورچی خانہ سے بکثرت محتاجوں کو کھانا ملتا۔ اُن کا فیض ہندو اور مسلمان دونوں کو یکساں پہنچتا تھا۔ ستر برس عہدۂ عرض مملکت پر ممتاز رہے۔ میں جب اُن کی آغوش شفقت میں بیس برس کا ہوا تو اُنھوں نے ایک سو تیرہ برس کی عمر میں وفات پائی۔ نانا کے انتقال کرنے پر میں شاہزادہ قتلو خاں[۵۲] عرف چھجو کے دامنِ دولت سے جا لپٹا۔ دو برس شاہزادہ ممدوح کی سرکار میں رہا۔ کئی قصیدے اس کی شان میں لکھے۔ میں ہمیشہ اس کی مجلس میں حاضر رہتا اور اپنی خوش بیانی سے حاضرین کو مسرور کرتا۔ ایک روز بادشاہ کا چھوٹا بیٹا بغرا خاں[۵۳] خانِ معظم قتلو خاں کے

---

[۵۱] راوت عرض عماد الملک ۱۲

[۵۲] علاؤالدین محمد بن عزالدین کشلی خاں ملقب بہ خانِ اعظم۔ سلطان بلبن کا بھتیجا تھا۔ اس کی سخاوت اور مجلس آرائی شہرۂ آفاق تھی۔ ۱۲ فرشتہ

[۵۳] سلطان غیاث الدین بلبن کے دو بیٹے تھے۔ قاآن الملک محمد سلطان خان شہید۔ یہ شاہزادہ بوجہ اپنے بے نظیر اوصاف کے باپ کو نہایت عزیز تھا۔ فضیلت، ہنر اور دانش میں بے مثل تھا۔ اس کی مجلس ہمیشہ علما و فضلا سے آراستہ رہتی۔ امیر خسرو اور خواجہ حسن پانچ برس اس کے پاس ملتان میں رہے۔ ان کی محفل میں شاہنامہ، دیوان خاقانی و انوری، خمسۂ نظامی اور کلام امیر خسرو پڑھا جاتا تھا۔ اس کی شعر فہمی مسلّم تھی۔ کلام متقدمین سے بیس ہزار شعر کے قریب منتخب کر کے ایک بیاض مرتب کی تھی اور اس کو اپنے قلم سے نہایت خوشخط لکھا تھا۔ اس کی شہادت کے بعد سلطان نے وہ بیاض امیر علی جامدار کو دے دی (باقی نوٹ برصفحہ آئندہ)

یہاں مہمان آیا (یہ دونوں باہم چچازاد بھائی تھے) چند مصاحب و ندیم ساتھ تھے۔ منجملہ ندیموں کے شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر بھی تھے۔ خانِ معظم کی مصاحبت میں صرف میں ہی تھا۔ اُس طرف سے وہ سب چھیڑ چھاڑ کرتے تھے۔ اس طرف اکیلے صرف میں جواب دیتا تھا۔ تاہم سب کا قافیہ تنگ تھا۔ میں نے لطائف و ظرائف سے محفل کو اس قدر گرمایا کہ شاہزادہ بغرا خاں نے قرطہ سرود میں ایک طبق پر زر میرے سامنے رکھوا کر کہا کہ یہ آپ کے باورچی خانہ کا خرچ ہے۔ ہمارے خان (قتلوخاں) کا مزاج نہایت غیور تھا، اُس کو یہ امر شاق ہوا۔ میں نے ہرچند معذرت کی لیکن اس کا مزاج صاف نہ ہوا۔ مگر نوبت یہاں تک بڑھا کہ میری صفائی کی فکر ہونے لگی۔ آخر مجھ کو کنارہ کش ہونا پڑا۔ اور بے سرو سامانی میں سامانے میں سامانِ امن نظر آیا۔ اور میں وہیں چلا گیا (سامانے کا حاکم شاہزادہ بغرا خاں تھا) لوگوں نے شاہزادے سے غائبانہ میری اس قدر تعریف کی کہ وہ سراپا شوق بن گیا۔ جب میں حاضر ہوا تو ندیم خاص مقرر کیا۔ میرا عروج روز بروز ترقی پذیر تھا کہ ناگاہ پرچم شاہی دارالملک دہلی سے

(بقیہ نوٹ صفحہ گزشتہ) سخن فہم اُس کے اشعار سے محفوظ ہو کر اُن کو اپنی بیاضوں میں نقل کرتے تھے حیف کہ یہ شاہزادہ مغلوں کے معرکہ میں باپ کی زندگی میں شہید ہو گیا۔۱۲

دوسرا بیٹا بغرا خاں تھا۔ یہ عیش و عشرت کی جانب مائل تھا۔ ماہرانِ موسیقی، قصہ خواں، خوش طبع، اور ظرفا کا اُس کی سرکار میں مجمع رہتا۔ باپ نے طغرل کو مغلوب کر کے بنگالہ کا حاکم کر دیا۔ اس ملک سے اُس کو اس قدر اُنس تھا کہ باپ نے خانِ شہید کے بعد ولیعہد بنا کر سلطنتِ دہلی دینی چاہی۔ مگر یہ لکھنوتی چلا گیا۔ سلطان بلبن کے بعد اس کا (بغرا خاں کا) بیٹا معز الدین کیقباد تختِ دہلی پر بیٹھا۔ یہ بیٹے کے ماتحت رہ کر بنگالے پر حکومت کرتا رہا۔ ایک بار دہلی آکر بیٹے سے ملا تھا۔ اسی ملاقات کی یادگار قران السعدین امیر خسرو ہے۔ دہلی میں سلطنت پر سلطنت بدلتی رہی لیکن یہ حاکم بنگالہ رہا۔ جو بادشاہ ہوتا اُس کی اطاعت سے خوش ہو کر حکومتِ بنگالہ بدستور اسی کے نام چھوڑ دیتا۔۱۲ (خلاصۂ تاریخ فرشتہ)

لہ طغرل ایک ترکی غلام سلطان غیاث الدین بلبن کی جانب سے حاکم بنگالہ تھا۔ ۶۷۸ھ ہجری میں یہ دیکھ کر کہ بادشاہ بوڑھا ہو گیا ہے اور شاہزادے سرحد پنجاب پر مغلوں کے مقابلے میں مصروف ہیں آمادۂ بغاوت ہو گیا۔ سلطان نے ان امرا کو اُس کے مقابلے پر بھیجا۔ جب اُن سے مہم سر نہ ہوئی تو خود مقابلے پر اُٹھا۔ یہ حکم دے کر کہ کشتیوں کی تعداد کثیر جمنا اور گنگا میں مہیا رہے۔ شکار کے بہانے سامانے کی طرف گیا۔ وہاں سے بغرا خاں کو مع لشکرِ خاص ہمراہ لیکر لکھنوتی کی جانب روانہ ہوا۔ برسات کا موسم تھا اس نے راستہ میں ہر چند ہوتا گیا بادشاہ لکھنوتی پہنچا تو طغرل میدان چھوڑ کر آگے بڑھ گیا تھا لشکرِ سلطانی بھی تعاقب میں بڑھا۔ غرض بہت سی سرگردانی کے بعد طغرل کا مقابلہ لشکرِ شاہی سے ہوا۔ اور وہ اسی معرکے میں کام آیا۔ بعد فتح بادشاہ نے لکھنوتی کی حکومت اپنے بیٹے بغرا خاں کو دے کر دارالسلطنت کی جانب معاودت کی۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اس مہم کے وقت سلطان کی عمر پچھتر برس کی تھی۔۱۲

لکھنوتی[1] کی جانب رواں ہوا (۶۷۸ھ) شاہزادہ خود عزمِ ہمرکابی کر رہا تھا کہ قاصدِ سلطانی پہنچا اور شاہزادہ مع سپاہ لشکرِ شاہی میں آ ملا۔ بندہ ساتھ تھا۔ ایک سال تک قطعِ مسافت کرتا رہا۔ تاہم منزلِ مقصود کا پتا نہ تھا۔ خلاصہ یہ کہ لکھنوتی سے ڈیڑھ سو کوس اُس طرف جا پہنچے پھر بھی گھوڑوں کی پشت زین سے گرانبار رہی۔ کیچڑ کا یہ عالم تھا کہ پرندہ اُس میں گر پڑتا تو شہد کی مکھی کی طرح پھنس رہتا۔ قصۂ دراز اور عرصۂ بیانِ تنگ خلاصہ یہ کہ طغرل کا قلع قمع ہو گیا اور شاہزادے کو حکومتِ لکھنوتی عطا ہوئی۔ شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر نے چاہا کہ میں بھی شاہزادے کے دربار میں حاضر رہوں۔ مگر میں عزیزوں کی مفارقت سے گھبرا گیا تھا۔ لشکرِ شاہی کے ہمراہ دہلی چلا آیا۔ انھیں مہینوں میں قاآن الملک (خانِ شہید) فاتح و منصور داخل دارالسلطنۃ ہوا۔ میری سخنوری کی شہرت سن چکا تھا۔ بلا کر ندیمی کا خلعت بخشا اور ملتان کو ساتھ لے گیا۔ وہاں مغلوں کا معرکہ پیش آیا۔ اور شاہزادے کو شہادت نصیب ہوئی۔ میں بھی گرفتار ہو گیا تھا۔ مگر زندگی باقی تھی۔ خداوند تعالیٰ نے اُس بلا[2] سے نجات دی۔ رہائی پا کر میں قبۃ الاسلام (دہلی) کی زیارت سے مشرف ہوا اور والدہ کی قدمبوسی کا شرف حاصل کیا۔ کچھ عرصہ تک مومن پور عرف پٹیالی میں گنگا کنارے وقت خوشی سے گزرا۔ اسی عرصے میں سلطانِ عادل غیاث الدین نے رحلت فرمائی (۶۸۵ھ ہجری) اور دولتِ معزّی کا علم بلند ہوا۔ بندے کی طلبی ہوئی۔ دربار میں ملک نظام الدین کا دور دورہ تھا اور اُس کے دل میں ایک وجہ سے مجھ خاکی کی جانب سے غبار تھا۔ مجھ کو اندیشہ ہوا کہ کہیں

[1] لکھنوتی بنگالے کا قدیم اسلامی دارالسلطنۃ تھا۔ گور بھی اسی کو کہتے تھے۔ اکبر بادشاہ نے جنت آباد لقب دیا۔ اب ویران پڑا ہے۔ پھر بھی اس کے کھنڈر رفتگی عظمت کی نشانی ہیں۔ لارڈ کرزن کی جو شاہانہ توجہ قدیم آثار کے حال پر مبذول ہوئی اُس میں گور کو بھی حصہ ملا ہے۔ اور اُس کے کھنڈروں کی حفاظت اور تا امکان درستی کا اہتمام ہو رہا ہے۔ گنگا کے مشرقی کنارے پر نقشے میں ویرانہ گور کا نشان دیا ہے۔

[2] یہ نہیں معلوم ہوتا کہ امیر خسرو کتنے دنوں تک مغلوں کی قید میں رہے۔ فرشتہ نے بضمن معرکۂ خانِ شہید یہ لکھا ہے کہ امیر خسرو بھی جو اس معرکے میں شریک تھے مغلوں کے اسیر ہو گئے اور پھر جس طرح دول رانی خضر خاں میں درج ہے رہائی پا کر دہلی پہنچ گئے۔ مثنوی دول رانی خضر خاں کا ایک نفیس نسخہ میرے پاس ہے۔ اُس میں (جہاں تک میں نے تلاش کی) صرف یہ اشعار اس واقعے کے متعلق ضمناً آ گئے ہیں جن سے کوئی واقعہ مشخص نہیں ہوتا صرف صحرا نوردی ظاہر ہوتی ہے۔ دو ابیات کہ این نفسِ بد آموز ۞ گرفتار مغل شد دور زا امروز ۞ بیاباں ہی بُردم ریگ میریگ ۞ بہ زیرِ گرد سر ہم چو خورشید چو دیگ ۔ من و یا من چو من تشنہ سوارے ۞ رسیدیم از رہ اندر جو بیارے ۔ آگے لکھا ہے کہ دریا سے تھوڑا سا پانی پیا۔ مگر رفیقِ سفر اور اُس کا گھوڑا دونوں زیادہ پانی پی گئے اور فوراً مر گئے۔ ۱۲

ضرر نہ پہنچائے۔ اس لئے کنارہ کشی کرکے حاتم خاں کے زیر سایہ پناہ لی۔ امیر موصوف نے اس قدر دولت مجھ کو عطا کی تھی کہ اگر میں اُس کو خرچ نہ کر ڈالتا تو میری اولاد کی عمر بھی آبرو اور فراغت سے بسر ہو جاتی۔ تھوڑے ہی دن حاتم خاں کی ندیمی میں گزرے تھے کہ نظام[1] الدین جنت کو سدھارا (مجلس نظامی بوستان فردوسی جاے خوش کرد) اور میں دربار شاہی میں حاضر ہو کر خلعتِ ندیمی سے ممتاز ہوا اور دولتِ تقرب سے مالا مال۔ بادشاہ کی اقبالمندی کا زمانہ تھا۔ اور رات دن عیش و عشرت کے چرچے تھے۔ آخر ساقی زمانہ نے اُس کو وہ جامِ نامرادی پلایا جس کے خمار نے آنکھ کھولنے کی مہلت نہ دی۔ اُس کا قرۃ العین شمس الدین تخت پر بٹھایا گیا۔ اور شائستہ خاں (جو آسمانِ فیروزی تھا) اُس کا پشت و پناہ بنا۔ بندہ خسرو کو خدمتِ شائستہ خانی سے سرفرازی ہوئی۔ آخر چترِ شاہی خود شائستہ خاں کے سر پر آکر ٹھہرا۔ اور وہ فیروز شاہ بن کر تخت نشیں ہوا۔ (۶۸۶ھ ہجری) خداوند تعالیٰ اُس کے اقبال کو بلند رکھے۔ اگرچہ میں نے ہمیشہ درباروں ہی میں بسر کی اور شاہزادوں کا ہمنشیں اور ہم زانو رہا مگر اوجِ ناموری پر اسی بادشاہ کی تربیت و مرحمت سے پہنچا۔ تمام بادشاہوں سے زیادہ ذی علم ہے۔ اور اگلے پچھلے بادشاہوں میں کوئی اُس کے مثل سخن فہم نہیں ہوا۔ میرے کلام کی جو کچھ حقیقت ہے اُس کو خوب سمجھتا ہے اور پوری قدردانی فرماتا ہے۔

آگے ایک موقع پر اپنے چار سخن سنج اور سخن فہم دوستوں کا ذکر کیا ہے۔ مولانا شہاب الدین۔ قاضی سراج الدین "برادرم" تاج الدین زاہد اور "برادرم" علاؤالدین علی شاہ۔ آخر الذکر کی نسبت فرماتے ہیں کہ وہ دوست موافق و منصف ہے۔ نہ میری طرفداری کرتا ہے اور نہ انصاف کی جانب پشت۔ اُس کا مرتبہ شاہانِ سخن میں مسلّم ہے۔ اور ایسا دوست ہے کہ اگر برادرانِ موافق اُس یوسف لقا کو ہزار جان کے بدلے میں بیچ ڈالیں تو بھی ٹوٹے میں رہیں گے۔ فقط

(رسالہ مخزن لاہور ماہ دسمبر ۱۹۰۴ء و فروری ۱۹۰۵ء)

---

[1] فرشتہ نے لکھا ہے کہ نظام الدین اُس وقت مرا جب کہ معز الدین مفلوج ہو کر مرضِ موت میں مبتلا ہو چکا تھا۔ امیر خسرو کی عبارت صاف کہہ رہی ہے کہ بادشاہ کی صحت و تندرستی کے زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا۔ ۱۲

اکبر کی جوہر پروری

نیرنگیِ قدرت کا ایک حیرت خیز نمونہ وہ شخص انسانی تھا جو اکبر کے نام سے شہرۂ روزگار ہوا۔ ایک اَن پڑھ مغل کا لڑکا تیرہ برس کی عمر میں ایک نام کی سلطنت کے تخت پر قدم رکھتا ہے۔ اس سلطنت کی وسعت یہ تھی کہ اُس کی کسی سرحد سے دلّی دور نہ تھی۔ اور حالت یہ کہ ملک زبردست دشمنوں (ہیموں بقال وغیرہ) سے گھرا ہوا تھا۔ دربار سرکش مدعیانِ قوت (بیرم خاں خانخانان وغیرہ) کے ہاتھ میں تھا۔ جب باون برس کی تخت نشینی کے بعد تختے کی نوبت آئی تو سلطنتِ اکبری بدخشاں سے آسام تک اور کشمیر سے دکن تک پھیلی ہوئی تھی۔ پھیلاؤ وہ نہیں جو اُس کے نامور مورث تیمور کے ملک کا تھا کہ تخت نشیں کے مرتے ہی تخت کا تختہ تختہ بکھر گیا۔ بلکہ وہ پھیلاؤ جو ہمالیہ کی چٹانوں کا ہے۔ جو جوڑ اُس نے لگا دیے تھے وہ اُس وقت تک نہ اُکھڑے جب تک خود اُس کے جانشیں اُن کے جڑ سے اُکھاڑ ڈالنے کی قسم نہ کھا بیٹھے۔ انتظام ایسا کہ جزو سے لیکر کُل تک آئین اور ضابطے کی زنجیر میں جکڑا ہوا تھا۔ ابوالفضل کی جادو نگاری کی تصویر آئینِ اکبری دیکھو۔ جہاں صوبوں کے آئین دیکھوگے وہاں اونٹ کی ناک میں تیل ڈالنے کا قاعدہ بھی نظر آئے گا۔ قصہ مختصر کیا بلحاظ وسعت و قوت اور کیا بلحاظ انتظام و آئین ایک ایسی سلطنت اس اَن پڑھ مغل نے چھوڑی جس کی نظیر بہ حیثیت مجموعی تاریخ عالم میں کم تر نظر آتی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بے نظیر سلطنت کے قایم ہونے کا اصلی سبب کیا تھا۔ راحت پسند دماغ اس معمے کو یوں آسانی سے حل کر دیتے ہیں کہ اکبر کو آدمی اچھے مل گئے تھے۔ گویا یہ عظیم الشان سلطنت ایک حسنِ اتفاق کا نتیجہ تھی۔ یہ ایک قسم کا ظلم ہے جو اس والا مرتبہ بادشاہ کی تمام آوری کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس سوال کا صحیح جواب یہ ہے کہ یہ سلطنت اُس بے نظیر قوتِ تربیت کا نتیجہ تھی جو اکبر کی ذات میں قدرت نے فیاضی سے ودیعت رکھ دی تھی۔ یہ وہی قوتِ تربیت تھی جس نے رفتہ رفتہ ایک چھوٹی سی حکومت کو عظیم الشان سلطنت بنا دیا، جس نے ابوالفضل اور مان سنگھ سے ارکینِ سلطنت

بنا کر اُن سے سلطنت کے وہ کام لئے جو تاریخ کے کارنامے بن گئے، جس نے کسی فن اور ہنر کو ترقی و تہذیب سے محروم نہیں چھوڑا۔ بالآخر جس نے خود اکبر کی ذات کو بھی جنتریں کھینچ کر سب بَل نکال دیئے۔

اُمرائے اکبری کے سرتاج وہ امیر ہیں جن کا نام نورتن کے لقب سے جہاں میں روشن ہے۔ اُن میں بھی جو سب سے زیادہ مقرب تھے وہ ابوالفضل اور فیضی تھے۔ فیضی دربار اکبری میں باریاب ہوا تو اُس میں ایک ہونہار فارغ التحصیل طالب علم سے زیادہ کوئی حیثیت نہ تھی۔ اُس کی یہ حالت تھی کہ طبابت کے ذریعہ سے یہ دقّت اوقات بسری ہوتی تھی اور کچھ آراضی بطور مدد معاش حاصل کرنے کی کوشش میں اہل کاروں کی جھڑکیاں اُٹھا چکا تھا۔ اُنیس برس کی عمر میں بادشاہ کا مجُرائی ہوا۔ اٹھارہ برس کے بعد اُس کو (سنہ ۳۰ جلوسی) ملک الشعراء کا خطاب ملا۔ ابوالفضل کو سنہ ۱۵ جلوسی میں فیضی کی وساطت سے بیس برس کی عمر میں شرفِ حضوری حاصل ہوا۔ جس حال میں دربار میں پہنچا اُس کو خود بیان کرتا ہے کہ "رعونتِ مُلّایانہ سے دماغ معمور تھا اور تنگ دلی سے سینہ تاریک"۔ وسعتِ خیال اور بے تعصبی کے انوار فیضِ شاہی سے اس کے دل و دماغ پر جلوہ گستر ہوئے۔ ایک ملّائے خشک کس طرح "علامی" ابوالفضل بن گیا۔ اس کی داستان تاریخ اکبری میں پڑھو اور دیکھو کہ کس طرح اکبر نے اس سے سیف و قلم کے کام لئے۔ جو زمانہ سلطنت اکبری کا ان دونوں بھائیوں کی باریابی سے پہلے گزرا وہ یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اکبر اکبر ہے۔ بیرم خاں خانخانان کا مع دیگر امرائے ترکمانی خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ ادھم جو بیرم کے توڑنے میں قوتِ بازو تھا جب ہوائے خودسری کے جھونکے نہ سنبھال سکا تو خود اُڑا دیا گیا۔ راجہ ٹوڈرمل کی جوہر دماغی عیاں ہو چکی تھی۔ راجہ بھگوان داس اور راجہ مان سنگھ شرف تقرب و اختصاص حاصل کر چکے تھے اور اُن کی کارگزاریاں جریدۂ عالم پر نقش ہوتی جاتی تھیں اور اس طرح شاہانہ تدبیر ایک عظیم الشان مسئلہ حل کر چکی تھی۔ مالوے کی یلغار ہو چکی تھی۔ چتوڑ، کالنجر، اور رنتھنبور وغیرہ حصار سنگین فتح ہو چکے تھے۔ قصہ مختصر عزم اکبری کے سامنے خاموش و گویا دونوں قوتیں سر جھکا چکی تھیں۔ خانخانان کی حشمت دیکھو۔ باپ نے اس کو چار برس کا چھوڑا تھا۔ جب محمد امین دیوانہ اور چند ماماہیں اس کو دربار شاہی میں لائیں تو شکستہ حالی میں مبتلا تھا۔ اکبر کی دوربین نظر نے پرکھ لیا کہ ایک

روز خانخاناں ہوکر نورتن کا بیش بہا نگینہ بنے گا۔ بدگویوں اور بداندیشوں نے نیش زنی کی لیکن بے سود۔ شاہی شفقت کے آغوش میں پلا۔ پہلے میرزا خان پھر خانخاناں بنا۔ فتح اللہ شیرازی ایران میں پیدا ہوا، بڑھا اور پڑھا۔ لیکن کسی نے نہ پہچانا۔ دکن کے دربار نے قدر کی لیکن وہاں بھی فتح اللہ شیرازی نہ تھا۔ یہ جوہر یہاں آکر کھلے کہ مستوفی الممالک راجہ ٹوڈرمل کا دست و بازو بن کر سلطنت کے مالی امور کا نظم و نسق درست کرلے گا۔ مآثر الامراء میں لکھا ہے کہ تیسویں سال جلوس میں فتح اللہ کو امین الملک بنا کر حکم دیا کہ راجہ ٹوڈرمل مہمات ملکی و مالی اُن کے مشورے سے طے کریں اور پرانے معاملے جو مظفر خاں کے عہد سے اُلجھے پڑے تھے اب فیصل کردیئے جائیں۔ میر ممدوح نے چند ضابطے بہبودی سلطنت اور بہتری رعایا کے بنا کر حضور شاہی میں پیش کئے جو پسند ہوئے اور ان کے صلے میں عضد الدولہ کا خطاب عطا ہوا۔ میر فتح اللہ کا قول تھا کہ "اگر در خدمتِ ایں کثرت آرائے وحدت گزیں نمی رسیدم راہے بایزد شناسی نمی بردم"۔ ٹوڈرمل لاہور کا کھتری تھا۔ مآثر الامراء کے مؤلف نے لکھا ہے کہ اکبر کے فیض تربیت سے اُس نے بڑی ترقی پائی اور چار ہزاری منصب پاکر درجۂ امارت و سرداری پر فائز ہوا۔ کام لینے کی قابلیت دیکھئے۔ گجرات فتح کیا تو وہاں کی تشخیصِ جمع ٹوڈرمل کے سپرد کی۔ جب بنگالہ کی مہم خانِ عالم اور خانِ خاناں سے باوجود کوشش سر نہ ہو سکی تو ٹوڈرمل کو جرنیل بنا کر بھیجا اور اس مہم کے سر کرنے کا سہرا اس کے سر رہا۔ ایک بار نہیں بارہا ایسا ہوا کہ قلم رکھ کر اُس نے تلوار پکڑی تو میدان جیت کر آیا اور تلوار رکھ کر قلم لیا تو میدان کاغذ میں جوہر قابلیت دکھلائے۔

یادش بخیر راجہ بیربر جیش داس نامی برہمن بھاٹ تھا۔ اکبری دربار میں جیش داس سے کب رائے[1] ہوا۔ کب رائے سے راجہ بیربر بنا۔ خطاب کا راجہ تھا نہیں جاگیردار۔ نام کا بیربر نہیں شیر میدان۔ نگرکوٹ کے راجہ سے مزاجِ شاہی برہم ہوا تو یہ اس کی سرکوبی پر مامور ہوئے۔ آخر میں بیربر کی تلوار یوسف زئیوں کے ملک میں جاکر چمکی۔ راجہ مان سنگھ کو حضوری اس وقت حاصل ہوئی تھی جب وہ اور اس کا باپ دونوں کنور تھے اور مان سنگھ کا دادا راجہ بہارا مل آمیر کی گدی پر تھا۔ اس واقعہ کے چودہ

---

[1] اصل لفظ کوی رائے ہے۔ کوی، شاعر ۱۲

برس بعد راجہ بھگوانداس کو موروثی گدی ملی تھی۔ مان سنگھ ہنوز کنور تھا کہ بڑی بڑی مہیں سر کر لیں۔ ایک روز ہم اُس کو مغرب میں کابل کا صوبہ دار دیکھتے ہیں تو دوسرے روز مشرق میں بنگالہ میں حکومت کر رہا ہی۔ شان وشوکت کا یہ عالم کہ اُس کے بھاٹ کے پاس سو ہاتھی تھے۔ کبھی خطاب فرزندی پایا کبھی میرزا راجہ بنا۔

آدمیوں سے گزر کر علوم و فنون کو دیکھئے۔ ہر قسم کے کمال اور اہلِ کمال کی سرپرستی جیسی اکبر نے کی ویسی اخیر دَور کے کسی دربار نے نہیں کی۔ قوتِ تربیت کا اثر ملاحظہ ہو۔ جو ایرانی شعرا ہندوستان میں آئے اور تربیتِ دربار سے فیضیاب ہوئے ان کے کلام کو اُن کے ہمعصر شاعروں کا کلام نہیں پہنچتا جو ایران میں رہے۔ نظیری، ظہوری، عرفی، غزالی مشہدی، طالب آملی کا جواب متاخرین میں وہاں ہو تو دکھاؤ۔ محتشم ہندوستان نہیں آیا۔ باوجود استادی۔ ع ؎

"ورائے شاعری چیزے دگر ہست"

اُس کے کلام میں پیدا نہ ہوئی۔ دیکھ لو، شیخ علی حزیں کلامِ محتشم کی بے نمکینی کا شاکی ہی۔ آئین اکبری دیکھو۔ ہر فن کی تربیت کے قاعدے جزو سلطنت تھے۔ بطور مثال دو فنِ لطیف لیجئے۔ تصویر اور شالبافی۔

تصویر | ابوالفضل لکھتا ہی " ابتدا سے بادشاہ کو اس فن کا شوق ہی اور توجہ شاہانہ اُس کے رواج اور تکمیل کی جانب مائل ہی۔ اس توجہ کے اثر سے اس فن کو خوب ترقی ہی اور ایک گروہ نامور مصوروں کا ملک میں موجود ہو گیا ہی۔ داروغہ اور بتکچی مامور ہیں کہ ہفتہ وار ایک مصور کا کام نظر شاہی میں پیش کرتے رہیں۔ ہر ایک کا ہنر جانچا جاتا ہی۔ جو قابلِ انعام ٹھہرتے ہیں اُن کو انعام عطا ہوتا ہے۔ جس قدر اُن کی مہارت ترقی کرتی جاتی ہی اُسی انداز سے ماہواریں اضافہ فرمایا جاتا ہی۔ رنگ آمیزی میں اور ہی حسن پیدا ہو گیا ہی۔ ہنرمندانِ شیریں کار نے بہزاد و اہلِ فرنگ کی مصوری سے رتبۂ شہرہ روزگار ہی اپنے حصے ملا دیئے۔ نازکی، نقوش کی صفائی، ہاتھ کی قوت اور دیگر صفات مرتبۂ کمال کو پہنچ گئی ہیں۔ ان خوبیوں کے اثر سے بے جانوں کی تصویریں وہ تازگی و رونق پیدا ہو گئی ہی جو جانداروں کی تصویروں میں ہوتی ہی۔ سو سے زائد درجۂ کمال حاصل کر چکے ہیں۔ جو قریب بہ کمال ہیں یا نصف

راہ طے کر چکے ہیں وہ بہت ہیں۔ میر سید علی سرکردہ مصورین ہیں۔ یہ فن تھوڑا سا اُس نے اپنے باپ سے سیکھا تھا۔ دربار میں پہنچ کر بادشاہی عاطفت کی بدولت کمال و ناموری کی دولت سے مالا مال ہوا۔ خواجہ عبدالصمد شیریں قلم شیرازی ہے۔ اس فن کو پہلے بھی جانتا تھا۔ لیکن شاہی نظر کے فیض سے اُس کا اور ہی عالم ہو گیا۔

اس واقعہ کو غور سے پڑھو۔ وسنتا ایک کہار کا لڑکا جو اس کارخانے کی خدمت پر مامور تھا دیکھتے دیکھتے وہ بھی لگا کیل کانٹے کاڑھنے۔ بادشاہ نے ایک روز اُس کو دیوار پر نقش بناتے دیکھ کر سمجھ لیا کہ اس کے ہاتھوں میں قابلیت ہے۔ خواجہ عبدالصمد شیریں قلم کے ہاتھوں سپرد کیا گیا۔ چند ہی روز میں خوبی تربیت سے اُستاد بن گیا۔ آخر جنون یہ رنگ لایا کہ اُس نے خودکشی کر لی۔ بہت سے نادر مُرقعے یادگار چھوڑے۔ بساون چہرہ کشائی، رنگ آمیزی اور ہو بہو تصویر اُتارنے میں یکتا ہے۔ کیسو، لعل، کنہ، مکیش، فرخ، قلماق، مادھو، جگن، مہیش، کھیم کرن، تارا، سانولا، ہربنس رام اس فن میں سرآمدِ زمانہ ہیں۔"

شال بافی

مورخ ممدوح کا بیان ہے کہ اس فن میں حسب ذیل ایجاد بادشاہ نے کئے ہیں۔ طوس اکبری عہد سے پہلے صرف ایک رنگ کا ہوتا تھا (جو پشم کا قدرتی رنگ ہے)۔ اب متعدد رنگ کا ہوتا ہے۔ تعجب ہے کہ سُرخ رنگ کو یہ پشم قبول نہیں کرتی۔ طرحدار، صرف چار رنگ کا ہوتا تھا۔ بادشاہ نے بہت سے رنگ اضافہ کر دیئے ہیں۔ زردوزی، کلابتون، قلغہ، باندھنوں، چھینٹ، الچہ، اور زردار، یہ سب ایجاد اکبری ہیں۔ پہلے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بُنے جاتے تھے۔ اب طول اور عرض میں ترقی دے کر ان کو جامہ رس بنا دیا گیا۔ زمانہ سابق میں شال کشمیر سے کم کم آتی تھی اور کمیابی کی وجہ سے لوگ احتیاطاً چار تہ کر کے اوڑھتے تھے۔ اب بہ کثرت آتی ہے اور بڑے چھوٹے سب بے تہ کے اوڑھتے ہیں۔ توجہ شاہی سے نہ صرف کشمیر میں شال بافی کو ترقی ہوئی بلکہ لاہور میں ایک ہزار سے زائد کارخانے قائم ہیں۔ یہ ایجاد بھی ہوا ہے کہ زر کے تانے اور ریشم کے بانے سے شال بُنی جاتی ہے۔ مایاں اس کا نام رکھا گیا ہے۔ جامے اور کمر کے پٹکے اُس سے بنتے ہیں۔

اکبر نے خود اپنی تربیت کس طرح کی اُس کو بھی مختصراً بیان کرنا چاہیے۔ بہت بڑا ذریعہ وہ بے نظیر مجمع تھا جو ہر ملّت اور ہر فن کے اہلِ کمال کا تختِ شاہی کے گرد رہتا تھا۔ اکبر کشادہ دلی اور توجہ سے ہر ایک کے علم سے فائدہ حاصل کرتا تھا۔ مختلف خیالات کو باہم ٹکرایا جاتا تھا۔ علمی مسئلوں کی چھیڑ چھاڑ رہتی تھی۔ اس طرح ہر قسم کی معلومات کا ذخیرہ اکبر نے اپنے دماغ میں فراہم کر لیا تھا۔ ایک وقت کتاب سننے کا مقرر تھا۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ شاہی کتب خانے کے دو حصے ہیں۔ کم تر کتابیں باہر رہتی ہیں، زیادہ محل شاہی میں۔ ہندی، فارسی، یونانی، عربی اور کشمیری زبان کی نظم و نثر کتابیں کتب خانۂ شاہی میں فراہم ہیں۔ ترتیب کے ساتھ ہر روز فہرست ملاحظہ میں پیش ہوتی ہے۔ بادشاہ جس کتاب کو سنتا ہے اوّل سے آخر تک سنتا ہے۔ جہاں تک کتاب سُن لی جاتی ہے خود بدولت خود اپنے ہاتھ سے اس مقام پر نشان ہندسہ بنا دیتے ہیں۔ سُنانے والا جس قدر ورق سناتا ہے اسی قدر اشرفی اور روپے بطور انعام اس کو دیے جاتے ہیں۔ مشہور کتابوں میں سے کم کتابیں ایسی ہوں گی جو محفل ہمایوں میں نہ پڑھی گئی ہوں۔ وہ کون سی گزشتہ داستان، علمی نکات اور حکمت کے مسئلے ہیں جو بادشاہ کو یاد نہیں۔ کتابوں کو بار بار سننے سے ملال نہیں ہوتا بلکہ ہر مرتبہ نہایت شوق سے سنتا ہے (" بفراواں خواہش نیوشند")۔

ہمیشہ اخلاقِ ناصری، کیمیائے سعادت، قابوس نامہ، مکتوباتِ شرف منیری، گلستاں، حدیقۂ سنائی، مثنوی معنوی، جامِ جم، بوستاں، شاہنامہ، خمسۂ شیخ نظامی، کلیاتِ خسرو و مولانا جامی، دیوانِ خاقانی و انوری اور تاریخی کتابیں پیش گاہِ حضور میں پڑھی جاتی ہیں۔ فقط

(اکبر نمبر رسالہ زمانہ۔ کانپور ۱۹۰۵ء)

راجہ کُندن لال اشکی الٰہی

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

کچھ کم تین ہزار برس کا زمانہ گزرا کہ اَنتکاپوری (اُجین) میں پانڈوؤں کی نسل کی آخری نشانی راجہ کھیمی کو دستِ انقلاب نے مٹایا اور آنند کایستھ کو سرور کامیابی بخشا۔ سات سو برس تک حکومت اس سلسلے میں رہی۔ انجام کار اس کی بھی برہمی کا وقت آپہنچا۔ اور شہرۂ روزگار راجہ بکرماجیت کے ہاتھوں آخر فرماں روا اوتی جن کا نہ صرف تاج گیا بلکہ سر بھی ندیتا راج ہو گیا۔ جب گھر بگڑا تو گھر والوں میں تفرقہ پڑ گیا۔ کچھ لوگ اودھ میں جا بسے، کچھ اور اطراف میں۔ دامودر نامے ایک خستہ حال نے کمپل میں سکونت اختیار کی۔ وہاں یاوری تقدیر نے ایک ایسے مرشد کامل (سمندر پال جوگی) کے آستانہ پر پہنچایا جس کے ابر کرم سے دامودر کی سوکھی کھیتی ہری ہو گئی۔ کمپل کے متعلق ۱۴ پرگنوں کی جاگیر بارگاہِ مرشد سے عطا ہوئی۔ ہزار برس ان پرگنوں پر یہ خاندان حاکم رہا۔ فرماں روائے قنوج (جے چند) کے باپ راجہ گوبند چند کا اقبال اس خاندان کا ادبار تھا۔ خاتمۃ الباب رائے چند نے دروازۂ زندان دیکھا۔ بعد چندے زمانے سے انقلاب کا دوسرا ورق اُلٹا۔ چوتھی صدی سمبت میں جلال الدین خلجی نے قصبۂ کمپل فتح کیا۔ باشندوں کو غبار فرار میں چہرۂ امن نظر آیا۔ بعضے اکبر آباد، بعضے دوسرے مقامات کو چلے گئے۔ ہمارے ہیرو کے مورث کرم چند کو سندیلہ پسند آیا۔ شمشیر کی بے وفائی کا دو مرتبہ مشہور تجربہ کرنے کے بعد اب اس خاندان نے اس کو کمر سے کھول دیا اور قلم ہاتھ میں لیا۔ سترھویں صدی سمبت میں رائے کھیم داس تاج البلاد شاہجہاں آباد میں آباد ہوئے اور خدمت شاہجہانی سے سربلندی حاصل کی۔ ان کے بیٹے رائے نند رام عہد عالمگیر میں موروثی منصب پر ممتاز رہے۔ یہ چندربھان برہمن کے شاگرد تھے۔ شعر گوئی کا شوق تھا۔ کہتے ہیں ؎

زیرِ پائے تو مقیم اند ہزاراں دلِ ریش
قدم آہستہ بنہ جائے درنگ است اینجا

نند رام کے نورِ نظر رائے ٹوک رام محمد شاہی ہیں۔ آخر عمر میں خدمتِ شاہی سے مستعفی ہو کر نواب قمر الدین خاں کی سرکار میں توشک خانہ کے مشرف ہو گئے تھے۔ سرآمد اہلِ دل میرزا عبد القادر بیدل سے تلمذ تھا۔ اُن کا شعر ملاحظہ ہو ؎

ساقی۔ مئش بجام بلوریں۔ چہ می دہی
گل را پیالہ کن۔ کہ لبِ یار نازک ست

ٹوک راج کے جارِ لختِ جگر تھے۔ خوش حال رائے رند تخلص۔ حضرت شاہ گلشن کے چمنِ فیض سے گلِ مراد چنتے تھے۔ پانچ ہزار مغلیہ سواروں کی وکالت پر ممتاز تھے۔ نادر شاہ ترکی و فارسی کی استعداد سے خوش ہو کر مالِ یغما کے ساتھ اُن کو بھی لے گیا۔ کابُل پہنچے تو پیامِ اجل آپہنچا۔ صاحبِ تصانیفِ کثیرہ تھے۔ انقلاب کے ہاتھوں نے سب برباد کر دیں۔ ترانۂ رند ؎

حالم بر آں صنم بگوئید	از سختیِ عشق ہم بگوئید
گر از دلِ من خبر بجوید	آفت زدۂ ستم بگوئید
از جانِ رمیدہ گر بپرسد	آوارۂ کوئے غم بگوئید
افسانۂ شامِ غم بخوانید	ویں قصۂ صبح دم بگوئید
گر رنجہ بود ز سیر گوئی	آہستہ و یدہ و کم بگوئید
باور نکند اگر بدیں قول	از جانبِ من قسم بگوئید

کاں سوختہ در غمِ تو جاں داد
فریاد ز دستِ عشق۔ فریاد

رائے بھیکم رائے موزوں نے وارستگی میں بسر کی۔ دلّی برباد ہوئی تو رام پور چلے گئے۔ کلام موزوں ؎

در لباسِ بیخودی دارند با ہم نسبتے ۔۔۔ چشمِ گریانِ من و آں دیدۂ خونبارِ تو

؎ مکن اے بیوفا رسم ستمگاری بحالِ من نگاہِ رحم کن تا دُور گردد انفعالِ من

رائے بُوچند ۔ مصوری، نجوم اور طب میں صاحبِ دستگاہ تھے ۔ اور رسالہ بیین دلاغ کی رسالہ داری پر مامور ۔

رائے سدا نند عاصی تخلص، سراج الدین علی خاں آرزو کے شاگرد ۔ یہ بھی رسالۂ مذکور کے رسالہ دار رہے ۔ جب اُس رسالے کا شیرازہ ابتر ہوا تو چندے دلّی میں بسر کی ۔ پھر میرزا جواں بخت بہادر کے ہمراہ پورب کے سفر پر روانہ ہوئے قصبۂ سانڈی سے ترکِ رفاقت کر کے رام پور چلے گئے اور مرتے دم تک وہاں کے حکمراں نواب فیض اللہ خاں کے دامنِ فیض سے لپٹے رہے ۔ ولہٗ ؎

گریبانِ من و زلفِ درازش بدستِ یکدگر بودے چہ بودے

بہ پیشش آہ ۔ دل از خویش رفتہ اگر خود در نظر بودے چہ بودے

؎ بگوشِ گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں ست

بہ عندلیب چہ فرمودہ کہ گریاں ست

اُردو کلام بھی ہے ۔ اگلے زمانے کی زبان پر اب ہنسی آتی ہے ۔ اس لئے نمونہ نہیں لکھا ۔ دیوان اشعار مجمع الحسنات و تاریخ ہند یادگار چھوڑی ۔ یادگار معنوی کے سوا چار صوری یادگاریں چھوڑیں ۔ رائے منولال فلسفی (راجہ کندن لال کے باپ) علوم معقول و منقول مولوی عز الدین رام پوری، مولوی محمد روشن بجنوری، شاہ نیاز احمد صاحب سرہندی بریلوی اور مولوی رفیع الدین صاحب دہلوی سے پڑھے تھے ۔ سفرِ کلکتہ میں انگریزی سے بھی واقف ہو گئے تھے ۔ اولاً سرکار نواب فیض اللہ خاں میں وکیل رہے ۔ محمد علی خاں کے قتل ہونے کے بعد فرماں روائے اودھ کے دربار میں ملازمت کی ۔ پھر یکے بعد دیگرے عہدہائے ذیل پر مامور ہوتے رہے ۔ میر منشی صاحب جانشین گورنر جنرل بہادر مرشد آباد ۔ سررشتہ داری پراونشل کورٹ اپیل بریلی ۔ وبورڈ ڈیوٹیو اضلاع مغربی ۔ سررشتہ داری فوجداری اٹاوہ ۔ مرنے سے دو برس پہلے ترکِ خدمت کر کے خانہ نشیں ہو گئے تھے ۔ ۱۲۴۸ھ میں بمقام فرخ آباد گنگا کنارے سفرِ آخرت اختیار کیا ۔ تصانیف گلستانِ ارم، شبستانِ سرور، شارستانِ نور (نثر فارسی) ترجمہ اسطرلابی ۔

فارکیو شہر ہیئت فثا غورس - دو رسالے علم جغرافیہ ہیں - سدید الاستخراج علم تقویم میں - عجاب (حساب) اسمار البلاد - رسالۂ احکام - و دیوان اشعار ؎

؎ عیسیٰ سحر بالین من نبضم بدست آورد و گفت — وارد تپ عشق کسے ہرگز نخواہد زیست ایں
؎ بیخود شدہ ام ز دردِ دوری — ہاں گریہ برائے من زن آیے
؎ خندہ می زند بر گل طعنہ می زند بر برق — نور چشم سیماب ست ایں دلے کہ من دارم

اُن اہل کمال کی فہرست جن کی خدمت میں راجہ کندن لال فائز ہوئے -

اسمائے علما و فقرا و اطبائے اہل اسلام :-

بمقام دہلی | شاہ عبد العزیز صاحب - مولوی عبد القادر صاحب - شاہ غلام علی صاحب نقشبندی - مولوی اسمٰعیل صاحب - مولوی عبد الحی صاحب - مولوی اسحاق صاحب - مولوی محمد حیات لاہوری - مولوی محمد کاظم - مولوی محمد شریف - مولوی ولی محمد - مولوی نظام الدین - مفتی اکرام الدین - مولوی محمد سلام اللہ - مولوی غیاث الدین - مولوی فضل امام - مولوی احمد یار - حکیم محمد شریف خاں - حکیم اجیت سنگھ - شاہ صابر بخش - سید امیر پنجہ کش رام پور - مولوی شریف الدین - مولوی جمال الدین - مولوی غلام جیلانی رفعت تخلص - مولوی محمد روشن (بمقام بریلی) مولوی عماد الدین - مولوی ولی اللہ - مولوی مدن صاحب حافظ معین الدین - مولوی نجابت حسین (بمقام فرخ آباد) مولوی ولی اللہ - مولوی مدن خاں (بمقام کانپور) حکیم امام الدین خاں - حکیم فرزند علی خاں - شیخ احمد عرب یمنی شروانی (بمقام مین پوری) مولوی سلامت اللہ - مولوی فضل رسول بدایونی - مولوی حسین بخش کاکوروی (بمقام شاہجہاں پور) مولوی خلیل خاں بزرگ - مولوی محمد شریف شاہ نانی

اکبر آباد | شاہ محمدی بیدار - حافظ عبد اللہ - شاہ دستگیر اکبر آبادی - جواد سا باطنی - فریدوں میرزا نزد رشتی عالم سرنج - گیا - مولوی غلام حسین جونپوری - میرزا جان آرا - ہیرا لال خلف راجہ پیارے لال (در علم معقول خصوصاً کلام دستگاہ معقول داشتند. مگر افسوس کہ نوجوان از ایں جہاں بر فتند) ماسہرا - اچھے میاں صاحب - لکھنؤ - مولوی سید محمد صاحب - مولوی سید میرن صاحب - مجتہدان امامیہ - مولوی ظہور اللہ مولوی ولی اللہ - مولوی قدرت علی - مولوی عبد الحکیم نبیرۂ مولوی عبد العلی - مولوی امداد علی - مولوی احمد علی

مولوی فضل حق - مولوی تراب علی - مولوی سعد اللہ - مولوی نعمت اللہ - لالہ دیبی پرشاد در علم ہندسہ
بیعدیل اند - و بالفعل کہ شفا فی بینند بہ مطالب آں می رسند۔ حکیم الملوک مرزا علی صاحب - حکیم مرزا محمد علی
صاحب مسیح الدولہ مرزا علی حسین خاں صاحب -

اسامی شعرا

بریلی | شیخ عبد الملک ممتاز - پرکاش داس لطفی - راجہ رتن سنگھ زخمی - مولوی غلام حضرت عشقی - مولوی
برہان الدین نزہت - میر غلام علی عشرت - مرزا امان بیگ فریاد - سعادت یار خاں رنگین
امین الدولہ آزاد - عبد الجلیل سائل نواب خان بہادر خاں - مولوی نظیر الدین حسن - منشی بدیع الدین محو - قاضی
محمد سعید الدین خاں بہادر - نواب حافظ یار خاں نواب شاہ عالم خاں - عبد الصمد قیصر - تلوک چند شیدا
گنگا پرشاد رند - قاضی نور الحق منعم - مولوی عبد الرزاق یمنی -

فرخ آباد | آغا حسن شیرازی - میاں نصیر دہلوی لکھنو - شیخ امام بخش ناسخ - خواجہ حیدر علی آتش - محمد خاں
رند - میرزا محمد رضا برق - حسن علی خاں اثر - علی اکبر شیرازی - گل محمد خاں ناطق - اس شہر کے
بعض شعرا جو مدت سے مرثیہ گوئی میں درپے تھے اور اب انھوں نے اس فن کو مرتبہ کمال پر پہنچا دیا ہے -
اس سے پہلے میرزا جعفر علی فصیح - میر حسن خلیق - اور میاں دلگیر نے نام پایا تھا - اب میر ضمیر - میر انیس
میاں دبیر اپنے فن میں عمدہ ہیں (در فن خود خوب اند) -

عالمان موسیقی -

دہلی | ہمت خاں - نور خاں - سیت خاں - چھوٹے صاحب - قائم خاں جھنگو خاں
دانیل عرف حلال خور - مسماۃ گشتی - بیگا - جوبن - رام پور - خالق داد والہ داد پنجابیاں - جمالی -
دھمالی - مراد بخش - غلام غوث - بولن خاں - بریلی - نواب اقبال الدولہ ستر پر اگدت (ہر دو شاگردان
میاں شوری) نظام خاں - امیر خاں - میراں قائم خاں - احمد علی پسر میاں جانی - ستکر و سکھن بانیاں -
میر تقی ستار نواز بر فاقت راجہ اودت نراین -

فرخ آباد | سندر - راجن وغیرہ - لشکر مہاراجہ سیندھیا بہادر - تیغہ طبلہ نواز - محمد خاں دھر تیپا - بھورا
دیا بائی - چیلا بائی شعبدہ باز -

کانپور | سکھ بدن و شمشیر بازش -

بنارس | رتم۔ چترا
اکبرآباد | زین مقطوع الانف (نکٹا) جوالاکھی۔ ایک عورت ملازم راجہ سنسار چند والی نگرکوٹ۔
لکھنؤ | میر علی صاحب حسین علی خاں۔ مولوی یہ میں نے سنا ہے کہ پیار خاں رباب خوب بجاتا تھا۔

اسمار علمار وفقرائے ہند جن سے ملاقات اور فیض حاصل کرنے کا اتفاق ہوا:

اوّل استاد مؤلف۔ اوجھا الب انند صاحب اور اُن کے تین بھائی اور دو بیٹے جو سب کے سب علم و عمل میں سرآمد معاصرین تھے۔ برہمن ساال پرست پنڈت ہرکشن (کہ اہل ہند کے مقبول چاروں طریقے جیسے چاہئے ویسے طے کر چکے تھے) ایک اُن کے بیٹے مکند رام (جو بیاکرن یعنی نحو میں سرآمد اقران اور ضلع بریلی میں صدر امین وصدر الصدور تھے) پنڈت جیت ناتھ (کہ علم سدھانت خوب جانتے تھے) حکیم موتی رام (کہ اُن کو آدمی بسد مانتے تھے) حکیم گنگا بلبھ (جن کی طبابت فقیر کی دانست میں بلکہ کل آدمیوں کے نزدیک نمونہ کرامات تھی) اُن کے بیٹے شیر بلبھ (جو اپنے باپ کے قریب قریب تھے) دین کھنڈوی جوگی (جن کی عمر تین سو برس سے زائد تھی) ایینہ جی مجذوب۔ جانکی داس (جو علاوہ درویشی بانسری بجانے کے فن میں کامل تھے) برہمچاری رام کشن (صاحب مقامات وکرامات تھے) نرگیلا سوامی کو جنبھ پہاڑ پر دیکھا اور اُن کے دل کو وسوسۂ دنیا سے پاک پایا۔ راجہ سونی کے مرشد کو کانگڑے میں دیکھا (جو منجملہ سدھان تھے)

بنارس۔ چند فاضل بے مثل بھیروں۔ مشر۔ دامودر بھٹا چاریج۔ بھیر بھٹا چاریج۔ چندر نرائن بھٹا چاریج۔ رام نرنجن سوامی وغیرہ۔ قنوج۔ میاّ رام پنڈت (علم نجوم میں بے مثل) بلدہ ملاّ داں۔ تواری درگا پرشاد کو اعمال میں اور دیو کنندن کو شعر ہندی میں کامل پایا۔ نیورا گھاٹ منگل گر درویش (جن کو لوگ صاحب کرامات کہتے تھے) بندرابن۔ موتی داس بری میاں۔ لکھنؤ پنڈت گنگا دھر (علم کلام جانتے تھے) پنڈت شنکر ناتھ ماہر منتر شاستر۔ فرح آباد۔ انند ناتھ علم کیمیا خوب جانتے تھے بہت سے نباتات جو اس فن میں کارآمد ہیں مجھ کو بھی دکھائے تھے میں نے بعض کا تجربہ کیا تو ٹھیک پایا۔ تاہم میں نے کچھ التفات اس فن کی طرف نہیں کیا۔

لالہ موتی رام گوہر مولوی عزالدین کے شاگردوں میں تھے۔ ابتدائے حکومت اہل فرنگ سے کورٹ اپیل بریلی وصدر دیوانی الٰہ آباد کے وکیل رہے ۱۲۶۵ھ میں رخت سفر باندھا۔ راجہ کندن لال لکھتے ہیں کہ ایسا

گویا اور خوش تقریر میں نے کوئی نہیں دیکھا۔ فضلا اُن کی تقریر سُن کر دنگ رہ جاتے تھے۔ سخاوت میں مشہور تھے۔
کلام گوہر ؎

مو بمو دل گرد زلف مشک بو دارم
روزگار سیہ و طالع ابتر دارم

لالہ سوہن لال۔ استعداد علوم ضروری کے ساتھ فنون طبیہ میں کمال تھا۔ دبستان فارسی۔ قواعد فارسی میں شاہد کمال ہے۔ ملازمت۔ سررشتہ داری سائر علاقہ بریلی۔ سررشتہ داری فوجداری ضلع مظفرنگر و بریلی بعہدہ کی نائب تحصیلداری فوجداری۔ یہ اُن کی ملازمت کی فہرست ہے۔ چند روز کلکتہ میں رہے تھے ۱۲۴۹ھ میں کالبد عنصری کی رفاقت چھوڑ دی۔

° لالہ ہولاس رائے متخلص بہ رشک۔ فن تاریخ میں یگانہ تھے۔ رضوان فریب۔ ہمیشہ بہار۔ حدائق الاخبار قصہ یاسمین رخ و تاج الملوک اُن کی تصنیف ہیں۔ نتیجۂ طبع ؎

می برد از دلم شکیب طرۂ جانفزائے تو — آب ز غنچہ می برد خندۂ خوش ادائے تو
حسن ملیحت اے پری شور فگندہ در جہاں — گرد سیاہ حالے کاکل مشکسائے تو

راجہ کندن لال

ولادت ۱۲۱۲ ہجری بعہد نواب سعادت علی خاں۔ پانچ برس کی عمر میں میر جعفر علی ساکن قصبہ سنبھل (جو سادات بخارائی میں سے تھے) اُن کی تعلیم فارسی پر مقرر ہوئے۔ چھٹے سال میرزا محمد علی زبان ترکی سکھانے پر۔ نویں سال شیخ خان محمد درس صرف و نحو پر۔ اور گیارہویں سال ملا محمد اکبر شاہ کابلی بجائے شیخ خان محمد موصوف۔ بعض فارسی کتابیں مولوی محمد سعید شاگرد مولوی صبغۃ اللہ سے پڑھیں۔ بانک کا فن امید سنگھ سے۔ شمشیر بازی احمد خاں سے۔ تیراندازی اپنے والد اور خلیفہ قادر بخش سے۔ گھوڑے کی سواری (اسپ تازی) کالے خاں سے اور خط نستعلیق میر غلام حسین سے سیکھا۔ چودہ برس کی عمر میں قصبہ للاواں میں شادی ہوئی۔ پندرہ برس کی عمر تھی کہ اُن کے باپ یورپ کو گئے اور اُن کو حضرت شاہ نیاز احمد صاحب سرہندی کے سپرد کر گئے۔ شاہ صاحب ممدوح ریاضی میں خواجہ احمد دہلوی کے شاگرد تھے۔ اور خواجہ احمد منجم مشہور خیر اللہ کے علوم عقلی میں قاضی مبارک گوپامئو سے تلمذ تھا اور قاضی مبارک کو تلمذ میر زاہد ہروی سے۔ دو برس شاہ صاحب ممدوح کی خدمت میں رہ کر کتب ذیل پڑھیں۔ میر زاہد کے دو

رسالے۔ سُلّم تھوڑا سا صدرا۔ شمس بازغہ۔ زبدۃ الہیئۃ اور تین مقالے اقلیدس کے۔ مطول اور مسلّم مفتی محمد عوض سے۔ تفسیر بیضاوی ایک سورت کے فاضل تھے۔ اور طب کی درسیہ کتابیں حکیم جمال الدین سے دیکھیں۔ اسی سال سری اوچھا کپ اندر خلف اوچھا بر ندر فرزند اوچھا رتن بپ ولد ہمایوں گدا سے اپنے والد کی اجازت کے بعد بیعت کی معاریج العلوم اور حساب المنجمین اپنے والد سے فرخ آباد میں پڑھیں۔ سولھویں سال علم استخراج نجوم بزور مطالعہ حاصل کیا۔ اور رسالہ مصباح النجوم لکھا۔ اپنے علوم دینی۔ نیائے (منطق ہندی) اور سانکھ (علم طبعی) اُن سے از سر نو پڑھے۔ علم کاب (یعنی شعر ہندی) تواری خوشحال رائے سے جن کی عمر اس وقت اسّی برس کی تھی حاصل کیا۔

اُنیسویں سال دلّی جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں پہنچ کر اپنے والد کے استاد مولوی رفیع الدین صاحب کی خدمت میں زانوے تلمذ تہ کیا اور رسالہ مساکن و ایام ولیالی ثاذ وسیوس مجسطی اور طبیعیاتِ شفا کا درس لیا۔ اس تحصیل کے سوا باقی رسائل متوسطات تذکرہ اور مجسطی اپنے والد سے پڑھے تھے۔ تصوف کی بعض مشکلات شاہ غلام سکین سے حل کیں۔ اور علم منتر کی تکمیل سری پال کرشنا نند سرستی سے کی۔

تیس برس کی عمر تھی کہ ضلع شاہجہاں پور میں بعہدۂ پیشکاری ملازمت حاصل کی۔ اُسی زمانہ میں داغ فرزندی نصیب ہوا۔ اور اس صدمہ سے ملازمت چھوڑ کر تین برس کے قریب خانہ نشیں رہے۔ درمیان میں ایک دفعہ پھر استعفا دیا۔ آخر میں اپنے چھوٹے بھائی کو جگہ دلا کر ۱۸۳۷ء میں خانہ نشیں ہوگئے۔ اس عہد کی قدردانی کب بیکار رہنے دیتی تھی۔ مسٹر رابنسن نے باصرار بلا کر قنوج کی تحصیلداری پر مقرر کر دیا۔ ہنوز وہاں نہ پہنچے تھے کہ منتظم الدولہ ناظم الملک محمد مہدی علی خاں سپہدار جنگ دو مہینے کے وعدے پر لکھنؤ اپنے ساتھ لائے اور محمد علی شاہ کے حضور میں پیش کیا۔ پیشگاہ شاہی سے خدمت وقائع نگاری عطا ہوئی۔ پانچ برس کے بعد امجد علی شاہ نے عہدۂ میر منشی کے ساتھ راجہ کا خطاب بخشا۔

یہاں پہنچ کر لالہ کندن لال لکھتے ہیں۔ رمضان ۱۱۵۹ھ سے رفیقۂ زندگی کی مفارقت کے صدمے سے افسردہ و دل گیر رہتا ہوں۔ وفات کا حال معلوم نہیں لیکن ۱۲۶۳ھ (عہد واجد علی شاہ) تک زندہ تھے۔ آخر میں سیدھا ہاتھ بیکار ہو گیا تھا۔

تصنیفات راجہ کندن لال | مشکوٰۃ النجوم۔ در علم استخراج۔ مصباح الحساب۔ آدوار ماضیہ (علوم ہندیہ) آثار باقیہ (علوم یونانی پر) آداب باقیہ (علوم عرب پر) نوادر رافرنجیہ

(علوم انگریزی پر) نزہتہ الناظرین (مذکورۂ بالا چاروں کتابوں کا خلاصہ) جام جہاں نما (ہیئت)، استقساط (علم ہندسہ) قطعات (علم قطاع) و وحدۃ الصفا (علم طبعیات) سبعہ سیارہ۔ حکمت ہندی مصطلحات علوم۔ فرن لوجی حکمت پارسی قدیم۔ اکسیر سعادت (تطبیق میان تصوف و فلسفہ) نغمۂ عنادل (تصوف) دو رسالے سنسکرت میں (عبادت روزانہ و سالانۂ اہل ہند) منتخب پوران (سنسکرت میں) اور چھوٹے چھوٹے رسالے مختلف فنون میں مثل تصویر کشی۔ سائنٹ سائنس۔ زبان یونانی۔ عبرانی۔ اور سریانی کا لغت۔ انگریزی کی مدد سے ترجمہ کیا اور انگریزی کو اپنے مطالعہ کی مدد سے حاصل کیا۔ تین کتابیں حیوانات برو بحر اور طیور کے حال میں لکھیں۔

خاتمۃ الباب

راجہ کندن لال اور اُن کے خاندان کی داستان آپ نے سُنی۔ اُن تعلقات کو دیکھا جو گزشتہ سو سائٹیوں میں باہم تھے۔ بُلبلِ شیراز کا نغمہ گویا تصویرِ حال تھا ؎

مہرِ تو در وجودم و عشقِ تو در سرم
با شیر اندروں شد و با جان بدر شود

پشتوں کے حالات پڑھئے سلسلۂ ربط مسلسل نظر آئے گا۔ تلمذ اور شاگردی ہو تو نسلاً بعد نسل ملازمت کا تعلق ہو تو موروثی اور پشتینی۔ یہ کیا دلفریب منظر ہو کہ "اسامی علما و فقرا و اطبائے اسلام" میں حکیم اجیت سنگھ۔ کنور ہیرا لال۔ لالہ دیبی پرشاد بھی نظر آتے ہیں۔ راجہ کندن لال نے ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو ایک بخاری سید کے آغوشِ تربیت میں پایا۔ علوم کے سوا اور فنون (شمشیر بازی وغیرہ) سیکھی تو مسلمانوں سے سیکھی۔ مولوی رفیع الدین صاحب دہلوی اُس خاندان کے رُکن رکین تھے جو کئی پشت تک ہندوستان کا مذہبی اور دینی پیشوا رہا۔ اُن کی شفقت دیکھو کہ کندن لال اور اُن کے باپ دونوں کو دامنِ شفقت کے سایہ میں رکھا۔ اُستادوں کی محبت اور عظمت کی تصویر راجہ کندن لال کے یہ الفاظ ہیں۔ مولوی رفیع الدین صاحب کو اِن الفاظ سے یاد کیا ہے۔ "قدوۃ العلماء الراسخین۔ امام المتاخرین مولوی محمد رفیع الدین صاحب کہ اُستادِ والدم نیز بودند"۔ شاہ نیاز احمد صاحب بریلوی شیر بیشۂ ولایت تھے۔ یہ بھی راجہ کے موروثی اُستاد ہیں۔ اُن کا ذکر کس شان سے کرتے ہیں۔ "قاموسِ ذخارِ معانی حکمیہ۔ بحرِ محیط مطالبِ عقلیہ مرکزِ دائرۂ علوم

کاشفِ استارِ اخلاق و نجوم محی سنن حکمائے متقدمین زبدۂ علماے متاخرین فخر فلاسفۂ نامدار افتخار علماے ذوی وقار۔ حضرت شاہ نیاز احمد صاحب سرہندی"۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کا جہاں نام لیا ہے وہاں اس طرح۔ "زبدۂ حکماے انام قدوۂ اہلِ حکمت و کلام حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب"۔

ملازمت کا سلسلہ عہد شاہجہانی سے شروع ہوا تو اُس وقت تک رہا جب تک کہ سلطنت مغلیہ میں دم رہا۔ جہاں وہ اپنے بزرگوں کے نام کے ساتھ شاہجہانی، عالمگیری، محمدشاہی لکھتے ہیں وہاں فیاضی و قدردانی کی تصویریں آنکھوں میں پھر جاتی ہیں۔ جب دامنِ دربار ہاتھ سے چھوٹا تو امرار کی سرکار پسند کی۔ دلّی چھوٹی تو رام پور آئے۔ رام پور چھوڑا تو لکھنؤ گئے۔ غرض رہے اسی دائرہ میں۔ یہ وہ دَور ہے کہ زمانہ سکھوں، مرہٹوں، جاٹوں سبھی کے دربار سجا رہا تھا۔ لیکن ان کو کیا۔ ربط جس سے تھا اُس سے تھا۔ راجہ کندن لال نے دوسری ملازمت جس طرح کی اُس کی کیفیت آپ نے پڑھی۔ ملازمتوں کے ساتھ استعفوں کا سلسلہ جاری رہا۔ قنوج کی تحصیلداری چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے۔ اور وہاں تین درباروں نے معزز عہدوں پر ممتاز رکھا۔

اُس عہد کی تعلیم پر نگاہ ڈالو۔ علاوہ علوم کے، مردانہ فنون، استعمال اسلحہ، گھوڑے کی سواری، فنونِ لطیفہ، خوش نویسی، تصویرکشی وغیرہ دائرۂ تعلیم سے باہر نہ تھے۔ راجہ کندن لال کی ہمہ گیر طبیعت کا رنگ اُن کی تصانیف، اُن کی مختلف ملازمتوں اور اُن اہلِ کمال کی فہرست سے ٹپک رہا ہے جن سے وہ ملے۔ یہ ہمہ گیر طبیعتیں وہی تعلیم پیدا کر سکی جس پر صرف قدامت کے جرم میں نفرت کی نگاہیں پڑتی ہیں۔ جس عہد کی "آپ بیتی" راجہ کندن لال نے سنائی ہے وہ انقلاب حکومت اور شورش کا دَور تھا۔ تاہم ہر فن کے اہلِ کمال ہر جگہ کثرت سے نظر آتے ہیں۔ اس سے قیاس کیا جاتا ہے کہ ایک زبردست سلسلۂ تعلیم ملک میں رائج تھا۔ جو بدامنی میں بھی فیض رساں رہا۔ اہلِ ہند کے اہلِ کمال کی فہرست کہہ رہی ہے کہ یہ علوم و فنون کسی بربادکن اثر کے نیچے صدیوں پامال نہیں رہے تھے۔ بلکہ سرپرستی کے اثر سے اب تک اُن میں شگفتگی باقی تھی۔

راجہ کندن لال کی تصانیف میں سے اکسیر سعادت اور منتخب تنقیح اخبار میرے پاس ہیں۔

یہ حالات منتخب کا انتخاب ہیں۔ علاوہ ان کتابوں کے اُن کی بعض اور بھی نفیس علمی یادگاریں (مرقع تصاویر و خطّاطی) میرے یہاں موجود ہیں۔ فقط

(رسالہ زمانہ کانپور۔ ماہ جنوری ۱۹۰۶ء)

حضرت خضر علیہ السّلام

مسلمانوں میں کم تر اشخاص ایسے ہوں گے جو اس برگزیدہ نام کے ذکر سے رطب اللسان نہ ہوں۔ نام کے ساتھ وہ روایتیں بھی زبانوں پر ہیں جو حضرت خضرؑ کی نسبت مشہور ہیں۔ خصوصاً سکندر و آبِ حیات کا تعلق اور حیاتِ جاوید۔ زندہ دل شعرا نے بھی ان مضامین کو لیا ہے اور سحر بیان کی مدد سے ہزاروں یاران عظام رمیم میں جانِ تازہ ڈالی ہے۔ اس میں شبہ کی کم گنجایش ہے کہ ان روایات کی عام شہرت زیادہ تر شعرا کی جادو بیانی کا نتیجہ ہے۔

شہرت اور حقیقت بہت کم ساتھ رہتی ہے۔ شہرت کی شوخی و چالاکی حقیقت کی سلامت روی و متانت سے بہت آگے بڑھ جاتی ہے اور اکثر جہاں شہرت کا پرچم لہراتا نظر آتا ہے وہاں حقیقت کا نشان بھی نہیں ہوتا۔ جو روایتیں حضرت خضرؑ کے متعلق شہرۂ آفاق ہیں ان کی نسبت یہ بحث کہ آیا وہ کہاں تک محقّقین کے نزدیک قابل تسلیم ہیں خالی از فائدہ نہ ہوگی۔

لفظ "خضر" مشتق ہے خُضرۃ سے جس کے معنے ہیں سبزی، گندم گونی، نمکینی۔ دو طرح مستعمل ہے خِضر (بکسر خاء وسکون ضاد) دوم خَضِر (بفتح خاء وکسر ضاد) عربی میں ثانی فصیح تر ہے، فارسی میں اول زیادہ مروّج ہے۔

قرآن مجید کی سورۂ کہف میں خدا کے ایک خاص بندہ سے حضرت موسیٰؑ کے ملنے کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ربّانی کا ترجمہ و خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

"(دو دریاؤں کے ملنے کی جگہ پہونچ کر) انھوں نے (یعنی حضرت موسیٰ اور ان کے خادم نے)

ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ کو پایا جس کو ہم نے اپنی مہربانی میں سے دیا اور اپنی طرف سے اس کو ایک علم سکھایا تھا۔ موسیٰؑ نے ان سے کہا کہ آپ اجازت دیں تو میں آپ کے ساتھ رہوں بشرطیکہ جو علم (لدنی) آپ کو سکھایا گیا ہے اس میں سے کچھ مجھ کو بھی سکھا دیں۔ انھوں نے کہا تم کو میرے ساتھ ہرگز صبر نہ ہو سکے گا، اور جو چیز تمہاری آگہی کے احاطہ سے باہر ہے اس پر تم کیسے صبر کر سکتے ہو۔ موسیٰؑ نے کہا کہ انشاء اللہ آپ مجھ کو ضابط پائیں گے اور میں آپ کے کسی حکم کے خلاف نہ کروں گا۔ انھوں نے کہا اگر تم کو میرے ساتھ رہنا ہی ہے تو جب تک میں تم سے کسی بات کا تذکرہ نہ کروں تم مجھ سے اس کی بابت کچھ پوچھنا ہی نہیں (اس کے بعد کشتی میں سوراخ کرنے، لڑکے کے قتل کرنے اور دیوار بنا دینے کا واقعہ بیان فرمایا گیا ہے۔ آخر میں اس خاص بندے نے اپنے افعال کی حکمت بیان کر کے کہا ہے میں نے جو کچھ کیا اپنے اختیار سے نہیں کیا۔ یہ ہے اصل حقیقت اس کی جس پر تم سے صبر نہ ہو سکا۔"

کلام مجید میں ان کی نسبت جو ارشاد ہے صرف اس واقعہ کا بیان ہے جو موسیٰؑ کے ساتھ گزرا۔ رہا اُن کا زندہ جاوید ہونا یا قصۂ آب حیات وغیرہ اُس کا ذکر کہیں کلام مجید میں نہیں ہے۔

امام ابن الدین حجر عسقلانی نے اصابہ کے باب الخاء میں خضر علیہ السلام کے متعلق مفصل بحث کی ہے اور ۴۸ صفحوں میں وہ صحیح اور غیر صحیح روایتیں جمع کی ہیں جو اس بارہ میں آئی ہیں۔ حافظ ممدوح جس پایہ کے محقق ہیں وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ شاہ عبدالعزیز صاحبؒ بستان المحدثین میں فرماتے ہیں "تصانیف ابن حجر زیادہ بر یک صد و پنجاہ کتاب ست و بہتر و محکم تر از تصانیف جلال الدین سیوطی ست .... اتقان و ضبط علم حافظ ابن حجر بیشتر از علم جلال الدین سیوطی ست ہر چند عبور و اطلاع فی الجملہ سیوطی را زیادہ باشد۔" اپنے داب و دستور کے مطابق موقع بالا پر ابن حجر نے حضرت خضرؑ کی نسبت بھی اس تدقیق سے بحث کی ہے کہ کوئی پہلو نہیں چھوڑا۔ حق جو نگاہ اس کے پڑھنے کے بعد پوری تسلی حاصل کر سکتی ہے۔ حقیقت شناس اہل نظر کے واسطے مضمون بالا کا لب لباب ذیل میں لکھا جاتا ہے۔

خضر (صاحب موسیٰ علیہ السلام) اُن کے نسب، نبوت، طول عمر اور بقا میں اختلاف ہے۔ اگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک اور اُس کے بعد تک اُن کے زندہ رہنے کو تسلیم کیا جائے تو ایک قول کے مطابق وہ صحابی کی تعریف میں داخل ہیں۔ مگر متقدمین میں سے کسی نے صحابہ کے ساتھ اُن کا ذکر نہیں کیا حالانکہ اکثر نے اُن اقوال کو قبول کیا ہے جو اُن کے معمرًا اور زندہ ہونے کے بارہ میں وارد ہیں۔ جہاں تک معلوم ہو سکے میں نے اُن کے حالات اس باب میں جمع کر کے صحیح اور غیر صحیح ہونے کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

وجہ تسمیہ | مجن کی روایت ہے "فانہ جلس علی فروۃ بیضاء فاذا ھی تھتز تحتہ خضراء" (بہذا لفظ احمد) یعنی چٹیل زمین اُن کی نشست کی برکت سے لہلہانے لگی تھی۔

نبوت | کلام مجید میں حکایت موسیٰؑ کے سلسلہ میں حضرت خضرؑ کا یہ قول منقول ہے "وما فعلتہ عن امری" یعنی میں نے یہ فعل از خود نہیں کیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ فعل مذکور بحکم الٰہی وقوع پذیر ہوا۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ حکم اُن تک کس طرح پہونچا۔ بلا[1] واسطہ آیا ہو۔ یہ بھی احتمال ہے کہ کسی پیغمبر کے ذریعہ سے ہوا ہو۔ یہ احتمال بعید ہے (اس لئے کہ اس کا کوئی قرینہ نہیں) الہام[2] کے ذریعہ سے ہو یہ اس لئے قابل تسلیم نہیں کہ الہام یقینی ہونے میں وحی کا ہم پلہ نہیں اور بدون وحی ایسے امور صادر نہیں ہو سکتے جیسے قتل نفس یا بہت سی جانوں کو خطرۂ غرق میں ڈالنا۔ نبوت مان لینے سے سب پہلو درست ہو جاتے ہیں۔ نیز نبی غیر نبی سے زیادہ عالم کس طرح ہو سکتا ہے۔ حدیث صحیح میں وارد ہے "ان اللہ قال لموسیٰ بل عبدنا خضر" نیز نبی غیر نبی کے تابع کس طرح ہو سکتا ہے۔ ثعلبی کا مقولہ ہے کہ حضرت خضر (تمام اقوال کے موافق) طویل العمر نگاہوں سے پوشیدہ اور نبی ہیں۔ ابو حیان اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ جمہور اُن کی نبوت کے قائل ہیں نیز اس امر کے کہ بذریعہ وحی ان کا علم معرفت باطنی تھا اور حضرت موسیٰؑ کا علم ظاہری۔ حضرات صوفیہ میں ایک گروہ اُن کے ولایت کا قائل ہے۔ علی بن ابی موسیٰ حنبلی اور ابو بکر انباری بھی (نبوت وغیر نبوت کا اختلاف نقل کرنے کے بعد)

---

[1] آتیناہ من لدنا علما۔

ولایت کے قائل ہیں۔ ابو القاسم قشیری اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں کہ خضرؑ نبی نہ تھے ولی تھے۔ ماوردی نے ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ وہ منجملہ فرشتوں کے ایک فرشتے ہیں۔ ابو الخطاب ابن وجیہ لکھتے ہیں کہ معلوم نہیں وہ فرشتے ہیں یا نبی یا ولی۔ بعض اکابر علما کا قول ہے کہ زندقہ کی بنیاد پر پہلی چوٹ حضرت خضرؑ کی نبوت کا اعتقاد ہے۔ کیونکہ زنادقہ اُن کی ولایت سے اس بات پر استدلال کرتے ہیں کہ ولی پیغمبر سے افضل ہے چنانچہ کسی کا قول ہے" مقام النبوۃ فی برزخ فوق الرسول ودون الولی" یعنی برزخ میں مقام النبوت رسالت سے اوپر اور ولایت سے نیچے ہے۔ نبوت کے تسلیم کرنے کے بعد رسالت کی بحث ہے کہ آیا وہ نبی تھے تو رسول بھی تھے یا نہیں؟ حضرت ابن عباس کا قول ہے کہ وہ نبی غیر مرسل تھے۔ اسمٰعیل بن ابی زیاد محمد بن اسحاق اور بعض اہل کتاب کا یہ عقیدہ ہے کہ وہ اپنی قوم کی جانب مرسل تھے اور اُن کی قوم نے اُن کی رسالت کو قبول کیا۔ ابو الحسن رمانی اور ابن جوزی نے اس کی تائید کی ہے۔ حافظ ابن حجر خلاصۂ بحث فرماتے ہیں کہ" ان غالب اخبارہ مع موسیٰ ھی الدالۃ علی تصحیح قول من قال انہ کان نبیا" یعنی جو ماجرا حضرت موسیٰؑ کے ساتھ گزرا وہ اُن لوگوں کے قول کا موئد ہے جو حضرت خضرؑ کی نبوت کے قایل ہوئے ہیں۔

زمانۂ پیدائش اس عنوان میں جو اقوال منقول ہیں وہ نہ محدثانہ ہیں نہ مورخانہ لہذا نظر انداز کئے جاتے ہیں۔

قصۂ ذو القرنین ابن عساکر نے بواسطہ خثیمہ بن سلمان ابو جعفر سے روایت کی ہے کہ اُن کے والد نے روایت کی (جس کا خلاصہ متعلق مدعا یہ ہے) کہ ذو القرنین کا ایک دوست گروہ ملائکہ میں سے تھا۔ ذو القرنین نے ایک روز اُس سے درازیٔ عمر کی ترکیب پوچھی تو اُس نے آب حیات کا چشمہ بتلایا جو ظلمات میں تھا۔ ذو القرنین وہاں گیا۔ حضرت خضر مقدمۃ الجیش تھے۔ ان کو آب حیات ملا، ذو القرنین ناکام رہا۔ خثیمہ بن سلمان نے حضرت جعفر صادق سے انھوں نے اپنے والد ماجد سے مثل بالا روایت کی ہے۔ سلمان الشیخ صاحب کعب احبار سے روایت کی جاتی ہے کہ خضرؑ ذو القرنین کے وزیر تھے (سکندر کا نام کسی روایت میں نہیں۔ اس میں بہت بحث ہے کہ ذو القرنین کون تھا)۔

نمبر	نام راوی	مضمون روایت	جرح وتعدیل
	ابن شاہین	انبیاء میں سے چار نبی زندہ ہیں دو آسمان پر عیسیٰ و ادریس دو زمین پر خضر و الیاس الخ	اس کی اسناد ضعیف ہے۔
	ثعلبی	ثعلبی نے کہا کہ کہا جاتا ہے (یقال) خضر اُس وقت تک زندہ رہیں گے کہ قرآن اُٹھا لیا جائیگا	

نووی نے لکھا ہے کہ اکثر علماء اُن کے زندہ اور موجود ہونے کے قائل ہیں اور یہ صوفیہ اور اہلِ صلاح ومعرفت کے نزدیک متفق علیہ ہے۔ اور وہ حکایتیں (جن میں انھیں دیکھنا۔ اُن سے ملنا۔ فائدہ حاصل کرنا اور سوال وجواب مقامات مقدسہ و مواقعِ خیر میں اُن کا موجود ہونا مذکور ہے) شمار سے باہر ہیں اور اُن کی شہرت حدِ بیان سے خارج۔ ابن الصلاح نے اپنے فتاویٰ میں لکھا ہے کہ وہ جمہور علماء و عامہ صلحاء کے نزدیک زندہ ہیں اور اس سے جس نے انکار کیا ہے وہ بعض محدثین ہیں (وانما شذ بانکارہ بعض المحدثین)۔ امام ابن حجر عسقلانی ان دونوں قولوں کی تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں بعض متاخرین نے وہ حکایات جمع کی ہیں جو صلحاء وغیرہ سے تیسری صدی ہجری کے بعد نقل کی گئی ہیں (وقد اعتنی بعض المتاخرین بجمع الحکایات الماثورة عن الصالحین وغیرہم ممن ورد بعد ثلاثمائة) اُن کی تعداد دسیوں تک نہیں پہونچی۔ ان میں سے بعض کی اسناد میں ایسے لوگ موجود ہیں جن کی تضعیف بوجہ اُن کی کثرتِ اغلاط یا ایہامِ کذب کے کی گئی ہے۔ مثلاً ابو عبد الرحمان سلمی اور ابو الحسن بن جہضم۔ یہ کہنا کہ چونکہ تواتر میں راویوں کے ثقہ اور عادل ہونے کی شرط نہیں بلکہ یہ شرط ہے کہ اس خبر کو اس قدر کثیر راوی روایت کریں کہ اُن کا اجتماع کذب پر عادۃً محال ہو۔ اگر سب کے الفاظ ایک ہوں تو فبہا ورنہ جس قدر بیان مشترک ہوگا متواتر سمجھا جائے گا۔ لہذا ان روایتوں سے بھی تواتر معنوی مستفاد ہوتا ہے، صحیح نہیں کیونکہ ان روایتوں کا قدر مشترک یہ ہے کہ خضرؑ زندہ ہیں لیکن اس میں یہ خلل ہے کہ بعض کا یہ قول ہے کہ ہر زمانہ کے خضرؑ جدا ہیں اور وہ نقیب الاولیاء ہیں۔ جب ایک نقیب رحلت کرتا ہے دوسرا اُس کی جگہ مقرر ہو جاتا ہے۔ نئے نقیب کا نام بھی خضر رکھا جاتا ہے۔ یہ وہ قول ہے جو صوفیہ کے ایک

گروہ میں برابر بدون اختلاف متداول رہا ہے۔ اس صورت میں یہ تعین نہیں ہو سکتا کہ جو بزرگ نظر آئے وہ رفیق حضرت موسیٰ تھے یا خضر زمان۔ اس کی تائید اس اختلاف حلیہ سے ہوتی ہے جو دیکھنے والے بیان کرتے ہیں۔ کوئی بوڑھا بتاتا ہے کوئی ادھیڑ کوئی جوان اور یہ اس پر محمول ہے کہ لوگوں نے مختلف اوقات میں مختلف اشخاص کو دیکھا اور ہو محمول علی تغایر المرئی و زمانہ واللہ اعلم۔ سہیلی نے کتاب التعریف والاعلام میں کہا ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ خضرؑ نے آنحضرت کا زمانہ نہیں پایا صحیح نہیں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ بخاری اور ایک گروہ محدثین اس امر کے قائل ہیں کہ خضر اول صدی ہجری کے انقضا سے قبل رحلت کر گئے۔ اور ہمارے شیخ ابوبکر بن العربی نے حدیث "لایبقی علی وجہ الارض" سے اس قول کی تائید کی ہے۔ سہیلی نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ خضر کا آنحضرت سے ملنا اور وفات شریف پر تعزیت اہل بیت کرنا طرق صحاح سے مروی ہے۔ منجملہ اُن کے وہ روایت ہے جو ابن عبداللہ نے تمہید میں نقل کی ہے جو اپنے وقت کے امام حدیث تھے۔ روایت مذکور میں ہے کہ لوگ تعزیت کرنے والے کی آواز سنتے تھے مگر صاحب آواز کو دیکھتے نہ تھے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ یہ خضر ہیں۔ سہیلی کا یہ بھی قول ہے کہ ابن ابی الدنیا نے مکحول کی روایت سے حضرت انس سے الیاس کا آنحضرت سے ملنا روایت کیا ہے۔ اور جب بقار الیاس عہد قدسی تک تھی تو بقار خضر بھی جائز ہے۔ ابوالخطاب ابن وحیہ نے بیانات سہیلی پر یہ اعتراض کیا ہے کہ جن روایتوں کی طرف سہیلی نے اشارہ کیا ہے اُن میں ایک بھی صحیح نہیں اور خضر کا اجتماع کسی نبی کے ساتھ سوائے حضرت موسیٰ کے ثابت نہیں (جس کی شکایت کلام الٰہی میں ہے) اور جو روایات اُن کی حیات کے متعلق ہیں اُن میں سے ایک بھی اہل نقل کے نزدیک پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچی۔ جو لوگ اُن کو نقل کرتے ہیں اور اُن کے سقم (ماعلیہ) کو بیان نہیں کرتے اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو ناقلین کے علم میں اس کا نہ ہونا دوسرے سقم کا وضوح اہل حدیث کے نزدیک اور مشائخ نے جو کچھ اس بارے میں نقل کیا وہ خالی از تعجب نہیں ہے لئے کہ ایک خردمند اس کو کیونکر روا رکھ سکتا ہے کہ وہ کسی شخص سے ملے اور وہ یہ کہے کہ میں خضر ہوں اور وہ اس کی تصدیق کرے۔ رہی حدیث تعزیت جس کو ابو عمر نے نقل کیا ہے وہ موضوع ہے

جس کو عبداللہ بن المحرز نے یزید بن الاصم سے اُس نے علیؓ سے روایت کیا ہی۔ ابن المحرز متروک ہی جس کی نسبت ابن المبارک نے (جیسا کہ مقدمہ صحیح میں مسلم نے لکھا ہی) فرمایا ہی کہ میں اونٹ کی مینگنی دیکھنے کو ابن المحرز کے دیکھنے سے بہتر سمجھتا ہوں۔ اس طرح اُنھوں نے نجاست کو اس کی روایت سے افضل سمجھا (ابن حجر کہتے ہیں کہ حدیث تعزیت اور طریقوں سے بھی مروی ہی جو آگے مذکور ہوں گے) حدیث ... روایت کیجئے موضوع ہی جس کی تکذیب باقوال امام احمد یحییٰ، اسحاق ور ابوزرعہ ثابت ہی اُس کا منشا ظاہر اللہ کا رہ (کھلے طور پر غلط) ہی۔ اور منجملہ مجازفات (لغویات) ہے۔ انتہی ملخصاً کلام ابوالخطاب۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ میں حدیث انس کو بطولہ ذکر کردوں گا۔ نیز یہ کہ اس کے اور طریقے بھی ہیں سوائے اُس کے جو سہیلی نے لکھا ہی۔ جو لوگ ان کے معمر ہونے کے قایل ہیں وہ آپ حیات سے سند لاتے ہیں۔ نیز اُس بیان سے جو صحیح بخاری و ترمذی میں ہی۔ لیکن یہ لحاظ رہی کہ وہ مرفوعاً ثابت نہیں۔

چند حالات حضرت خضرؑ کا ذکر جو بعثت آنحضرتؐ سے پہلے وقوع میں آئے

اس سلسلہ میں مستند وہ ماجرا ہی جو حضرت موسیٰ کے ساتھ کلام مجید میں مذکور ہی اور جو بروایت صحیحین ثابت ہی۔ اس کے بعد وہ روایت ہی جو طبرانی نے معجم کبیر میں حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کی ہی۔ اس کا خلاصہ یہ ہی کہ آپ نے فرمایا کہ خضرؑ ایک روز بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک مکاتب غلام نے آواز دی کہ مجھ کو کچھ دو اللہ تمہارے مال میں برکت کرے گا۔ خضرؑ نے کہا کہ میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں جو وہ چاہتا ہی وہی ہوتا ہی۔ میرے پاس کچھ نہیں جو میں تجھ کو دوں۔ اُس مسکین نے کہا کہ میں خدا کا واسطہ دے کر تم سے سوال کرتا ہوں۔ میں نے تمہارے چہرہ پر آثار بزرگی دیکھ کر بہبودی کی امید باندھی تھی۔ خضرؑ نے کہا کہ میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں میرے پاس کچھ نہیں البتہ تم مجھ کو لے چل کر بازار میں بیچ لو۔ مسکین نے کہا یہ واقعی کہتے ہو۔ کہا ہاں۔ اس لئے کہ تو نے ایک ایسا عظیم الشان واسطہ دیا ہی کہ میں تجھ کو محروم نہیں کر سکتا۔ غلام یہ سن کر ان کو بازار میں لے گیا اور چار سو درہم کو بیچ دیا۔ مالک نے عرصہ تک تو ان سے کچھ کام

نہیں لیا۔ آخر انھوں نے ایک روز کہا کہ تم نے مجھ کو کسی نفع کے خیال سے خریدا ہوگا پھر کام کیوں نہیں لیتے۔ مالک نے کہا تمہارے بڑھاپے کی وجہ سے۔ انھوں نے کہا میں کام بے تکلف کرسکتا ہوں۔ مالک نے امتحاناً ایک گراں وزن پتھر اٹھانے کی ہدایت کی۔ وہ گھر سے باہر گیا تو انھوں نے پتھر اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دیا۔ مالک نے آکر دیکھا تو حیرت میں رہ گیا۔ اور بے ساختہ آفریں کہی ایک بار مالک باہر گیا تو کہا کہ میں تم کو متدین سمجھ کر اپنے بچوں کی نگرانی تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ انھوں نے کہا بہتر اور کچھ کام بھی بتلاتے۔ مالک نے کہا زیادہ کام سے تکلیف ہوگی۔ انھوں نے کہا نہیں تکلیف نہ ہوگی۔ غرضکہ مالک نے اینٹیں پاتھنے کی خدمت بھی سپرد کی۔ لوٹ کر دیکھا تو مکان تیار تھا۔ حیرت زدہ ہو کر پوچھا کہ تم کون ہو اور تمہارا کیا حال ہے انھوں نے کہا کہ میں خضر ہوں۔ اس کے بعد مسکین کا قصہ کہا۔ مالک نے یہ سنا تو معذرت کرکے ان کو آزاد کر دیا۔ یہ حدیث حسن ہو تو اگر بقیہ کا عنعنہ اس میں نہ ہوتا اور اگر ثابت ہوتی تو یہ ثابت ہو جاتا کہ خضر نبی تھے۔ کیونکہ مالک نے ان سے کہا تھا "یا نبی اللہ"۔

وہ لوگ جو وفات خضر کے قائل ہیں

ابوبکر نقاش نے اپنی تفسیر میں حضرت علی بن موسیٰ رضا اور امام بخاری سے یہ روایت کی ہے کہ خضر مر گئے اور امام بخاری سے حیات خضر کے بابت سوال کیا گیا تو انھوں نے اس حدیث کی بنیاد پر ان کے زندہ ہونے سے انکار کیا "لا یبقی علی وجه الارض ممن هو علیها احد"[1] [illegible] یہ حدیث انھوں نے حضرت ابن عمرؓ سے اپنی صحیح میں روایت کی ہے۔ جو لوگ وفات خضر کے قائل ہیں اور ان کی بقا کے منکر ان کی یہ عمدہ دلیل ہے۔ ابوحیان اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ مذہب جمہور یہ ہے کہ خضر نے وفات پائی۔

ابن ابی الفضل سے منقول ہے کہ خضر صاحب موسیٰ نے رحلت کی۔ اس لئے کہ اگر زندہ ہوتے تو ان پر آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہونا آپ پر ایمان لانا اور آپ کا اتباع کرنا لازم ہوتا حالانکہ آپ سے یہ ارشاد مروی ہے کہ اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو ان پر بھی میرا اتباع لازم ہوتا۔ انھوں نے

---

[1] اس جملہ سے لفظاً [illegible] تک حیات کی نفی ثابت نہیں ہوتی۔ محی الدین [2] اس کی نفی بھی ثابت ہے۔

اشارہ کیا ہی کہ خضر اور ہیں اور صاحب موسیٰ اور۔ اور بعض نے یہ کہا ہی کہ ہر زمانے کے لئے ایک خضر ہیں اور یہ دعویٰ بلا دلیل ہی۔ ابوالحسن بن المبارک نے جو کتاب احوال خضر میں جمع کی ہی اُس میں وہ ابراہیم حربی کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ خضر نے رحلت کی۔ اسی کا یقین ابن المنادی نے کیا ہی۔ انھوں نے یہ حدیث بھی نقل کی ہی "عن علی بن موسی الرضا عن سالم بن عبداللہ بن عمر عن ابیہ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم ذات لیلۃ بعد صلوٰۃ العشاء فی اٰخر حیاتہ فلما سلم قال ارایتکم لیلتکم ھذہ فان علی راس مائۃ سنۃ لا یبقی علی وجہ الارض احد" اخرجاہ واخرج مسلم من حدیث جابر قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم قبل موتہ بشھر تسألونی الساعۃ وانما علمھا عند اللہ اقسم باللہ ما علی الارض نفس منفوسۃ یاتی علیھا مائۃ سنۃ۔ ھذہ روایۃ ابن الزبیر عنہ وفی روایۃ نضرۃ عنہ قال قبل موتہ بقلیل او بشھر ما من نفس وزاد فی اٰخرہ وھی یومئذ حیۃ واخرج الترمذی عن طریق ابی سفیان عن جابر نحو روایۃ ابن الزبیر۔ ابن الجوزی نے جو کتاب اس موضوع پر لکھی ہی اُس میں لکھا ہی کہ ابو یعلی حنبلی کہتے ہیں کہ ہمارے بعض اصحاب سے خضر کی بابت سوال کیا گیا کہ آیا انھوں نے رحلت کی تو جواب دیا کہ ہاں وہ کہتے ہیں کہ مجھ کو بھی قول ابوطاہر عبادی کا پہونچا ہی۔ اور وہ یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ اگر وہ زندہ ہوتے تو آنحضرت کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے[له]

ابن حجر یہ لکھ کر کہتے ہیں کہ ابوالفضل بن ناصر، قاضی ابوبکر بن العربی اور ابوبکر نقاش بھی انھیں بزرگوں کے ہم خیال تھے۔ ابن جوزی وفات خضر پر اس حدیث سے بھی استدلال کرتے ہیں (جس کو امام احمد نے حضرت جابر سے روایت کیا ہی کہ اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو اُن کو سوا میرے اتباع کے کچھ چارہ نہ ہوتا۔ جب آنحضرت نے حضرت موسیٰ کی نسبت یہ فرمایا تو حضرت خضر کو بطریق اولیٰ اتباع کرنا پڑتا۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو آپ کے ساتھ ضرور جمعہ و جماعت میں شریک ہوتے آپ کے علم زیر سایہ جہاد کرتے۔ جس طرح یہ ثابت ہی کہ حضرت عیسیٰ اس امت کے امام

[له] حضرت عیسیٰ بھی زندہ ہیں مگر ایک مرتبہ بھی حاضر خدمت نہیں ہوئے۔

کے پیچھے نماز پڑھیں گے - نیز اس آیت سے استدلال کرتے ہیں۔ "واذ اخذ اللہ میثاق النبیین" الآیہ - ابن عباس فرماتے ہیں کہ جس نبی کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا اُن سے یہ عہد لیا کہ اگر اُن کی حیات میں آنحضرت مبعوث ہوں تو وہ اُن پر ایمان لائیں اور اُن کی مدد کریں پس اگر خضرؑ عہد مبارک میں زندہ ہوتے تو آپ کے پاس آتے اور آپ کی مدد ہاتھ اور زبان سے کرتے اور آپ کے علم کے نیچے جہاد کرتے ۔ اور یہ بڑا سبب اہلِ کتاب کے اسلام لانے کا ہوتا - کیونکہ اُن کے اور حضرت موسیٰ کے قصے سے واقف تھے - ابن منادی کہتے ہیں کہ میں نے زندگی خضر اور اس امر سے کہ آیا وہ زندہ ہیں یا نہیں بحث کی ہے - اس سلسلے میں میں نے دیکھا کہ اکثر بے خبر اس دھوکے میں ہیں کہ وہ اب تک زندہ ہیں - اُن کے خیال کا منشا وہ روایات ہیں جو اس بارہ میں آئی ہیں لیکن روایتوں کا حال یہ ہے کہ احادیث مرفوعہ اس بارہ میں واہی ہیں اور اہل کتاب کی طرف جو روایتیں منسوب ہیں وہ اس لئے قابل اعتبار نہیں کہ وہ لوگ خود قابل اعتماد نہیں ۔ مسلمۃ ابن مصقلہ کی روایت بمنزلہ خرافات ہے اور روایت ریاح مثل ریح (باد ہوائی) ہے ان کے سوا بھی جس قدر روایتیں ہیں وہ سب واہی الصدر والاعجاز (بے سر و پا) ہیں - وہ دو حال سے خالی نہیں یا تو ثقات نے نادانستہ اُن کو روایت کر دیا ہے - یا بعض نے قصداً ایسا کیا ہے حالانکہ اللہ پاک ارشاد فرماتا ہے - "وما جعلنا لبشر من قبلک الخلد" یعنی ہم نے تم سے پہلے کسی آدمی کو بقا نہیں بخشی - اہل حدیث ناقل ہیں کہ حدیث انس منکر السند سقیم المتن ہے - اور یہ کہ خضرؑ نے ہمارے نبی سے نہ بذریعۂ ایلچی گفتگو کی اور نہ ملاقات کی - اگر خضر زندہ ہوتے تو وہ آنحضرت سے الگ نہیں رہ سکتے تھے اور ہجرت اُن پر واجب ہوتی - اور مجھ کو ہمارے اصحاب نے خبر دی ہے کہ ابراہیم حربی سے حیات خضرؑ کی بابت سوال کیا گیا تو انھوں نے انکار کیا - اور کہا وہ پہلے ہی رحلت کر چکے - اُن کے سوا اوروں سے بھی سوال کیا گیا تو یہ جواب دیا کہ جو شخص زندہ غائب یا میت کا حوالہ دے اُس نے اُس کے حق میں انصاف نہیں کیا - اور یہ خیال انسانوں میں شیطان نے القا کیا ہے - انتہیٰ - ابن حجر کہتے ہیں کہ میں نے اُن روایات کی تصریح کی ہے جن کی طرف ابن منادی نے اشارہ کیا ہے اور اُن پر بہت کچھ اضافہ کیا ہے - اُن کا غالب حصہ خالی از علت نہیں - واللہ المستعان

تفسیر اصبہانی میں ہے کہ حسن بصری سے روایت کی گئی ہے کہ ان کا مذہب یہ تھا کہ خضر نے وفات پائی۔ امام بخاری سے سوال کیا گیا تو انھوں نے خضرؑ و الیاسؑ دونوں کی زندگی سے بربناء حدیث "رأس مأتہ سنۃ" انکار کیا۔ ابن جوزی اُن کی وفات پر اُس دعا سے بھی استدلال کرتے ہیں جو آنحضرت نے غزوۂ بدر کے موقع پر کی تھی یعنی اے اللہ اگر تو اس گروہ (مومنین) کو ہلاک کردے گا تو پھر تیری زمین پر عبادت نہیں کی جائے گی۔ خضرؑ گروہ مذکور میں شامل نہ تھے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو اس میں شامل ہوتے؛ اس لئے کہ وہ یقینی عبادت الٰہی کرنے والوں میں سے تھے۔ بعض نے حدیث "لا نبی بعدی" سے بھی استدلال کیا ہے۔ لیکن ابن وجیہ نے اس پر مفصل گفتگو کی ہے اور اس دلیل پر اعتراض کیا ہے کہ حضرت عیسیٰ قطعاً نبی ہیں تاہم وہ آخر زمانے میں زمین پر تشریف لائیں گے اور بموجب شرع محمدی احکام جاری کریں گے۔ پس مطلب حدیث یہ ہے کہ نبی جدید مبعوث نہ ہوگا جو پہلے سے نبی ہیں اُن کے وجود کی نفی نہیں۔

(یہ بیان کہ حضرت خضر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں موجود تھے اور آج تک موجود ہیں) جو روایتیں ابن حجر نے اس عنوان کے تحت میں لکھی ہیں اُن کو بہ شکل نقشہ ہم نقل کرتے ہیں۔ نقشہ کے دیکھنے سے واضح ہوگا کہ وہ روایتیں قریباً سب کی سب ضعیف و مجروح ہیں اور اُس پایہ کی نہیں جن کو بموجب اصطلاح محدثین صحیح کہہ سکیں؛ کوئی صحاح ستہ کی روایت نہیں بلکہ اُن کتابوں کی ہیں جو اُن کے رتبہ کی نہیں۔

نمبر	نام راوی	خلاصۂ روایت	جرح
۱	کامل[۱] ابن عدی بروایت ابن عوف۔ ابن[۲] المنادی ابن[۳] العساکر طبرانی[۴] (اوسط)	آنحضرت نے مسجد میں ایک شخص کی دعا کی آواز سنی کہ وہ یہ دعا کر رہا ہے "اللھم اعنّی علی ما ینجینی مما خوّفتنی" آپ نے سن کر فرمایا کہ اُس کے دوسرے جزء کو کیوں نہیں ملاتا۔ اتنے میں اُس شخص	اس روایت میں کثیر بن عبداللہ بن عاصم سے صرف وضاح نے روایت کی ہے؛ اُس سے روایت میں محمد بن سلام منفرد ہے۔ ابن المنادی کہتے ہیں کہ یہ حدیث واہی ہے۔ بسبب وضاح وغیرہ کے وہ منکر الاسناد سقیم المتن ہے۔

نمبر	نام راوی	خلاصۂ روایت	جرح
	ابن حجر کہتے ہیں کہ علاوہ ان کے دو ذریعوں سے اور بھی یہ روایت آئی ہے۔ ابن شاہین۔ دارقطنی (افراد)	ان نے کہا "اللھم ارزقنی شوق الصالحین الی ما شوقتھم الیہ" یہ سن کر آپ نے حضرت انس سے فرمایا کہ اس شخص کے پاس جاکر کہو کہ رسول اللہ کی تم سے فرمایش ہے کہ میرے لئے استغفار کرو۔ حضرت انس نے یہ پیغام پہونچایا تو اس شخص نے کہا کہ تم رسول اللہ کے رسول ہو تو لوٹ کر جاؤ اور اس کو ثابت کرلو۔ وہ آئے اور ماجرا سنایا آپ نے فرمایا نعم (ہاں ہو) اس شخص نے جب یہ سنا تو کہا جاؤ اور یہ کہو کہ آپ کو اللہ نے انبیاء پر اسی طرح فضیلت بخشی ہے جس طرح رمضان کو اور مہینوں پر اور آپ کی امت کو ایسا افضل بنایا ہے جیسے جمعہ کو باقی ایام پر حضرت نے ان کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ خضرؑ ہیں۔	خضرؑ نے آنحضرتؐ سے نہ بالواسطہ گفتگو کی اور نہ ملاقات۔ ابن الجوزی نے اس کو اس بنا پر مستبعد سمجھا ہے کہ باوجود ملاقات کے موقع کے خضر آپ کی خدمت میں نہ آئے۔ ابن عساکر نے ابن خالد کے واسطے سے روایت کی ہے دارقطنی کی روایت میں محمد بن عبد اللہ ہے جو نہایت واہی الحدیث ہے۔
	(فوائد) ابن اسحٰق	اس روایت میں حضرت الیاسؑ کا بھی ذکر ہے کہ وہ ہر سال حج کے زمانے میں باہم ملتے ہیں۔ الخ	دارقطنی کا قول ہے کہ ابن جریج سے اس کو حسن بن رزین کے سوا کسی نے روایت نہیں کیا۔ ابو جعفر عقیلی کہتے ہیں کہ اس کی پیروی نہیں کی گئی اس لئے کہ وہ مجہول ہے اور اس کی حدیث غیر محفوظ۔ ابن المنادی کہتے ہیں کہ یہ حدیث واہی ہے کیونکہ اس کے راویوں میں حسن (مذکور) ہے۔

نمبر	نام راوی	خلاصہ روایت	جرح
۳		روایت بالا طریق احمد بن عمار کے سوا اور طرح بھی آئی ہی بواسطۂ مہد بن ہلال	ابن الجوزی نے لکھا ہی کہ دارقطنی کے نزدیک احمد بن عمار متروک ہی علیٰ ہذا القیاس مہدی بن ہلال موضوعات کی روایت کرتاہے۔
۴	بواسطۂ عبید بن اسحاق	حضرت جبرئیل ومیکائیل واسرافیل وخضرؑ ہرعرفہ کو باہم ملتے ہیں۔الخ	عبید بن اسحاق متروک الحدیث ہے۔
۵	عبداللہ بن احمد (کتاب زہد)	الیاسؑ وخضرؑ بیت المقدس میں شہر رمضان میں باہم ملتے ہیں۔الخ	معضل ہے
۶	ابوعلی (فوائد)	آنحضرت کا ارشاد کہ الیاس ویسع ہر سال حج میں ملتے ہیں۔الخ (مقاتل کا قول ہی کہ یسع اور خضر ایک ہیں)	ابن الجوزی کہتے ہیں کہ یہ روایت یقینی موضوع ہی۔اس کا راوی عبدالرحیم متہم ہی ابن حبان اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ وہ حدیث وضع کرتا ہی۔
۷	ابن شاہین	مکحول از واثلہ بن الاسقع سے راوی ہیں کہ غزوۂ تبوک میں حضرت الیاس سے حضرت حذیفہ وانس بحکم حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ملے۔الخ	ابن الجوزی نے لکھا ہی کہ شاید بقیہ نے اُس کو کسی کذاب سے سنا اور اوزاعی کے نام سے روایتاً کردی۔ابن حجر کہتے ہیں کہ اوزاعی سے بقیہ کے سوا اوروں نے بھی دوسری طرح اس کو روایت کیاہے۔
۸	ابن ابی الدنیا	حضرت انس ایک غزوہ میں حضرت الیاسؑ سے ملے۔الخ	اس کے رواۃ میں یزید اور اسحاق ہیں جن کی نسبت ابن الجوزی نے لکھا ہی کہ وہ غیر معلوم ہیں (لا یعرفان)
۹	ابن عساکر	حضرت خضرؑ والیاسؑ بیت المقدس میں روزہ رکھتے ہیں۔الخ	
۱۰	عبداللہ بن احمد (زیادات الزہد)	ابن ابی رواد سے کہا ہو کہ خضر والیاس بیت المقدس میں روزۂ رمضان رکھتے ہیں۔	

نمبر	نام راوی	خلاصۂ روایت	جرح
١١	ابن جریر طبری (تاریخ)	حضرت خضر اولاد فارس میں اور حضرت الیاس بنی اسرائیل میں ہیں ہر سال موسم حج میں ملتے ہیں۔	

اُن روایتوں کا ذکر جو بقاء الخضر بعد النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان میں آئی ہیں اور وہ روایتیں جن میں رویت خضر مذکور ہے۔ (جس پایہ کی یہ روایتیں ہیں وہ ایک نظر میں معلوم ہو سکتا ہے)

نمبر	نام راوی	خلاصۂ روایت	جرح
١	فاکہی (کتاب مکہ) و زبیر (کتاب النسب)	حضرت جعفر صادق اپنے والد بزرگوار حضرت امام باقر کی خدمت میں حاضر تھے وہاں ایک شخص آئے اور گفتگو کی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ خضر تھے۔	
٢	ابن عساکر	ولید بن الملک سے خدام مسجد نے بیان کیا کہ حضرت خضر ہر شب کو مسجد میں نماز ادا کرتے ہیں۔	
٣	ابراہیم الجبلی (کتاب الدیباج)	ایک شخص ساکن بیت المقدس سے روایت ہے کہ وہ حضرت الیاس سے ملا اور اس نے اُن سے بقاء خضرؑ کا سوال کیا تو جواب اثبات میں ملا۔ وغیر ذالک۔	ابن حجر کہتے ہیں کہ اس میں جہالت ہے اور متروک الحدیث راویوں سے مروی ہے۔ (فیہ جہالۃ و متروکون)
٤	ابن ابی حاتم و محمد بن منصور جزار و واقدی و محمد بن ابی عمر۔	حضرت خضرؑ نے بوقت غسل حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعزیت کی اس طرح کہ نگاہوں سے غائب تھے۔	ابن منصور اپنی روایت کی نسبت کہتے ہیں کہ اُس میں محمد بن صالح ہے جو ضعیف ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں کہ واقدی نے بھی روایت کی ہے اور وہ کذاب ہے۔ ابن جوزی نے کہا کہ محمد بن ابی عمر مجہول ہے۔ ابن حجر محمد بن ابی عمر کے مجہول ہونے پر اعتراض کرتے ہیں کیونکہ وہ مسلم وغیرہ آئمہ کے

نمبر	نام راوی	خلاصۂ روایت	جرح
			شیخ اور ثقہ حافظ و صاحب مستند مشہور ہیں۔
۵	ابن حجر عن شیخہ ابی الفضل	قریباً مضمون بالا۔	اس میں محمد بن جعفر ہیں جن کی نسبت امام بخاری کا قول ہے آخرہ اسحاق رونق منہ۔
۶	بیہقی	بمضمون بالا۔	اس روایت میں حضرت خضرؑ کا ذکر نہیں بلکہ ملائکہ کا تعزیت کرنا مذکور ہے۔
۷	سیف بن التیمی	؍؍	اس کی سند میں کلام ہے اور سیف کا شیخ غیر معروف ہے۔
۸	ابن ابی الدنیا	؍؍	اس کی اسناد میں عباد ہے عقیلی اور امام بخاری نے اس کی تضعیف کی ہے۔
۹	طبرانی (اوسط)	؍؍	اس میں بھی عباد مذکور ہے طبرانی کہتے ہیں تفرد بہ عباد عن انس۔
۱۰	ابن شاہین (کتاب الجنائز)	حضرت عمرؓ کے عہد میں حضرت خضرؑ ایک جنازہ کی نماز میں شریک ہوئے۔	اس کی اسناد کی نسبت ابن جوزی کہتے ہیں کہ اس میں مجہول ہے نیز ابن المنکدر اور عمرؓ کے درمیان انقطاع ہے۔
۱۱	ابن ابی الدنیا	ایک شخص مال بیچنے میں قسم کھاتا تھا ایک شیخ نے اس کو ٹوکا اور نصیحت کی آخر میں شیخ ممدوح کی نسبت لکھا ہے "کانوا یرون انہ خضرؑ"۔	
۱۲	ابو عمرو بن سماک (فوائد)	حضرت عمرؓ نے کے شخص کو خضر کہا۔	راویوں میں علی بن عاصم ہیں جو بقول ابن الجوزی ضعیف وسیئ الحفظ ہیں۔ ابن الجوزی کا قول ہے کہ اس روایت کو احمد بن محمد بن مصعب نے بھی بیان کیا ہے۔ یہ منجملہ وضاعین حدیث

نمبر	نام راوی	خلاصۂ روایت	جرح
			ہے۔ اور اُس کی روایتوں میں مجہول راویوں کا ایک سلسلہ ہے۔ ابن حجر لکھتے ہیں کہ میں نے اس روایت کا ایک جید طریقہ پایا ہے جو بیہقی کی دلائل النبوۃ میں ہے۔ لیکن اُس کے اخیر میں راوی کہتا ہے "کانہم کانوا یرون انہ خضرا والیاس" یعنی لوگوں کا اب خیال تھا کہ شاید وہ خضر یا الیاس تھے۔
۱۳	ابن ابی الدنیا و دینوری (مجالسہ)	حضرت علیؓ کو طواف میں خضر ملے۔	

و احمد بن حرب نیشاپوری و محمد بن معاذ ہروی (حضرت سفیان ثوری سے) یہ روایت کی ہے۔

نمبر	نام راوی	خلاصۂ روایت	جرح
۱۴	سیف (فتوح)	حضرت سعد بن ابی وقاص کا مع ایک جماعت کے ابو محجن کو جنگ کرتے دیکھنا بطوالت مذکور ہے۔ اخیر میں ہے "وھم لا یعرفونہ ما ھو الا الخضر" یعنی اُن کے علم میں وہ سوائے خضر کے اور کوئی نہ تھے۔ اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ وہ بزرگ اس وقت میں موجودہ خضری کا عقیدہ رکھتے تھے۔	
۱۵	ابو عبد اللہ بطہ	حضرت خضرؑ نے مسئلہ قضا و قدر میں محاکمہ کیا ہے۔	روایت کا راوی امین ابن سفیان متروک الحدیث ہے۔
۱۶	حماد ابن عمرو واحد المنذر	ایک غلام اہل بیت نے تباہی حجاز کے بعد دریا میں خضر کو دیکھا۔	

نمبر	نام راوی	خلاصہ روایت	جرح
۱۷	امام احمد (کتاب الزہد) وابونعیم (حلیہ)	ایک شخص نے باغ میں دوسرے شخص کو نصیحت کی۔ اخیر میں معمر کا قول لکھا ہے کہ لوگوں کی رائے تھی کہ وہ (ناصح) خضر تھے۔	
۱۸	ابراہیم راوی مسلم	قاتل دجال خضر ہوں گے (آخر حدیث ابوسعید قصہ دجال)۔	
۱۹	ابونعیم (حلیہ) سوائے ابونعیم کے اوروں نے بھی یہ روایت نقل کی ہے۔	سفیان بن عیینہ کو طواف میں ایک بزرگ ہے اور اُن کو نصیحت کی انھوں نے یہ حال سفیان ثوری سے کہا تو انھوں نے کہا کہ کیا عجب ہے کہ وہ خضر ہوں یا ابدال میں سے کوئی ہو۔	
۲۰	طبرانی (کتاب الدعا)	سلیمان بن عبدالملک کے عہد میں ایک شخص پر الزام قتل تھا وہ روپوش ہو کر جنگل جنگل بھاگا پھرتا تھا صحرا میں ایک مرتاض بزرگ ہے۔ انھوں نے حال سن کر ایک دعا بتائی وہ دعا پڑھ کر سلیمان کے سامنے گئے تو وہ ملائم ہو گیا۔ تبدیل حالت پر اُس کو تعجب ہوا تو قصہ پوچھا اُس شخص نے تمام ماجرا جنگل کا بیان کیا سلیمان نے سنکر کہا کہ وہ بزرگ خضر تھے۔	
۲۱	ابونعیم (حلیہ) بسند تاریخ سراج و بروایت محمد بن ذکوان۔	رجاء بن حیوۃ تابعی مشہور سلیمان بن عبدالملک کے پاس تھے کہ ایک بزرگ نے آکر اُن کو حاجت روائی خلق کے متعلق نصیحت کی پھر غائب ہو گئے۔ تابعی ممدوح کی رائے تھی کہ وہ خضر تھے۔	

نمبر	نام راوی	خلاصۂ روایت	جرح
۲۲	زبیر بن بکار	ایک بزرگ دوسرے بزرگ سے ملے۔ خاتمۂ روایت میں بزرگ کا قول ہو کہ "فظننته انه الخضر" میں نے گمان کیا کہ وہ خضر تھے۔	
۲۳	ابو الحسن المنادی	ابو عمر نصیبی سلمۃ بن مصقلہ سے (جن کا شمار ابدال میں کیا جاتا ہے) ملے انھوں نے (ایک بزرگ کو دیکھ کر حضرت الیاس خیال کرتے پر اُن سے مل کر گفتگو کرنے ساتھ کھانا کھانے پھر اُن کے غائب ہو جانے کا) قصہ بیان کیا۔	ابن جوزی اس روایت کے ایک سے زاید راویوں کو غیر معلوم بتاتے ہیں۔
۲۴	داؤد بن ہمدان	ایک بزرگ سے مل کر انھوں نے سوال کیا تو انھوں نے کہا "خضر ہوں"۔	
۲۵		ابو جعفر منصور نے طواف میں ایک شخص کو دیکھا جو ظہور فساد کا شکوہ کر رہا تھا پھر اُس نے مبالغہ سے ابو منصور کو نصیحت و پند کی اُس کے بعد چلا گیا اور باوجود تلاش نہ ملا۔ منصور نے کہا یہ خضر تھے۔	
۲۶	ابن عساکر	ابراہیم تیمی کو حضرت خضر نے ایک ہدیہ دیکر کہا کہ میں خضر ہوں۔	
۲۷	ابو الحسن ابن المنادی	حضرت عمر بن العزیز نے حضرت خضر سے ملاقات کی۔	
	و دینوری (مجالسہ)	ابن حجر کہتے ہیں کہ اس باب میں جس قدر روایتیں میں نے	
	و یعقوب بن سلیمان (تاریخ)	دیکھی ہیں اُن سب سے یہ بہتر ہے۔	
	و عروہ و ابو نعیم (حلیہ)	و ابن حجر (فوائد ابو عبداللہ الرازی)	
۲۸	ابو عبدالرحمٰن	بلال الخواص حضرت خضر سے ملے اور امام شافعیؒ اور	

نمبر	نام راوی	خلاصۂ روایت	جرح
		امام حنبل اور بشر بن الحارث کی بابت سوال کیا۔	
۲۹	ابونعیم (حلیہ)	بلال الخواص نے خواب میں حضرت خضر کو دیکھا۔ اس میں بھی امام احمد وبشر بن الحارث کی نسبت وہی سوال وجواب ہیں جو اوپر کی روایت میں ہیں۔	
۳۰	ابوالحسن بن جہضم	حضرت بشر بن الحارث نے حضرت خضر کو اپنے حجرہ میں دیکھا۔	
۳۱	عبدالغیث	عن ابن عمران ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال ما یمنعکم ان تکفروا ذنوبکم بکلمات اخی الخضر فذکر نحو کلمات المذکورۃ فی بشر۔	
۳۲	ابونعیم	ابواسحق مرستانی نے خضر کو دیکھا اور ان سے دس کلمات کی تعلیم پائی۔	
۳۳	ابوالحسن بن جہضم	ابوعمران الخیاط سے حضرت خضر کی ایک گفتگو نقل کرتے ہیں	ابن جہضم معروف بالکذب
۳۴	حسن بن غالب	اپنا ملنا حضرت خضر سے بیان کرتے ہیں۔	ابن الجوزی کا قول ہے کہ حسن بن غالب کی تکذیب محدثین نے کی ہے۔ (حسن بن غالب کذبوہ)
۳۵	ابن عساکر (بسند صحیح)	ابوزرعہ کی ملاقات حضرت خضر سے۔ ابوزرعہ کے الفاظ ہیں "نخیل لی انہ الخضر"۔	
۳۶	ابن ابی حاتم (جرح وتعدیل) ونعیم بن میسرہ	عبداللہ بن بکر نے کتاب الزہد میں ایک شخص کا کلام نقل کیا ہے جس کو انھوں نے دیکھا اور جو کلام کر کے غائب ہو گیا۔ شخص مذکور کا خیال تھا کہ وہ حضرت خضر تھے۔ وکان یری انہ الخضر	

نمبر	نام راوی	خلاصۂ روایت	جرح
۳۷	ابن حجر (اخبار ابراہیم بن ادہم)	بروایت ابراہیم بن بشار خادم حضرت ابراہیم بن ادہم کیفیت ملاقات حضرت خضر۔	
۳۸	عبدالمغیث بن زبیر (فی الکتاب الذی جمع فی احوال خضر)	تین روایتیں امام احمد بن حنبل کی ملاقات خضر کی بابت۔	عبدالمغیث کی روایتیں امام احمد سے ثابت نہیں۔ ابن الجوزی۔
۳۹	ر	حضرت معروف کرخی نے کہا کہ مجھ سے خضر نے گفتگو کی۔	ومن ابن یصح ہذا عن معروف۔ ابن الجوزی۔

ابوحیان اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ اہل صلاح میں سے بہت سوں نے مبالغہ کے ساتھ بعض صلحا کی ملاقات خضر کو بیان کیا ہے۔ امام ابوالفتح قشیری اپنے ایک شیخ کے حضرت خضر کو دیکھنے اور کلام کرنے کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ جب اُن سے کسی نے کہا کہ اُن کو یہ کس نے بتایا کہ یہ خضر ہیں اور تم اُس کو پہچانتے ہو تو وہ خاموش ہو گئے۔ (فقیل لہ من اعلمہ انہ الخضر وانت عرفت ذالک فسکت) انھوں نے کہا ہے کہ بعض کا قول ہے کہ ہر زمانہ کے لئے ایک خضر ہیں۔ میں (ابن حجر) کہتا ہوں کہ اس میں یہ تسلیم ہے کہ خضر مشہور رحلت کر گئے۔

ابوحیان کہتے ہیں کہ عبدالواحد حنبلی کے شاگردوں کو اعتقاد تھا کہ وہ خضر سے ملتے ہیں۔ ابن حجر سے اُن کے شیخ ابوالفضل عراقی نے نقل کی کہ شیخ عبداللہ یافعی کا عقیدہ تھا کہ حضرت خضر زندہ ہیں۔ میں نے جب کہا کہ امام بخاری اُن کی وفات کے قائل ہیں تو وہ غصہ ہوئے اور کہا جو ان کو مردہ بتائیگا میں اُس پر غصہ ہوں گا۔ یہ سن کر شیخ نے اعتقاد فوت خضر سے رجوع کیا۔ حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ بعض ایسے لوگ میں نے دیکھے جو حضرت خضر سے ملنے کا دعویٰ رکھتے تھے منجملہ اُن کے قاضی علم الدین تھے جو عہد سلطان الظاہر برقوق میں مالکیوں کے قاضی تھے (خلاصۃً ما فی الباب) ملاقات حضرت موسیٰ و حضرت خضر علیہما السلام کا واقعہ بنصِّ قرآنی ثابت ہے۔ اُن کی نبوت بقول اصح محقق ہے ذوالقرنین

کی وفات و آبِ حیات کا ذکر ضعیف روایتوں میں ہے۔ درازیٔ عمر[3] میں بہت بحث ہے۔ اُس کی مؤید روایات اکثر ضعیف اور مشکوک ہیں۔ محققین[4] (جن کے سرگروہ حضرت امام علی رضا و امام بخاری ہیں) اُن کی وفات کے قائل ہیں۔ نیز اُن کی حیات جاوید بقول ابن المنادی خلاف نص قرآنی ہے۔ امام[5] ابو القاسم قشیری نے ایک گروہ اہل باطن کا یہ قول لکھا ہے کہ ہر زمانے کے لئے ایک خضر ہوتے ہیں۔ جب وہ وفات پا جاتے ہیں تو دوسرے اُن کی جگہ ہو جاتے ہیں۔

(رسالۂ الندوہ لکھنؤ۔ بابتہ مارچ و مئی ۱۹۰۷ء)

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

مکرمی ایڈیٹر صاحب۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ براہ کرم مندرجہ ذیل تحریر اپنے اخبار میں شائع فرما دیجئے:

۸ رشعبان ۱۳۲۹ھ مطابق ۴ راگست ۱۹۱۱ء جمعہ گزشتہ کو عین نماز جمعہ کے وقت میرے منجھلے لڑکے محمد عزیز عرف "چھٹو میاں" نے رحلت کی۔ یہ ایک امانتِ الٰہی تھی جو تیرہ (۱۳) برس میرے سپرد رہی اور اب واپس لے لی گئی۔ رضینا بقضاء اللہ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

میں نے بشری کمزوریوں کے ساتھ کوشش کی تھی کہ اس امانت کا حق اپنی بساط کے مطابق ادا کروں۔ ابتدا سے تعلیم و تربیت کا اہتمام پیش نظر رہا تھا۔ مذہبی پابندی کی عادت ہوش سنبھالنے کے بعد ہی ڈلوائی گئی تھی۔ نتیجہ یہ کہ چلّے کے جاڑوں میں بھی صبح کی نماز اول وقت جماعت سے اپنے بھائیوں کے ساتھ بے تکلف اور بے تاکید ادا کرتا تھا۔ خواجہ حسن نظامی صاحب ایک مرتبہ یہاں آئے تھے۔ دلّی جا کر مجھ کو خط بھیجا تو اُس میں لکھا کہ "نمازی بچے مجھ کو یاد آتے ہیں"۔ روزے نہایت شوق سے رکھتا تھا۔ اگرچہ کم عمری کے سبب میں روکتا تھا، تاہم جہاں تک اُس کے امکان میں ہوتا روزوں کی تعداد بڑھانے کی کوشش کرتا۔ سالِ ماسبق میں کچھ روزے میں نے نہیں رکھنے دئے تو ملول رہا۔ بہت نو عمری سے گھوڑے پر نہایت دلیری اور بے باکی سے سوار ہوتا تھا۔ سواری کی مشق

باقاعدہ کرائی گئی تھی۔ شکار کا بھی شوق تھا۔ خصوصاً کتوں کے شکار کا۔

فارسی میں کسی قدر استعداد ہو جانے کے بعد عربی شروع کرائی گئی تھی۔ اب عربی میں قال اقوال اور قدوری پڑھتا تھا۔ انگریزی میں پانچویں جماعت کی خواندگی جاری تھی۔

مرضِ وفات بخار اور موتی جھارا ہوا۔ بخار شدید دو ہفتہ سے زائد رہا، ایک سو پانچ ڈگری تک پہنچ جاتا تھا۔ اس سخت موسم میں مرض کی سختیاں نہایت صبر اور خاموشی کے ساتھ برداشت کیں، کبھی اضطراب یا گھبراہٹ کا اظہار نہیں کیا۔ شدتِ بخار میں بھی کسی نے پوچھا کہ طبیعت کیسی ہے تو یہی جواب دیا کہ "اچھی ہے" سوائے اس کلمہ کے دوسرا کلمہ نہیں کہا۔ سرسامی اثر دور کرنے کے واسطے اطبا نے مرغ سر سے بندھوایا تھا۔ اس کی گرمی سے بے قرار ہو کر اس کے ہٹانے پر اصرار کیا۔ میں نے کہا "میاں تھوڑی دیر رکھا رہنے دو" تو کہا "بہت تکلیف ہوتی ہے"۔ یہ کلمہ دو مرتبہ ادا کیا۔ اس پر میں نے کہا کہ حکیم صاحب نے تمہارے آرام کے واسطے یہ دوا بندھوائی ہے، تھوڑی دیر اور بندھی رہنے دو۔ یہ سُن کر نہایت استقلال سے سکوت اختیار کیا، اور ایک کلمہ زبان سے نہیں نکالا۔ یونانی و ڈاکٹری دونوں علاج نہایت اہتمام سے ہوئے، لیکن بے سود۔ آخر میں علاج ڈاکٹری ہوا، اور غذا و دوا کی بھرمار حسبِ قاعدہ ہوئی۔ مگر میرے بچے نے بے دریغ اُن کا استعمال کیا۔

میں اپنے دلی احباب کی اطلاع کے واسطے یہ سطور شائع کرتا ہوں۔ اور فرداً فرداً خط نہ بھیجنے کی معافی چاہتا ہوں، جو امید ہے کہ عطا ہوگی۔

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۹ اگست ۱۹۱۱ء)

جناب چودھری نوراللہ خاں صاحب مرحوم رئیس سہاور ضلع ایٹہ

شہرت اور خوبی اکثر جمع نہیں ہوتیں۔ ہزاروں شہرتیں خوبی سے خالی ہوتی ہیں اور ہزاروں خوبیاں شہرت سے ناآشنا۔ خوبیاں شہرت سے عاری ہوں تو اُن پر کچھ حرف نہیں آسکتا۔ شہرت خوبی سے بے بہرہ ہو تو داغ بدنامی ہی اور بہ چشم حقیقت ناکامی۔ خوبیاں مشہور نہ ہونے سے دوسروں کو یہ نقصان پہنچتا ہی کہ وہ لاعلمی کے سبب اُن کی قدر اور پیروی سے محروم رہ جاتے ہیں۔

جناب چودھری نوراللہ خاں صاحب مرحوم (جن کا کچھ ذکر ذیل کی سطور میں کیا جائے گا) اُن کی ذات بہت سی خوبیوں کی مجمع تھی، مگر عرفی شہرت کی کبھی ممنون احسان نہ ہوئی۔ وہ اس کے طالب بھی نہ تھے۔ اگر طالب شہرت ہوتے تو وہ حقیقی عزت جو اُن کو حاصل ہوئی ہرگز نہ ہوتی۔ جن دلوں میں شہرت طلبی کا ولولہ رہتا ہی اُن پر حقیقی صفات کا رنگ کم چڑھتا ہی۔ اعلیٰ خوبیوں کا طبیعت ثانیہ بن جانا چاہتا ہی ایک عمر کی یکسوئی اور یک جہتی کے ساتھ کوشش اور ممارست کو۔

چودھری صاحب مرحوم ضلع ایٹہ کے معزز و نامور رئیس تھے۔ ۱۲۵۵ھ میں پیدا ہوئے۔ "مظہر علی" تاریخی نام تھا۔ اُن کا گھرانا پشتہا پشت سے رئیس و باعزت رہا ہی۔ گزشتہ رواج کے مطابق اُن کی تعلیم رسمی تو محض معمولی تھی، مگر جن بزرگوں کی اُنھوں نے صحبت اٹھائی اور جو مثالیں اُن کی زندگی کا سانچہ بنیں اُن کے فیضِ صحبت سے ایسی صفات کے جامع تھے کہ بڑے بڑے تعلیم یافتوں کے واسطے نمونہ بن سکتے تھے۔ چھہتر برس کی عمر پائی۔ اس طویل عمر کو جس پاکیزگی اور وضع داری سے نباہ گئے وہ ایک کارنامۂ زندگی ہی۔ ایک صدی کے ان تین چوتھائی حصوں نے عالم میں کس قدر عظیم الشان تغیرات دیکھے ہیں، اور کیسے کیسے انقلابوں کا تجربہ کیا ہی، مگر چودھری صاحب کی ذات اُن کی زد سے بچی ہوئی تھی۔ وضع، عادات و حرکات میں اپنے نیک سلف کے طریقہ پر قائم تھے۔ ارکانِ مذہبی کے نہایت پابند تھے۔ صبح، عصر، مغرب، عشاء، اور جمعہ کی نماز باجماعت پابندی

کے ساتھ مسجد میں پڑھا کرتے تھے۔ مسجد مکان سے بہت قریب نہ تھی۔ وہاں تک پہنچنے میں نشیب و فراز بھی تھا۔ تاہم اخیر وقت تک حاضری مسجد کی پابندی قائم رہی۔ رمضان مبارک کے روزے مسجد میں نمک کے ریزے یا کھجور سے افطار ہوتے تھے۔ یہ بھی ایک عادت تھی جو ساری عمر ساتھ رہی۔ تلاوتِ کلامِ مجید کے اوقات بھی معین تھے۔ ایک عرصہ سے تہجّد کے بھی پابند تھے۔

عادات نہایت شائستہ مگر سنجیدہ مستحکم اور مضبوط تھیں۔ برآمدہ میں ایک جانب چوکی بچھی رہتی تھی، اُس پر تپائی گدّا اور گاؤ تکیہ لگا رہتا۔ صبح کی نماز اور دیگر ضروریات سے فارغ ہو کر دوپہر تک اور پھر بعد ظہر اس چوکی پر نشست ہوتی تھی۔ اور آنے جانے والوں، کاروبار کے آدمیوں اور اہل حاجت کے واسطے اذنِ عام ہوتا تھا۔ کوئی موسم ہو، کیسی ہی سردی گرمی ہو، اس میں فرق نہ آتا تھا۔ عصر کی نماز کے بعد ہوا خوری کے واسطے جنگل کو تشریف لے جاتے اور مغرب کے وقت واپس آتے تھے۔ آندھی آئے، بارش ہو، اس میں تغیر نہ ہوتا تھا۔

عام میوجات سے شوق تھا، خصوصاً آم اور تربوز سے خاص رغبت تھی۔ موسم میں تربوز مشہور مقامات سے اہتمام کے ساتھ منگوائے جاتے، خود کھاتے اوروں کو کھلاتے۔ آم کے شوق نے فیض عام کا ایک سلسلہ جاری کر دیا تھا جو سالہا سال تک مخلوق کو آرام اور راحت پہنچائے گا۔

ریاست میں (خصوصاً قصبۂ سہاور میں) جس نے باغ لگانے کا شوق کیا، عمدہ موقع سے اُس کو بلا لگان اراضی عطا کی۔ سہاور جاؤ اور دیکھو اُس کا نواح کیسا سرسبز و شاداب ہے اور پتے پتے کی زبان حال پر چودھری صاحب کے فیض کا ذکر ہے۔ خود بھی باغ لگانے اور درختوں کے پرورش کرنے کا سلسلہ اخیر دم تک جاری رکھا۔ آم کی قلم اپنے ہاتھ سے نہایت شوق سے لگاتے تھے، اور جب قلم پختہ ہو جاتا تو لوگوں کو باغ میں نصب کرنے کے واسطے عنایت ہوتا۔ آموں پر جس وقت سے مور آتا تھا، شام کی ہوا خوری کے وقت باغوں کے درختوں پر تفصیل وار نگاہ ڈالتے تھے۔ بہار کا اندازہ فرماتے کہ کس قدر آئی۔ ایک ایک درخت کی بابت جس قدر واقفیت اُن کو تھی شاید خود مالکانِ باغ کو اُس سے زائد ہو گی

علاوہ میوہ جات کے، کھانے کی چیزوں میں دہی کا بہت شوق تھا۔ لازم تھا کہ ہر کھانے پر دہی ضرور ہو۔ جو دعوت کرتا عمدہ دہی کا اہتمام کرتا۔ دہی آگیا ہمہ نعمت آگئی۔

مخلوق کی رضاجوئی کا یہ عالم تھا کہ بہت کم نگاہ ملا کر بات کرتے تھے۔ اور سخت و سُست کلام اُن کی زبان سے مدت العمر میں غالباً متعدد ہی مرتبہ نکلا ہوگا۔ جس کسی نے دعوت کی خواہ وہ کسی مرتبہ کا ہو اُس کے یہاں کھانا کھانے چلے جاتے تھے بلحاظ مرتبۂ ظاہری اعزہ اور متوسلین کو ہمیشہ ناگوار رہا، مگر چودھری صاحب نے کبھی اس کی پروا نہ کی۔

حلم اور استقلال ضرب المثل تھا۔ غصہ سے گویا واقف ہی نہ تھے۔ جب سخت سے سخت مخالف مقابلہ کرکے ہر طرف سے مایوس ہو جاتا بے تکلف اُن کے پاس چلا آتا۔ معمولی معذرت چودھری صاحب کی نگاہ کو نیچا کر دیتی۔ اور سوائے عفو کے کوئی چارہ نظر نہ آتا۔ اب مخالف غالب ہوتا تھا اور چودھری صاحب مغلوب۔ وہ اپنی مرضی کی شرطیں قبول کرا کر ہٹتا۔ قصبۂ سہاور میں دو سال طاعون کی نہایت شدّت رہی۔ دوسری مرتبہ شدت کے ساتھ کئی مہینے قائم رہا اور قصبہ کے بہت سے عمائد اُس کا شکار بنے سینکڑوں آدمی آبادی چھوڑ کر بھاگ گئے اور بیسیوں گھر ویران ہوگئے۔ چودھری صاحب کے استقلال اور جوش ہمدردی ان موقعوں پر جس شان سے نمایاں ہوا وہ یادگار رہے گی۔ قصبہ سے باہر جانا کیا معنی اپنے کمرہ سے بھی نہیں ہٹے۔ دوسری مرتبہ کے طاعون میں جب خود اُن کے مکان میں چوہے مرے اور تعفّن کے سبب تکلیف ہوئی تو بس اتنا کیا کہ دوسرے کمروں میں چلے گئے۔ یہ طوفان اُٹھے اور فرو ہوگئے، مگر اُن کے استقلال کے لنگر نے جگہ سے جنبش نہ کی۔ اُن کی ہمت و ہمدردی ایک مخلوق کی تسلی و ہمّت کا باعث رہی۔ چودھری صاحب ان امتحان کے موقعوں پر مخلوق الٰہی کی ہمدردی میں بلا لحاظ قوم و ملت ہمہ تن مستعد اور مجبور رہے۔ تیمارداری فرماتے، تجہیز و تکفین میں شریک ہوتے۔ ایسا بھی ہوا کہ ایک جنازہ دفن کرکے لوٹے ہیں، دوسرا راستہ میں مل گیا، وہیں سے پھر واپس چلے گئے۔ شب کو سوتے سے بچارے مصیبت زدہ آدمی اُٹھا دیتے تھے اور چودھری صاحب کشادہ دلی کے ساتھ اُن کی ضرورتوں کا اہتمام فرما دیتے۔

باوجود اپنے مذہب کی پابندی کے اُن کے اخلاق و ہمدردی کا دائرہ وسیع تھا۔ اُن کے دماغ یا برتاؤ میں مسلمان اور ہندو کا نیا مسئلہ (جو سخت قابل نفرت ہے) کبھی نہیں آیا اور شاید انھوں نے کبھی اس کا احساس بھی نہ فرمایا ہو۔ ہندوؤں کے ساتھ ایسا برتاؤ تھا کہ سہاور کے گرد و نواح کے ہندو اُن پر دل سے فدا تھے، اور اُن کے اوصاف کی عقیدت ہندوؤں کے دلوں میں بشری اوصاف سے کسی قدر بڑھ کر تھی۔ دیکھو اس روش کا نتیجہ۔ اُن کی وفات کا ماتم ہندوؤں میں مسلمانوں سے کم نہیں، بلکہ کچھ زیادہ ہی ہوگا۔ جنازہ جب تیار ہو چکا تو صدہا ہندو صحن خانہ میں بھرے ہوئے تھے اور رو رو کر التجا کرتے تھے کہ آخری درشن ہم کو کرا دو۔ جنازے کی نماز میدان میں ہوئی۔ وہاں بھی ہندوؤں کی یہ کثرت تھی کہ نماز کی صفوں سے ہندوؤں کا علیحدہ ہونا دشوار ہو گیا، بلکہ نہ ہو سکا۔ باوجود قدیم روش کے جدید مفید باتوں سے بے لگاؤ نہ تھے۔ اخبار بینی پابندی سے ہوتی تھی۔ شروانی اسکول (چھرّہ) جب قائم ہونے لگا اور میں نے اُس کی مختصر اسکیم پیش کی اور نقشہ دکھایا، تو پسند فرمایا اور ایک سو بیس (باعث) روپیہ سالانہ چندہ مقرر کر دیا۔ یہ وعدہ پتھر کی لکیر تھا۔ اخیر زمانہ تک چندہ جاری رہا۔ ریاست کورٹ ہو گئی تو کاغذات کورٹ میں اندراج کرا دیا اور محکمہ کورٹ سے سالہا سال ملتا رہا۔ مسلم یونیورسٹی فنڈ کو پانسو روپے دیئے۔

اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں پر فدا تھے۔ پھوپی زاد بھائیوں (میرے والد اور عم مرحوم) کا اس درجہ پاس و ادب ملحوظ رکھتے تھے کہ حقیقی بھائیوں سے بھی (اس زمانہ میں) ممکن نہیں۔ بھائیوں کے بعد اُن کی اولاد کے ساتھ بزرگانہ شفقت قائم رکھی۔

طبیعت نہایت غیور اور فیاض تھی۔ اہل حاجت کے ساتھ سلوک کا سلسلہ علانیہ و خفیہ جاری رہتا تھا۔

ریاست میں بیش قرار اضافے کئے اور جس قدر ریاست و جائداد اُن کو ترکہ میں ملی تھی اُس سے غالباً المضاعف اپنے ورثا کے واسطے چھوڑی ہے۔ ایک زمانہ میں ریاست زیر بار قرضہ ہو گئی تھی۔ حکام کی مہربانی و توجہ سے کورٹ ہو گئی اور قرضہ سے پاک و صاف ہو کر واگزاشت کر دی گئی۔ آخر

وقت تک صحت نہایت عمدہ رہی۔ تمام اعضا اور قویٰ سے تندرستی کے آثار نمایاں تھے۔ صورت ایسی پاکیزہ اور نورانی تھی کہ اسم با مسمیٰ تھے۔

ایک مورخ نے مادۂ تاریخ وفات "نور اللہ تربتہ" نکالا ہے۔ یہ مادہ حضور نظام مرحوم کے واسطے بھی نکالا گیا تھا، لیکن اس موقع پر زیادہ موزوں ہے۔

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۷ جنوری ۱۹۱۲ء)

علامہ سید رشید رضا اور اخبارات مصر

(بخدمت جناب ایڈیٹر صاحب علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ)

جناب من! السلام علیکم۔ مجکو اجازت دیجئے کہ امر حق کے اظہار واسطے آپکے مفید اخبار میں شائع ہونے کے لئے چند سطور ارسال کروں۔

یہ سن کر دلی قلق ہوا ہے کہ بعض اخبارات مصر (منبر ترکی۔ ایڈیٹر) نے جناب مولانا سید محمد رشید رضا صاحب کے سفر ہند کو داغ دار کرنے کی غرض سے کچھ ایسی باتیں شائع کی ہیں جس سے جناب ممدوح کے کارناموں پر حرف آنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ سخت تعجب ہے کہ اخبار "وکیل" (امرتسر) کے ایڈیٹر صاحب نے بھی اُن کی تائید کی ہے اور لکھا ہے کہ لکھنؤ میں جلسۂ ندوۃ العلماء کے موقع پر اُن کی تقریر کا وہ حصہ جو گورنمنٹ برطانیہ کی تعریف کے متعلق تھا بے توجہی سے سنا گیا۔ لکھنؤ کے اجلاس ندوۃ العلماء اور کالج کے جلسہ میں برابر مجکو حاضری کا اتفاق ہوا۔ علی گڑھ میں علامہ مصری کی دو تقریروں کی ترجمانی میں نے کی۔ ان دونوں موقعوں پر ہرگز ہرگز سید صاحب نے اُس خوشامدانہ پیرایہ میں گورنمنٹ برطانیہ کی تعریف نہیں کی جس کا الزام یہ مصری اخبارات دے رہے ہیں۔ کالج میں تو مطلق اس بحث کو چھیڑا ہی نہیں۔ لکھنؤ میں البتہ اس پیرایہ میں ذکر کیا تھا کہ مسلمانان مصر و ہند کو گورنمنٹ برطانیہ کے زیر سایہ جو امن و آزادی ہر قسم کی ترقیات کی حاصل ہے اس کے ہوتے ہوئے اگر وہ ترقی سے غافل

رہیں تو یہ خود اُن کا قصور ہوا اور کوئی عذر اُن کا پذیرا نہیں ہوسکتا۔ اور یہ بالکل حق بجانب اور برمحل تھا۔ رہا اہل جلسہ کا اس حصہ کو بے توجہی سے سننا، یہ بھی خلاف واقع ہے۔ میں نے اول سے آخر تک دیکھا کہ تمام جلسہ محو سماعت تھا، کثرت سے ایسے لوگ تھے جو سمجھتے نہ تھے، تاہم محو ذوق تھے۔ سمجھنے والے برابر احسنت و آفریں کی صدا بلند کرتے رہے۔ دیوبند میں حاضر ہونے کی سعادت مجھ کو حاصل نہیں ہوئی، تاہم وہاں کی اسپیچ میں نے پڑھی ہے۔ اس میں بھی کوئی ایسی بات نہ تھی جو خیالات مصر کی تائید کرسکے۔

سید محمد رشید رضا صاحب نے اپنے اخلاص و اخلاق، وسعت معلومات، پختہ مغزی اور ہمدردی امت کا جو نقش مسلمانانِ ہند کے دل پر چھوڑا ہے وہ اتنا گہرا اور دیرپا ہے کہ مذکورۂ بالا قسم کے بہت سے بیانات بھی اُس کو مٹا نہیں سکتے۔ علامہ سید محمد رشید رضا صاحب یقین فرمائیں کہ اُن کے محاسن کی یاد شکرگزاری کے ساتھ ہمارے دلوں میں جاگزیں ہے۔ اور مسلمانانِ مصر باور کریں کہ اُن کے علم نے دیارِ ہند میں مصر کا نام اور زیادہ روشن کردیا ہے۔

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۷ ر اگست ۱۹۱۲ء)

بدگمانی اور ایک عَلَم بردار علم قوم سے!!!

"اِنَّ الظن لا یغنی من الحق شیئا"

۱۹۱۱ء کی آمد مسلمانانِ ہند کے حق میں فصل بہار کی آمد تھی۔ اُس وقت کے نشاط و انبساط پر خیال کرو تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ قدرت نے جانفزا مستقبل کا نظارہ دکھلا کر اہل اسلام کو فرحت و سرور سے سرشار کردیا تھا۔ جادو نگار شعراء نے فصل بہار اور بہار عید کی جو تصویریں کھینچی ہیں اُن کے دیکھنے

سے مبالغہ کا تصور آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ لیکن جن لوگوں نے لکھنؤ اور لاہور کے آغاخانی خیر مقدموں کا عالم دیکھا ہے وہ کہہ سکتے ہیں کہ سارے مبالغے واقعات بن گئے تھے اور خیالی طلسم اصلیت کی صورت میں نگاہ کے سامنے جلوہ گر ہو گیا تھا۔ اس گرمیٔ ہنگامہ کا اصلی باعث یہ نشاط افزا امید تھی کہ عنقریب ملک معظم جارج پنجم کی رونق افزائی کے موقع پر مسلمانوں کی پنجاہ سالہ آرزو بر آئے گی اور مسلم یونیورسٹی کا چارٹر ہلالِ عید بن کر نمایاں ہوگا۔

مسلم یونیورسٹی کی مختصر تاریخ ہر واقعہ گزر جانے اور ہر ایجاد موجود ہو جانے کے بعد عام نگاہوں میں معمولی بات معلوم ہونے لگتی ہے، لیکن حکمت آشنا طبائع ماضی کے اہم واقعات کے پہلوؤں پر عبرت کی نظر ڈالتی اور حال و استقبال کی مشکل کشائی میں اُن سے مدد لیتی ہیں، موجدوں کی مشکلات پر غور کر کے ہمت کا سبق حاصل کرتی اور ترقی و ایجاد کے میدان میں قدم بڑھاتی ہیں۔ اب جبکہ ہم مشکلات میں پھنسے ہوئے ہیں، تو مسلم یونیورسٹی کی تاریخ پر نظر ڈالنا سبق آموز ہوگا۔

سر سید احمد خاں مرحوم نے جب مسلمانوں کی تباہ حالی اور آیندہ کی بہبود پر غور کیا تو اُن کی دوربیں نظر نے پالیا کہ تباہی کا باعث جہالت اور آیندہ ترقی کی تدبیر علم کی اشاعت ہے۔ وہ اسی دُھن میں ولایت گئے۔ وہاں کی تعلیم گاہوں کو بہ نظر غور دیکھا اور کامل فکر و تدبر کے بعد ایک عظیم الشان تعلیمی منصوبہ لے کر واپس آئے۔ اُس منصوبہ کی شکل اُن کی تحریروں اور تقریروں میں صاف اور دلکش پیرایہ میں عیاں ہے، اور مجسم تصویر بے نظیر محمدن کالج ہے۔ سر سید نے خوب سمجھ لیا تھا (اور کیا خوب سمجھا تھا) کہ مسلمانوں کی ترقی و بہبود وابستہ ہے اُس اعلیٰ تعلیم کے ساتھ جو جامع ہو قدیم و جدید علوم کی اور شامل ہو شریفانہ تربیت اور اصول صحت کی ممارست پر۔ انھوں نے دیکھا کہ سرکاری کالج اور اسکول ان مراتب کے لحاظ سے ناقص ہیں، اس لئے مسلمانوں کی تعلیم کا اہتمام خود اپنے ذمہ لیا۔ ابتداءً اگرچہ وہ بے یار و مددگار تھے، لیکن عزم سچا تھا اور ارادہ پکا۔ تائید غیبی نے دست گیری کی علی گڑھ کی پرانی چھاؤنی کے وحشت خیز خارستان میں اُس دور میں فدائی امت کو وہ عظیم الشان درس گاہ

صاف نظر آرہی تھی جو آج چشم بد دور نونہالانِ قوم کے دم قدم سے رشکِ چمن ہوا اور جس کی تکمیل کے سامان برابر ہو رہے ہیں۔ لارڈ لٹن نے جس روز بنیادی پتھر رکھا تھا اُسی روز سرسید نے اپنے اڈریس میں کہہ دیا تھا کہ یہ بنیاد کسی اسکول یا کالج کی نہیں ہے بلکہ ایک عظیم الشان یونیورسٹی کی ہے جو مسلمانوں کے درد کی دوا بننے والی ہے۔ اُس وقت کے محمڈن کالج کے چھپر دیکھتے ہوئے اس خیال پر "جھونپڑوں میں رہ کر محلوں کا خواب دیکھنے" کی مثل پورے طور پر صادق آتی تھی۔ لیکن وہ خواب سچا تھا اور آج اس کی تعبیر ایک عالم کے سامنے ہے۔ سرسید نے باہمہ جواں مردی و ہمت مسلم یونیورسٹی کا ایک ناتمام نقش زمین پر چھوڑا جو مشہور مخالفین اور ادوار صدمات کے اثر سے مٹنے پر آمادہ تھا۔ ممالک مغربی و شمالی (حالی صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ) کا ایک حصہ، ذرا سا گوشہ صوبۂ بہار کا، ملک پنجاب، یہ وہ ممالک تھے جو وفات کے وقت سرسید کے زیر نگیں تھے۔ چونکہ جمہور امت محمدیہ سرسید کے مذہبی خیالات سے بیزار تھی، اس لئے تعلیمی معاملات میں کشادہ دلی کے ساتھ اُن کی معاون نہیں ہوئی۔ لیکن اُن کے پولیٹکل خیالات کو امت نے بسمع و رضا کے ساتھ سنا اور نہایت مضبوطی کے ساتھ اپنی آیندہ فلاح کا دستور العمل بنایا۔ یہ وجہ ہے کہ سرسید وفات کے وقت بمقابلہ سابق زیادہ ہر دل عزیز ہو چکے تھے مرحوم نواب محسن الملک اور مسٹر بیک نے اپنی حذاقت و فراست سے موقع کی نبض پر ہاتھ رکھا! اور یادگار سرسید کے پیرایہ میں قوم کو یونیورسٹی از سر نو یاد دلائی۔ اس تحریک کو کامیابی ہوئی لیکن آج اُس کا ذکر ع

گل آورد سعدی سوئے بوستاں
بشوخی و فلفل بہ ہندوستاں

کا مصداق ہے۔ تاہم اس تحریک کے ذکر کو ہماری تعلیمی کانفرنس نے گوناگوں کوششوں سے تازہ رکھا۔ کہتے ہیں کہ عالم میں رونق و گرمیٔ ہنگامہ آفتاب عالم تاب کے دم سے ہے۔ اس میں کلام نہیں ہو سکتا کہ اس دور میں مسئلہ یونیورسٹی کی رونق و گرم بازاری صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی سرگرم کوشش سے بہت کچھ وابستہ رہی۔ اس کوشش کا انتہائی عروج امرت سر کا وہ پرجوش جلسہ کانفرنس تھا جس میں یونیورسٹی کا رزولیوشن پیش ہو کر عہد قدیم از سر نو تازہ کیا گیا۔ بارہ سال کے عرصہ میں چوبیس لاکھ روپیہ فراہم

کرنا اُس عہد کا سرمایہ تھا۔ مگر ہماری ہمت کا اُس وقت تک کا رنگ کہہ رہا تھا کہ کانفرنس کی کاغذی تجویزوں
کی فہرست میں ایک نمبر اور بڑھا۔ یہ سب کچھ صحیح ہے کہ سرسید نے نقشِ ناتمام چھوڑا، محسن الملک اور
بیک کو پوری کامیابی نہیں ہوئی، کانفرنس کی تجویز نے تکمیل کا منہ نہیں دیکھا۔ لیکن چالیس سال کی
مسلسل کوشش، اور کانفرنس کے صوبہ بہ صوبہ، اور شہر بہ شہر اجلاسوں نے اعلیٰ سے لیکر ادنیٰ تک یہ
خیال دلوں میں پیدا کر دیا کہ ہمارے مرض کا علاج ہی تو تعلیم ہے۔ یہ کہنا کہ قومی ولولہ ظہور کا بہانہ ڈھونڈتا
تھا اور اتفاقاً بہ شکل مسلم یونیورسٹی ہویدا ہوگیا، واقعات کا خون کرنا اور ہمدردوں کی کوششوں
پر خاک ڈالنا ہے۔ علاوہ تعلیم کے کوئی اور کوشش کرو کبھی وہ جوش پیدا نہ ہوگا۔ جن لوگوں نے مسلم
یونیورسٹی کے متعلق دورافتادہ دیہات اور حلقۂ مستورات میں خدمت کی ہے وہ اس سے بخوبی واقف
ہیں کہ تعلیم اور کالج کو ترقی دینا کوئی اجنبی کام نہ تھا جس کی نوعیت اور کیفیت اپنی اپنی سمجھ کے مطابق
اُن کے مخاطب نہ سمجھتے۔ بلکہ جس وقت مسلم یونیورسٹی کا مفہوم اُن کے سامنے اس پیرایہ میں بیان کیا
جاتا تھا کہ اس کے حاصل ہونے سے مسلمانوں کی دینی و دنیاوی تعلیم کا اعلیٰ انتظام ہو جائے گا اور
محمڈن کالج تکمیل کو پہنچ جائے گا، تو وہ اس کو اپنی ایک دیرینہ مراد کا بر آنا خیال کرتے اور فوراً چندہ
دینے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔

انسان کی کوشش رائگاں نہیں جاتی۔ لیکن کام تائیدِ غیبی سے بنتے ہیں اور ؎

غیرتِ حق بہانہ می جوید

چالیس سال کی متواتر سعی کے بعد وہ زمانہ آیا کہ امت کامیابی کا دلربا چہرہ دیکھے۔ ملک میں غلغلہ
اٹھا کہ حضور ملک معظم جارج پنجم کے قدوم شوکت لزوم سے ہندوستان رشکِ گلستاں بنا چاہتا ہے،
اور برسوں کے بعد شاہی و شہریاری کے جلوے پھر اس سرزمین پر نظر آئیں گے۔ مسٹر محمد علی (آکسن) کی
فراست نے موقع شناسی کی، اور انھوں نے ٹرسٹیان محمڈن کالج کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ بادشاہ
سلامت کی رونق افروزی کی یادگار میں وہ سائنس اسکول (جو ورود ولیعہدی کی یادگار ہے) دس لاکھ
کے چندہ سے سائنس کالج بنا دیا جائے۔ یہ تجویز ٹرسٹیوں کے سامنے آئی۔ لیکن اس پر جس عزم و دلبستگی

سے غور ہوا اس کا میں عینی شاہد ہوں۔ اگر جلسہ میں خود محرک نہ ہوتے تو اُس کا پاس ہونا محال تھا۔ تجویز کے پاس ہونے کے وقت خیالات کا رجحان اس طرف تھا کہ دس لاکھ چندہ ہونا تو معلوم، تاہم کچھ نہ کچھ ہو رہی گا۔ صبح صادق کا نور بتدریج عالم میں پھیلتا ہی۔ آخر کار ہز ہائی نس سر آغا خاں نے اس عظیم الشان تحریک کا علم ہاتھ میں لیا جس کے پرچم پر مسلم یونیورسٹی کا طغرا نقش تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کو بتایا اور یقین دلایا کہ اب وہ وقت آگیا ہی کہ دیرینہ مرادیں پوری ہوں، اور جس آب حیات کی قوم قرنوں سے تشنہ ہی اُس کے دریا ملک میں بہہ جائیں اور دولت برطانیہ کے زیر سایہ خود مسلمان اپنی دینی و دنیاوی تعلیم کا اعلیٰ پیمانہ پر بندوبست کرسکیں۔ یہ مفہوم تھا اُن توقعات کا جو اُن الفاظ میں پوشیدہ تھیں کہ حضور ملک معظم کے قدوم کی یادگار میں مسلمانوں کو مسلم یونیورسٹی کا چارٹر مل جائے گا۔ اس تحریک کا اہل اسلام نے جس جوش و حوصلہ سے خیر مقدم کیا وہ عالم پر آشکارا ہی۔ سرمایہ کی تعداد کا مطالبہ جوشش قومی کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا گیا۔ دس لاکھ سے بیس لاکھ ہوئے، بیس لاکھ سے پچیس اور پچیس سے تیس، اور یہ واقعہ ہی کہ آج تیس لاکھ سے زائد سرمایہ مسلم یونیورسٹی کمیٹی کے ہاتھ میں ہی۔ اور اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ اگر قومی جوش سے پورا کام لیا جاتا، تو وصول شدہ رقم کی تعداد دگنی ہو چکی ہوتی۔ "اذا اراد اللہ شیئاً ہیّا اسبابہ" تحریک مسلم یونیورسٹی کے واسطے نہ صرف روپیہ ملا، بلکہ بہت سے کام کے آدمی میدان عمل میں سرگرم کوشش نظر آنے لگے۔ سر آغا خاں، راجہ صاحب محمود آباد، نواب وقار الملک بہادر، ملک مبارز خاں، شوکت علی، ڈاکٹر ضیاء الدین اور بہت سے دوسرے بزرگوں کے نام مسلم یونیورسٹی کی کتابوں پر صدہا سال تاباں رہیں گے۔ فراہمی سرمایہ کے ساتھ ساتھ فدائیان امت کی توجہ قواعد و قوانین مرتب کرنے کی جانب بھی مبذول رہی۔ حکام والا مقام کے مشوروں سے نفع اٹھایا، آزاد اہل الرائے سے مشورہ لیا اور کوشش و مباحثہ کے بعد مسلم یونیورسٹی کے قواعد مرتب کئے (اور ایسے مرتب کئے کہ مخالف بھی حیرت سے انگشت بدنداں رہ گئے)۔

مسلم یونیورسٹی کی موجودہ تحریک کی جان یہ ہی کہ ادنیٰ و اعلیٰ، اور سوسائٹی اور مذہب کے تمام طبقوں

اور فرقوں نے یکساں ہمدردی اور شوق کے ساتھ باہم مل کر اس کی تکمیل میں کوشش کی ہے۔

موجودہ مشکلات

"ہر جا کہ گل ست خار ست" ایک پرانا مقولہ ہے جس کو ہزاروں تجربوں کا عطر کہنا چاہیئے۔ جبکہ قوم اپنی کامیابی کے نشہ میں چور اور باغ امید کے نظارہ سے مسرور تھی اُس کو مایوسی کی مہیب شکل نظر آنے لگی۔ ٹھوکر یہ اندازۂ رفتار لگتی ہے۔ اس ٹھوکر نے تمام قوم کو اس سرے سے دوسرے تک ہلا دیا۔ اب اس جنبش کو سنبھالنا اور قوم کو صراط مستقیم سے نہ بھٹکنے دینا رہنمایانِ قوم کا نازک فرض ہے۔ خداوند تعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ مسلمان اس معرکہ سے خیر و خوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوسکیں گے۔ جو سرکاری مراسلے حال میں شائع ہوئے ہیں اُن سے ان تمام توقعات کو صدمہ پہنچا ہے جو مسلم یونیورسٹی کے ساتھ وابستہ تھیں۔ اندرونی انتظام آزادانہ ہوگا، دائرۂ الحاق کا پرکار صرف سرزمین علی گڑھ پر گردش کرے گا "مسلم" کا نعم البدل "علی گڑھ" ہوگا اور ہماری یونیورسٹی کا نام بجائے "مسلم یونیورسٹی" کے "علی گڑھ یونیورسٹی" ہوگا۔ عزیز توقعات کے صدمے سے مسلمانوں پر ایک عالم پریشانی طاری ہے۔ قوم کے کارآزمودہ ہمدرد ثابت قدم ہیں اور کوشش کر رہے ہیں کہ اُس کو مایوسی کی ظلمات سے نکال کر پھر امید کے نور میں لے آئیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ایک طبقہ ایسا ہے جس کی تحریروں اور رایوں سے اضطراب اور گھبراہٹ کے آثار نمایاں ہیں۔ ناصحان شفیق میں بعض وہ حضرات سب سے زیادہ بلند آہنگ ہیں جنھوں نے مسلم یونیورسٹی کی تحریک کو کامیاب بنانے میں بہت ہی کم تکلیف گوارا فرمائی تھی (بلکہ ایک حد تک جدا رہنا پسند فرماتے رہے) اہل خرد کے نزدیک ایسے ناصحوں کی نصیحت کیا وقعت حاصل کر سکتی ہے؟ اس وقت سب سے اعلیٰ فرض سرکاری تجاویز پر کشادہ دلی اور اطمینان کے ساتھ غور کرنا اور قوم کو صراط مستقیم کی جانب رہنمائی کرنا ہے۔

مسئلہ الحاق کے خلاف سرکاری مراسلات میں حسب ذیل دلائل پیش کی گئی ہیں:

(۱) موجودہ یونیورسٹیوں کے ساتھ مناقشہ کا اندیشہ۔

(۲) معیار تعلیم کا پست و بیتذل ہو جانا (۳) نگرانی کی عدم قابلیت۔

ہمارے نزدیک گورنمنٹ نے جن امور کا اندیشہ ظاہر کیا ہے وہ ضرور قابل لحاظ ہیں، لیکن مسلمانوں

کی یونیورسٹی سے یہ اندیشہ ظاہر کرنا خلافِ حقیقت ہی۔ تعلیم جدید کے متعلق نصف صدی اور تعلیم قدیم کے متعلق تیرہ صدیوں کا تجربہ کافی ضمانت اس امر کی ہو کہ مسلمان ان خطاؤں کے مرتکب نہ ہوں گے۔
اسلام نے جس وقت اس عالم میں قدم رکھا، اشاعت علم کا پرچم اُس کے ہاتھ میں تھا۔ قرآن مجید کی جو آیتیں سب سے اول نازل ہوئیں اُن میں پڑھنے اور لکھنے کا حکم اور ذکر ہے۔ کلام ربانی اور احادیث نبوی میں کثرت سے علم اور اہل علم کا فضل و شرف بیان فرمایا گیا ہی۔ احادیث سے ثابت ہو کہ مسجد نبوی میں ایک سائبان تھا جس میں صحابۂ کرام کا ایک پاک گروہ رہتا تھا جن کی ضروریات کا اہتمام خود حضرت سرورِ عالم فرماتے تھے، اور یہ بزرگ خدمت بابرکت میں حاضر رہ کر علم دین کا فیض حاصل کرتے تھے۔ ان ہی بزرگوں میں سے ایک صحابی حضرت ابو ہریرہؓ تھے جن کی شان سے اہلِ علم واقف ہیں۔ یہ قدسی گروہ "اصحاب صفّہ" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ہی بنیاد اُن عظیم الشان درسگاہوں کی جو صدہا سال تک ممالک اسلامیہ میں قائم ہوتی رہیں۔ ہر بڑی مسجد کے ساتھ مدرسہ لازم تھا۔ جامع مسجد دہلی کے ساتھ جو مدرسہ تھا اُس کا نام "دار البقاء" تھا، اور آج قاہرہ میں اس کا نمونہ "جامع ازہر" موجود ہی۔ اپنے علوم کے سوا اور قوموں کے علوم کی طرف بھی مسلمانوں نے نہایت اولوالعزمی سے توجہ کی۔ یونان، روم، ہندوستان و ایران کے علوم ترجمہ کے ذریعہ سے مسلمانوں نے اپنی زبانوں میں منتقل کئے۔ جس ملک میں مسلمانوں کے قدم گئے وہ ملک دولتِ علم سے مالا مال ہو گیا۔ ہماری تاریخ کا یہ شاندار واقعہ ہو کہ صدیوں تک مسلمانوں نے علم کو صرف علم کی خاطر حاصل کیا۔ جب مشہور نظامیہ یونیورسٹی قائم ہوئی، تو علمائے ماوراء النہر نے ایک ماتم کا جلسہ منعقد کیا اور اس پر تاسف کیا کہ اب علم علم کی خاطر نہ پڑھا جائے گا، بلکہ اس سے ادنیٰ منافع پیش نظر رہیں گے۔ یورپ میں صدیوں تک مسلمانوں کے علوم زیر درس رہے۔ ابن رشد اور ابن سینا کا فلسفہ بیکن کے اجتہاد تک پڑھایا جاتا رہا تھا۔ جب مسلمان انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ ہوئے تو سر سید احمد خاں مرحوم نے انگلستان کی بہترین درسگاہوں کو نمونہ قرار دیا، یعنی کیمبرج اور آکسفورڈ کو۔ کیا مسلمانوں کے واسطے یہ مقام فخر نہیں ہو کہ خود وہ قوم جس کے کارنامے آکسفورڈ اور کیمبرج ہیں، ہندوستان میں لاکھوں کروڑوں روپے

خرچ کرنے پر یہ اعلیٰ نمونہ تعلیم قائم نہ کر سکی، پچاس برس کے تجربہ کے بعد اب ماہرانِ تعلیم بالاعلان تسلیم کر رہی ہیں کہ جو چیزیں انھوں نے چھوڑیں وہی دراصل تعلیم کی جڑ تھیں۔

مذہبی تعلیم، تربیت، جسمانی صحت کی نگہداشت، یہ وہ امور ہیں جو ہمارے کالج کی خصوصیات خاصہ میں سے ہیں اور باوجود یونیورسٹیوں کی جکڑبند کے مسلمان اپنے حسن تدبیر سے ان کو نباہتے رہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمارے کالج کے طلبار قابلیت و لیاقت کا معیار تسلیم کئے جاتے ہیں۔ جب کہ ہم بورڈنگ ہاؤس قائم کر رہے تھے اور تربیت کے مسائل کے حل میں مصروف تھے، دوسرے کالج اس سے بالکل غافل و بے خبر تھے۔ ان کالجوں میں جو بنگلے یا مکانات طلبار کی سکونت کے واسطے تھے، وہاں تربیت کا عدم وجود برابر تھا۔ خود مجھ کو اس صوبہ کے ایک نامور کالج میں پڑھنے کا فخر حاصل ہے۔ اس کے بورڈنگ ہاؤس کے بنگلے ایک وسیع میدان میں پھیلے ہوئے تھے۔ گروہ سلسلہ مفقود تھا جو کیرکٹر کا سانچے میں ڈھالنے والا ہے۔ میری موجودگی میں نواب محسن الملک مرحوم نے ایجوکیشن کمیشن کے سامنے اپنے بورڈنگ ہاؤسوں کو "سرائے" سے تعبیر کیا تھا۔ یہ تعریف ایسی جامع و مانع تھی کہ مدت تک کمیشن کے کاغذات میں دائر و سائر رہی۔ جن لوگوں کو ہمارے کالج کے جلسے دیکھنے کا کا موقع ملا ہے وہ جانتے ہیں کہ مسٹر بیک ہمارے ہر دل عزیز پرنسپل کس جوش اور فصاحت کے ساتھ سرکاری یونیورسٹیوں کے نقائص علی گڑھ تشریف لانے والوں وائسرایوں اور دیگر بلند پایہ وزیٹروں کے سامنے اسٹریچی ہال میں بیان کیا کرتے تھے۔ ان گزشتہ اور موجودہ واقعات کے ہوتے ہوئے ہماری جانب سے یہ اندیشہ کہ ذی اختیار ہونے پر ہم معیار تعلیم پست کر دیں گے کس قدر حیرت خیز ہے۔ ہم نے اور صرف ہم نے چالیس سال انگریزی تعلیم و تربیت کا معیار ہندوستان میں بلند رکھا۔ اب جبکہ ہمارے رفیق اور کچھ پیدا ہو رہے ہیں ہم اس پرچم کو نیچا کر دیں! ان ھذا الشیٔ عجاب!!! یہ دوسری یونیورسٹیوں کے ساتھ مناقشہ۔ جب سرکاری یونیورسٹیوں میں باہم مناقشہ پیدا نہیں ہوتا تو مسلم یونیورسٹی کا (جو مثل دیگر نئی یونیورسٹیوں کے اصول و قواعد کی پابند ہوگی) سرکاری یونیورسٹیوں سے مناقشہ کرنا کیونکر قیاس میں آئے۔ ایک ہی کالج کے طلبار دو دو یونیورسٹیوں میں

امتحان دیتے ہیں اور کامیاب ہوتے ہیں، مگر کبھی مناقشہ پیدا نہیں ہوتا۔ تو جو کالج صرف ایک ہی یونیورسٹی کے ماتحت ہوں گے وہ نزاع کا دنگل بن جائیں، یہ ناممکن ہے۔ اگر کبھی اتفاق سے کوئی امر اختلافی ہوگا (جیسا اور تمام باقاعدہ جماعتوں میں بھی پیدا ہوتا رہتا ہے) تو اُس کو ہمارا عالی مرتبہ چانسلر فیصل کر سکے گا۔

بعض اہل الرائے کا خیال ہے کہ جب کہ ہمارے پاس اِس وقت متعدد کالج نہیں ہیں، تو الحاق پر اصرار بے معنی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ کالجوں کا ہونا مقتضی ہے اس امر کا کہ الحاق کا اختیار ضرور حاصل کیا جائے۔ میں نے اوپر عرض کی ہے کہ گزشتہ واقعات سے سبق حاصل کرنا چاہیے، اور اسی لئے پہلے مسلم یونیورسٹی کے متعلق مختصر و اہم واقعات گزارش کر دیئے ہیں۔ اُن پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ باوجود سالہا سال کی مسلسل کوشش کے مسلم یونیورسٹی کی تحریک کا ایک پیادہ پا آدمی کی رفتار چلنا اور ۱۹۱۱ء میں موٹر کی تیزی اور ہوائی جہاز کی پرواز اختیار کر لینا محض اس وجہ سے تھا کہ مسلمانوں کے دلوں میں یہ امید پیدا ہوگئی تھی کہ وہ اس اعتماد کے قابل ہیں کہ اپنی تعلیم کا اپنی ضروریات کے مطابق خود انتظام کر سکیں۔ "کامریڈ" کے لائق ایڈیٹر نے اعداد سے ثابت کیا ہے کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں کے مسلمانوں نے خود اپنے کالجوں اور اسکولوں کو سالہا سال میں اتنا روپیہ نہیں دیا جتنا چند مہینے میں مسلم یونیورسٹی کو دے دیا۔ اس طرح برسوں کی میعاد سمٹ کر مہینوں کی شکل میں آگئی۔ اس صورت میں اگر الحاق کا اختیار نہیں ملے گا، تو سالہا سال تک بھی کالج قائم نہ ہوں گے۔ وجہ یہ کہ قیام کالج کے اصلی دونوں سبب مفقود ہوں گے، یعنی امید اور مرکزی قوت۔ لیکن اگر اختیار الحاق حاصل ہوتا ہے، تو یہی دونوں سبب مل کر حیرت خیز عجلت کے ساتھ ہر صوبہ میں کالج قائم کر دیں گے۔ یہ اندیشہ کہ مختلف صوبوں میں کالج قائم کرنے سے قوت متفرق ہو جائے گی اگر صحیح ہے تو اس کا یہ مطلب ہے کہ برسوں کالج قائم نہیں ہونے چاہئیں۔ اسی کے ساتھ اس پر بھی غور کرنا چاہیے کہ جب مرکزی قوت ہر صوبہ میں کالج قائم کرے گی تو قوت متفرق نہ ہوگی بلکہ متفقہ کوشش کام کر جائے گی۔ یہ محض بحث یا مناظرہ نہیں ہے، بلکہ ایک دقیق پہلو اس معاملہ کا ہے جس پر مسلمانوں کو پوری توجہ سے غور کرنا ضروری ہے۔

الحاق کے خلاف ایک یہ دلیل بھی بیان کی جاتی ہے کہ سرسید احمد خاں نے بیرونی کالجوں کا الحاق اپنی اسکیم میں نہیں رکھا تھا۔ اس دلیل پر غور کرنے کے وقت ہم کو یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ سرسید نے اپنی اسکیم میں ایک ہزار طلبہ کی تعداد لکھی ہے۔ اُن کے زمانہ میں جو حالت جدید تعلیم کی اشاعت اور محمڈن کالج کی مقبولیت کی تھی وہ اوپر گزارش ہو چکی ہے۔ اُس کے لحاظ سے ایک ہزار طلبا کی تعداد کافی تھی اور جو یونیورسٹی صرف ایک ہزار طلبا کے واسطے بنے اُس کے واسطے علی گڑھ سے باہر جانے کی ضرورت نہ تھی۔ ہمارے کالج کی بنیاد جس پیمانہ پر رکھی گئی وہ ایک ہزار طلبا کے واسطے کافی تھی۔ آج حالات بالکل متغیر ہو چکے ہیں اور مسلمانوں میں علوم جدیدہ کا شوق اُس حد تک پہنچ گیا ہے کہ ایسے مرکز تعلیم میں (جیسا مسلم یونیورسٹی ہوگی) ایک ہزار طلبہ کی تعداد مضحکہ خیز ہے۔ سرسید احمد خاں کے زمانہ میں کالج کا دائرہ بہت ہی محدود تھا۔ اب ہندوستان جنت نشان کے چاروں کونوں میں جو اولوالعزم طالب علم آنکھ کھولتا ہے وہ علی گڑھ کی طرف دیکھتا ہے۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ دیگر ممالک کے متلاشی ترقی مسلمان بھی علی گڑھ ہی کا خواب دیکھتے ہیں۔ اندریں صورت قدیم اسکیم کے اس حصہ کو آنکھیں بند کرکے کافی و شافی سمجھ لینا خود کشی کا مرتکب ہونا ہے۔ دیکھو جو لوگ خود علی گڑھ میں دائرہ یونیورسٹی محدود کرنا چاہتے ہیں وہ بھی کہتے ہیں کہ متعدد کالج قائم کرو۔ اُن سے پوچھو کہ سرسید کی اسکیم میں متعدد کالجوں کا علی گڑھ میں بنانا کہاں تھا؟

نگرانی ایک یہ اعتراض بھی ہے کہ مسلمان نگرانی بیرونی کالجوں کی نہ کر سکیں گے۔ اول دریافت طلب یہ امر ہے کہ جو لوگ علی گڑھ کے متعدد کالجوں کی نگرانی کر سکیں گے وہ باہر کے کالجوں کی نگرانی سے کیوں قاصر رہیں گے؟ جو گروہ علی گڑھ کے متعدد کالجوں کے واسطے طریقہ تعلیم نصاب اصول تربیت وغیرہ اہم اور عظیم الشان امور تجویز اور مدوّن کر سکتا ہے امتحان لے سکتا ہے سندیں دے سکتا ہے وہ یہی کام باہر کیوں نہیں کر سکتا؟ صرف فاصلہ کا سوال باقی رہ جاتا ہے جس طرح سرکاری یونیورسٹیاں دور دراز فاصلہ پر کالجوں کی نگرانی کر سکتی ہیں اُسی طریقہ سے مسلم یونیورسٹی کر سکے گی۔ بقدر ضرورت بیش قرار انسپکٹر رکھے جا سکتے ہیں۔ بیرونی کالجوں کی نگرانی کے متعلق جو قواعد ہماری

کانسٹی ٹیوشن کمیٹی نے تجویز کئے ہیں اُن کے پڑھنے سے واضح ہو سکتا ہے کہ کیسا مفید اور مضبوط طریقہ
تجویز کیا گیا ہے۔ مجوزہ طریقے میں جو خامیاں اور کوتاہیاں آیندہ تجربہ سے ثابت ہوں اُن کی اصلاح
بتدریج ہوتی رہے گی۔ اب صرف یہ امر باقی رہتا ہے کہ ہم قصداً معیار تعلیم پست کر دیں۔ اس کا جواب
اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔ علاوہ ازیں اگر ہم ایسا کریں گے، اپنا اعتبار کھو دیں گے اور گورنمنٹ کو سلب
اختیارات کا حق ہر وقت حاصل ہوگا۔ مسئلۂ الحاق پر غور کرتے وقت ایک اور پہلو قابل لحاظ ہے۔
تھوڑی دیر کو مان لیجیے کہ مسلم یونیورسٹی کا دائرہ اثر صرف علی گڑھ تک محدود ہے۔ اس صورت میں وہ
کالج اسلامیہ جو مسلم یونیورسٹی کے زیر اثر نہیں آئیں گے اُن کی مذہبی و دینی تعلیم اور اُن کی نگرانی کا
کیا اہتمام ہوگا؟ اُن کی تربیت (جس میں مذہبی و قومی زندگی کا لحاظ رہے) کس کے متعلق ہو گی؟ ظاہر ہے
کہ سرکاری یونیورسٹیاں (جو مذہبی تعلیم کی ذمہ داری سے جدا ہیں اور جدا رہیں گی) یہ بار اپنے ذمہ
نہیں لے سکتیں۔ دوسری شکل یہ ہے کہ خود ان کالجوں کے مہتمم ان امور کے نگران بنیں۔ اور ضرور یہی ہوگا
تو اس صورت میں غور کرنا چاہیے کہ مسلم یونیورسٹی کی نگرانی ناقص خیال کی جائے اور ان سے متفرق
اشخاص کی نگرانی اعلیٰ ہو۔ یہ کیسا خیال ہے؟ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی مذہبی اور قومی تعلیم و تربیت صرف
اسلامی گروہ کر سکتا ہے اور اسلامی گروہ مسلم یونیورسٹی سے بہتر دستیاب ہونا بھی عرصہ تک ممکن نہیں۔

نام

نام کی خوبی یہ ہے کہ سادہ، متعارف اور مسمّٰی کے ساتھ مناسب ہو۔ جو یونیورسٹی مسلمانوں کے
واسطے دینی و دنیوی اعلیٰ تعلیم گاہ ہو اُس کا نام "مسلم یونیورسٹی" سے بہتر دوسرا نہیں ہو سکتا۔
سر سید احمد خاں مرحوم نے جب مسلمانوں کے واسطے کالج قائم کیا تو اُس کا نام "محمڈن اینگلو اورینٹل
کالج" رکھا۔ علاوہ کالج کے اُس زمانہ میں جو اور تحریکیں مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ تعلق رکھتی تھیں
اُن کے نام کے ساتھ بھی "محمڈن" کا لفظ ضرور تھا مثلاً "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" "محمڈن لٹریری
سوسائٹی کلکتہ" چونکہ انگریزی تحریروں میں اُس زمانہ میں "مسلم" کے واسطے "محمڈن" کا لفظ تھا تو اسی لئے انگریزی
نام میں اس لفظ کا رواج لابد تھا۔ ورنہ مسلمانوں نے خود اس لفظ کو اپنے واسطے پسند نہیں کیا۔ چنانچہ
سر سید نے اپنے کالج کا نام ہندوستانی میں "مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ" رکھا تھا۔ مابعد کی تحریکوں میں

یہ رجحان عام رہا اور بجائے "محمڈن" کے "مسلم"، "اسلامی" الفاظ زیادہ رائج ہوئے چنانچہ "انجمن حمایت اسلام" لاہور، "اسلامیہ کالج" لاہور، "انجمن اسلامیہ پنجاب" "مسلم لیگ"، "مسلم ڈیپوٹیشن"۔ جو کالج پشاور میں مسلمانوں کے واسطے قائم ہو رہا ہے اس کا نام بھی "اسلامیہ کالج" تجویز کیا گیا ہے۔ اسی بناء پر مسلم یونیورسٹی کی کمیٹی نے اس عظیم الشان درس گاہ کا نام مسلم یونیورسٹی تجویز کیا جو ہزاروں، لاکھوں مرتبہ اس عرصہ میں پبلک کی زبانوں پر آیا اور بے مبالغہ لاکھوں ہی مرتبہ قلم بند ہوا۔ اس تحریک کے متعلق اخباروں، کتابوں، رسالوں، رسیدبہیوں، خط و کتابت اور مراسلت میں بھی یہی نام پبلک سے روشناس رہا ہے۔ اور پبلک کو اس تحریک کے حامیوں نے بتایا ہے کہ جو درسگاہ مسلمانوں کی دینی اور دنیوی تعلیم کی متکفل ہوگی اس کا نام "مسلم یونیورسٹی" ہوگا۔ کوئی شبہ نہیں کہ پبلک کا عام رجحان اس طرف ہونا اسی وجہ سے تھا کہ ان کو انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم سے بھی اطمینان دلایا گیا۔ اب اس نام کا بدلنا پبلک میں یہ بدگمانی پیدا کرے گا کہ مقاصد یونیورسٹی میں کچھ تغیر تبدل ہوا جو یہ نام بدلا جاتا ہے۔ علاوہ اس کے جب ہماری تمام تعلیمی و پولیٹیکل تحریکیں اپنے نام کے ساتھ اسلامی نشان رکھتی ہیں، تو اس سارے مجمع میں اس عظیم الشان درس گاہ کا اس نشان سے محروم رہنا کس قدر بدنما ہوگا! پبلک میں مذکورۂ بالا بدگمانی پیدا ہونا اس عام ہمدردی کو اس تحریک سے جدا کر دے گا جو اب تک اس کے ساتھ ہے۔ یہ محض وہمی اندیشہ نہیں ہے، واقعی اندیشہ ہے۔ ابتداءً لاہور میں کانسٹی ٹیوشن کمیٹی میں علماء کے شامل نہ ہونے سے جو ناراضی پیدا ہوئی تھی اس کو پیش نظر رکھنا چاہیے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ نام آخر نام ہے۔ انھوں نے غالباً معاملہ کے تمام پہلوؤں پر غور نہیں کیا ہے۔

اب کیا کرنا چاہیے؟

اب اہم سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کو آیندہ کیا کرنا چاہیے؟ اس کے متعلق سب سے زیادہ ضروری امر یہ ہے کہ ہر قسم کے کوتہ اندیشانہ جوش و خروش سے اور شور و غوغا سے احتراز کیا جائے۔ گورنمنٹ کی جانب سے نہ خود بدگمانی کرنی چاہیے اور نہ دوسروں میں پھیلانی چاہیے۔ سربرآوردہ مسلمانوں کا اہم فرض ہے کہ وہ اس نازک موقع پر قوم

کی کشتی کو فہم و فراست کے ساتھ کھے کر کنارہ پر لگا دیں۔ مع ہذا استقلال و ادب کے ساتھ اپنی ضرورتوں کو گورنمنٹ کے سامنے پیش کرتے رہنا چاہیے، اور ظاہر کرنا چاہیے کہ مسلم یونیورسٹی تحریک کی جان وہی امور ہیں جو اس وقت زیر بحث ہیں۔ اور مسلم یونیورسٹی کے سلسلے کا درہم برہم ہونا حضور ملک معظم کی سات کروڑ رعایا کی تعلیم کے سلسلے کا درہم برہم ہونا ہے۔ اگر سربرآوردہ مسلمان یہ امور گورنمنٹ کے ذہن نشین نہ کر سکے تو وہ اپنے فرض کے ادا کرنے میں قاصر رہیں گے۔ جب تک ایسی یونیورسٹی نہ ملے جو ہمارے مقاصد کو مفید ہو اس وقت تک قبول نہیں کرنی چاہیے۔ سرمایہ کو برابر ترقی دی جائے۔ جو وعدے ہیں وہ پورے ہوں۔ جو لوگ وعدے پورے کر چکے وہ از سر نو چندہ دیں۔ تیس لاکھ آخر ایک قلیل رقم ہے۔ جو مسلم یونیورسٹی کی تکمیل کے لئے چندہ پھر ہوتا، پھر ہوتا وہ اب اس فرصت میں ہونا چاہیے۔ جس قدر سرمایہ جمع ہوگا ہم منزل کے قریب تر پہنچتے جائیں گے۔ جو سرمایہ جمع ہے اُس کے یا اُس کے منافع کے خرچ کرنے کا اُس وقت تک خیال بھی نہیں کرنا چاہیے جب تک کہ مسلم یونیورسٹی کی منظوری نہ ہو جائے۔ کمیٹی اس سرمایہ کی امین ہے اور شرط امانت یہ ہے کہ چندہ دہندوں کی شرائط کا لحاظ رہے۔ بدوں منظوری مسلم یونیورسٹی محمدن کالج علی گڑھ میں روپیہ لگانا امانت کے خلاف ہوگا۔ رہا واپسی سرمایہ کا خیال، میرے نزدیک کوئی ذی حمیت مسلمان اس کا خواب بھی نہ دیکھے گا۔ جب روپیہ بلا شرط واپسی کے دیا گیا ہے، تو اب واپسی کیسی؟ آخر میں یہ عرض ہے کہ اس وقت ناصحانِ مشفق بہت پیدا ہو گئے ہیں۔ پبلک کو اُن کی نصیحت سننے سے پہلے یہ اندازہ کر لینا چاہیے کہ ان حضرات نے اس تحریک کے کامیاب بنانے میں کس قدر جاں فشانی کی ہے۔ جو لوگ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہے وہ پہلے بھی تماشا دیکھتے تھے اب بھی تماشا دیکھ رہے ہیں۔ جن دلوں میں اس تحریک کا درد ہے صرف اُن کی نصیحت قابل قبول ہے۔

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۳ اکتوبر ۱۹۱۲ء)

مرحومی علامہ شبلی نعمانی

۱۳۳۲ھ ہجری کا خاتمہ

ایک ایسے حادثہ پر ہوا جو ہماری تاریخ میں مدت دراز تک حسرت و افسوس کے ساتھ یاد رہے گا۔ ۲۸ ذی حجہ کو جب سال مذکور کی زندگی میں صرف دو یوم باقی تھے۔ یہ اندوہناک خبر شائع ہوئی کہ آج صبح شمس العلما علامہ شبلی نے رحلت فرمائی حیف کہ صبح کے وقت جو طلوع و ظہور نور کا وقت ہے آفتاب علم غروب ہوگیا اور عالم علم پر ظلمت چھا گئی۔

ہماری علمی زندگی کا مدت ہوئی خاتمہ ہو چکا ہے، اس لئے شاید یہ صدمہ اس قدر محسوس نہ ہو جس قدر ہونا چاہیئے۔ لیکن جب ہم زندہ تھے اُس وقت اہل کمال کا ماتم بھی اُسی جوشِ عقیدت سے ہوتا تھا جو اُن کے کمال کی قدرشناسی میں عیاں ہوتی تھی۔ امام طبری نے وفات پائی تو تین مہینے تک لوگ دور دراز مقامات سے آ آکر نماز جنازہ ادا کرتے رہے۔ ماتم کی شان یہ ہے کہ رحلت کرنے والوں کے اوصاف یاد کرکے دل پر صدمہ ہو، صدمہ سے وہ بجلی چمکے جو زندگی کی اساس ہے، اس برقی روشنی میں اوصاف بالا منزل مقصود دکھلائیں۔ اور اس طرح وہ موت زندوں کے لئے حیاتِ مزید کا باعث بن جائے۔

اس قحط الرجال کے زمانہ میں ہم میں سے جو باکمال اُٹھ جاتا ہے اُس کی جگہ خالی پڑی رہتی ہے جس طرح ایک کہنہ عمارت کا جو حصہ گرتا ہے ویرانہ میں اضافہ کرتا ہے۔ پہلے کامل کی جگہ پر کامل تر بیٹھتا تھا۔ بزم حمّاد میں امام ابو حنیفہ زیب مجلس بنے۔ امام الحرمین کی مسند کمال امام غزّالی سے آراستہ ہوئی فیضی کی ملک الشعرائی کی کرسی پر طالب آملی جلوہ افروز ہوا۔

ایک عالم کا ماتم یہ ہے کہ اُس کے کمالات کی صدا مدت تک ملک و ملت میں گونجتی رہے۔ اُس صدا سے رہ روانِ شوق کو تلاش منزل میں مدد ملے۔ اُن کا نمونہ نو واردوں کے واسطے شمع ہدایت بنے جن شاندار اور مفید کاموں کی بنیاد انھوں نے ڈالی ہو اُن کی تکمیل کی جائے، ان کی تصانیف، اُن کے حالات ملک میں شائع ہوں، تاکہ پڑھنے والے اُن کو پڑھیں اور نفع حاصل کریں۔ انسان کا ظاہر گوشت پوست

ہے۔ مگر اس کی اصل زندگی اوصاف ہیں (خواہ اچھے ہوں یا برے) صفات کا ظہور حرکات سکنات، رفتار گفتار، غرض زندگی کے ہر جلوے سے عیاں ہوتا ہے۔ ایک بدکار کی بدکاریاں ہر قول و فعل سے نمایاں ہوتی ہیں۔ کاملین کی زندگی کے ہر شعبے میں کچھ نہ کچھ کمال کی جھلک ضرور نظر آتی ہے۔ اس لئے اہل کمال کے حالات کو نگاہ تبصرہ سے دیکھنا خود اپنے آپ میں آثار کمال پیدا کرتا ہے۔

علامہ شبلی مرحوم کی زندگی میں بہت سے پہلو ایسے ہیں جو قدیم و جدید دونوں طبقوں کے علماء کے واسطے سبق آموز ہو سکتے ہیں۔ اس لئے ان کے سوانح عمری اگر محنت کے ساتھ لکھے جائیں تو بے حد مفید ثابت ہوں گے۔

ضروری حالات

اس مضمون میں ہم کسی قدر تفصیل سے بعض پہلوؤں پر بحث کرنا چاہتے ہیں۔ علامہ شبلی اعظم گڑھ کے ایک مشہور خاندان کے فرد اور نامور باپ کے بیٹے تھے۔ میرا ذاتی علم نہیں، لیکن اس عرصے میں جو مضامین اخبارات میں شائع ہوئے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے۔ فطرۃً ذہن ثاقب اور طبع سلیم ان کو عطا ہوئی تھی۔ اسباب ترقی مہیا ہوئے کہ شفیق باپ نے پوری توجہ ان کی تعلیم پر صرف کی۔ مولانا محمد فاروق صاحب سا استاد وقت استادی کو ملا۔ مولانا فاروق باوجود آزادی بہت سے ایسے اوصاف کے جامع تھے جو آج طبقہ اساتذہ میں کمیاب ہیں۔ خاص جوہر یہ تھا کہ شاگرد کے دل میں علم کا ذوق پیدا کر دیتے تھے۔ طلباء کو کتاب کا کیڑا نہیں بناتے تھے بلکہ علم کا چسکا اور شائق بنا دیتے تھے۔ فنون معقول و ادبیات میں کامل ماہر تھے۔ اس کے علاوہ فارسی اور اردو کے لٹریچر کا پاکیزہ مذاق تھا۔ ایسے استاد کی صحبت نے علامہ شبلی کے دل و دماغ میں بھی علاوہ استعداد علم کے کاوش و ذوق فنون اور انتقال ذہنی کی قوت پیدا کر دی۔ علم حدیث کا استفادہ مولانا احمد علی صاحب مرحوم محدث سہارنپوری سے کیا تھا۔ فراغ تحصیل کے بعد چند روز امین دیوانی رہے۔ مگر یہ ملازمت ان کے واسطے مصیبت تھی۔ جس جگہ قسم کے واسطے جانے والوں کا کھانا پینا سب حرام، آخر نہ چل سکی۔ نوجوانی ہی میں علی گڑھ تشریف لائے۔

ملخصاً ماخوذ از حیات شبلی، مؤلفہ مولوی سید سلیمان ندوی، دار المصنفین اعظم گڑھ سے شائع کی ...

۱۵ جمادی الثانی ۱۳۳۳ھ

خان بہادر محمد کریم[1] صاحب اُس زمانے میں یہاں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ اُن کے توسل سے مولوی سمیع اللہ خاں صاحب مرحوم سے ملے۔ مولوی صاحب ممدوح کو خداوند تعالیٰ نے جوہر شناسی کا ملکہ بخشا تھا کتنے آدمی اُن کی جوہر شناسی کی بدولت کیا سے کیا ہوگئے۔ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب نے اُن کو کالج کی پروفیسری کے لئے انتخاب کرکے سر سید احمد خاں مرحوم کے سامنے پیش کیا۔ یہ راستہ تھا "مولوی شبلی" کے "علامہ شبلی" بننے کا۔ میں نے بہت ابتدائی زمانہ میں اُن کو علی گڑھ کی نمائش کے موقعے پر کشتی کے دنگل میں دیکھا تھا۔ خوب توانا تھے۔ سر کے بال پریشان ایک سیاہ گول ٹوپی سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ عرصہ تک شہر میں رہے۔ پھر سر سید کے پڑوس میں ایک چھوٹا سا بنگلہ لیکر آ رہے۔ سر سید مرحوم کو خداوند تعالیٰ نے ایسا دماغ عطا فرمایا تھا جو صحیح اصول کا اخذ کرنے والا تھا۔ ذوق علم اُن کے رگ و پے میں ساری تھا اُن کی مجلس میں علمی چرچے رہتے تھے۔ مختلف مسائل پر جرح و قدح ہوتی تھی۔ جدید و قدیم اصول باہم ٹکراتے تھے۔ بڑی خوش قسمتی علامہ شبلی کی یہ تھی کہ اُس عہد میں پروفیسر آرنلڈ سا علم دوست استاد کالج میں تھا۔ یہ دونوں دلدادگان علم باہم ملے اور اس طرح ملے کہ جس طرح مختلف اللون نور کی شعاعیں باہم مل کر عالم کی روشنی کا باعث بنتی ہیں۔ پروفیسر آرنلڈ نے علامہ شبلی کو جدید اصول سے آگاہ کیا۔ یہ بتایا کہ جدید علمی مجلس کے کیا ساز و سامان ہیں۔ قدیم علوم پر کیا کیا اعتراض اور حملے ہیں علامہ شبلی کی حذاقت اور قوت دماغی یہ تھی کہ وہ جدید اصول کے طمطراق سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ اُن پر اطمینان سے غور کیا۔ جو اصول عمدہ تھے اُن کو اخذ کیا (نہ صرف اخذ کیا بلکہ اُن کو اپنی زندگی کا رہبر بنایا) نمائشی چیزوں کو رد کر دیا۔ پروفیسر آرنلڈ نے عربی کا استفادہ علامہ شبلی سے کیا اور یہ سیکھا کہ پرانی زمینوں میں بھی جواہر آبدار موجود ہیں، اگرچہ گرد آلودہ ہو کر نگاہوں سے پوشیدہ ہوگئے ہیں۔ اس واقفیت کا نتیجہ پروفیسر آرنلڈ کی بے نظیر تصنیف "پریچنگ آف اسلام" کی صورت میں عیاں ہوا۔ علامہ شبلی نے پروفیسر آرنلڈ سے کسی قدر فرنچ بھی سیکھی تھی۔ علامہ ممدوح کی زندگی کا یہ دور بہت کچھ سبق آموز اور ایک بڑے تعلیمی مسئلہ کا حل کرنے والا ہے۔ پروفیسر آرنلڈ سالہا سال محمڈن کالج میں رہے،

---

[1] رئیس محمد آباد ضلع اعظم گڑھ۔ حبیب الرحمٰن ۳ر شوال ۱۳۶۲ھ

اور بیسیوں طلبار نے اُن سے پڑھا۔ وہ محض ضابطہ کے پروفیسر نہ تھے جو بائیسکوپ کی تصاویر کی طرح حرکات و صورت دکھا کر نظر سے اوجھل ہو جاتی ہوں۔ وہ استاد شفیق اور شفقت کے اثر سے شاگردوں کے دل میں گھر کرنے والے تھے۔ اس پر بھی اُن کے کسی شاگرد نے اُن سے وہ فیض حاصل نہ کیا جو علامہ شبلی کے حصہ میں آیا حالانکہ اور شاگرد بھی اُن کے خام عقل بچے نہ تھے، کالج کلاسوں کے طلبار تھے۔ خود علامہ شبلی سولہ برس کالج میں رہے۔ مگر کسی شاگرد کے قلب میں ان کے کمال کی وہ قدر و محبت پیدا نہ ہوئی جو استاد کی پیروی پر آمادہ کرتی۔ فیض حاصل کیا تو صرف اس قدر کہ ڈگریوں کا امتحان پاس کر لیا۔ اس میں علامہ شبلی کی کیا خصوصیت تھی۔ یہ تو ہر کالج میں ہوتا آیا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جو سلسلہ تعلیم جدید کا ہمارے دیار میں مروج ہے اُس کا نظام و ترتیب اس قسم کی ہے جو طلبار میں شوق علم پیدا کرنے سے ہمیشہ قاصر رہی۔ وہ ایک سیلاب ہے جس میں پڑ کر طلبار اضطراری حالت میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے ڈگریوں کے ساحل پر جا پڑتے ہیں۔ کچھ خود ٹھہرتے ہیں، بہت کچھ سیلاب کا زور اُن کو بہا کر کنارہ پر جا ڈالتا ہے۔ جب ساحل پر پہنچ کر آنکھیں کھولتے ہیں تو نجات پانے پر شکریہ ادا کرتے ہیں اور عہد کرتے ہیں کہ پھر اس بحر ناپیدا کنار کی طرف رخ نہ کریں گے۔ بارہ برس پڑھ کر جب ڈگری مل جاتی ہے تو کتابوں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاتے ہیں۔ اس تعلیم سے وہ قوت مطالعہ بھی نہیں پیدا ہوتی جو ترقی علم کے واسطے لازم ہے۔

اس زمانہ میں جو کام جدید سلسلہ میں بھی ہوئے ہیں، وہ بھی بہت کچھ تعلیم قدیم کے زیر بار احسان ہیں۔ بنگالی کی ترقی ہمیشہ راجہ رام موہن رائے آنجہانی کی ممنون رہے گی۔ یہ واقعہ ہے کہ وہ عربی تعلیم کے فیض یافتہ تھے۔ سر سید احمد خاں مرحوم پرانے مکتب و مدرسے سے اسکول اور کالج کے میدان میں آئے تھے۔ بلگرامی خاندان کی عظمت تعلیم جدید میں مسلم ہے۔ یہ خاندان بھی تعلیم قدیم کے آغوش شفقت میں تربیت پا کر انگریزی مدارس میں پہنچا تھا۔ اس بحث سے مقصود ہا شا کوئی اعتراض یا الزام نہیں۔ تعلیم قدیم میں بہت سے نقائص ہیں جن کو خود علماء نے تسلیم کیا ہے۔ غرض صرف اس قدر ہے کہ یہ ایک اہم مسئلہ قومی تعلیم کا ہے اور ماہرین کی توجہ کا محتاج۔

علامہ شبلی ۱۸۹۸ء تک محمڈن کالج میں رہے۔ سر سید مرحوم کی وفات کے بعد جلد کالج چھوڑ کر حیدرآباد

چلے گئے۔ یہ نواب وقار الامراء بہادر کی وزارت کا زمانہ تھا۔ سید علی بلگرامی مرحوم کی سرپرستی میں سلسلۂ آصفیہ قائم ہوا۔ علامہ شبلی کے دو سو روپیہ ماہوار بطور وظیفہ تصنیف مقرر ہوئے۔ عرصہ تک وہاں مقیم رہ کر تصنیف و تالیف میں مصروف رہے تقرر وظیفہ کے بعد کی جملہ تصانیف سلسلۂ آصفیہ کے عنوان سے معنون ہیں۔ مولوی عزیز مرزا مرحوم کے عروج کے زمانے میں علامہ مرحوم نے اورنٹیل یونیورسٹی کی اسکیم تیار کی۔ حال میں وظیفہ میں ترقی ہو کر وہ تین سو روپیہ ماہوار ہو گیا تھا۔

حیدرآباد سے واپس آکر کچھ دن تک ندوۃ العلماء اور محمدن کالج کی کشمکش میں رہے۔ نواب محسن الملک مرحوم ہمیشہ اس فکر میں رہے کہ کسی طرح علامہ شبلی پھر کالج میں آ جائیں لیکن ندوۃ العلماء کی کشش غالب آئی اور وہ مستقل طور پر لکھنؤ جا کر قیام پذیر ہوئے۔

ندوۃ العلماء کے ساتھ علامہ شبلی کو ابتدا ر قیام مجلس مذکور سے تعلق خاص تھا اور وہ اُن چند مخصوص ارکان میں سے تھے جنھوں نے ندوہ کے مقاصد کو پوری طرح سمجھ کر اس کی کامیابی کو نصب العین قرار دیا تھا۔ مولانا سید محمد علی صاحب ناظم اول کی دوربین اور مردم شناس نظر نے ابتدار سے یہ امر محسوس کر لیا تھا کہ ندوۃ العلماء کے بعض مقاصد ایسے ہیں جن میں علامہ شبلی کی رہبری کی ہمیشہ ضرورت ہوگی۔ دارالعلوم کی اسکیم اُن ہی کے دماغ کا نتیجہ تھی۔ جو رسالہ ندوۃ العلماء نے اس کے متعلق شائع کیا وہ اُن ہی کے قلم کا لکھا ہوا تھا جب تک مولانا سید محمد علی صاحب کی نظامت رہی مختلف خیال کے ارکان اپنے اپنے دائرے میں کام کرتے رہے۔ اور باہم تصادم نہیں ہوا مولانا کی علیحدگی کے بعد پھر کوئی ایسا ناظم نہ ملا جو مختلف الخیال ارکان سے کام لے سکتا۔ علامہ شبلی چونکہ سالہا سال تک کالج میں رہے تھے ایک حد تک اُن کے خیالات آزاد تھے علمار کے مروجہ رسمی طریقوں کو وہ لوازم دین نہیں خیال کرتے تھے۔ اعتراض کرنے میں بے باک تھے۔ اُن کی وسیع نظر کے سامنے متقدمین کا دور اور اس کے آثار تھے لہذا متاخرین کے انداز کے زخم خوردہ نہ تھے۔ یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے قدیم علمار کو اُن کی جانب سے شبہات تھے بعض کا عرصہ تک یہ خیال رہا کہ وہ کالج کے سفیر بن کر ندوہ میں آئے تھے تاکہ یہاں بھی الحاد کا رنگ جمائیں۔ خلاصہ یہ کہ آخر وقت تک علامہ شبلی

قدیم طبقہ کے علماء میں شیر و شکر نہ ہو سکے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُن کی خدمات نے ندوۃ العلماء کے قالب میں ایک تازہ روح پھونکی۔ بہت سے مرحلے طے کئے لیکن جو کامیابی حاصل ہونی چاہئے تھی وہ باہمی تصادم خیالات نے حاصل نہ ہونے دی۔ ہماری بہت سی محرومیوں میں ایک یہ بھی ہے۔

رسالۂ الندوہ (جو اردو کے مہتم بالشان رسالوں میں سے ایک رسالہ تھا) علامہ شبلی کے قلم کے دم قدم کے ساتھ تھا۔ جب اس رسالے کے اجرا کی تجویز مجلس انتظامیہ نے منظور کی تھی تو ایڈیٹری میں میرا نام صرف اس وجہ سے ضم کیا گیا تھا کہ میری جہالت کی تاریکی علامہ شبلی کے خیالات کی تیز روشنی کی چکاچوند کو کچھ کم کرتی رہے گی، اور بدگمانی کا زیادہ موقع نہ رہے گا۔ علامہ شبلی کے دورِ ایڈیٹری میں الندوہ میں جس پایہ کے مضامین نکلے اُن سے اہل ذوق واقف ہیں۔ یہ مضامین ادبِ اردو کے لئے بہترین سرمایۂ ناز رہیں گے۔ قیام ندوۃ العلماء سے قبل جدید و قدیم طبقہ میں باہم جس قدر مغائرت اور نفرت تھی آج اُس کا اندازہ بھی مشکل ہے اور اب جب کہ وہ منافرت دور ہو چکی ہے تو اُس کی یاد بھی خالی از ضرر نہیں۔ اس لئے ہم اُس کی تفصیل سے گریز کرتے ہیں۔ تاہم اس قدر کہنا بیجا نہ ہوگا کہ علامہ شبلی کی ذات واسطہ تھی، قدیم و جدید سوسائٹی کی صلح و آشتی کا (جس کی بنیاد پٹنہ کے اجلاس ندوۃ العلماء میں مولانا سید محمد علی صاحب اور مولانا منور علی صاحب مرحوم سے قدیم محترم علماء اور آنریبل مولوی سید شرف الدین صاحب اور آنریبل سر سید علی امام صاحب سے جدید نامور تعلیم یافتوں کے ہاتھ سے رکھی گئی) اس صلح اور باہمی تبادلۂ خیالات کا ثمرہ وہ بے نظیر متفقہ کوشش تھی جو مسلم یونیورسٹی کی تحریک کے زمانہ میں عیاں ہوئی۔ دورانِ قیام لکھنؤ میں علامہ شبلی نے بیحد کوشش کی کہ دارالعلوم کے منصوبے کو قوت سے فعل میں لائیں۔ لیکن افسوس کہ مذکورۂ بالا اختلاف نے اُن کی کوششوں کو بارآور نہ ہونے دیا۔ دونوں فریق کا زور بجائے ترقی دارالعلوم میں صرف ہونے کے باہمی کشمکش میں صرف ہوتا رہا۔

اگر دارالعلوم نے کسی وقت ایک قدم آگے بڑھایا تو دوسرے وقت دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس وسیع تجربہ کی رو سے جو ندوہ کی نسبت مجھ کو سالہا سال سے حاصل ہے میں کہہ سکتا ہوں کہ کسی فریق کا عمل

بدنیتی پر مبنی نہ تھا۔ اختلاف کا منشا کم تر بعض اصول اور زیادہ تر اختلاف طبائع تھا۔ اگر کوئی زبردست ناظم ندوۃ العلماء کو ملا ہوتا تو وہ دونوں متضاد قوتوں کو ملا کر اسی خوبی سے کام چلاتا جیسے انجن میں آگ اور پانی کی مدد سے قوت رفتار پیدا کی جاتی ہے۔

سفر

علی گڑھ کے زمانہ میں علامہ شبلی نے ممالک اسلامیہ کا سفر کیا۔ اس سفر کا ایک مقصد الفاروق کے واسطے مواد تاریخی فراہم کرنا اور اُن کتابوں کا دیکھنا تھا جو ہندوستان میں موجود نہ تھیں اس رحلت کے دلچسپ حالات سفرنامہ میں شائع ہو چکے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ مراجعت کے بعد وہ خوب تندرست تھے۔ ایسی تندرستی پھر کبھی اُن کو نصیب نہیں ہوئی۔ کچھ عرصہ کے بعد سیر کشمیر کے لئے گئے۔ افسوس ہے کہ گل گشت کشمیر کا وقت بلحاظ آب و ہوا موزوں انتخاب نہیں کیا گیا۔ جولائی اگست کا زمانہ تھا۔ وہاں کے ملیریا نے سخت نقصان پہنچایا اور صحت ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ گئی۔ بلبل شیراز عرفی نے تو تعریفِ کشمیر میں یہ نواسنجی کی ہے ؎

ہر سوختہ جانے کہ بکشمیر درآید
گر مرغِ کباب ست کہ بابال و پر آید

مگر بلبل ہند کو وہاں کے بخار نے بالکل سوختہ جاں کر دیا۔

پانوں کا واقعہ

علامہ شبلی کی زندگی کا ایک سخت واقعہ پانوں کا بندوق سے اڑجانا تھا۔ مردانِ جنگ آزما جس تمنا میں ساری عمر رہتے ہیں وہ اُن کو گھر بیٹھے مل گئی ؎

قسمت نگر کہ کشتۂ شمشیر عشق یافت
مرگے کہ زندگاں بہ دعا آرزو کنند

شعر العجم کی تالیف کا زمانہ تھا۔ شاہنامہ پر ریویو ہو رہا تھا۔ یہ اشعار لکھ کر قلم رکھا ؎

بروز نبرد آن یلِ ارجمند ق بہ تیغ و بہ تیر و بہ گرز و کمند
برید و درید و شکست و ببست یلاں را سر و سینہ و پا و دست

زمانہ میں تخت پر آ کر بیٹھے۔ اتفاقیہ بہو کے ہاتھ سے بندوق سر ہو گئی۔ نشانہ علامہ کا پانوں تھا۔ زانو کے

نیچے سے قریباً سارا پاؤں اُڑ گیا۔ اہلِ علم کی زندگی کا ہر پہلو علمی دلچسپی کا سامان بن جاتا ہے۔ یہ حادثہ بھی بہت سے ادبی نکات و لطائف کا باعث ہو گیا۔ فارسی اور اُردو کی بیسیوں نظمیں اس کے متعلق لکھی گئیں جن میں "لنگ" کے خصائص شاعرانہ لطف کے ساتھ موزوں ہوئے۔ سال میں ایک بار کالج میں آکر کسی اسلامی موضوع پر لکچر دینے کا معمول کئی برس رہا۔ واقعہ مذکور کے بعد جب علی گڑھ تشریف لائے تو تاخیر حاضری کا سبب زخم بند وق بیان کیا۔ اور فرمایا "امید ہے کہ یہ میرا عذر، عذرِ لنگ نہ خیال کیا جائے گا۔"

آخری زمانہ آخر زمانہ میں ندوۃ العلماء کے واقعات سے پریشان رہے۔ اور لکھنؤ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے لیکن میں نے دیکھا کہ مخالفت کے تلاطم میں بھی باطمینان سیرت کی تصنیف میں مصروف تھے۔ اور فرصت کا عمدہ وقت خصوصاً صبح کا اسی کام میں صرف کرتے تھے۔ افسوس ہے کہ آخر عمر میں مولوی محمد اسحٰق صاحب مرحوم وکیل ہائی کورٹ سے قابل و عزیز بھائی کی وفات کا صدمہ اُن کو برداشت کرنا پڑا۔ اور کچھ شبہ نہیں کہ بھائی کی موت اُن کے لئے پیامِ اجل لیکر آئی۔ جو مرثیہ اس حادثہ کے متعلق لکھا ہے اُس کا ہر ایک بند دل تڑپانے والا ہے۔ وفات سے چند روز پہلے اُس کے تین نسخے میرے پاس پہنچے تھے۔ جس دل سے یہ شعر نکلے ہوں وہ خون ہونے سے کب بچ سکتا تھا ایک دوسرے بھائی مہدی مرحوم کے حادثہ کو یاد کرنے کے بعد لکھتے ہیں ؎

آج افسوس کہ وہ نیرِ تاباں نہ رہا ۔۔۔ میری جمعیتِ خاطر کا وہ ساماں نہ رہا
اب وہ شیرازۂ اوراقِ پریشاں نہ رہا ۔۔۔ عتبۂ والدِ مرحوم کا درباں نہ رہا

گلۂ خوبیِ تقدیر رہا جاتا ہے
نوجواں جاتے ہیں اور پیر رہا جاتا ہے

یہ بھی اے جانِ برادر کوئی جانے کا ہے طور ۔۔۔ اپنے بچوں کی نہ کچھ فکر، نہ تدبیر نہ غور
ابھی آنے بھی نہ پایا تھا ترے اوج کا دور ۔۔۔ کیا ہوا تجھ کو کہ تو ہو گیا کچھ اور سے اور

چھوڑ کر بچوں کو بے صبر و سکوں جاتا ہے
کوئی جاتا ہے جو دنیا سے تو یوں جاتا ہے

ایک بند کا آخر شعر ہے ؎

اب وہ مجموعۂ اخلاق کہاں سے لاؤں
ہائے افسوس میں اسحٰق کہاں سے لاؤں

آخر نوجوانوں کے قدم بہ قدم پیر نے بھی سفر کیا۔ ہزاروں پیر و جوان اپنے ماتم میں نوحہ خواں چھوڑے۔ اسہال خونین بہانۂ موت ہوئے۔ پندرہ روز علالت کا سلسلہ رہا۔ ۱۹ رنومبر کو میرے مکرم دوست اور علامہ مرحوم کی عزیز شاگرد مولوی سید سلیمان صاحب نے مجھ کو لکھا:

"آپ کا حبیب صمیم (مولانا شبلی) اس وقت موت و حیات کی کشمکش میں ہے پیچش سے آنتوں میں زخم ہے۔ دس روز سے غذا نہیں۔ حالت مایوس کن ہے"۔

مولوی اسحٰق صاحب مرحوم نے ۵ راگست ۱۹۱۴ء کو وفات پائی۔ اس حادثے کے بعد علامہ شبلی اعظم گڑھ گئے کہ مرحوم بھائی کے جو منصوبے اور تجویزیں اپنے ابنائے وطن کی تعلیم و تربیت کے متعلق تھیں اُن کی تکمیل و انصرام کی کوشش کریں۔ ۱۶ ستمبر کے والا نامہ میں مجکو لکھا تھا:-

"عزیز مرحوم کے واقعہ نے مجھ پر اس قدر سخت اثر کیا کہ تمام عمر کبھی نہیں ہوا تھا حالانکہ مہدی مرحوم کا واقعہ اسی درجہ کا گزر چکا تھا۔ بہر حال میں اعظم گڑھ چلا آیا۔ محمدن شبلی اسکول جو ۳۰ برس ہوئے میں نے قائم کیا تھا ہائی اسکول سے مڈل اسکول تک آ گیا۔ عزیز مرحوم اس کو انٹرینس تک پہنچانا اور تمام برادری کے قصبات میں اسکول اور مکاتب قائم کرنا چاہتے تھے۔ دو مہینہ کا دورہ رکھا تھا اور پانسو روپیہ مصارف دورہ کے لئے الگ کر دئے تھے۔ اشتہارات اور رسید بہیاں سب چھپ گئی تھیں۔

مجکو اس کام کے علاوہ دارالمصنفین اور دارالتکمیل کی فکر ہے۔ ندوۃ میں کام کرنا ممکن نہ تھا۔ ۶ برس تک کشاکش میں گزرے۔ جو ہو گیا وہی تعجب انگیز ہے۔ بہرحال صورت موجودہ یہ ہے کہ اسکول کے پاس ہی میرا اور میرے خاندان کا باغ ہے جس کا کل رقبہ ۱۱ بیگہ پختہ ہے۔ اس کو وقف کر رہا ہوں۔ اور شرکا بھی راضی ہو گئے ہیں۔ مسودہ لکھا جا چکا۔ رجسٹری کرانا ہے۔ دو بنگلے پہلے سے موجود ہیں۔ کتب خانہ (دوبارہ) بقدر معتدبہ مہیا ہو گیا ہے اور بڑھتا جاتا ہے۔ دفتر سیرت کا کل سرمایہ اس طرف منتقل ہو جائے گا۔ بنگلہ

صرف کتب خانے کے لئے کافی ہوگا۔ ضروری طور سے فرنشڈ کر دیا ہی۔ دارالمصنفین کی عمارت کے لئے کچھ اضافہ ہوگا۔ چاہتا ہوں کہ اس کے چار کمرے ۴ عناصر اردو کے نام سے تعمیر ہوں اور عمارت پر تمام موجودہ معززین ارباب قلم کے نام کندہ ہوں۔ چندہ مشروط نہیں۔ ہر صاحب قلم چندہ دے بھی نہیں سکتا۔

اسی کے ساتھ دارالتکمیل کھول رہا ہوں یعنی ادب اور تفسیر کی تکمیل کے طلبا کو تیار کروں۔ دو مددگار ہوں گے۔ انتہائی صفوں کو خود پڑھاؤں گا۔

سردست طلبہ تصنیف کی تعلیم کا یہ طریقہ ہوگا کہ پہلے چھوٹے چھوٹے عنوانات اور ان کے متعلق ذخیرہ معلومات اور کتابیں اُن کو دی جائیں گی۔ جو کچھ لکھیں گے اُس کا عیب و ہنر بتایا جائے گا۔ پھر پمفلٹ، رسالے اور پھر تصنیف کرائی جائے گی۔ وظائف تصنیفی مقرر ہوں گے۔ جو کم از کم ۲۰، ۲۵ روپیہ ماہوار ہوں گے۔

دستاویز کی رجسٹری ہو جائے تو باغ کی کاٹ چھانٹ اور عمارت کی داغ بیل ڈالی جائے۔ ایک کمرہ مرحوم کے نام سے بھی تعمیر کرانا مقصود ہے۔

یہ اخیر عمر کا خواب ہی اور امید ہے کہ ؎

چوں ہنرہائے دگر موجب حرماں نشود

نواب عماد الملک نے دارالمصنفین کی صدر انجمنی قبول کر لی ہی۔ تکمیل دستاویز کے بعد انجمن کے قواعد اور ممبروں اور عہدہ داروں کے نام شائع ہوں گے۔ والتسلیم شبلی

۱۶ ستمبر سنہ ۱۹۱۴ء اعظم گڑھ"

اس تحریر میں دو امر خصوصاً قابل لحاظ ہیں۔ ایک پاک اور کار آمد منصوبے۔ دوسرے یہ کہ شدت غم میں بھی دماغ علم کی غمخواری میں مصروف تھا۔ سید سلیمان صاحب کی تحریر سے (جو بعد وفات علامہ مرحوم آئی ہی) معلوم ہوا کہ بنگلہ اور باغ از روئے وصیت وقف کر دیا ہی اور بلدہ حوصلہ افزا تکمیل وصیت پر آمادہ ہیں۔ قبر اسی باغ میں بنی ہی اور وہیں تکمیل سیرت کے سامان ہو رہے ہیں ؎

شدیم خاک ولیکن ز بوئے تربتِ ما
تواں شناخت کزیں خاک مردمے خیزد

عادات و خصائل

علامہ مرحوم سے میری سب سے اول ملاقات اندازاً [illegible] میں ہوئی
آغاز تعارف اختلاف سے ہوا۔ کتاب المامون جب شائع ہوئی تو میں نے
ریویو لکھا۔ بعض اہم مسائل پر اعتراض کیا۔ غالباً صرف یہی ایک ریویو تھا جس کا علامہ شبلی نے
جواب لکھا۔ یہ بے نیازانہ شعر بھی جواب مذکور میں تھا ؎

رسی آنکہ بدر دماکہ چوما
خامہ گیری و حرف ہنگاری

یہی اختلافی تعارف باعث ملاقات ہوا۔ ملاقات بڑھ کر سرحد نیازمندی تک پہنچی۔ نیاز مخلصانہ محبت
سے مبدل ہوا اور الحمد للہ کہ وہ اخلاص علامہ ممدوح کی رحلت تک قائم رہا اور اب بھی ہے۔ اور
یقین ہے کہ میری حیات تک دل سے محو نہ ہوگا۔ موت نے اخلاص میں کمی نہیں کی بلکہ حسرت کا اضافہ
کر دیا۔ قریباً سی سالہ مودت کے دوران میں صدہا ملاقاتیں ہوئیں۔ بارہا پاس رہنے کا اتفاق ہوا۔
حبیب گنج بھی چند مرتبہ قدوم سے مشرف ہوا۔ ہر قسم کے مسائل پر بحث و مباحثے رہے۔ اس تمام
تجربہ کے بعد میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ علامہ مرحوم سچے اور با اخلاص دوست تھے اس
زمانہ کی سوسائٹی کی بہت سی کمزوریوں سے پاک اور صاف تھے۔ اُن کے اخلاق کا معیار بہت
بلند تھا۔ نظر میں بلندی تھی۔ مزاج میں استغنا۔ حوصلے میں عزم تھا۔ مزاج میں نفاست تھی۔ دوستی اور
مخالفت دونوں شدید تھیں۔ لیکن دوستوں کی مروت کبھی اُن کو رسمی تملق و چاپلوسی پر آمادہ نہیں کرتی
تھی۔ عزیز سے عزیز دوست کی خاطر وہ اپنی رائے سے نہیں ہٹتے تھے۔ مخالفین کی مخالفت سے دبرو
نہیں رُکتے تھے۔ مگر اُن کے پس پشت بیان اختلافات میں بھی اُن کی زبان سے ایسے الفاظ نہیں
نکلتے تھے جو نفسانیت اور معاندانہ عیب جوئی پر دلالت کرتے۔ مخالف کی رائے کی تردید سختی کے
ساتھ کرتے تھے۔ اپنی رائے کے دلائل کا زور شور سے اظہار کرتے۔ باوجود اس کے یہ کبھی نہیں ہوتا تھا
کہ مخالف کے ذاتی یا صفاتی عیوب پیش کرکے اس کو ذلیل و رسوا کرتے۔

صحبت نہایت پاکیزہ و شگفتہ تھی۔ انسان خواہ کسی درجہ کا ہو اُن کی باتوں سے محظوظ ہوتا تھا۔ جس مسئلہ پر گفتگو کرتے اُن کے کمال کی خوبیاں نظر آتیں عقلی پیرایہ، مورخانہ انداز، شاعرانہ نکتہ سنجی اُن کے بیان کے رفیق و ہمدم تھے۔ جب کبھی کسی علمی مسئلہ پر گفتگو ہوئی بعض نادر اور نازک پہلو ضرور بیان کئے۔ فضول باتیں میں نے اُن کی زبان سے کبھی نہیں سُنیں۔

اعزّہ کے ساتھ بہت الفت تھی۔ اپنے بھائی مہدی مرحوم کا ذکر برسوں دل گیری کے ساتھ کیا۔ دوسرے بھائی کی موت تو اُن کی جان ہی لے گئی۔

احساس بہت شدید تھا، اس لئے رنج والم سے بہت متاثر ہوتے تھے۔ ۱۹۰۲ء میں کانفرنس کے اجلاس کلکتہ کے زمانہ میں وہ اور میں ایک مکان میں مقیم تھے۔ ایک روز ایک نیم مردہ بھڑ نے اُن کے پاؤں پر ڈنک مار دیا۔ اس قدر بیتاب ہوئے کہ مجھکو حیرت ہو گئی۔ اس قدر زمانہ گزرنے پر آج تک اُس اضطراب کی تصویر آنکھوں میں ہے۔ یہ احساس شاعری کا لوازمہ تھا۔ ہر ذوق میں شدت چاہتے تھے۔ نمک کھانے میں تیز ہو۔ دسترخوان پر نمک رکھ لیتے اور کھانے میں ڈالتے جاتے۔ شیرینی بھی گلو سوز مرغوب تھی۔ یہ عام منظر تھا کہ کاغذ پر قند رکھی ہوئی ہے۔ باتیں کرتے جاتے ہیں۔ قند کے دانے منہ میں ڈالتے جاتے ہیں۔ وہ قند سے اور سامع اُن کے کلام سے شیریں کام ہوتے ع

سخن ہائے شیرین تر از قند ہست

مزاج کی تیزی کی تاب نہ تھی سفر ملتے تھے میں نے انہیں ہتیار ڈالے ہیں۔ ایک مرتبہ جلسۂ ندوۃ العلماء کے سلسلے میں بریلی اُن کا میرا ساتھ ہوا۔ اُس زمانہ میں تندرست تھے۔ قریباً ہر اسٹیشن پر شیرینی خریدی اور چکھی، بلکہ کھائی۔ محض شیریں ہونا کافی تھا، اُس کے حسن و قبح سے بحث نہ تھی۔ پانی تیز سرد پیتے تھے جاڑوں میں بھی یہی ہوتا۔ اس کے ساتھ سردی وگرمی بہت محسوس کرتے۔ ایک مرتبہ جاڑوں میں حبیب گنج تشریف لائے متعدد رضائیاں اوڑھیں تسلّی نہ ہوئی۔ دوسرے روز خاص اہتمام سے لحاف خوب روئی بھروا کر تیار کیا گیا۔ گرمیوں میں ہندوستان چھوڑ کر سرد یا کم گرم مقام پر چلے جاتے تھے اس سلسلہ میں بمبئی کے سفر فارسی شعر و سخن کے لئے یادگار رہیں گے۔ چائے سادہ اور گاڑھی پیتے تھے صبح کو نماز کے اول وقت چائے پی کر فارغ ہو جاتے تھے۔ عادات میں سادگی تھی۔ لباس

عمدہ اور نفیس پہنتے تھے۔ غذا ابہت کم تھی۔ آخر آخر میں اُس کی قلت سے حیرت ہوتی تھی۔

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۰ و ۲۱ جنوری ۱۹۱۵ء)

علی گڑھ کالج میں تکبیر و تہلیل

ڈیڈیٹر صاحب۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ ۱۰ فروری سنہ حال کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں جو مضمون بعنوان "علی گڑھ کالج میں تہلیل و تکبیر" رسالہ خطیب سے نقل کیا گیا ہے اُس میں بعض بیان ایسے ہیں جو واقعات کے صریح خلاف ہیں۔ اور چونکہ وہ مضمون آپ کے اخبار میں نقل ہوا ہے اس لئے اگر اُن کی تصحیح نہ کی جائے تو غلطیاں زیادہ سنگین ہو جائیں گی۔ اس لئے مجھ کو اجازت دیجئے کہ میں مفصلہ ذیل سطور کے شائع کرنے کی درخواست آپ سے کروں۔

(۱) جلالتمآب امیر کابل نے جو امتحان دینیات رونق افروزی کالج کے وقت لیا تھا وہ قرأت کا نہ تھا بلکہ عقائد و فقہ کا تھا۔ جس تحقیق کے ساتھ یہ امتحان لیا گیا اُس سے وہ اصحاب واقف ہیں جو طلبہ امتحان میں شریک تھے۔ منجملہ سوالات ایک یہ سوال بھی تھا کہ "دم مسفوح" کس کو کہتے ہیں؟ اسی امتحان کی مصروفیت کی وجہ سے ہز مجسٹی اسٹریچی ہال میں وقت مقررہ سے بہت بعد تشریف لیجا سکے تھے۔ اسی کے ساتھ یہ امر بھی غور طلب ہے کہ پہلے سے طلبا انتخاب کرکے پیش نہیں کئے گئے تھے بلکہ فی الوقت امیر صاحب نے قصد امتحان ظاہر فرمایا اور اسی وقت جس قدر طلبا پیش نظر تھے وہ حاضر کردیے گئے۔ اور آن ہی کا امتحان مذکورۂ بالا مضامین میں ہوا۔ آخر امتحان میں جب ہز مجسٹی نے قرآن کی تعلیم کی بابت سوال کیا تو چند طلبا قرآن سنانے پر آمادہ ہوئے۔ اُن میں سے علی الدین کو طلب فرمایا۔ یہ بیشک حسن اتفاق تھا کہ وہ فن تجوید سے واقف تھے اور اُن کی قرأت کا یہ اثر ہوا کہ امیر صاحب کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ بہرحال اصلی امتحان فقہ و عقائد کے مسائل کا تھا جن کی نسبت پوری تحقیق کے بعد امیر صاحب نے اپنا اطمینان الفاظ ذیل میں ظاہر فرمایا تھا:۔

"من بعض خود و زبان خود از شاگردان کالج موصوف امتحان بعض عقائد ضروری اسلامی
و مسائل نماز و روزہ گرفتم تمام سوالہائے مرا بطریق عقائد اہل اسلام جواب گفتند"

اس امتحان کے بعد جو اندازہ دینیاتِ کالج کا امیر صاحب نے فرمایا وہ صریح راست تھا نہ "صریح غلط" اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ جو ترقی دینیات آج خدا کے فضل سے کالج میں نمایاں ہے اس کی بنیاد نواب محسن الملک بہادر مرحوم کے عہد میں پڑ چکی تھی اور جناب ممدوح دل سے ترقی دینیات کے جویا تھے۔

(۳) نواب وقار الملک بہادر کے زمانہ میں دینیات نے بہت زیادہ ترقی کی۔ پروفیسر دینیات کا عہدہ قائم ہو کر مولانا سید سلیمان اشرف صاحب کا تقرر عمل میں آیا۔ درسِ قرآن و تفسیر کی جماعت قائم ہوئی۔ اس کا ایک دور ختم بھی ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی علمائے کرام مدعو ہوئے تھے۔ مولانا احمد رضا خاں صاحب، مولانا ولایت حسین صاحب الہ آبادی اور اور بزرگوں سے درخواست قدوم کی گئی تھی۔ چنانچہ مولانا عبد الحق صاحب حقانی تشریف لائے اور چند گھنٹے امتحان لیا۔ جو تحریر بعد امتحان میرے نام بھیجی تھی اس سے واضح ہوتا تھا کہ نتیجۂ امتحان سے ممدوح کو حیرت انگیز اطمینان تھا۔

(۴) صیغۂ تجوید کی بنیاد نواب اسحٰق خاں صاحب بہادر کے عہد میں قائم ہوئی ہے۔ تکمیل مسجد کا سہرا کارکنانِ قضا و قدر نے نواب صاحب ممدوح کے واسطے محفوظ رکھا تھا۔ ذٰلک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۳ / مارچ ۱۹۱۵ء)

زنانہ مسلم اسکول علی گڑھ میں تعلیم قرآن مجید

جناب ایڈیٹر صاحب۔ السلام علیکم۔ آپ کے اخبار مورخہ ۳ مارچ میں مدرسہ نسواں علی گڑھ کی سالانہ رپورٹ کے خلاصہ میں یہ پڑھ کر خاص مسرت ہوئی کہ پردہ کے انتظام کے ساتھ "قرآن پاک کی تعلیم اور نماز روزے کی پابندی نہایت سختی کے ساتھ ہوتی ہے" اس سلسلہ میں آپ مجکو اجازت دیں کہ میں منتظمان اسکول کی توجہ اس جانب مائل کروں کہ تعلیم قرآن پاک میں قرآن مجید کا ادب اور احترام ملحوظ رہنا عین مقتضائے ایمان ہے۔ کلام مجید جہاں پڑھا جائے وہ پامال اور مبتذل جگہ نہ ہو۔ کلام مجید رحل یا کسی اور بلند جگہ پر رکھا جائے۔ اگر یہ اہتمام نہ ہوگا تو بچیوں کے دل میں کلام مجید کا ادب اسلامی شعار کے مطابق نہ رہیگا۔

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۷ مارچ ۱۹۱۵ء)

جناب خواجہ عزیز الدین صاحب "عزیز" لکھنوی

ایک اور باکمال نے رحلت فرمائی۔ اس مرتبہ ادب فارسی کا خاتمہ ہوا۔ خواجہ صاحب مرحوم اُن اہل کمال میں سے تھے جن کی ذات سے آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے کی ادبی مجالس کو زینت و عزت حاصل ہوتی۔ پختگی و متانتِ کلام (جو متقدمین کا سرمایۂ ناز ہے) خواجہ عزیز کے حصہ میں آئی تھی۔ جہاں تک مجھ کو معلوم ہے غزل و قصائد کا مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ لیکن تازشِ فن دو مثنویاں عرصہ ہوا شائع ہو چکی ہیں۔ ایک "قیصر نامہ" دوسری یدبیضا۔ قیصر نامہ میں ۱۸۷۷ء کی جنگ روم اور روس کا حال ہے اور سکندر نامہ کا انداز۔ متانت و پختگی میں سکندر نامہ کے نہ ہم پلہ ہے اور نہ ہو سکتی تھی۔ مگر اس کو پڑھ کر یہ حیرت ضرور ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں ایسی فارسی مثنوی لکھی گئی۔ فارسی ادب کی صدہا برس کی عمر

ہیں غزل و قصائد کے مقابلے میں مثنوی کے استاد بہت کم ہوئے ہیں۔ مشہور مثنوی گو اساتذہ کی تعداد غالباً بیس سے زیادہ نہ ہوگی۔ اس سے مثنوی لکھنے کا اشکال ذہن میں آسکتا ہے۔ ید بیضا اہلی شیرازی کی مشہور معرکۃ الآرا مثنوی سحر حلال کا جواب ہے۔ سحر حلال ذو قافیتین صنعت تجنیس کے ساتھ ہے۔ خواجہ صاحب نے ید بیضا میں صنعت ذو بحرین اضافہ فرما دی ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے۔ ؎

اے ز تو اندر سر من شور ہا

نام تو شد زینت منشور ہا

قیصر نامہ کی حمد و نعت کے کچھ اشعار بطور نمونہ درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ حسرت دل میں ہے کہ اخبار پڑھنے والوں میں سے کتنے اہل مذاق لطف سخن سے آگاہ ہوں گے۔ یہ کمال کا شعر نہیں جنگل میں کتنے پھول ہیں جن کے رنگ نگاہ سے اور بو دماغ سے آشنا نہیں تاہم دو پھول ہیں ؎

شاخ گل ہر جا کہ روید ہم گل است

خُم مُل ہر جا کہ جوشد ہم مل است

حمد

بنام خداوند کار آفریں — ہزار آفریں صد ہزار آفریں

جہاں پادشاہ خدیوان خدیو — ازو بہ کشش اوجہ گاو چہ گیو

ازل تا ابد بارگاہ وی است — گراں تا گراں در پناہ وی است

درش را بدرباں سرو کار نیست — کسے ناکساں را بہ آتش بار نیست

قضایش برآرد بہر جا کہ تیغ — کہ آرد کہ دارد سر از وے دریغ

اگر از جلالش زند دم زباں — بلرزد سپہر و بجنبد جہاں

بجنبش ابابیل چوں پر زند — صف ژندہ پیلاں بہم بر زند

کند قطرہ را در صدف دُر ناب — دہد سایہ را پایہ آفتاب

دل و جاں دہد تا بے طاقت دہد — عجب ایں کہ بے خدمت اجرت دہد

نعت

فروزندہ خورشید شب زندہ دار — شب افروز شمع رہ کردگار

بہ معنی ز رحمت نخست آیتے | بظاہر ز دولت پسیں رایتے
زمیں تا فلک روشن از دین او | ز آئینہ روشن تر آئینِ او
بشنبہ شرف دادہ آدینہ را | ہم بر زدہ دینِ دیرینہ را
ز مہرِ نبوت کہ بر پشت زد | بہ مہر سلیماں ز دانگشت رد
حبش از غلامی او داغدار | بہ بوئش سوادِ یمن مشکبار
ہماں سایہ دار د سراپائے نور | بلے سایہ از نور دارد ظہور

ایک نعتیہ شعر غزل کا قابل شنید ہے ؎

دہد حق عشق احمد بندگانِ چیدۂ خود را
بخاصاں شاہ می بخشد مئ نوشیدۂ خود را

حالات و اوصاف خواجہ صاحب کشمیری الاصل تھے سلطنت اودھ کے زمانے میں بزرگوں کا شال بنانے کا بڑا کارخانہ تھا۔ لکھنؤ کی رونق کے ساتھ کاروبار میں رونق تھی۔ لکھنؤ مٹا تو کارخانہ بھی مٹ گیا۔ مبدا فیاض نے شال کشمیری کی نزاکت و رنگینی کلام میں عطا فرما دی۔ بقول غالب مرحوم ؎

آنچہ از دستگہ پارس بہ نیغما بردند
تا بنالم ہم ازاں جملہ زبانم دادند

خواجہ صاحب کی پیدائش لکھنؤ کی تھی۔ یہیں نشو و نما ہوئی یہیں علم و کمال حاصل کیا۔ عمر غالباً ستر اور اسی کے درمیان تھی۔ علاوہ کمالِ سخن جناب مرحوم کے اخلاق ایسے پاکیزہ و پختہ تھے کہ ملنے والوں کا دل مسخر ہو جاتا تھا۔ روش نہایت مہذب و متین تھی۔ شفقت اس درجہ تھی کہ حضوری ایک طرف غیبت میں بھی دل اُس کا اثر محسوس کرتا۔ باوجود شانِ کمال تواضع اس قدر تھی کہ ملنے والوں کا قلب اثر خجالت محسوس کرتا۔ مہماں نوازی تمغائے اخلاق تھی۔ جب جاؤ ممکن نہیں کہ چار کی مدارات نہ ہو۔ شام کو سادہ، صبح کو ناشتہ کے ساتھ۔ اپنے ہاتھ سے سماوار میں کولہ ڈالتے آگ روشن کرتے۔

چا ر تیار کر کے عنایت فرماتے۔ ناممکن تھا کہ کوئی اصرار اس سے باز رکھتا۔ سماوار میں کوئلہ ڈال دیا ہے آگ پنکھے سے روشن ہو رہی ہے۔ اسی میں فارسی کے اشعار یا ادبی نکات بیان فرما رہے ہیں حیف اب وہ لطف کہاں۔ وہ با فیض صحبت کہاں۔ مجکو دیرینہ نیاز حاصل تھا۔ جب لکھنؤ گیا ضرور حاضر ہوا۔ ایک آدھ مرتبہ حاضری ناغہ ہوئی ہوگی۔ ہر مرتبہ لطف و شفقت کا تازہ لطف پایا۔ چند سال اُدھر علامہ شبلی بھی ہوتے اُس وقت مضمون "قند مکرر" و "لطف دو بالا" ہوتا۔ جب حاضر ہوا کسی نہ کسی مہمان کو فروکش دیکھا۔ جب بادشاہ سلامت بحیثیت ولی عہد رونق افروز لکھنؤ تھے تو میں نے دیکھا کہ دیوان خانہ کا بڑا کمرہ مہمان خانہ بنا ہوا تھا۔

خواجہ صاحب عرصہ تک کیننگ کالج (لکھنؤ) کے فارسی پروفیسر رہے۔ اب بہت دن سے خانہ نشین تھے۔ نہایت آن بان کے ساتھ بسر کرتے تھے۔ خواجہ صاحب کی خوش قسمتی سے صاحبزادے سب لائق و برسرِ کار ہیں۔

ایک بار خواجہ صاحب فرماتے تھے کہ ابتداء عمر میں ایک سفر کے سلسلہ میں دلّی جانے کا اتفاق ہوا۔ مرزا غالب مرحوم کا آخیر زمانہ تھا۔ میں حاضر ہوا تو پلنگ پر لیٹے تھے۔ حال دریافت کر کے کلام سنانے کی فرمائش کی۔ میں نے اپنا یہ شعر سنایا:

مہ مصر ست داغ از رشک مہتابے کہ من دیدم
زلیخا کور شد از حسرتِ خوابے کہ من دیدم

سُن کر تامل کیا اور فرمایا ماہِ کنعان مسلّم، ماہِ مصر نئی ترکیب ہے۔ میں نے مرزا صائب کی سند پیش کی۔ سند سُن کر میرے شعر کی داد دی۔

خواجہ صاحب کی خدمت میں مجکو سب سے آخر مرتبہ گزشتہ ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس کے موقع پر حاضر ہونے کا اتفاق ہوا۔ کھانسی اور خارش کی شکایت زیادہ تھی۔ ضعف بھی بڑھ گیا تھا۔ میں نے علامہ شبلی مرحوم کا ذکر عمداً نہیں کیا کہ صدمہ ہوگا۔ ایک اور صاحب نے چھیڑ دیا۔ بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ بہت ہی دلگیر الفاظ میں مرحوم کو یاد فرمایا۔ جو

تاریخ وفات لکھی تھی اُس کا مادہ سنایا ؎

از سخن تاج جہاں بانی رفت
مولوی شبلی نعمانی رفت
۱۳۳۵ - ۳ = ۱۳۳۲ ہجری

میں نے بقیہ اشعار کی درخواست کی فرمایا لکھ کر بھیج دوں گا۔ حیف کہ اس کی نوبت نہ آئی اور خود مرحوم کا پیام اجل آپہنچا۔ (یہ مکمل نظم انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۳ فروری ۱۹۱۵ء میں شائع ہو چکی ہے۔ ایڈیٹر)

صاحبزادگان والا شان کو غیر مطبوعہ کلام کی ترتیب و اشاعت کی جانب توجہ مائل فرمانی چاہیے فارسی ادب کا نادر مجموعہ[1] ہوگا۔

مانا کہ یہ بھی ہوا۔ خواجہ عزیز کی شفقت کو آنکھیں ترسیں گی، دل ڈھونڈیگا نہ پائے گا۔ ہاں یادِ حیات کا ساتھ دے گی۔ فیضی ؎

اے ہم نفسانِ محفلِ ما
رفتید و لے نہ از دلِ ما

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۱۵ء)

کلام مجید کے دو نئے ترجمے

کلام مجید کے پارۂ اول کے دو ترجمے حال میں قادیان سے اُس پارٹی کی طرف سے شائع کئے گئے ہیں جو قادیانی فرقہ کی گرم پارٹی خیال کی جاتی ہے۔ ایک ترجمہ اردو کا ہے، دوسرا انگریزی کا۔ یہ ترجمے عمدہ کاغذ پر اہتمام کے ساتھ چھاپے گئے ہیں۔ نوٹ بھی کثرت سے درج ہیں۔ انگریزی ترجمہ کا اہتمام خصوصاً قابل لحاظ ہے۔ ٹائپ ایسا عمدہ ہے کہ کسی استادِ نسخ کا قلم معلوم ہوتا ہے۔

لیکن افسوس ہے کہ ساری خوبیاں صرف اہتمام طبع پر ختم ہو جاتی ہیں۔ مضامین کے اعتبار سے پوری طرح معانی قرآنی کی تحریف کی گئی ہے۔ جو معنی کلام مجید کے عہد رسالت سے آج تک سمجھے گئے

---

[1] وصی الدین صاحب (فرزند خواجہ صاحب) نے بڑے اہتمام و شوق سے دیوان کلام طبع کرا کے شائع کر دیا۔ حبیب الرحمٰن

تھے وہ سب غلط قرار دیکر خلاف سیاق قرآنی نئے معنی اپنے فرقہ کی تائید میں اختراع کرکے درج کئے گئے ہیں
مثلاً سورۂ فاتحہ میں "غیرالمغضوب علیہم" کی تفسیر میں آج تک مفسرین نے یہ سمجھا تھا کہ :
"مغضوب علیہم" (وہ لوگ جن پر غضب الٰہی نازل ہوا) سے یہود مراد ہیں۔ اس جدید ترجمہ میں لکھا ہے کہ وہ مسلمان بھی مراد ہیں جو مرزا غلام احمد قادیانی پر ایمان نہ لائیں اور اس طرح زمرۂ یہود میں داخل ہوجائیں (ملاحظہ طلب صفحہ ۳ کالم ۴)۔ سورۂ بقرہ میں "وبالاٰخرۃ ھم یوقنون" سے مراد تمام مفسرین کے نزدیک عالم آخرت ہے اور اس پر کثرت سے آیات قرآنی شاہد ہیں (جیسا کہ خود ترجمہ جدید میں تسلیم ہے) لیکن ترجمہ قادیانی میں بتلایا گیا ہے کہ "آخرت" سے مراد "قادیانی مرزا صاحب" ہیں اس کی بابت ایک لفظ نہیں لکھا کہ "الاٰخرۃ" کا موصوف مقدر کیا ہے جس سے ادعائے معنی کی تائید ہوتی۔ سورۂ فاتحہ کے الفاظ "انعمت علیہم" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ نبی ہونے کی دعا مانگے۔ ظاہر ہے کہ دعا اُسی مقصد کے لئے مانگی جائے گی جو ممکن الحصول ہو۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہر مسلمان نبی ہوسکتا ہے۔ اس طرح نبوت کا دروازہ نہایت فیاضی کے ساتھ کشادہ کیا گیا ہے۔ حالانکہ کلام مجید نے بالاعلان ختم نبوت کا اظہار فرما دیا ہے۔ سورۂ جمعہ کی آیت "ھوالذی بعث فی الامیین الخ" کے معنی عام مفسرین نے یہ لکھے ہیں کہ حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت آپ کے معاصرین اور بعد کے آنے والوں کے واسطے یکساں تھی۔ یہی عامۂ مسلمین کا عقیدہ ہے۔ مگر نیا ترجمہ تبلاتا ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بعد کے آنے والے لوگوں کے لئے رسول نہ تھے بلکہ وہ شخص ہے جو آپ کی محبت میں اور فرماں برداری میں فنا ہو کر صاحب وحی ہوگا اور یہ کہ اُس شخص کا نام مرزا غلام احمد خاں قادیانی ہے"۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مذہب قادیانی کے ظہور کے بعد حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا (معاذ اللہ) خاتمہ ہوچکا۔ دریافت طلب لطیفہ یہ ہے کہ عہد صحابہ کے بعد سے ظہور قادیانی تک مسلمان کس کی رسالت میں رہے؟

خلاصہ یہ کہ یہ ترجمے اسی قسم کے ادعائی مضامین اور بلا دلیل دعووں سے بھرے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کے واسطے سراسر مضر ہیں۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس مضمون کو عام مسلمانوں تک پہنچا دے

مسلمان ایڈیٹروں سے بالخصوص ہماری درخواست ہو کہ اس ریویو کو اپنے اپنے اخبارات میں طبع فرما دیں، تاکہ مسلمان مالی اور دینی نقصان سے محفوظ رہیں۔

زیادہ افسوس انگریزی ترجمہ کا ہو۔ انگریزی صحیح ترجمہ کی جیسی ضرورت ہو ظاہر ہو۔ یہ ترجمہ ظاہری اہتمام کے لحاظ سے قابلِ تحسین ہو۔ لیکن افسوس ہو کہ فرقہ بندی کے مسلمات نے اُس کو بالکل بیکار کر دیا۔ اور ویسا ہی غلط رہا جیسے پہلے ترجمے سیل وغیرہ کے ہیں۔ ہم کو اندیشہ ہو کہ انگلستان میں اسلامی تحریک کو اس ترجمے سے نقصان پہنچے گا۔ اور وہاں کی پبلک اس کے بے دلیل دعووں کو پڑھ کر خود اسلام کو بے دلیل دعویٰ خیال کرنے لگے گی۔ اس کے علاوہ یہ بھی اندیشہ ہو کہ (جس طرح بعض صلحبوں کا پہلے بھی گمان تھا) یہ خیال عام نہ ہو جائے کہ خواجہ کمال الدین صاحب کا مقصود درپردہ قادیانی عقیدہ کی اشاعت ہو۔ ہم کو امید ہو کہ خواجہ صاحب موصوف اور مولوی صدرالدین صاحب اس امر کا اعلان فرما دیں گے کہ وہ ان عقائد کے مؤید نہیں اور انگلستان کی پبلک کے سامنے وہ صرف عام اسلامی مطالب کی اشاعت کر رہے ہیں، نہ مخصوص فرقۂ قادیان کی۔

قادیانی ترجمہائے قرآنی پر جو ریویو محض جمہور اہل اسلام کی آگاہی کے واسطے میں نے لکھا تھا اُس پر اخبار "الفضل" قادیان نے جرح وقدح کی ہو۔ بعض مطالب پر مزید بحث کی ضرورت ہو، اس لئے سطور ذیل کی اشاعت کی درخواست کی جاتی ہو۔ ریویو میں میں نے لکھا تھا کہ مفسرین نے اب تک یہ سمجھا تھا کہ "غیرالمغضوب علیھم" سے مراد یہود ہیں۔ قادیانی ترجمہ میں وہ مسلمان بھی متوجب غضب الٰہی قرار دئے گئے ہیں جو قادیانی مذہب پر ایمان نہ لائیں۔ اس بیان کو مضمون نگار اخبار "الفضل" نے محض ادعائے اور بے سند قرار دیا ہو۔ مگر جلیل القدر مفسرین کے اقوال ذیل میرے بیان کی تائید کریں گے :۔

۱۔ امام المفسرین ابن جریر طبری تفسیر "جامع البیان" میں فرماتے ہیں :

فان قال لنا قائل فمن ھٰؤلاء المغضوب علیھم الذین امرنا اللہ جل ثنائہ مسئلۃ ان لا یجعلنا منھم قیل ھم الذین وصفھم اللہ	اب اگر کوئی دریافت کرے کہ المغضوب علیھم سے وہ کون لوگ مراد ہیں جن کی نسبت اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہ حکم دیا ہو کہ ہم اُس سے یہ دعا کریں کہ وہ ہم کو اُن میں شامل

جل ثناءہ فی تنزیلہ فقال قل ھل انبئکم بشر من ذالک مثوبۃ عند اللہ من لعنہ اللہ وغضب علیہ وجعل منھم القردۃ والخنازیر وعبد الطاغوت اولئک شر مکانا واضل عن سواء السبیل فاعلمنا جل ذکرہ بمنہ ما احل بھم من عقوبتہ بمعصیتھم ایاہ ثم علمنا منتہ علینا وجہ السبیل الی النجاۃ من ان یحل بنا مثل الذی حل بھم من المثلات ورافتہ منہ بنا قال قال وما الدلیل علی انھم الذین وصفھم اللہ وذکرھم فی تنزیلہ علی ما وصف قیل حدثنی احمد بن الولید الرملی (... اسناد)

فرمائے تو کہا جائے گا کہ وہ وہ لوگ ہیں جن کا بیان اللہ تعالیٰ نے اپنی اس آیت میں فرمایا ہے (ترجمہ آیت) تو کہہ میں تم کو بتاؤں ان میں کس کی بری جزا ہے اللہ کے یہاں وہی جس کو اللہ نے لعنت کی اور اس پر غضب ہوا اور ان میں بعض بندر کئے اور بعض سور اور پوجنے لگے شیطان کو وہی بدتر ہیں درجے میں اور بہت بہکے سیدھی راہ سے۔ اس طرح خداوند تعالیٰ نے اپنے کرم سے ہم کو جتا دیا کہ ان پر خدا کا عذاب نافرمانی الٰہی کی سبب نازل ہوا تھا پھر اپنے فضل رحمت سے یہ بھی بتا دیا کہ جو عذاب اُن پر نازل ہوا اُس سے بچنے کی کیا سبیل ہے۔ اب اگر یہ سوال ہو کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ (المغضوب علیھم) سے مراد وہی لوگ ہیں جن کا ذکر آیت میں ہوا تو جواب دیا جائے گا کہ مجھ سے حدیث بیان کی احمد بن الولید رملی نے (میں باقی اسناد بخوف طول حذف کرتا ہوں)

عن عدی بن حاتم قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المغضوب علیھم الیھود۔

عدی بن حاتم سے انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ المغضوب علیھم یہود ہیں۔

اس کے بعد امام طبری نے تیرہ اور حدیثیں اسی قول کی تائید میں روایت کی ہیں اور سوائے اس معنی کے کہ "المغضوب علیھم" سے مراد یہود ہیں اور کوئی معنی اپنی تفسیر میں نہیں لکھے (ملاحظہ ہو تفسیر جامع البیان امام طبری الجزء الاول صفحہ ۶۱ مطبوعہ مطبع المیمنیہ مصر)

۲- امام ابن کثیر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں (یہ بیان کرکے کہ المغضوب علیھم سے مراد یہود ہیں):

ولا اعلم من المفسرین فی ھذا اختلافاً

اور میں نہیں جانتا کہ مفسرین سے کسی نے اس سے اختلاف

وشاهد ما قاله هؤلاء الائمة من ان اليهود مغضوب عليهم والنصاریٰ ضالّون الحدیث المتقدم وقوله فی خطابه مع بنی اسرائیل فی سورة البقرة بئس ما اشتروا به انفسهم (الآیة) وقال فی المائدة قل هل انبئکم بشر من ذالك مثوبةً عند الله من لعنه الله وغضب علیه (الآیة) وقال تعالیٰ لعن الذین کفروا من بنی اسرائیل علیٰ لسان داؤد وعیسیٰ بن مریم (الآیة)

گیا ہوا اور ان اماموں کے اس بات کے قائل ہونے کی دلیل کہ المغضوب علیہم سے مراد یہود ہیں وہ حدیث ہے جو اوپر گزری اور یہ آیتیں ہیں بئس ما اشتروا به انفسهم الخ اور هل انبئکم بشر من ذالك الخ اور لعن الذین کفروا الخ (ملاحظہ طلب تفسیر امام ابن کثیر مطبوعہ مطبع المیسریہ مصر ۱۳۰۰ھ بر حاشیہ فتح البیان صفحہ ۵۲)

۳- امام ابن حیان تفسیر البحر المحیط میں (یہ قول نقل کرکے کہ المغضوب علیہم سے مراد یہود ہیں) فرماتے ہیں:-

قاله ابن مسعود و ابن عباس ومجاهد والسدی وابن زید۔

یہی قول حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) اور مجاہد اور سدی اور ابن زید کا ہے (ملاحظہ ہو البحر المحیط مطبوعہ مطبع السعادۃ مصر ۱۳۲۸ھ صفحہ ۳۰)

۴- تفسیر کبیر میں امام رازی لکھتے ہیں (غیر المغضوب علیہم کی تفسیر میں) "المشهور ان المغضوب علیهم هم الیهود لقوله تعالیٰ من لعنه الله وغضب علیه والضالّین هم النصاریٰ لقوله تعالیٰ قد ضلوا من قبل واضلوا کثیراً فضلوا عن سواء السبیل وقیل هذا ضعیف" (ملاحظہ طلب تفسیر کبیر امام رازی صفحہ ۱۳۵)

۵- علامہ ابو سعود اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں "وبالمغضوب علیهم ولا الضالین الیهود والنصاریٰ کما ورد فی مسند احمد والترمذی" (تفسیر علامہ ابو سعود بر حاشیہ تفسیر مذکور صفحہ ۱۴۳ الجزء الاول مطبوعہ مطبع حسینیہ مصر)

۶۔ تفسیر السراج المنیر میں ہے:

غیر المغضوب علیھم وھم الیھود لقولہ تعالیٰ فھم من لعنہ اللہ وغضب علیہ .... وقال صلی اللہ علیہ وسلم ان المغضوب علیھم الیھود ولا الضالین النصاریٰ. رواہ ابن حبان وصححہ.

المغضوب علیھم یہود ہی ہیں اس کی دلیل خداوند تعالیٰ کا قول ہو اُن کے حق میں من لعنہ اللہ وغضب علیہ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو بیشک المغضوب علیھم یہود اور الضالین نصاریٰ ہیں۔ اس حدیث کو ابن حبان نے روایت کیا ہو اور کہا ہو کہ یہ حدیث صحیح ہو۔ (ملاحظہ ہو تفسیر السراج المنیر صفحہ ۱۰ و ۱۱ جلد اول مطبوعہ مطبع النجایہ مصر ۱۳۱۱ھ)

تفسیر السراج المنیر میں سوائے اس قول کے کہ المغضوب علیھم یہود ہیں کوئی دوسرا قول نقل نہیں کیا۔

۷۔ تفسیر جلالین میں ہو غیر المغضوب علیھم وھم الیھود۔ المغضوب علیھم یہود ہی ہیں)۔
(الجلالین صفحہ ۴۹۴ مطبوعہ مطبع احمدی ۱۲۵۷ھ)

۸۔ امام جلال الدین سیوطی تفسیر الدر المنثور میں فرماتے ہیں (اصل عربی عبارت طول کے خیال سے چھوڑ دی گئی ہے)۔

ربیع بن انس، ابن عکرمہ، مجاہد، سعید بن جبیر (ان سب تفسیر کے اماموں) کا یہ قول ہو کہ المغضوب علیھم سے مراد یہود ہیں۔ عبد الرزاق، امام احمد، عبد بن حمید، ابن جریر، بغوی، ابن صدبا ور ابو الشیخ (ان تمام محدثین) نے یہ حدیث عبد اللہ بن شقیق سے روایت کی ہو کہ المغضوب علیھم یہود ہیں۔ ابن مردویہ نے بھی یہ روایت کی ہو۔ نیز امام بیہقی نے شعب الایمان میں، امام سفیان بن عیینہ نے اپنی تفسیر میں اور سعود بن منصور نے بھی یہ روایت کی ہو۔ امام احمد، عبد بن حمید اور ترمذی (ترمذی نے اس حدیث کو حسن بتایا ہو) ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابن حبان نے (صحیح میں) حضرت عدی بن حاتم سے روایت کی ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ المغضوب علیھم یہود ہیں۔ ابن جریج نے حضرت عبد اللہ بن مسعود کا اور مجاہد کا یہ قول روایت کیا ہو کہ المغضوب علیھم یہود ہیں۔ ان

تمام اقوال کو نقل کرکے امام جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں:

قال ابن ابی حاتم (محدث مشہور) ابن ابی حاتم نے فرمایا ہو کہ میں نہیں جانتا کہ مفسرین میں سے

لا اعلم خلافا بین المفسرین فی تفسیر المغضوب علیھم بالیھود والضالین النصاریٰ	کسی نے بھی اس میں اختلاف کیا ہو کہ المغضوب علیھم سے مراد یہود ہیں۔

(ملاحظہ ہو الدر المنثور صفحہ ۱۶ الجزء الاول مطبوعہ مطبع المیمنیہ مصر ۱۳۲۴ھ)

۹۔ تفسیر ابن عباس میں ہے:

غیر المغضوب علیھم غیر دین الیھود الذین غضب علیھم۔	دین یہود کے سوا جن پر غضب نازل ہوا

(تفسیر ابن عباس صفحہ ۴ حاشیہ الدر المنثور مذکور)

۱۰۔ معالم التنزیل میں ہو (غیر المغضوب علیھم کی تفسیر میں):

وغضب اللہ تعالیٰ لا یلحق عصاۃ المؤمنین انما یلحق الکافرین	خدا تعالیٰ کا غضب گنہ گار مسلمانوں پر نازل نہیں ہوتا بلکہ صرف کافروں پر نازل ہوتا ہے۔

(ملاحظہ ہو تفسیر معالم التنزیل صفحہ ۱۰ مطبوعہ بمبئی مطبع صالحی ۱۲۶۹ھ ہجری)

مذکورۂ بالا اقوال کے پڑھ لینے کے بعد خصوصاً امام ابن کثیر اور امام محدث ابن ابی حاتم کی اس تصریح کے بعد کہ مفسرین میں سے کسی کو اس قول سے اختلاف نہیں، ہی قارئین کرام کو یہ اطمینان ہو جائے گا کہ میرا یہ کہنا کہ "سلف سے اب تک المغضوب علیھم سے مراد یہود ہیں" محض ادعا نہ تھا بلکہ تفاسیر معتبرہ کے عین مطابق تھا۔

اب امام بیضاوی کا وہ قول رہ جاتا ہی جو اخبار "الفضل" نے نقل کیا ہی۔ اول یہ مناسب ہے کہ ہم تفسیر بیضاوی کی عبارت بجنسہٖ نقل کرکے اس کا ترجمہ کر دیں۔ امام بیضاوی لفظ غضب و ضلال کے معنی اور عبارت غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کی ترکیب نحوی بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

وقيل المغضوب عليهم اليهود لقوله تعالى
فيهم من لعنه الله وغضب عليه و لا
الضالين النصارى لقوله تعالى قد ضلوا
من قبل واضلوا كثيرا و قد روى مرفوعا
ويتجه[1] ان يقال المغضوب عليهم العصاة
والضالون الجاهلون بالله لان المنعم
عليه من وفق للجمع بين معرفة الحق لذاته
والخير للعمل به وكان المقابل له من اختل
احدى قوتيه العاقلة والعاملة والمخل
بالعمل فاسق مغضوب عليه لقوله تعالى
في القاتل عمدا وغضب الله عليه والمخل
بالعلم جاهل ضال لقوله تعالى فماذا
بعد الحق الا الضلال۔

اور کہا گیا ہے کہ المغضوب علیہم یہود ہیں۔ کیونکہ خداوند
تعالیٰ فرماتا ہے من لعنہ اللہ وغضب علیہ ولا الضالین نصاریٰ
کیونکہ خداوند تعالیٰ فرماتا ہے قد ضلوا من قبل و اضلوا
کثیرا اور یہ قول روایت کیا جاتا ہے بطور حدیث مرفوع
کے۔ اور ذہن میں یہ بات بھی آتی ہے کہ یہ کہا جائے کہ
المغضوب علیہم گنہ گار ہیں اور ضالون وہ جو خدا کو نہیں
جانتے۔ اس واسطے کہ نعمت یافتہ وہ شخص ہیں جن کو خداوند
تعالیٰ کی ذات کی معرفت کی اور خیر پر عمل کرنے کی توفیق
بخشی گئی ہو۔ لہذا اس کا (نعمت یافتہ کا) مقابل وہ ہوگا جو
اپنی قوت عاقلہ و عاملہ میں سے ایک کو بیکار کرے۔ عمل
میں خلل انداز فاسق مغضوب علیہ ہے اس لئے کہ خداوند تعالیٰ
قاتل بالارادہ کی نسبت فرماتا ہے وغضب اللہ علیہ
اور علم میں خلل انداز جاہل گمراہ ہے بموجب قول الٰہی
فماذا بعد الحق الا الضلال۔

[1] اتجاہ۔ روے نمودن یقال اتجہ لہ رأی ای سنح۔ منتہی الارب۔

(ملاحظہ ہو تفسیر بیضاوی صفحہ ۱۱ مطبوعہ مطبع مجتبائی دہلی سنہ نامعلوم)

یہ ہیں تمام وہ معنی جو امام بیضاوی نے تحریر فرمائے ہیں۔ اور اس میں غیر المغضوب علیہم کے صرف دو معنی بیان کئے ہیں، نہ پانچ (جیسا کہ "الفضل" نے لکھا ہے اور انعمت علیہم کے معنی المغضوب علیہم کے معنوں میں شامل کر کے دو کے پانچ قول بنا دئے ہیں) اول یہود اور اس کی دلیل کلام الٰہی اور کلام نبوی دونوں سے نقل فرمائی ہے۔ دوسرے معنی اس عنوان سے بیان کئے ہیں کہ ذہن میں آتا ہے کہ کہا جائے (اور یہ معنی خود امام بیضاوی کی رائے ہیں جیسا کہ علامہ سیالکوٹی کی عبارت منقولہ الفضل سے

معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ اس معنی کی نسبت تقریر اعتراض معترض میں کہتے ہیں "المخترعی للرائے" کہ مغضوب علیہم سے مراد فاسق اور ضالین سے مراد جاہل گمراہ ہوں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ امام بیضاوی اس قول کی نسبت ظاہر کر دینا چاہتے تھے کہ یہ میری ذاتی رائے ہے۔ اسی لئے فرمایا ویتجاہ (یعنی یہ معنیٰ ذہن میں آتے ہیں) اس سے معلوم ہوا کہ یہ قول عامۂ مفسرین کا قول نہیں ہے ورنہ امام بیضاوی اُس کو اپنے ذہن کی جانب منسوب نہ کرتے۔

رہا یہ امر کہ المغضوب علیہم سے مراد یہود ہونے کے قول کو اُنھوں نے "قیل" کرکے لکھا ہے لہذا اُس کو ضعیف تبلایا ہے تو اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ اگر یہ قول ضعیف ہے تو دوسرا بھی ضعیف ہے اس لئے کہ وہ "ان یقال" کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ قیل ویقال دونوں بصیغۂ مجہول ہیں۔ لیکن اصلی جواب یہ ہے کہ یہ تمام بحث قیل کے مجہول ہونے سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ اصطلاح منطق اور معقول کی ہے کہ صیغۂ مجہول کے ساتھ قول ضعیف نقل کرتے ہیں۔ کلام مجید میں بہت سے مقامات میں قیل اور یقال کے ساتھ احکام ارشاد ہوئے ہیں، وہاں تضعیف کس طرح مراد ہوسکتی ہے؟ محدثین جو کہتے ہیں کہ رُوِی اُس سے مراد روایت ضعیف نہیں ہوتی۔ اہل لغت جب کوئی سند لاتے ہیں تو کہتے ہیں یقال کذا۔ اس سے قوت سند مراد ہوتی ہے نہ تضعیف۔ جو عبارتیں اوپر نقل کی گئی ہیں اُن سے معلوم ہوا ہوگا کہ قول منصور و مقبول قیل کرکے بیان فرمایا ہے (دیکھو امام جلیل ابن جریر طبری کا قول) اس لئے یہ کہنا کہ جو قول قیل کرکے نقل کیا ہے اُس کو امام بیضاوی ضعیف خیال کرتے ہیں، صحیح نہیں خصوصاً جب کہ وہ اُس کو قول الٰہی و حدیث نبوی سے مدلّل فرماتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں دوسرا قول اس طرح پیش کرتے ہیں کہ ذہن میں آتا ہے کہ کہا جائے۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں جو لکھا ہے اُس سے معلوم ہوگا کہ وہ امام بیضاوی کے قول ثانی کی تضعیف کرتے ہیں اور اُس مذہب کو قول مشہور مفسرین کا بیان کرتے ہیں جس کو امام بیضاوی نے قیل کرکے نقل کیا ہے۔ اب رہا علامۂ سیال کوٹی کا حاشیہ۔ میرے یہاں یہ حاشیہ نہیں ہے اس لئے پوری عبارت دیکھنے سے مجبور رہا۔ تاہم جو عبارت اخبار الفضل میں نقل ہوئی ہے اُس کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک محشیانہ توجیہ ہے جیسا کہ لفظ یجوز کے

استعمال کرنے سے واضح ہی نہ مفسرانہ یا محدثانہ تحقیقات۔ اکابر محدثین و مفسرین کے اقوال بالاسے روشن ہوچکا ہی کہ کلام رسالت سے مراد تخصیص یہود ہی۔

یہ بحث تو ختم ہوئی اب ایک سوال مترجم قادیانی سے باقی رہتا ہی۔ وہ یہ کہ اگر اُن کا ترجمہ مطابق تفاسیر سلف ہی تو وہ بتلائیں کہ اُن کا یہ قول کہ المغضوب علیھم میں وہ مسلمان بھی داخل ہیں جو مسیح قادیانی پر ایمان نہ لائیں کس تفسیر میں درج ہی؟ یہ امر بھی غور طلب ہی کہ میں نے اُسی مضمون میں لکھا تھا کہ آج تک مفسرین نے یہ سمجھا تھا کہ المغضوب علیھم سے مراد یہود ہیں۔ الفضل کے مضمون نگار لکھتے ہیں:۔
" شروانی صاحب نے اپنے مضمون میں المغضوب علیھم کی تفسیر کے متعلق جو یہ دعویٰ کیا ہی کہ عہد رسالت سے آج تک المغضوب علیھم سے صرف یہود ہی سمجھے گئے ہیں"۔ یہ دو تخصیص کے لفظ "صرف" اور "ہی" میرے کس کلام سے مستنبط ہوئے؟

دوسری بحث

اب دوسری بحث " وبالآخرۃ ھم یوقنون" کی تفسیر کے متعلق ہی۔ "الفضل" میں یہ اعتراض ہی کہ میں نے یہ غلط لکھا ہی کہ قادیانی ترجمہ میں وبالآخرۃ سے مراد قادیانی مرزا صاحب ہیں۔ مجکو بھی حیرت ہی کہ صاحب مضمون اس امر سے کس طرح انکار کرتے ہیں کہ بالآخرۃ سے مراد ترجمہ قادیانی میں وہی ہیں جو میں نے اپنے ریویو میں نقل کی۔ خود مضمون کی ان عبارتوں کو ملاکر پڑھیے " اور الآخرہ میں اُس وحی کا ذکر ہی جو پیچھے نازل ہونے والی ہی اور یہ وہ وحی ہی جو سورۂ الجمعہ .... میں موعود ہی۔ سورۂ جمعہ میں دو بعث فرمائے گئے ہیں ایک تو وہ بعث جس میں قرآن کریم نازل ہوا۔ اور ایک دوسرا بعث جو آخری زمانہ میں ہونا مقدر تھا...... چنانچہ احادیث اور قرآن شریف کی دیگر آیات سے ثابت ہی کہ وہ صاحب وحی شخص مسیح موعود و مہدی موعود ہی جس کی وحی پر یقین لانا ایسا ہی ضروری ہی جیسا دوسری وحیوں پر"۔ کیا اس عبارت سے وہ مطلب صاف عیاں نہیں ہی جو میں نے سمجھا؟ اگر "مسیح موعود و مہدی موعود" سے مترجم قادیانی کے نزدیک پیشوائے قادیانی کے سوا کوئی اور صاحب مراد ہیں تو

میں اپنی غلطی کو نہ اپس لینے کے لئے تیار ہوں۔

صاحب مضمون نگار الفضل نے میری نسبت یہ بیان خواہ مخواہ منسوب کرکے کہ میں یہ کہتا ہوں کہ (قادیانی فرقہ آخرت کا قائل نہیں) جرح و قدح کی ہے حالانکہ میں نے کہیں یہ نہیں لکھا۔

اب سوال یہ ہے کہ الآخرۃ سے مراد وحی قادیانی کا ہونا کس تفسیر کے حوالے سے لکھا گیا ہے؟ جس طرح بیضاوی کا قول اوپر نقل کیا گیا ہے۔ براہ مہربانی اپنے اس قول کی تائید میں بھی کسی مفسر کا قول مع حواشی نقل کیا جائے۔ اگر کوئی قول اس مذہب کی تائید میں نہیں ہے (اور یہ درست ہے) تو ہمارا یہ کہنا کہ یہ قول خلاف مسلک سلف صالحین ہے بالکل صحیح ہے۔ رہا اس قول کا بیان قرآنی کے مطابق ہونا اس کی تردید خود ترجمۂ قادیانی کے اس بیان سے ہوتی ہے کہ کثرت سے الآخرۃ سے کلام مجید میں الدار الآخرۃ مراد ہے

تیسری بحث

میں نے ریویو میں لکھا تھا کہ قادیانی ترجمہ میں لکھا ہے کہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ نبی ہونے کی دعا مانگے۔ مضمون نگار الفضل لکھتے ہیں کہ یہ میرا ایجاد ہے ترجمہ میں نہیں ہے۔ حالانکہ جو عبارت ترجمہ خود مضمون مذکور میں ہے وہی میرے قول کی شاہد ہے (ملاحظہ ہو عبارت مذکور مندرجۂ ذیل):

"غرض اس دعا کے ذریعہ سے ہر ایک مسلمان کا فرض رکھا گیا ہے کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ انعامات (جن میں نبوت بھی ہے) اللہ تعالیٰ سے طلب کرے۔"

کیا خداوند تعالیٰ سے نبوت طلب کرنا اور نبی ہونے کی دعا مانگنا الگ الگ چیزیں ہیں؟ اسی ضمن میں ختم نبوت کی بحث میں حضرت امام ربانی اور حضرت ابن عربی اور امام شعرانی کے اقوال نقل کرکے یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ ان بزرگوں نے تصریح فرما دی ہے کہ نبوت ختم نہیں ہوئی حالانکہ ان عبارتوں کے پڑھنے سے جو خود صاحب مضمون نے نقل کی ہیں صاف آشکارا ہوتا ہے کہ ان حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ کمالات نبوت ختم نہیں ہوئے اور اُن کا جلوہ متبعین اسلام میں پایا جاتا ہے۔ ان اقوال کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے:-

"العلماء ورثۃ الانبیاء" امام شعرانی کی عبارت میں جو حدیث سنداً پیش کی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایک حافظ قرآن جو سینہ میں کلام الٰہی کو محفوظ رکھتا ہے نبوت کو اپنے سینہ میں لئے ہوئے ہے لیکن ان اقوال سے یہ کہاں ثابت ہے کہ صاحب وحی نبی مبعوث کے ہونے کی بھی گنجایش ہے۔ قادیانی ترجمہ تو صاحب وحی نبی کا اعلان کر رہا ہے، جیسا کہ اُس عبارت سے واضح ہے جو ہم ابھی ابھی مضمون الفضل سے نقل کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ساری بحث کا ابھی خاتمہ ہوتا ہے اگر مضمون نگار الفضل اس امر کو تسلیم کر لیں کہ وہ اپنے پیشوا میں ایسے ہی نبوت کے جلوے دیکھتے اور مانتے ہیں جیسے کہ ہر حافظ قرآن کے سینے میں ہیں اور جو ہر ایک عالم ربانی کو ورثہ میں حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے ہیں۔ لیکن اگر اس سے ماورا اور جلوے ہیں جو صاحب وحی ہونے کے لوازم ہیں تو اُس کی تائید قول حضرت امام ربانی یا حضرت ابن عربی یا امام شعرانی سے ہونی درکنار کسی معمولی مسلمان عالم کے قول سے بھی نہیں ہو سکتی۔

تعجب ہے کہ بحث ترجمۂ کلام مجید کی تھی اور اُس کی تائید میں کسی تفسیر کا قول نقل نہیں کیا گیا۔

چوتھی بحث

چوتھا اعتراض میرے اُس قول کے متعلق ہے جو دو بعثتوں کے متعلق ہے "وبالآخرۃ ھم یوقنون" کی تفسیر میں سورۂ جمعہ کی آیت کا جو مطلب ترجمۂ قادیانی میں نقل کیا گیا ہے اُس کے پڑھنے سے ضرور میں نے وہ مطلب اخذ کیا جو اپنے ریویو میں لکھا ہے۔ اگر مضمون نگار الفضل کا اُس سے دل دُکھا تو مجھ کو افسوس ہے۔ اور بہت ممکن ہے کہ میں نے یہ غلط معنی اخذ کئے ہوں۔ لیکن یہ میں بالاعلان کہتا ہوں کہ سورۂ جمعہ کی آیت "ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم الخ" سے دو بعثت مراد لینا (ایک وہ بعثت جس میں قرآن کریم نازل ہوا۔ دوسرا وہ جو آخر زمانہ میں ہونا مقدر تھا) قطعاً تفسیر سلف صالحین کے خلاف ہے۔ اور کسی معتبر مفسر نے یہ مطلب نہیں بیان کیا۔ اگر کوئی سند اُس کی ہے تو بیان کی جائے۔

آخر میں یہ اور عرض ہے کہ میرا مدعا ریویو لکھنے سے قادیانی فرقہ کی تردید یا تکذیب نہ تھی، بلکہ صرف

یہ مقصود تھا کہ جمہور اہل اسلام کو اس سے آگاہ کردوں کہ ترجمۂ قادیانی ایک خاص فرقہ کے عقائد کا آئینہ ہے۔ سلف صالحین و اکابر مفسرین کے مسلک کے مطابق نہیں ہے۔ یہ میرا اب بھی قول ہے اور عامۂ مسلمین کو مغالطہ سے بچانے کے لئے ہی یہ مضمون میں نے لکھا ہے۔ اس لئے مجھ پر یہ لازم نہ تھا کہ میں اس بحث میں پڑتا کہ قادیانی مسیح موعود سچے تھے یا نہ تھے۔

ضروری جوابات مضمون الفضل کے ختم ہوئے۔ رہی مضمون مذکور کی سخت کلامی و درشتی زبان، اس کے متعلق اس کلام ربّانی کے آگے سر جھکانا لازم ہے "واذا مرّوا باللغو مرّوا کراماً" "والسلام علیٰ من اتّبع الھدیٰ"

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۶ اگست و ۴ اکتوبر ۱۹۱۶ء)

خطبۂ صدارت اجلاس ندوۃ العلماء بمقام مدراس[1]

حضرات علمائے کرام و معززین امت! بغداد شریف کے مدرسۂ نظامیہ کا سارے عالم میں شہرہ ہے۔ امام فخر الاسلام جب اوّل مرتبہ وہاں مسند درس پر بیٹھے تو انھیں وہ اکابر یاد آئے جن سے مسند مذکور مزیّن رہ چکی تھی۔ مثلاً شیخ ابو اسحٰق شیرازی و امام غزالی۔ اس خیال سے امام ممدوح کے دل پر ایک چوٹ سی لگی آنکھوں پر عمامہ رکھ کر بے اختیار روئے اور فرمایا ؎

[1] یہ مضمون بطور خطبہ صدارت مدراس کے اجلاس ندوۃ العلما کے لئے لکھا گیا تھا جہاں سیاسی ہلچل کی وجہ سے میری شرکت نہ ہو سکی البتہ خطبہ وہاں پڑھا گیا۔ حبیب الرحمٰن

خلت الدیار فسدت غیر مسود
زمانہ اہلِ کمال سے خالی ہوگیا تو مجھ سا بے مایہ سرگروہ تھا

ومن العناء تفردی بالسؤدد

مجھ سے آدمی کا سالارِ یگانہ بنا گیا اندوہ افزا ہے

آج کا حسرت انگیز سماں اس مثال سے کس قدر مطابق ہے۔ جو کرسی جناب استاذ العلماء مفتی محمد لطف اللہ صاحب مغفور اور مولانا احمد حسن صاحب مرحوم سے بزرگوں کی صدارت سے شرف حاصل کر چکی ہو اُس پر ایک ایسے شخص کا بیٹھنا جو نہ عالم ہے نہ کسی علمی خاندان کا فرد فی الحقیقت حیرت خیز اور عبرت انگیز منظر ہے۔ میں کبھی اس مقام پہ قدم رکھنے کی جرأت نہ کرتا اگر میرے تحیر کو ایک میرے مخدوم یہ کہہ کر دُور نہ فرما دیتے "کبّر ناموت الکبراء"۔ اس مشہور مقولہ نے مجھ کو یہ اطمینان دلا دیا کہ میرا کوئی شرف باعثِ انتخاب نہیں ہوا بلکہ بزرگانِ اُمت نے میری کم مائگی کو نظرِ قبول سے ملاحظہ فرمایا ہے۔ اب یہ بے سر و سامانی میرے واسطے سرمایۂ فخر ہے اور میں اپنی بے بضاعتی کے اعتراف و اقرار کے ساتھ تعمیل ارشاد اور خدمت کے واسطے حاضر ہوں۔

بنازم بہ بزمِ محبت کہ آنجا
گدائے بہ شاہے مقابل نشیند

با ایں ہمہ سمجھتا ہوں کہ یہ شرف ایسا ہے جو نازشِ عمر اور کارنامۂ زندگی مانا جا سکتا ہے پس جن بزرگوں نے یہ اعزاز عطا فرمایا ہے اُن کے شکر و سپاس سے میرا دل مالامال ہے۔

جَزَاھُمُ اللہُ عَنّی خَیرَالجزاء۔ عرض بھی ضروری ہے کہ بدون آپ کے کرم اور توجہ کے میں اس خدمت کا حق ادا نہ کرسکوں گا۔

بزرگانِ قوم! مجلس ہذا کے مقاصد و اغراض کے اعتبار سے نیز اس لحاظ سے کہ زمانۂ حال میں عموماً مسلمان علوم عربیہ سے بے پروا نظر آتے ہیں، مناسب ہوگا کہ میں اس موقع پر علوم عربیہ کی مختصر تاریخ عظمت اور وسعت بیان کروں تاکہ معلوم ہو کہ کیسی شان دار امانت (جو اسلاف کی محنتوں کا نتیجہ اور حق و صداقت کا ذخیرہ ہے) ہمارے ہاتھ میں ہی اور ہم کو کیسے بے مثل سرمائے کی حفاظت و ترقی کا حق ادا کرنا ہی۔ کلام ربانی اور احادیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہی کہ دین الٰہی کے اہم مقاصد میں سے ایک مقصد علم کی ترویج و اشاعت بھی تھا۔ کلام مجید میں بار بار اور مختلف پیرایوں میں علم اور علماء کی فضیلت بیان فرمائی ہے اور حصول علم کی تاکید۔ مثالاً چند آیتیں نقل کرتا ہوں۔

ویرفع اللہ الذین اٰمنوا منکم والذین اوتوا العلم درجات	اور بلند کرے گا اللہ تم میں سے ان لوگوں کے جو ایمان لائے ہیں اور اُن کے جو علم والے ہیں بہت سے درجے۔
ومن یوت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً	جس کو حکمت دیدی گئی اُس کو بڑی بھاری دولت بخش دی گئی۔
انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء	اللہ سے ڈرنے والے صرف علماء ہیں۔

خشیتِ الٰہی (جو ذریعہ ہی نجات اور اجر کریم اور ہدایت پانے کا) اُس کو گروہ علماء میں حصر فرما دینا علماء کی انتہائی شان پر دلالت کرتا ہے۔

سب سے زیادہ علمی ترقی کی محرک وہ آیتیں ہیں جن میں آیات ربّانی اور مظاہر قدرت پر غور وتدبر کی تاکید فرمائی گئی ہے اور یہ مظاہر قدرت اس قدر وسیع ہیں کہ طبعیات، زرعیات، برقیات، فلکیات، ارضیات وغیرہ تمام علوم اُن کے لانہایت دائرے میں آجاتے ہیں۔

اربابِ تفسیر نے لکھا ہے کہ حضرت آدم کو ملائکہ کا سجدہ کرنا تعظیم علم کے سبب سے تھا۔ نہ صرف حصول علم کی تاکید ہے بلکہ علم میں برابر ترقی کرنے کا حکم ہے۔ چنانچہ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا تلقین فرمائی گئی:۔

ربِّ زدنی علما۔	یا رب میرے علم کو بڑھا۔

حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کلام ربانی کی تائید اُسی اہتمام سے فرمائی۔ ارشاد ہے:۔

العلم حیات الاسلام وعماد الدین العلم سلطان اللہ فی الارض فمن وقع فیہ فقد ھلک۔	علم اسلام کی جان اور دین کا ستون ہے علم زمین پر خدا کی قوت ہے جو اس سے مقابل ہوا تباہ ہوا۔
العلم خلیل المومن والعقل دلیلہ۔	علم مومن کا دوست اور عقل اُس کی رہنما ہے۔
العلماء مصابیح الارض وخلفاء الانبیاء و ورثتی وورثۃ الانبیاء۔	علماء زمین کی روشنی ہیں اور انبیاء کے نائب اور میرے اور انبیاء کے جانشین۔
وزن حبر العلماء بدم الشھداء فرجح علیہ ما تصدق الناس بصدقۃ افضل من علم	علماء کی روشنائی شہداء کے خون سے وزن کی گئی تو اس کا پلہ بھاری رہا۔ علم پھیلانے سے بہتر کوئی صدقہ نہیں۔
	وہ علم باعثِ بربادی ہے جس پر عمل نہ ہو۔

مثل العالم الذی یعلم الناس الخیر وینسیٰ نفسہ کمثل السراج یضیئی للناس ویحرق نفسہ

جو عالم اوروں کو نیکی سکھائے اور خود اپنے نفس کو بھول جائے وہ مثل چراغ کے ہے جو لوگوں کی روشنی بنتا ہو مگر اپنے آپ کو خاک سیاہ کر دیتا ہے۔

اشد الناس عذابًا یوم القیامۃ عالم لم ینفعہ علمہ۔

جس عالم کو اُس کا علم نفع نہ پہنچائے اُس کو قیامت میں سب سے زیادہ شدید عذاب ہوگا۔

علم لا ینفع ککنز لا ینفق بہ۔

علم غیر نافع ایسا خزانہ ہے جو صرف نہ کیا جائے۔

علاوہ قولی تاکید کے عملاً بھی علم وعلمار کی شان وفضیلت کا اظہار فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ مسجد میں حضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ وہاں دو حلقے تھے ایک میں کچھ آدمی خدائے تعالیٰ سے دعا مانگ رہے تھے دوسرے میں درس تدریس جاری تھی۔ آپ نے ارشاد فرمایا "انما بعثت معلمًا" یعنی میں تو تعلیم دینے آیا ہوں۔ یہ فرما کر درس تدریس کے حلقہ میں تشریف فرما ہوگئے۔ اس پاک تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ صحابۂ کرام میں علم کا ذوق سرایت کر گیا۔ اور وہ قدسی گروہ علوم کی ترویج پر کمربستہ ہوگیا۔

سب سے اول کلام الٰہی اور حدیث وفقہ کی حفاظت واشاعت پر توجہ فرمائی اُس سعی کا یہ نتیجہ ہے کہ صدہا برس گزر جانے پر بھی علم کے یہ دونوں سرچشمے تحریف وتصحیف کے گرد وغبار سے پاک اور صاف اپنے فیض سے عالم کو سیراب کر رہے ہیں۔ علاوہ دینی علوم کے دوسرے علوم کی خدمت کی بنیاد مسلمانوں میں خود صحابۂ کرام کے زمانہ میں پڑ چکی تھی۔ باب مدینۃ العلم حضرت علی مرتضیٰ کی ہدایت ومشورہ سے ابوالاسود دؤلی نے علم نحو کے اصول قائم کئے۔ علمی مذاق صحیح جو مشکوٰۃ نبوت سے سینوں پر چمکا تھا اُس کا اثر تھا کہ صحیح علم کا ذوق صحابۂ کرام میں تھا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ سے علم نجوم کی بابت پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا اُس کا وہ حصہ سیکھنا چاہیے جو راہ نمائی میں کام آئے یعنی عملی پہلو لے لو باقی اور بے اصل حصہ چھوڑ دو۔ حضرت ابن عباسؓ کا حلقۂ درس بہت وسیع تھا۔ اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ اُن کی علمی تقریر کی قوت کا یہ عالم تھا جیسے سیلاب بلندی سے گرے۔ ہفتے میں ایک دن اُن کے درس میں صرف ادبِ عربی کی تعلیم کے واسطے مخصوص تھا اور اُس کا لقب انھوں نے "حُتینی" رکھا تھا۔

حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں بعض غیر زبانوں کے علوم کا اضافہ عربی میں ہوا۔

اسلام جس سرعت و قوت سے پھیلا اُسی سرعت و قوت سے علم کا شوق مسلمانوں کے دلوں میں ترقی کرتا گیا۔ پہلی ہی صدی ہجری میں ممالک اسلامیہ دار العلوم بن گئے۔ اس میں کسی قوم یا رنگ کی خصوصیت نہ تھی۔ تابعین کے طبقے میں ہی عرب کی جگہ عجمیوں نے لے لی۔ عکرمہ، امام مکحول، امام ابوحنیفہ وغیرہ ائمہ جلیل القدر عجمی تھے۔ حدیث میں ارشاد ہوا "الحکمۃ ضالۃ المومن من حیث وجدہا جذبہا" (علم مسلمان کا گم شدہ سرمایہ ہے جہاں پاتا ہے لے لیتا ہے) اس گم شدہ سرمایے کی تلاش میں مسلمانوں نے دنیا کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا جہاں سے خزانہ علم حاصل نہ کیا ہو۔ کوئی علمی زبان نہیں چھوڑی جس کا سرمایہ عربی میں منتقل نہ کیا ہو۔ علامہ ابن ندیم نے کتاب الفہرست تقریباً چوتھی صدی کے وسط میں لکھی ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یونانی، رومی، قدیم فارسی، سریانی، کلدانی، سنسکرت وغیرہ تمام قدیم زبانوں کے علوم ترجمہ ہو کر عربی میں آئے۔ علامہ ممدوح ہر زبان کے مترجمین کا اور اُن کی ترجمہ کی ہوئی کتابوں کا مفصل ذکر کرتا ہے سنسکرت کے مترجمین میں منکہ، کنکہ، جودر، منجھل، نسق، ابن دھن ہیں۔ ان ناموں کی ترکیب صاف کہہ رہی ہے کہ عربی برقع میں ہندی صورتیں مستور ہیں۔ ابن دھن کی نسبت لکھا ہے کہ برامکہ کے شفاخانہ کا مہتمم تھا۔ اور ہندی سے عربی میں ترجمہ کیا کرتا تھا۔ ابن ندیم کہتا ہے جن علماء ہند کی کتابیں نجوم اور طب کے متعلق ہم تک پہنچی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:-

باکھر، راجہ، جنکر، داہر، آنکو، زنکل، اریکل، جھبر، اندی، جباری۔ جو کتابیں طب کی سنسکرت سے عربی میں ترجمہ ہوئیں اُن کی مفصل فہرست دی ہے۔ صفحہ ۳۴۴ پر لکھتا ہے کہ ہارون رشید کے وزیر یحیٰی بن خالد نے ہندوستان ایک آدمی کو بھیجا تاکہ وہ دوائیں لائے جو ہندوستان میں پیدا ہوتی ہیں اور اُس ملک کے مذاہب کی تحقیقات کر کے لکھے اس کے بعد یحیٰی مذکور نے ایلچی بھیج کر ہندوستان سے علماء طب و حکمت کو بغداد طلب کیا۔ اتنا لکھ کر ابن ندیم نے خود بھی ہندوؤں کے مذہب کا ذکر مفصل کیا ہے اور اُن کے معابد اور مذہبی فرقوں کی تفصیل لکھی ہے۔ ہندوستان کے علوم کی جو تحقیقات مسلمانوں نے کی اس کی بہترین یادگار کتاب الہند ابوریحان بیرونی کی ہے جس میں تمام علوم ہندوستان سے مفصل بحث کی ہے۔ کتاب مذکور کے دیباچہ

نیز تاریخ مروج الذہب مسعودی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی پانچویں صدی ہجری میں علمائے اسلام کا ایک بڑا طبقہ تھا جس نے علوم ہندوستان کی تحقیق اپنا وظیفہ قرار دے رکھا تھا۔ کیسی حیرت ہے کہ جس وقت سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر حملہ کیا اُسی وقت ابوریحان علمی فتوحات کے واسطے ہندوستان آیا اور اُس ہنگامۂ جنگ و جدال میں برسوں ہندوستان میں رہ کر علوم سنسکرت حاصل کئے اور بالآخر ایسا زبردست فاضل ہو گیا کہ خود ہندوستان سے مشکل مسائل اُس کے پاس حل کرنے کے واسطے بھیجے جاتے تھے۔ جن ممالک میں مسلمان گئے علم اور علم کا شوق ساتھ لے گئے۔ حجاز، شام، یمن، عراق، ماوراءالنہر، ایران، خراسان، کابل، ترکی، مصر، ٹونس، مراکو، اندلس (اسپین) چین، صقالیہ (سسلی) اور بحر روم کے دوسرے جزائر، جاوا وغیرہ جزائر بحر ہند، ہندوستان غرض وہ کون سا ملک تھا جہاں مسلمان گئے اور وہ دارالعلوم نہ بن گیا۔ ان ممالک کے شہر اور قصبے ذرکنار گاؤں تک مرکز علوم بن گئے تھے۔ مکۂ مکرمہ، مدینۂ طیبہ، بغداد، اصفہان، نیشاپور، ہرات، طوس، دہلی، لکھنؤ، قیروان، قرطبہ، قاہرہ، قونیہ، بیت المقدس، بخارا سطح ارض پر کہاں کہاں بکھرے ہوئے ہیں لیکن اُن میں سے جس مقام پر جاکر گوشِ عبرت سے سنئے گا ذرہ ذرہ کی زبان پر علوم اسلامیہ کا تذکرہ پائے گا۔ الاصابہ کے مقدمے میں ڈاکٹر اسپرنگر نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کے علم اسماء الرجال کی کتابوں میں کم سے کم دس لاکھ علماء کا ذکر ہے۔ معجم البلدان، یاقوت مستعصمی کی ضخیم جلدیں مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ وہ کونسا قریہ تھا جہاں مسلمان گئے اور وہاں نامور علماء پیدا نہ ہوئے۔ اسلام کی خصوصیت یہ تھی کہ علم ظاہر اور معرفتِ باطن دونوں دوش بدوش تھے۔ سرزمین اندلس کو ابن عربی اور ابن رشد دونوں پر ناز ہے۔ ملک ایران ابن سینا اور حضرت بایزید بسطامی پر فخر کر رہا ہے۔ بغداد کو جہاں کندی اور بنی موسیٰ پر فخر ہے وہاں حضرت جنید و شبلی کی ذات مبارک سے بھی شرف حاصل ہے۔ علیٰ ہذا القیاس یاد ش بخیر ہمارا ہندوستان بھی ترقی علوم میں کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ ہندوستان میں علوم عربیہ دوسری صدی ہجری میں اسلامی فتوحات کے ساتھ ساتھ ماوراءالنہر و خراسان سے داخل ہوئے۔ قدرتاً سب سے اول ملک سندھ اس نور سے روشن ہوا اور ہندوستان میں پہلا مدینۃ العلم ملتان تھا۔ علماء کا ایک گروہ عظیم وہاں سے پیدا ہوا۔ ملتان کے بعد لاہور دَورِ غزنویہ میں مرکز علم تھا۔ لاہور کے بعد دہلی مرحوم گہوارۂ

علوم بنی۔ کیا کسی قلم میں یہ طاقت ہے کہ وہاں کے گوناگوں علوم اور گروہا گروہ علمار کی شمار کر سکے؟ آہ دہلی مٹ گئی لیکن اب بھی اُس کا نام فضل و کمال کی چمکتی ہوئی بجلیاں اپنے اندر مخفی رکھتا ہے۔ سلطنت دہلی میں عہد تغلق کے بعد جب ضعف ہوا تو علم کی مسند جونپور میں جا کر بچھی۔ جونپور کا نور لکھنؤ پر چمکا اور فرنگی محل اُس وقت بھی دارالعلم تھا جب دارالسلطنت لکھنؤ کا وجود بھی نہ تھا۔ لکھنؤ میں آفتاب علم کس آب و تاب سے چمکا جس نے وہاں کے ہر قصبے کو انوار علم سے منور کر دیا۔ علمی دنیا میں بلگرام، سندیلہ، گوپامئو، خیرآباد وغیرہ سے کون واقف نہیں؟ شاہ جہاں فخریہ لہجہ میں کہا کرتا تھا "پورب شیراز ماست"۔ میر غلام علی آزاد نے مآثر الکرام میں لکھا ہے کہ دیار پورب سے اودھ اور ضلع الہ آباد کا کچھ حصہ مراد ہے۔ صوبۂ بہار کو دہلی و لکھنؤ سے فیض پہنچتا رہا۔ بنگالہ بھی شیراز سے دور نہ تھا۔ حافظ شیرازی کو خطۂ بنگالہ نے بھی دعوت دی تھی جو اگرچہ ناتمام رہی تاہم لسان الغیب کی زبان پر بنگالہ کا ذکر تھا ؎

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند

زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

ایک دوسرا مرکز علم گجرات تھا۔ وہاں علم براہ راست دارالحکمۃ یمن اور شیراز سے سمندر کے راستے سے پہنچا اور علامہ الہدیٰ اور خطیب گازرونی سے کملائے وقت وہاں سے اُٹھے۔ گجرات سے علم کی شعاعیں دکن اور مالوہ تک پہنچیں۔ ابھی اُس سرزمین کا بیان باقی ہے جہاں آج ہم سب جمع ہیں۔ مدراس تعلیم جدیدہ کے اثر سے شاغوں میں ایک ایسی نوعیت رکھتا ہے کہ بظاہر اُس کا علوم عربیہ کا کبھی مرکز رہنا بعید از قیاس سا معلوم ہوگا۔ لیکن نہیں، وہ علوم عربیہ کے فیض سے پوری طرح بہرہ یاب رہ چکا ہے۔ ابن بطوطہ جب آج سے تقریباً چھ سو برس پہلے اس خطے میں آیا تو سواحل ملابار کو علم عربی اور علما سے معمور پایا۔ وہ اپنے سفرنامے میں قالقوط (کالیکٹ) ہنوز، منجرور (منگلور) جرفتن وغیرہ اُس زمانے کے تمام مشہور مقامات کا ذکر کرتا ہے ساتھ ساتھ ہر جگہ کے علماء عربی کا اور مدرسوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ قالقوط کی نسبت کہتا ہے یہاں امیر التجار ابراہیم شاہ بندر ہے جو ایک بحرین کا فاضل ہے۔ قاضی یہاں فخرالدین عثمان ہیں اور صاحب خانقاہ شیخ شہاب الدین گازرونی۔ منجرور (منگلور) کی نسبت لکھتا ہے۔ یہاں کے قاضی ایک فاضل کریم شافعی

ہیں جن کا نام بدر الدین ہے۔ اُن کے یہاں مجلس درس گرم رہتی ہے۔ بندر ھیلی کی نسبت لکھا ہے یہاں کی مسجد
ہندو مسلمان دونوں کے نزدیک محترم و واجب التعظیم ہے تجار کثرت سے اس میں روپیہ بھیجتے ہیں جس
کی وجہ سے مسجد کا خزانہ معمور ہے۔ طلبار کی ایک جماعت اُس میں ہے جن کو وظائف ملتے ہیں۔ لطف یہ
ہے کہ یہ تمام مقامات خاص ہندو راجاؤں کے قبضے میں تھے۔ مسلمانوں کے مفتوحہ نہ تھے آخر زمانہ
میں شہر مدراس دارالعلوم بنا۔ بارھویں صدی ہجری میں قاضی ابوبکر شافعی قاضی مدراس تھے۔ اس
سلسلے میں سب سے بڑا شرف اس شہر کو مولانا بحر العلوم کے قدوم سے حاصل ہوا۔ جس طرح مدراس
کا بندر سمندر کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے ہے اسی طرح شہر مدراس کو یہ شرف حاصل ہے کہ علوم کے
سمندر مولانا بحر العلوم اُس کے آغوش میں آرام فرما ہیں۔ مولانا بحر العلوم نے ان ممالک میں فیض علمی کے
دریا بہا دئے۔ ملّا علار الدین، ملّا جمال الدین، مولانا عبدالواحد اور بہت سے بزرگ اُس فیض کی یادگار
تھے۔ آخری یادگاروں میں حضرت شاہ عبداللطیف صاحب ویلوری تھے جن کی ذات سے ویلور کی
مشہور خانقاہ مشرف تھی۔ ہندوستان میں کثرت علمار کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ہمارے محترم ناظم
نے جو تاریخ ہندوستان کے علمار کی لکھی ہے وہ دس جلدوں میں ہے اور پانچ ہزار سے زیادہ مشہور علمار کا
اُس میں ذکر ہے۔

اس قدر بیان سے آپ یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ علوم عربیہ نے عالم کو کس قوت و وسعت کے
ساتھ اپنے انوار سے روشن کیا۔ علوم عربیہ کی تاثیر قوت اس سے ثابت ہوتی ہے کہ جس قوم اور ملک
میں پہنچے وہیں علم و کمال کی بنیاد جمادی۔ امام عکرمہ حبشی۔ امام ابوحنیفہ فارسی اور حکیم ابونصر فارابی ترک
تھے۔ علوم عربیہ کا اثر صرف مسلمانوں تک محدود نہیں رہا دوسرے مذاہب کے پیرو بھی ان سے فیضیاب
ہوتے رہے۔ خلافت اندلس اور حروب صلیبیہ کے سلسلے میں جب یورپ کی اقوام کو مسلمانوں سے ملنے
کا موقع ملا تو علمی شوق نے اُن میں بھی ایک تحریک پیدا کردی۔ ابوسینا اور ابن رشد کا فلسفہ صدیوں تک
یورپ کے درس میں شامل رہا۔ اندلس مدت تک اہل یورپ کی تعلیم کا مرکز رہا۔ انگریزی ہیئت کی کتابیں
دیکھئے اصطلاحی الفاظ اُن کی عربیت پر صاف شہادت دیتے ہیں۔ ہمارے ملکی بھائی ہندوؤں نے

ہمیشہ علوم عربیہ سے استفادہ کیا۔ راجہ کندن لال اشکی کی کتاب منتخب تنقیح الاخبار، راجہ رتن سنگھ زخمی کی حدائق النجوم اور رائے منولال فلسفی کی کتاب سدید الاستخراج فن تقویم میں اُن کے علم کی بہترین شاہد ہیں۔ بنگال میں جدید دورترقی کا سنگِ بنیاد راجہ رام موہن رائے کے قابل ہاتھوں سے رکھا گیا ہے یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے پٹنہ میں عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ گزشتہ موسم سرما میں ایک نامور بنگالی بابو[1] صاحب نے مجھ سے کہا کہ ان کے باپ اور چچا کے زمانہ تک کلکتہ سے بہ کثرت بنگالی، عربی پڑھنے پٹنہ جایا کرتے تھے۔ چنانچہ اُن کے چچا نے پندرہ برس میں علوم عربیہ کی تکمیل کی تھی۔ اُس عہد کے ہندو مسلمانوں کے تعلقات و ربط کی یہ ایک سبق آموز مثال ہے کہ جناب مفتی محمد لطف اللہ صاحب مرحوم کے استاد فارسی منشی سوہن لال تھے اور مولانائے مغفور کے تلامذہ میں بہاری لال کایستھ تھے میں نے بچشم خود دیکھا کہ مولانا کے دوسرے رشید تلامذہ اُن کے ساتھ برادرانہ برتاؤ کرتے تھے۔

ہمارے علمار کی شان ہمیشہ یہ رہی کہ انھوں نے علم کو علم کے لئے حاصل کیا۔ علوم دین سے انھوں نے خدا اور اُس کے رسول کی خوشنودی مقصود رکھی۔ علوم دینیہ جن کو بہت کم ذریعۂ جاہ و حشمت بنایا اُن کی خدمت بھی بہ حیثیت علم کرتے رہے یہ واقعہ زرین تاریخی کارنامہ ہے کہ جب بغداد میں مدرسۂ نظامیہ قائم ہوا اور وہاں علمار کے گراں قدر مشاہرے اور طلبار کے لئے بیش قرار وظائف اور سامان آسائش مہیا کئے گئے تو علمائے بخارا نے علم کی مجلس ماتم منعقد کی اور رو کر کہا کہ اب علم علم کے لئے نہیں بلکہ جاہ و حشمت کے لئے حاصل کیا جائے گا۔ اسی یکسوئی اور وحدت مقصود کا اثر تھا کہ ہمارا علمی گروہ تغیرات زمانہ سے بہت کم متاثر ہوا۔ اگلے زمانے میں امن و امان زیادہ ارزاں نہ تھی۔ سلاطین کا انقلاب امرا کا عروج و تنزل، ملک میں تزلزل پیدا کرتا رہتا تھا۔ لیکن اس کا اثر ترقی علوم پر بہت کم ہوا۔ اسی کی آخری مثال دہلی کے محدثین کا خاندان ہے۔ مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے وقت جب تخت گاہ حوادث کی آماج گاہ بنی ہوئی تھی اور تخت و تاج تاخت و تاراج ہو رہا تھا شاہ ولی اللہ صاحب کا خاندان انتہائی سکون و وقار کے ساتھ علم دین کی خدمت میں منہمک تھا اور اسی دور نے شاہ ولی صاحب کی ذات

---

[1] سر بھوپیندر ناتھ باسو ۱۲

میں ایک ایسا حکیم الامت پیش کیا جس کی مثال امام غزالی کے بعد مشکل سے مل سکتی ہے اور ایک ہی خاندان پر کیا حصر ہے دہلی مرحوم کی آخری بہار نے کمال کے بہت سے گل سرسبد نمایاں کئے۔

اس بے تعلقی و یکسوئی کے ساتھ علوم عربیہ علمی دماغ اور کاروباری ذہن پیدا کرنے میں کبھی قاصر نہیں رہے ائمہ مجتہدین کی معاملہ فہمی پر فقہ کے مسائل زبردست گواہ ہیں جو آج بھی قانون کا بہترین سرمایہ خیال کئے جاتے ہیں۔ جن بزرگوں نے خالص دنیاوی کاروبار کی جانب توجہ کی وہ کامیابی کی اعلیٰ منزل پر پہنچے امام یحییٰ ابن اکثم امام حدیث ہیں۔ مامون الرشید کی تاریخ پڑھئے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس یادگار روزگار خلافت کے انتظام میں امام ممدوح کا کیا حصّہ تھا، امام ابن ماکولا (علم الرجال کی بے مثل کتاب اکمال کے مصنف) جس طرح نامور امام حدیث تھے اُسی طرح ایک کامیاب مدبّر وزیر تھے ابن ابی دواد، نظام الملک طوسی، صاحب ابن عباد وغیرہ وزرائے نامور کی ذات سے ایوان وزارت اور قصر علم دونوں یکساں زینت کے ساتھ مزیّن تھے۔ ہندوستان کی تاریخ میں عہد اکبری سلطنت کی اعلیٰ نظم و نسق اور مشکل مسائل کے حل کے لحاظ سے ہمیشہ یادگار رہے گا۔ امرائے اکبری کے نورتن کی آب و تاب ابوالفضل، فیضی، میر فتح اللہ شیرازی، حکیم ہمام، خانخانان کے دم سے تھی۔ کیا اس کے یاد دلانے کی ضرورت ہے کہ ان میں سے ہر ایک عربی مدرسوں میں بوریا نشیں رہ چکا تھا۔ اس دور آخر میں بھی جن دماغوں نے تعلیم جدید کا مسئلہ حل کیا وہ قدیم مدارس کے تربیت یافتہ تھے اور ابھی یہ امر بحث طلب ہے کہ ہمارے جدید تعلیم یافتہ گروہ نے ان سے بہتر کہاں تک مسئلہ تعلیم کو سمجھا ہے۔ اس زمانے میں ہمارے قدیم علوم کے اساتذہ اور طلباء دونوں میں یہ خیال دل نشیں ہے کہ اگلے علماء کی کامیابیوں کا سنگ بنیاد وہ فراغ خاطر اور فراخ دستی تھی جو اس عہد کی قدردانی کا نتیجہ تھی۔ میں بالاعلان کہتا ہوں کہ یہ خیال گزشتہ اہل کمال کی جناب میں گستاخی بلکہ اُن پر ظلم ہے۔ اُن بزرگوں کے حالات پڑھنے سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ہم اُن سے بہت زیادہ فارغ البال اور امن میں ہیں۔ مثلاً سنئے۔ امام بخاری کو ایام طالب علمی میں ایک مرتبہ تہی دستی کے ہاتھوں مجبور ہو کر تین روز متواتر جنگل کی بوٹیاں کھانی پڑیں۔ امام ابو علی بلخی جب عسقلان میں تھے تو خرچ سے اس قدر تنگ ہوئے کہ کئی فاقوں کی نوبت پہنچی۔ جب بھوک نے بہت

ستایا تو نان بائی کی دکان پر اس غرض سے جا بیٹھے کہ اس فقدان قوت کی حالت میں کھانے کی خوشبو ہی سے کچھ قوت حاصل کر لوں۔ یہ تو مثالیں فراخ دستی کی ہیں۔ فارغ البالی ملاحظہ ہو۔ علوم عقلیہ میں شفا و اشارات کا جو درجہ ہے اس سے ہر طالب علم واقف ہے شیخ الرئیس نے اشارات اس حالت میں لکھی کہ جان کے خوف سے ایک لوہار کے گھر میں چھپا ہوا تھا۔ اسی لُہار سے سامان تحریر منگوا کر یہ بے نظیر کتاب لکھدی۔ ہمارے علمار کے حالات میں یہی ایک واقعہ نہیں ہے۔ ہزاروں واقعات ایسے گزرے ہیں۔ اصل راز علمائے قدیم کی کامیابی کا وہ شوق طلب تھا جو علمی شیفتگی سے پیدا ہوتا تھا اور یہی شوق منزل کی ہر دشواری کو آسان کر دیتا تھا۔ امام ابو حاتم رازی نے شوق طلب میں تو ہزار میل سفر پیادہ پا کیا۔ نو ہزار تک شمار کر کے اُنھوں نے میلوں کو شمار کرنا چھوڑ دیا۔ کتاب النفس ارسطو کا ایک نسخہ کسی کے ہاتھ لگا جس پر حکیم ابو نصر فارابی کے ہاتھ کی یہ عبارت تحریر تھی "انی قرأت ھذا الکتاب مأۃ مرۃ" یعنی میں نے اس نسخے کو سو بار پڑھا۔ امام مزنی نے کتاب الام شافعی کا مطالعہ مسلسل پچاس برس تک کیا اور اُن کا بیان ہے کہ ہر دفعہ کے مطالعہ میں نئے فوائد حاصل ہوئے۔ یہ کھلا ہوا راز ہے کہ اب اُس علمی شیفتگی کا نشان بھی نہیں الا ماشاء اللہ۔ اسی لئے مدرسوں میں ہر طرف کمال کا زوال ہے۔

ہمارے علم و کمال کی تصویر کا یہ روشن پہلو تھا۔ دوسرا پہلو ابھی دیکھنا باقی ہے۔ زمانے کے انقلاب نے ہماری تعلیم قدیم کا شیرازہ پریشان کر دیا۔ پرانی درس گاہیں مٹ گئیں۔ سلسلۂ تعلیم درہم برہم ہو گیا۔ قدیم اساتذہ کے ساتھ اُن کا طریقۂ تعلیم بھی رخصت ہوا۔ علمی خزانے یعنی کتاب خانے (جن کی ملک میں کچھ انتہا نہ تھی) تباہ و برباد ہو گئے۔ جو سرمایہ بچا وہ یورپ و امریکہ کی قدردانی کی بدولت وہاں کے کتاب خانوں کی زینت بن گیا۔ ان تمام اسباب کا یہ نتیجہ ہوا کہ ارادوں میں سستی، حوصلوں میں پستی پیدا ہو گئی۔ تعلیم کی غرض و غایت بجائے حصول علم و کمال کے چند کتابوں کی عبارت و الفاظ میں منحصر ہو گئی جن میں کثیر حصہ تخیلات کا تھا۔ اس تعلیم کے اثر نے بحث و مباحثے کی نوبت نزاع و خصومت تک پہنچا دی۔ اور ہر طرف جھگڑوں اور مخالفتوں کے معرکے گرم نظر آنے لگے۔ اسی کے ساتھ جدید تعلیم کے اثر نے جدید و قدیم خیال کے دو گروہ علٰحدہ علٰحدہ ہم میں پیدا کر دیے۔ ہندوستان کے قدیم شرفا

کے خاندان جو علوم قدیمہ کے ملجا و ماوا تھے۔ زمانہ کی ضرورتوں سے مجبور ہو کر خانقاہوں اور مدرسوں سے نکل کر اسکولوں اور کالجوں میں جا پہنچے۔ ایک زمانہ میں میں نے عربی مدارس کے طلبہ کی مردم شماری بلحاظ وطن اور مسکن کے کی تھی۔ اُس سے معلوم ہوا کہ خاص ہندوستان کے طلبہ کا وجود اُن مدرسوں میں مفقود تھا صرف آفاقی طلبہ کے دم سے اُن کی رونق باقی تھی۔ میں نے اوپر عرض کی ہے کہ ہندوستان میں علوم عربیہ مختلف ممالک سے آئے تھے۔ قدرتی طور پر اُن ملکوں میں جن علوم کا چرچا تھا وہی ہندوستان کے مختلف حصوں میں رائج ہوئے۔ سندھ میں سلسلۂ علم خراسان اور ماوراءالنہر (ترکستان) سے آیا۔ ان ممالک میں فقہ اور معقولات کو بہت ترقی تھی۔ لہٰذا جب ملتان مرکزِ علم بنا تو وہاں کی درس تدریس میں ان علوم کا عنصر غالب تھا۔ دو سو برس تک یعنی ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری میں نصابِ تعلیم اسی رنگ میں رہا۔ اُس عہد میں علم نحو، بلاغت، فقہ، تصوف اور تفسیر معیارِ فضیلت خیال کئے جاتے تھے۔ حدیث، ادب وغیرہ برائے نام پڑھائے جاتے تھے۔ نویں صدی ہجری میں دارالعلوم ملتان کو زوال ہوا۔ یہاں سے علما ملک کے مختلف حصوں میں گئے۔ ان بزرگوں میں سے مولانا عبداللہ تلنبی نواح دہلی میں آئے اور اُن کے شاگرد مولانا عزیزاللہ سنبھل پہنچے۔ یہ زمانہ سکندر لودی کی سلطنت کا تھا۔ سلطان مذکور نے ان دونوں بزرگوں کی تشریف آوری ایک نعمت غیبی سمجھی اور اُن کے واسطے درس گاہیں دیا کیں۔ اُس کو اُن کے درس سے اس قدر شوق تھا کہ کبھی کبھی مدرسہ میں آتا اور کسی گوشہ میں چھپ کر اُن کا پڑھانا سنتا۔ ان دونوں اہل کمال نے قدیم نصابِ تعلیم میں تغیر کیا۔ مولانا عبداللہ تلنبی، مولانا عبداللہ یزدی شارح تہذیب کے شاگرد تھے اس لئے قدرۃً منطق کا پلہ زیادہ بھاری ہوا۔ نیز علامہ تفتازانی اور میر سید شریف کی تصانیف شامل درس کی گئیں۔ دسویں صدی ہجری کے آخر میں محقق دوانی، صدر شیرازی اور مرزا جان شیرازی کی تصانیف ہندوستان میں پہنچ کر داخل درس ہوئیں۔ اور معقولات کی تعلیم کا دور دورہ پہلے سے بھی زیادہ ہو گیا۔ اس ترقی علمی میں نمایاں حصہ میر فتح اللہ شیرازی کا ہی جو اکبری نورتن میں تھے۔

اسی طبقۂ علما میں علامہ قطب الدین سہالی تھے جو علمائے فرنگی محل کے مورث ہیں۔ اسی زمانہ میں بعض

اہل علم ملک عرب تشریف لے گئے اور وہاں سے علم حدیث حاصل کرکے ہندوستان واپس آئے۔ ان بزرگوں میں شیخ محمد بن طاہر صاحب مجمع البحار، شیخ یعقوب کشمیری اور شیخ عبدالنبی گنگوہی قابل ذکر ہیں۔ چونکہ گجرات میں علم ملک یمن سے بھی آیا تھا اس لئے وہاں علم حدیث کا درس جاری تھا۔ ہندوستان سے کچھ علمار گجرات گئے اور وہاں سے علم حدیث پڑھ کر مراجعت کی۔ غرض اس طرح دسویں صدی ہجری میں علم حدیث کو بھی ایک حد تک رواج ہوا (گر معقولات میں علما اور طلبار کی محویت کی وجہ سے بہت کم ہوا) بالآخر شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی مساعی جمیلہ نے فیض کے دریا بہائے اور ایک مخلوق کو علم حدیث سے بہرہ یاب کیا۔ بلحاظ نظام درس یہ تیسرا طبقۂ علما رتھا۔

بارہویں صدی ہجری میں چوتھے طبقے کا آغاز ہوا۔ استاذ الہند ملا نظام الدین صاحب نے نصاب تعلیم میں جدید تغیر کیا اور وہ نصاب مرتب فرمایا جو آج تک درس نظامی کے نام سے مشہور اور تمام مدارس میں کمی بیشی کے ساتھ رائج ہے۔ اس نصاب تعلیم سے زیادہ تر مقصود یہ تھا کہ اس سے طلبار میں دقت نظر اور قوت مطالعہ پیدا ہو۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ بوجہ احسن یہ مقصد درس نظامیہ سے حاصل ہوا۔ اسی دور میں دہلی میں شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم نے علم حدیث کی ترویج پر کمر ہمت باندھی۔ اور ہمارے ملک کا بچہ بچہ اس سے واقف ہے کہ شاہ صاحب کی کوشش میں خداوند تعالیٰ نے برکت عظیم عطا فرمائی اور اس خاندان کی سعی سے ہندوستان دارالحدیث بن گیا۔ ملا نظام الدین صاحب کے بعد درس نظامی میں کتب منطق کا اضافۂ کثیر کیا گیا اور وہ کتابیں پڑھائی گئیں جو درس نظامیہ کی تدوین کے وقت تصنیف بھی نہ ہوئی تھیں مثلاً حاشیہ غلام یحییٰ، قاضی مبارک، حمداللہ وغیر ذالک۔ اس کے متعلق ایک عجیب واقعہ ہے۔ شارحین سُلّم العلوم کے تلامذہ اپنے استادوں کے شروح پڑھتے پڑھاتے تھے اور ان میں باہم اس پر نزاع رہتا تھا کہ کس کی شرح بہتر ہے۔ مدرسین جب اس سے تنگ آ گئے تو انھوں نے سب شرحیں داخل درس کر دیں۔ اس طرح سُلّم العلوم کے شروح و حواشی گویا تمام درس نظامی پر حاوی ہو گئے (ان تمام معلومات کے لئے میں اپنے محترم حکیم سید عبدالحئی صاحب ناظم[1] ندوۃ العلمار کا ممنون ہوں۔

---

[1] مؤلف تاریخ علمائے ہند ندکورۂ بالا۔ حبیب الرحمٰن

مذکورۂ بالا بیان سے آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ کس طرح صدیوں تک منطق و حکمت کا اضافہ ہمارے عربی مدارس کے نصاب میں ہوتا رہا۔ ان فنون کی خالص کتابیں درکنار تقریباً تمام باقی علوم کی بھی وہی کتابیں داخل درس ہونے کے قابل سمجھی گئیں جو علوم معقول سے مالامال تھیں اور اس طرح اول سے آخر تک منطق کا سکہ مدارس عربیہ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ندوۃ العلماء جس وقت قائم ہوا اُس وقت نظام درس کی یہ حالت تھی کہ طلباء کی عمر کا کثیر حصہ منطق کی تحصیل میں صرف ہوتا تھا (فن منطق کی تحصیل میں بھی اُن سنگ لاخ کتابوں کی تحصیل میں جو گو شامل منطق تھیں مگر اُن میں وہ مسائل تھے جن کو منطق کے مسائل نہیں کہہ سکتے مثلاً وجود، علم وغیرہ کے متعلق مباحث) ادب عربی کی بہت سی معرکۃ الآرا کتابیں داخل درس تھیں اور طلبا اُن کو نہایت جاں فشانی سے پڑھتے تھے تاہم عربی عبارت لکھنے یا بولنے سے عاری رہتے تھے۔ قرآن مجید کی خدمت بہت کم تھی یہ کھلا ہوا راز ہے کہ جو دماغ ذوق معقول میں سرشار تھے وہ منقول کو اس نظر سے دیکھتے تھے کہ اُس سے ذہن میں سطحیت پیدا ہوتی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگلے اساتذہ کی طرز تعلیم اور صحبت کی برکت بہت کچھ نشۂ معقول کے حق میں ترشی کا کام دیتی تھی۔ اسی کے ساتھ ساتھ قریباً ہر درس گاہ عظیم کے ساتھ خانقاہ بھی لگی ہوتی تھی جو اخلاق کی صفائی اور باطن کی پیراستگی میں اکسیر کا حکم رکھتی تھی اور طلباء مدرسوں سے فارغ ہو کر خانقاہوں سے فیض حاصل کرتے تھے۔

انقلاب زمانہ سے یہ سامان اصلاح تو مفقود ہو گئے۔ منطقی کتابوں کا بار گراں طلباء کے دوش پر رہ گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ زمانے کی جدید ضرورتیں اس امر کی متقاضی تھیں کہ طلباء کا کچھ بوجھ ہلکا کیا جائے تاکہ وہ ان ضرورتوں کی جانب توجہ کر سکیں۔ یہ اسباب تھے جنھوں نے ندوۃ العلماء کے مقاصد میں اصلاح نصاب تعلیم کو داخل کیا۔

(ماخوذ از علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۲۵ را پریل ۱۹۱۷ء)

آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس

(جدید آنریری جائنٹ سکرٹری کا اعلان)

آل انڈیا محمدن ایجوکیشنل کانفرنس کی خدمت جناب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب کی کنارہ کشی پر میرے سپرد فرمائی گئی ہے۔ میں نے کبھی اپنے آپ کو اس بارگراں کے تحمل کا اہل نہیں سمجھا۔ اس لئے میرے حاشیۂ خیال میں بھی یہ نہ تھا کہ "قرعہ فال" میرے نام نکلے گا۔ لیکن اب کہ انتخاب ہو چکا تو میں صداقت اور اعتراف بے مائگی کے ساتھ اپنی خدمت پر حاضر ہو گیا ہوں۔ سب سے اول میں نے بارگاہِ ربانی میں عاجزانہ دعا کی کہ مجھ کو امت کی خدمت گزاری کی توفیق اور قوت عطا فرمائی جائے۔ وما توفیقی الا بہ۔ کام جس قدر اہم اور وسیع ہے اُس کے بیان کی حاجت نہیں "عیاں را چہ بیان"۔ اسی کے ساتھ مسئلہ تعلیم اس قدر نازک اور غور طلب ہے کہ اُس کے ہر ایک شعبہ اور پہلو کا حل صرف ماہرانہ نظر اور رائے کا محتاج ہے۔ مجھکو اول قدم پر بے مائگی کا اعتراف ہے۔ اس طرح آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ میں قدم قدم پر کس قدر مشورہ ہمدردی اور امداد کا محتاج ہوں۔ یقین ہے کہ بزرگان ملت ہمدردی اور مشورہ میں کبھی توجہ دریغ نہ فرماویں گے۔ مجھ کو حاضر خدمت ہوئے ابھی چند ہفتے ہوئے ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ آئندہ کی کارروائیوں کا کوئی نظام پیش کرنا یا اپنے ارادے کا اظہار بالکل قبل از وقت ہے لیکن اتنی گزارش کی جسارت کرتا ہوں کہ کوئی فریقانہ اصول یا خیال میرا نصب العین نہیں ہے اور میں صدق دل سے بدوں شائبہ کسی ذاتی غرض کے ادائے خدمت اور کارآمد و مفید مشورے کے قبول کرنے اور اُس پر عمل پیرا ہونے کے لئے تیار ہوں۔ البتہ اہل نظر سے یہ استدعا ضروری ہے کہ اظہار رائے کے وقت کانفرنس کی قوت، مشورہ کے عملی پہلو اور ذمہ داری پر لحاظ فرمایا جائے۔

مایداں منزل عالی نتوانیم رسید ہاں اگر پیش نہد لطف شما گامے چند

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۹؍ ستمبر ۱۹۱۷ء)

شکریہ اور عرضِ حال

جنابِ ایڈیٹر صاحب :- السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ ۔ میرے بڑے لڑکے مولوی محبوب الرحمٰن خاں کی وفات میں جن بزرگوں نے ازراہِ اخوتِ اسلامی تعزیت فرمائی ہے میں آپ کے اخبار کے ذریعہ سے اُن کا شکریہ ادا کرتا ہوں ۔ فرداً فرداً جواب لکھنے سے بمقتضائے ضعفِ بشریت مجبور ہوں ۔ امید ہے کہ یہ عذر قابلِ پذیرائی ہوگا۔

برخوردار موصوف کی پیدائش ۱۳ رمضان المبارک ۱۳۱۳ھ کو ہوئی تھی ۔ تعلیم ابتدائی کلام مجید اور فارسی کی ہوئی ۔ فارسی کی پختگی کے بعد عربی شروع کرائی گئی ۔ عربی صرف و نحو کی استعداد کے بعد انگریزی ۔ عربی میں قطبی تک معقولات پڑھ لی تھی ۔ دینیات میں قدوری و منیۃ المصلّی اور مشکوٰۃ المصابیح ان کے علاوہ تاریخ الخلفاء امام جلال الدین سیوطی کی ۔ انگریزی میں میٹرک کا دو مرتبہ امتحان محمدن کالج علی گڑھ سے دیا تھا ۔ میرا خیال ہے کہ دوبارہ فیل ہونے کے صدمہ نے اُس کی صحت کو صدمہ پہنچایا اور اُس کا اثر پھیپھڑے تک پہنچا ۔ قریباً ایک سال لکھنؤ اور بھوالی اس مرض کا علاج ڈاکٹری پوری پابندی کے ساتھ ہوا ۔ اور ایسا اچھا کہ مرض بالکل جاتا رہا ، صحت کے زمانہ سے زیادہ توانائی اور تنومندی حاصل ہوگئی ۔ میں اس علاج کے سلسلے میں ڈاکٹر ماسٹار اللہ خاں صاحب سول سرجن مراد آباد ، میجر اسپراسن میڈیکل کالج لکھنؤ اور کرنیل کاکرین سول سرجن بھوالی کی توجہ اور کوشش کا تہِ دل سے ممنون ہوں ۔ ان صاحبوں نے جس توجہ اور ہمدردی سے مشورہ دیا اور معالجہ کیا وہ فی الواقع شفقت کا ایک نمونہ تھا ۔ میرے پاس الفاظ نہیں جو اُن کے شکریہ کے واسطے کافی ہوں ۔ لیکن افسوس ہے کہ موت کے سامنے ساری کوششیں بے کار رہیں ۔ وفات سے ٹھیک ۱۳ دن پہلے پیٹ میں شدید درد ہوا اور عرصہ تک رہا ۔ جب درد فرو ہوا تو بخار ہوگیا ۔ مزید تشخیص سے معلوم ہوا کہ پیٹ میں پھوڑا ہوگیا ہے اور شگاف کی ضرورت ہے ۔ ۸ ذی الحجہ بروز چہارشنبہ کو دوپہر کے وقت تین سول سرجنوں نے مل کر عمل جراحی کیا ۔ بڑا پھوڑا نکلا

جس میں مواد بہت تھا۔ اس صدمہ سے جاں بری نہ ہو سکی، اور بروز پنج شنبہ ۹ ذی حجہ ۱۳۴۵ھ کو عصر کے وقت بمقام نینی تال رحلت کی۔ خداوند تعالیٰ کے فضل سے آخر وقت کے گھنٹے ایسے تھے جن سے اہل ایمان کو تسکین بلکہ مسرت ہو سکتی ہے۔ پنج شنبہ کے دوپہر سے پہلے سانس پر اثر تھا اور ضعف زیادہ تھا۔ دوپہر کو مجھ سے کہا کہ قرآن شریف سنو۔ میں سمجھا کہ سناؤ کہا۔ چنانچہ میں نے سورۂ ملک شروع کی۔ روک کر کہا کہ میں پڑھتا ہوں، آپ سنیں۔ میں نے کہا۔ بہتر۔ چنانچہ خود سورۂ ملک شروع کی۔ چند آیتیں پڑھی تھیں کہ ضعف کا اثر زیادہ ہونے لگا۔ میں نے بشریت کے غلبہ سے کہا کہ پوری سورت کے پڑھنے سے ضعف زیادہ ہو گا، آیۃ الکرسی پڑھ لو۔ چنانچہ آیت الکرسی پڑھی۔ آیت الکرسی کے بعد سورۂ ملک اس مقام سے پھر شروع کی جہاں سے چھوڑی تھی۔ جب آیہ "ما کنا فی اصحٰب السعیر" پڑھی تو مجھ کو تشابہ ہوا اور میں نے کہا کہ "من اصحاب السعیر" ہے۔ ایک دفعہ پھر پڑھ کر سوچا اور کہا کہ نہیں۔ "فی اصحاب السعیر" ہے۔ میں نے اصرار کیا۔ کہا۔ قرآن شریف منگوائیے۔ قرآن شریف بھوالی رہ گیا تھا۔ برخوردار موصوف کے ماموں مولوی خلیل الرحمٰن خاں صاحب سے پوچھا۔ انھوں نے کہا۔ "فی اصحاب السعیر" ہے۔ غرض دو مرتبہ سورۂ ملک کا دور کیا۔ پھر سورۂ نون شروع کی۔ مجھکو یہ سورت حفظ نہیں ہے۔ اس لئے میں نے سننے سے معذوری ظاہر کی۔ پھر کہا قرآن شریف منگواؤ۔ چنانچہ حافظ کلاً کے پاس سے قرآن شریف منگوایا گیا۔ اور قرآن شریف کے آنے پر نصف سورۂ نون سنائی۔ سنانے میں پوری ترتیل اور ادائے مخارج کا لحاظ تھا۔ دوسرے جلسہ میں سورۂ بقر کا اخیر رکوع پڑھا۔ آیہ "ربنا ولا تحملنا مالا طاقتہ لنا بہ" تین مرتبہ پڑھی۔ لہجہ میں صاف مناجات کا رنگ تھا، اسی طرح دعا لیا، "واعف عنا واغفر لنا وارحمنا" علاوہ تلاوت کے خاموشی میں اللہ کا نام تھا۔ میں نے متعدد بار پوچھا کہ اللہ کا نام لیتے ہو۔ جواب میں الحمد للہ ہر مرتبہ اشارہ سے کہا ہاں۔ سوا تین بجے کے قریب میں پڑھا ہوا پانی لے گیا۔ اور پوچھا کہ پڑھا ہوا پانی پیو گے؟ پڑھے ہوئے پانی کا لفظ سن کر مرحوم پر ایک کیفیت شوق طاری ہوئی اور مسکرا کر پوچھا کہ پڑھا ہوا پانی کہاں سے آیا؟ میں نے کہا تمہارے خالو جی نے پڑھ دیا ہے۔ چنانچہ پیا اور پی کر کچھ کہا جو میں نہ سمجھا۔ دریافت کیا تو آواز سے کہا۔ الحمد للہ الذی اطعمنی

وسقانی وارہ انی وجعلنی من المسلمین"۔ یہ اخیر الفاظ تھے۔ اس کے بعد نیم خوابی کی سی حالت پیدا ہوگئی۔ چار بجے کے بعد میں نے یٰسین شریف پڑہی۔ تیسری مرتبہ جب میں نے ختم کی اور کہا۔ "سبحان الذی بیدہ ملکوت کل شیٔ والیہ ترجعون"۔ جس وقت "ترجعون" کا لفظ میری زبان سے نکلا۔ میرے نور نظر محبوب الرحمٰن کی روح اپنے رب کی جانب مراجعت کر گئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ مرحوم نے جس اطمینان سے قرآن پاک پڑھ کر جان دی اس کے لحاظ سے میری عاجزانہ تمنا ہی کہ اس نے "یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ" کی صدا سنی ہو۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔ اخیر وقت میں جب طبیعت کا حال پوچھا۔ جواب میں کہا۔ اچھی ہی۔ دوپہر سے قبل خشکی پیاس کی شکایت تھی۔ دوپہر کے بعد میں نے کئی بار دریافت کیا تو کہا کہ اب خشکی پیاس بالکل نہیں ہی۔ مرحوم صوم صلوٰت اور جماعت کا بچپن سے پابند تھا۔ صبح کی تلاوت کلام مجید مرض میں بھی جاری رہی۔ نہایت حلیم، مستقل مزاج، با ادب، اور ملنسار تھا۔ آج اُس کے معالج ڈاکٹر، استاد، ہمجولی طلباء، ان اوصاف کو تعزیت ناموں میں لکھتے ہیں اور افسوس کرتے ہیں، عزیزوں کا کیا ذکر۔ اخیر وقت تک (سوائے آخری ایک گھنٹے کے) ہوش وحواس بالکل درست رہے۔ استقلال واطمینان کا جو عالم تھا اُس کو دیکھنے والے جانتے ہیں۔ نبض چہارشنبہ سے خراب تھی پنجشنبہ کو تو قریباً ساقط تھی۔ دوپہر کو میں نے نبض دیکھی تو سارے ہاتھ میں کہیں پتہ نہ تھا۔ سارے عزیز اور ڈاکٹر پریشان تھے۔ تاہم مرحوم کے پاس جو گیا یا بات کی اُس کا اطمینان اور استقلال دیکھ کر اپنی پریشانی پر دل میں ایک گونہ ندامت محسوس کی۔ میں اس صدمۂ عظیم میں جب اُس کے اطمینان و استقلال کا تصور کرتا ہوں خداوند تعالیٰ کی جانب سے ثبات وصبر کی توفیق ہوتی ہی، والحمد للہ علی ذالک۔ میں نینی تال کے اُن جملہ مسلمان بھائیوں کی ہمدردی و مدد کا دل سے ممنون ہوں اور شکر گزار جنھوں نے اس واقعہ کے وقت عید کا تیوہار چھوڑ کر ہمدردی فرمائی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ اُس اثر کا نتیجہ تھا جو اب بھی مسلمانوں میں تعلیم اسلام کا باقی ہی۔ اس لئے میرے کسی شکریہ کی ضرورت اُن بزرگوں کو نہیں ہے۔ تاہم چونکہ اس وقت مجھکو بے انتہا مدد ملی اس لئے شکریہ مقتضائے ایمان ہی ناظرین کرام سے میری

عاجزانہ التجا ہے کہ برخوردار مرحوم کی مغفرت کی دعا فرمائیں۔
(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۰ ر اکتوبر ۱۹۱۱ء)

بجلی

کل سہ پہر کو دو بجے کے بعد میں تلاوت میں مصروف تھا، مینھ زور سے برس رہا تھا، یکایک آنکھوں کے سامنے ایک تیز مگر صاف روشنی چمک گئی گویا دو چار مہتاب روشن ہو گئے اور نہایت زور سے بادل گرجا۔ اس گرج میں دو طرز کی آواز تھی ایک دونک اور دوسری چیخ۔ میری زبان سے بے اختیار "یسبح الرعد بحمدہ" نکلا اور کلام پاک ہاتھ میں لیکر کھڑا ہو گیا اور چند قدم ایک طرف کو چلا گیا۔ یہ تمام حرکتیں بے اختیاری تھیں اب مجھ کو تنبہ ہوا اور دل پر قابو کر کے سنبھل گیا۔ وہشتناک آواز ختم ہو چکی تھی لیکن گرج اور زمین میں ایک گونہ جنبش سی محسوس ہوتی تھی۔ بادل کے دونکنے اور زمین کے دہلنے اور مخلوق کے فوری اضطراب سے دک الارض کا مسئلہ (جس کا وعید کلام اللہ میں ہے) دل غافل کی سمجھ میں کچھ آگیا۔ اپنی حالت درست کر کے فوراً آ بیٹھا اور قرآن شریف پھر شروع کر دیا۔ تلاوت سے فارغ ہو کر سنا کہ پاس ہی بیچ کے ہال کے منارہ پر بجلی گری ہے اور منارہ پاش پاش ہو گیا۔ میری جائے نشست اور بجلی گرنے کی جگہ سے قریب پندرہ قدم کے فاصلہ تھا۔ جتنے آدمی مکان کے اندر تھے یہ حس کسی کو نہیں ہوا کہ یہ آسمانی زد ان کے سر دل پر پڑی ہے۔ باہر سے ایک لڑکے نے دیکھا کہ منارہ گرا اور وہ چلایا کہ خان صاحب کی انگیٹھی گر پڑی۔ میں نے باہر نکل کر پھٹا ہوا منارہ دیکھا اور ہال کے اندر گیا۔ ہال میں جلی ہوئی گندھک کی بو بہت تیز بسی ہی تھی اور میرے جانے سے پہلے کچھ دھوئیں کی کیفیت بھی تھی۔ میرے والد اسی ہال کے دوسرے کنارہ پر آتش خانہ کے مقابل جیب گھڑی ملاحظہ فرما رہے تھے۔ منارہ کا بالائی حصہ ریزہ ریزہ ہو کر چھت پر آ رہا۔ چھت اور چھت کا پانی خوب گرم تھا۔ اطمینان ہو جانے کے بعد میں نے موقع صدمہ کو بغور مشاہدہ کیا۔ منارہ کے نیچے دیوار کا چونا تین چار جگہ ایسا گر گیا تھا جیسا توپ کے گولے سے گر جاتے ہیں۔ چند نکل آئی تھیں ان پر جلی ہوئی بارود کی چھینٹ لگی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے سونگھا تو جلی ہوئی گندک کی بو تھی۔ چھت پر کوئی صدمہ نہ تھا۔ دیوار کے بیرونی جانب صرف یہی آثار تھے۔ اندرونی طرف پانچ چھ ہاتھ نیچے کو ایک ایسا نشان تھا جیسے کسی گولی سے چھید کیا ہو۔ اس کے چند انگشت بعد ہماوری کو توڑ دیا ہے اس کی حرکت ایک پہلو کی طرف مائل ہو گئی۔ دیوار میں ایک نقشہ آویزاں تھا اس کی پشت پر دیوار میں لمبا سا گولی کے چھیدے کا سا اثر تھا مگر نقشہ کو کچھ نقصان نہیں پہنچا۔ اس سے تھوڑی دور پر ایک اور نشان تھا۔ اس نشان کے بعد دروازہ کے پہلو میں ایک گڑھا تھا۔ یہ دروازہ بند تھا۔ کواڑ کا ایک ٹکڑا علیحدہ ہو گیا۔ نشان جتنے ہیں سب کا ایک حصہ تو گہرا ہے اور کچھ حصہ

ایسا ہی گویا کوئی چیز رگڑ لی گئی ہو۔ دروازہ کے سامنے گچ میں تین چار انگل کا گہرا گڈھا تھا اس گڈھے کے بعد کوئی اثر محسوس نہ تھا سامنے کے دروازے سب کھلے ہوئے تھے لیکن جس دروازہ کے کواڑ کو توڑا ہی وہ بند تھا اسی دروازہ کے نیچے ایک نیچہ اور اخبار پڑا تھا نیچہ کی نے پچک گئی اور اس کا کپڑا اور اخبار ایسے پارہ پارہ ہوگئے جیسے چوہوں نے کتر لیا ہو۔ میرے والد کے دماغ پر گرمی کا سا اثر ہوا اور پاؤں کے اعصاب درد کرنے لگے بعض آدمیوں کی آنکھوں میں سے چمک کے اثر سے پانی نکلنے لگا جس لڑکے نے منارہ گرتے دیکھا اُس کا بیان ہی کہ اُس میں سے دھواں بھی نکل رہا تھا۔ خدا کا شکر ہی کسی جان کا نقصان نہیں ہوا۔

حبیب گنج ۲۰ ذی قعدہ سنہ ۱۳۰۷ھ پنجشنبہ مطابق ۱۷ جولائی سنہ ۱۸۹۰ء ساون سنہ ۱۹۴۷ بکرمی } بجلی گرنے کے تھوڑی دیر بعد گھڑا ہوا یا دل پھٹ کر منتشر ہوگیا بجلی نے کمرے سے نکل کر جنوبی جانب قلعے میں جو پانی بھرا تھا اُس میں ایک ٹیپہ لیا اور پھر آسمان کو چلی گئی۔

(غیر شائع شدہ)

تغلق نامہ

(بہ خدمت جناب اڈیٹر صاحب)

جناب والا! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، تغلق نامہ کی نسبت (فقرہ ۳ و ۴) اہل نظر نے کامل غور و فکر کے بعد جو رائے قائم کی ہی اُس کی صحت میں خلاصۃ التواریخ کے بیان سے کسی قسم کا شبہ پیدا نہیں ہوتا اور نہ میرے نزدیک کوئی خدشہ پیدا ہوتا ہی بلکہ ایک جدید اور مفید اطلاع ملتی ہی۔ یعنی یہ کہ حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ نے غازی الملک اور خسرو خاں کی لڑائی کے واقعات کو پنجابی زبان میں بھی نظم فرمایا ہی۔ چونکہ مؤلف خلاصۃ التواریخ سبحان رائے پنجابی ہی اور بٹالہ کا رہنے والا ہی اور یہ کتاب اُس نے سنہ عالمگیری میں تالیف کی ہی اس لئے میرے نزدیک اُس کا بیان بالکل معتبر ہونا چاہیے اور یہ کہ کم از کم اواخر عہد اورنگ زیبی میں لوگ اس واقعہ سے واقف تھے کہ حضرت امیر کی ایک نظم پنجابی زبان میں بھی اس موضوع پر ہی۔ سبحان رائے کے الفاظ کو اگر غور سے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہی کہ اُس نے اس نظم کو دیکھا ہی ورنہ ذیل کے الفاظ ہرگز اُس کے قلم سے نہ نکلتے:

"چنانچہ امیر خسرو بزبان پنجاب بہ عبارت مرغوب مقدمہ جنگ غازی الملک تغلق شاہ و ناصر الدین خسرو خاں گفتہ کہ آں را بزبان ہندوار گویند۔"

چونکہ یہ اطلاع ایک معتبر اور مستند ذریعہ سے حاصل ہوئی ہے اور نیز اورنگ زیب کے عہد کو کچھ زیادہ زمانہ نہیں گزرا، اس لئے اگر اضلاع پنجاب میں اس کی کافی تلاش اور جستجو کی جائے تو اُس کا دستیاب ہونا کچھ بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ اس لئے میری رائے میں بہت ضروری ہے کہ اس امر میں حتی الوسع کوشش کی جائے۔

(اول) یہ کہ اس کتاب کو بھی کتب زیر تلاش کی فہرست میں شامل کیا جائے۔

(دوم) یہ کہ پنجاب کے ادبا اور اہل ذوق کو خلاصۃ التواریخ کے اس فقرہ کی نقل بھیجی جائے اور اُن سے درخواست کی جائے کہ وہ اس نظم کی تلاش میں کوشش کریں اور اس معاملہ میں اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔ جس طرح ہمارے اضلاع میں (آلہ، اودھل) عام طور پر گایا جاتا ہے، اسی طرح پنجاب میں (ہیر، رانجھا، سسی، پنوں، سرمتی سوال) اور بہت قصے ہیں جو گائے جاتے ہیں اور صدیوں سے زبان زد چلے آتے ہیں۔ ممکن ہے کہ قصہ زیر بحث اب تک وہاں لوگوں کی زبان پر ہو۔ اس میں اگر کامیابی ہوئی تو یہ ایک عجیب و غریب کامیابی ہوگی۔

(فقرہ ۶ و ۷) سلطان علاء الدین کے بیٹوں اور اُن کے ناموں کی نسبت کتب تواریخ میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ فرشتہ نے صرف تین نام لکھے ہیں، فرید خاں، عمر خاں و علی خاں۔ مگر سجان رائے نے صرف دو ہی ناموں پر اکتفا کی ہے، فرید خاں اور منگو خاں۔

سجان رائے کا یہ بیان ضیاء برنی سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ فیروز شاہی اس وقت میرے پاس موجود نہیں ہے۔ مگر جہاں تک مجھے یاد ہے منگو خاں کا نام سوائے فیروز شاہی کے اور کسی کتاب میں میری نظر سے نہیں گزرا۔ حضرت امیر خسرو نے پانچ کی تعداد لکھی ہے ؎

زبعد آں سر پیارے مرحوم
برادر پنج دیگر مانند مظلوم

اور ان ناموں کے ساتھ ان کی عمر اور مقدار تعلیم و تربیت بھی کافی تفصیل کے ساتھ لکھی ہے۔ اس لئے حضرت امیر کا بیان نہایت مستند اور قابل یقین ہے اور یہی تعداد سلطان فیروز شاہ تغلق کے بیان سے

بھی ثابت ہوتی ہے۔اب رہا ناموں کا اختلاف تو یہ میرے نزدیک کچھ زیادہ قابل لحاظ نہیں۔اس لئے
کہ ہندوستان میں عام رواج ہے کہ بچوں کے کئی کئی نام ہوتے ہیں اس لئے ناموں میں اختلاف ہوجانا
بعید از قیاس معلوم نہیں ہوتا ناموں کے اس اختلاف سے اس امر پر استدلال کرنا کہ سلطان
علاء الدین کے بیٹوں کی تعداد پانچ سے زیادہ تھی، میری رائے میں صحیح نہیں ہے۔

ظفر حسن صاحب کا یہ قیاس بھی میرے نزدیک صحیح نہیں ہے کہ شہاب الدین خاں کے نام کو حضرت
امیر نے ضرورت شعری کی وجہ سے بہا خاں کرلیا ہوگا۔اس لئے کہ اس قسم کی تخفیف ضرورت شعری
کی وجہ سے امیر صاحب تو کیا کوئی ادنےٰ درجہ کا شاعر بھی گوارا نہیں کرسکتا۔اور دوسری بات یہ ہے
کہ شہاب الدین خاں بہت پیشتر خضر خاں اور شادی خاں کے ساتھ قلعہ گوالیار میں قتل ہوچکا تھا۔
حضرت امیر عشقیہ میں فرماتے ہیں :۔

شہابے کز سریش بود گردے
چشیدا و نیز ازاں جو آب خوردے

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۳ر نومبر ۱۹۱۸ء)

مسلم یونیورسٹی

(فوری تکمیل کے لئے پرجوش اپیل)

رزولیوشن نمبر۱ متعلق قیام مسلم یونیورسٹی آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے بتیسویں سالانہ
اجلاس منعقدہ سورت میں بماہ دسمبر گذشتہ تمام ارکان اور حاضرین اجلاس کی متفقہ رائے سے
پاس ہوا ہے جس کی نقل اس مختصر گزارش کے ساتھ آپ کی توجہ کی غرض سے ارسال خدمت کرتا ہوں
کہ تاخیر قیام مسلم یونیورسٹی کی وجہ سے جو عالم گیر مایوسی قوم میں پھیلی ہوئی ہے، اس حوصلہ شکن حقیقت پر
آپ جلد سے جلد توجہ فرمائیں اور ذیل کے واقعات و حالات پر غور کرکے شکرگزاری کا موقع دیں۔

سنہ ۱۹۱۰ء میں جب ناگپور میں یہ تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی تو ہز ہائی نیس سر آغا خاں بالقابہ انگلستان
سے تشریف لاکر اس قومی مجلس میں شریک ہوئے اور مسلم یونیورسٹی کے خیالِ کہن کو پیام اُمید کی شکل میں
قوم کے سامنے پیش کیا۔ سنہ ۱۹۱۱ء اور سنہ ۱۹۱۲ء یہ دونوں سال حسنِ عمل اور جوشِ قومی کے لحاظ سے نواب
وقار الملک بہادر مرحوم کے عہد کے ہمیشہ تاریخی سال شمار ہوں گے۔ یونیورسٹی کے وجود میں لائے جانے
کی کوشش میں قوم کے ہر برنا و پیر نے حصہ لیا۔ امراء قوم نے فیاضی کے ساتھ ہز ہائی نیس ممدوح
کی اپیل کا خیر مقدم کیا۔ لاکھوں روپیہ سے مدد دی۔ غریب اور اوسط درجہ کے طبقہ نے بھی اپنی اپنی
ہمتوں سے کام لیا اور جس سے جس قدر مالی امداد بن پڑی اُس نے مدد کی۔ نہ صرف شہروں بلکہ قصبوں
اور قریوں میں مسلم یونیورسٹی کی صدا لگاتے ہوئے وہ لوگ نظر آئے جن کا اپنی آرام گاہوں سے
قدم باہر نکالنا دشوار معلوم ہوتا تھا۔

دنیا دار جماعت سے گزر کر علماء اور صوفیا کے مقدس گروہ تک نے اس تجویز کو قوم کے حق میں آیۂ رحمت
سمجھ کر خود اس علمی کوشش میں شریک ہو کر یونیورسٹی کی ضروریات پر مُہر کی جس کا نتیجہ ڈیڑھ سال کی کوشش
میں یہ نکلا کہ جو مجوزہ رقم قیام مسلم یونیورسٹی کے واسطے قوم سے طلب کی گئی تھی وہ ستائیس اٹھائیس لاکھ
نقد کی شکل میں فراہم ہو گئی۔

غرض اس آہنگِ عمل نے قوائے عمل کے بیدار کرنے میں اس سرعت اور تیزی کے ساتھ حصہ لیا
کہ مسلمانوں کو خوابِ غفلت و جہالت سے چونکتا ہوا دیکھ کر ملک کی دوسری زندہ اقوام نے بھی اُن کے
طرزِ عمل کو حیرت کے ساتھ دیکھا اور اُن کے احساسِ ملی پر غور کے ساتھ توجہ کی۔

لیکن کوشش اور عمل کا یہ ایک بادل تھا کہ گرجا اور برسا اور پھر ایسا کھلا جس کے دوبارہ امنڈنے
کی شکل سے امید ہوتی ہے۔ یا جد و جہد کا ایک طوفان تھا جو آناً فاناً آیا اور نکل گیا، یا قوتِ عمل اور قوتِ اتحاد کی
کا ایک سیلاب تھا کہ دفعتہً اٹھا اور اپنے ساتھ دوسری خصوصیات کو بھی بہا لے گیا۔ اور جس کے پھر
اُٹھنے کا خیال بھی نہیں آتا۔

یونیورسٹی کے متعلق جو جو حوادث و افکار سامنے سے گزرے اُن کا نتیجہ محمدن یونیورسٹی کی شکل میں

ظاہر ہوتا تو مسلمانوں کی زشتیِ اعمال کی وجہ سے کار اہم تھا ہی اُن کی وجہ سے دوسری قومی تحریکوں
کو جیسا دھکا لگا وہ اس امر سے ظاہر ہے کہ مسلمانانِ ہندوستان کے ہر حصہ میں مایوسی اور ناامیدی
کے خیالات جاگزیں ہوگئے ہیں، اُن کی حرکت بند ہوگئی ہے اور جن سوتوں سے کشتِ امید کی آبیاری کی
توقع کی جا سکتی تھی اُن کے منہ تک بند ہوگئے ہیں۔ خود مدرسۃ العلوم علی گڑھ جس کی ترقی کی کوشش میں
آدھی صدی گزر چکی ہے اور جس کو یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچانے کا خیال پچاس برس سے اُس کے بانیوں
اور اُس کے کارفرماؤں کے دل و دماغ میں گردش کرتا رہا ہے اور جس کے وجود میں لانے کے لئے
یہ جد و جہد اور تگ و دو جاری تھی) یہ خیال اب ایک مایوسی کی شکل میں آشکارا ہو کر خود کالج کو اُس کے
درجہ سے گرانے کی شکل میں تبدیل ہوگیا۔ اور جس کی یہ حالت اب مخفی نہیں رہی کہ وہ علی گڑھ جس کی شہرت
اور تعلیم کی خوبی نے چار چاند لگا کر قوم کی قوت کو ایک مرکز بنا کر اُس کے گرد جمع کر لیا تھا، اب اس کا شیرازہ
تتر بتر ہونے کے قریب آ لگا ہے اور اس کالج کو جس کی اعلیٰ تعلیم و تربیت پر نہ صرف قوم کو اعتماد کلی حاصل
ہو چکا تھا، بلکہ حاکمانِ وقت کی رائیں اس کے اوصاف تعلیم و تربیت کی خوبی کو برملا ظاہر کرتیں اور اس
کی مدد کرنے میں بیش از بیش نظر آتی تھیں) اب خود قوم کی توجہ کا یہ حال ہے کہ سینکڑوں طلبار کالج سے جدا
ہوگئے۔ جس درسگاہ کے بورڈنگ ہاؤسوں میں قلتِ تعداد کی ہمیشہ شکایت رہتی تھی، جس میں طلبار کی
گنجائش نکالنے کے واسطے منتظمانِ کالج کی کوشش ہر وقت سرگرم نظر آتی تھی، وہاں بیسیوں اور سینکڑوں
طلبہ کی سکونت کے مکان خالی پڑے ہوئے جانے والوں کو یاد کر رہے ہیں۔ اور اس بے اعتمادی
اور اس کی خرابیِ تعلیم کی شکایتیں ہر جگہ سنی جاتی ہیں۔ کیا یہ حالت اب اس حد تک نہیں پہنچ گئی کہ ہم اس
پر غور کر کے اصلی مرض کے دفعیہ کی کوشش کریں؟ حالت یہ ہے کہ بہت ہی بے سر و پا باتوں اور بے بنیاد
واقعات کی اصلاح کرنا اور صحیح خیالات کا ظاہر کرنا بھی ایک ایسا امر اہم ہوگیا ہے جس کے سننے کے لئے
لوگ تیار نہیں ہیں۔ جو خیالات تعلیم کی طرف سے بے توجہی کے پھیلے ہوئے ہیں، جس طرح رفتہ رفتہ اس
چھ سات سال کے دوران میں فیاض اور ہمدرد اصحاب نے تعلیمی امداد سے دست کشی اختیار کر رکھی
ہے اور جس طرح تمام قوم میں ایک پرمعنی خاموشی طاری ہے، بے اعتمادی اور بدگمانی کا جس بلند آہنگی کے

ساتھ اعلان ہوا ہے، میری ناچیز رائے میں اس سردمہری کے دوسرے اسباب فرع ہیں ان اصلی واقعات کے جو اس زمانہ میں پیش آئے ہیں۔ اصلی سبب اور حقیقی بنیاد کا سراغ لگانے میں اگر توجہ کی جائے گی تو مسلم یونیورسٹی کے امکان کا ظہور میں نہ آنا قوم میں پژمردگی اور تعلیمی جوش کی مانع ترقی کا سبب دیگر اسباب سے قوی تر ثابت ہوگا جس کے حاصل ہو جانے کی بہت سی ذمہ دار تقریروں میں گنجائش نکال کر یونیورسٹی کے امکان کو یقین کے درجہ تک حاصل کرنے کی قوم سے ضمانت کر لی گئی تھی۔

مسلم یونیورسٹی کا چارٹر حاصل کرنے کا جوش اور سرخوشی کا زمانہ جو ایک حرکتِ مذبوحی سے زیادہ ثابت نہ ہوا، گزر گیا تو دوسری طرف پڑوسیوں میں کام کا حقیقی جذبہ پیدا ہوا۔ ان پر بھی موافق اور ناموافق دونوں حالتیں گزریں، لیکن انجام بینی اور مصلحت اندیشی چونکہ ان کے ضمیر فطرت میں داخل ہو چکی ہے، انھوں نے اپنی منزلِ مقصود کا راستہ تلاش کر لیا۔ جس منزل کی اُن کو تلاش تھی وہ وہاں پہنچ گئے اور پہنچ کر آباد بھی ہو گئے۔ اُن کی ترقیٔ نسل کی بیل بھی پھلنی اور پھولنی شروع ہو گئی ہندو یونیورسٹی قائم ہو گئی اس کے کانووکیشن کا جلسہ بھی گزشتہ مہینے میں ہو چکا (جس کی مبارکباد ہم برادرانِ وطن کی خدمت میں پیش کرتے ہیں) اور ہم ابھی تک ہست و نیست کی مباحث سے فارغ نہ ہوئے ؎

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا

ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

مسلم یونیورسٹی ملتی یا نہ ملتی، یہیں تک خیر تھی۔ ہم نے اس چیز کو بھی متزلزل کر دیا جس کی ترقی میں پچاس برس صرف کئے گئے تھے۔ یہ وہ مظاہرۂ حقیقت ہے جس پر توجہ کرنے سے ہمارے ضعف اور غفلت کا اصلی راز کھلتا ہے۔ اب تھکے ماندوں کے لئے بسترِ راحت و عالمِ سکون کا درجہ باقی تھا جس میں ہم پورے اطمینان و راحت کے ساتھ مبتلا نظر آتے ہیں۔ مولانا "حالی" کا یہ قول جیسا ہماری حالت پر منطبق ہے شاید ہی دنیا کے کسی خطہ کی قوم کے مناسب حال ہو ؎

ایسے کچھ بیٹھے ہیں فارغ یار سب کچھ دے کر
جو مہم درپیش تھی وہ کر چکے گویا کہ سر

قوم میں تعلیم پھیلائی تھی سو پھیلا چکے
ہو گیا وہ بیج جو بویا تھا نخلِ بارور

احرام سفر باندھ کر اُٹھے تھے جس منزل سے پر جو سچ پوچھو تو ہم اب تک اُسی منزل میں ہیں

مخدومانِ من! قوم میں تعلیمی تحریک کو مسلم یونیورسٹی کے معرضِ ظہور میں نہ آنے سے جو صدمہ پہنچا اور پہنچ رہا ہے اور اس سبب سے جو مایوسی کے خیالات عالم گیر طور پر پھیل رہے ہیں اور جن کا اظہار قومی مجلسوں میں، آپس کی ملاقاتوں میں، گھروں میں بیٹھ کر کیا جاتا ہے، میں نے اس حالت کی طرف اس لئے جناب کی توجہ چاہی ہے کہ جو وقت گزرنا تھا گزر گیا، اور جو حالت پیدا ہونی تھی وہ ہو گئی۔ میری رائے ناقص میں اس غفلت اور سکون کا علاج اب بھی اگر ہو سکتا ہے تو مسلم یونیورسٹی کے حصول چارٹر سے ہی ہو سکتا ہے۔ یہی چیز ایسی ہو گی جو بیداری کی پھر حرکت پیدا کرے گی۔

لہٰذا آپ کی قومی ہمدردی اور جوش سے اپیل کر کے رزولیوشن پاس کردہ اجلاس کانفرنس کے آخری جلسے پر اس ناچیز گزارش کو ختم کرتا ہوں کہ اس مقصد کے حصول کے واسطے جلد تر قانونی کارروائی کی تکمیل میں کوشش فرمایئے۔ اس کے لئے یہ مناسب ہو گا کہ باہمی مشورہ سے فاؤنڈیشن کمیٹی کا جلسہ طلب کر کے اُس میں یہ مسئلہ پیش کیا جائے۔ اصل رزولیوشن کی عبارت بغرض ملاحظہ و توجہ درج ذیل کی جاتی ہے:

(رزولیوشن نمبر ۱ محولہ بالا): "بلحاظ اس تاخیر کے جو مسلم یونیورسٹی کے قائم ہونے میں واقع ہوئی ہے اس کانفرنس کا یہ مضبوط خیال ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے جلد تر قانونی کارروائی کی تکمیل میں کوشش کی جاوے۔"

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۵ رمارچ ۱۹۱۹ء)

علمی خزانوں کی تباہی

(قدیم قلمی کتابوں اور فرامین کی حفاظت کے لئے اپیل)

ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کے زوال اور بربادی کے ساتھ ساتھ جہاں مسلمانوں کی دولت اور ثروت کا خاتمہ ہونا شروع ہوا، اُن کی جاگیریں اور زمینداری کے علاقے برباد ہوئے، اُن کی اخلاقی اور دماغی قوتیں فنا ہونی شروع ہوئیں، اسی کے ساتھ ساتھ ان کا علم و فضل اور تحصیل علوم کا سرمایہ یعنی بیش بہا کتاب خانے (جو جواہرات سے بھی زیادہ قیمتی تھے) تباہ ہونے شروع ہوئے۔

جو اسلاف مسند علم کی زینت دینے والے تھے اُن کے اخلاف اور قائم مقام ایسے ہوئے جنھوں نے ان انمول موتیوں کی سنگریزوں کے برابر بھی قدر نہ کی۔ غدر ۱۸۵۷ء کے واقعہ کو ابھی پون صدی بھی نہیں گزری، اہل بصیرت کو اس کا علم ہے۔ اُس زمانہ میں شہر تو شہر صدہا قصبے بھی ایسے تھے جہاں یہ علمی سرمایہ بہت کچھ موجود تھا۔ دہلی، لکھنؤ، لاہور، پٹنہ، آگرہ، سورت، احمد آباد، بنارس، بلگرام، کاکوری، پانی پت، مارہرہ، امروہہ اور مثل ان کے اور بہت سے مقامات تو گویا اس بازار علم و عمل کے وساور تھے، جس میں متاعِ حدیث، فقہ، تفسیر، منطق، معانی، تاریخ، طب، حکمت، فلسفہ اور عربی فارسی ادب کی کتابیں، نامی شعراء کے دواوین، قلمی بے بہا نسخوں، مشہور خطاط استادوں کے قطعات اور قلمی مرقعوں کی شکل میں انبار کے انبار نظر آتے تھے۔ اُن کے مکانات کی الماریاں اور بڑے بڑے صندوق ان جواہرات سے معمور تھے۔

کتاب خانے ایک طرف، رہنے کے مکانوں کا یہ عالم تھا کہ جہاں آج مکانات کی زینت اور آرائش میں یورپ کی نت نئی اشیاء نے جگہ حاصل کی ہے، وہاں اب سے پچاس ساٹھ برس پہلے تک مسلمانوں کے دیوان خانوں اور گھروں کے معمولی سے والانوں کی آرائش میں جو چیزیں دیگر اشیاء نمائشی میں نمایاں نظر آتی تھیں، وہ ان خوشنویس اور صاحبِ کمال خطاطوں کی وصلیاں اور طغرے

ہوتے تھے جن میں نہایت پُرمعنی اور پُرکیف بیتیں، پُرنصیحت قطعے، پُراخلاق جملے، دل آویز فقرے، حدیث شریف اور کلام پاک کی آیات مبارکہ کے پُرتاثیر جملے اس خوبی اور کمال تحریر کے ساتھ چوکھٹوں میں لکھ کر آویزاں کیے جاتے تھے، جن کے در و دیوار سوتے جاگتے اخلاق آموزی حکمت پژوہی اور خوبی مذاق کی طرف زبانِ حال سے تعلیم دینے میں مصروف رہتے تھے۔ اس دستور کی وجہ سے صدہا اقوال مسلمانوں کے علمی لٹریچر کی جان بن کر جاہلوں تک کی زندگی کے دستورالعمل بن گئے۔

جن علمی جواہرات کو ہماری جہالت نے خزف ریزوں کی طرح پامال کرنا شروع کیا، یورپ نے اپنے دامنِ امید میں اُن موتیوں کو رول کر بھرنا شروع کر دیا۔ آج بڑے سے بڑے مسلمان عالم کی نادر اور نایاب کتابوں کا مسلمانوں کے علوم و فنون سے دلچسپیوں کا، بڑے بڑے مسائل علمی پر اُن کی مجتہدانہ اور محققانہ موشگافیوں کا، اُن کے میدانِ علم کی تلاش و جستجو میں پُرمغز کارناموں کا پتہ لگانا چاہو تو اُس کا نشان یورپ کے سوا کہیں اور نہ ملے گا۔ جب قوم میں قومی علوم کی یہ قدر افزائی رہ جائے تو پھر قومی خصوصیات کا ذکر اور اُس کی بقا کی امید ایک قصۂ پارینہ سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ جب اُن کے کتب خانے اپنے معلّمانِ اخلاق کی تصنیفات سے خالی ہو جاویں تو اس جذبہ اور کیفیت کی تلاش تحصیل حاصل ہے کہ کبھی ہماری قوم بھی علوم و فنون کی دنیا میں اخلاق پھیلانے کی اور تہذیب و شائستگی کو اس عالم میں رواج دینے کی کفیل تھی اور ہم نے بھی یہ سبق ایک عالم کو پڑھایا تھا۔

امید کی جھلک نمایاں ہونے میں پس و پیش کی ضرورت نہیں۔ بہت سے قومی بھلائی چاہنے والے، قوم سے مختلف امراض کو دور کرنے میں اور اُس کے ضعیف قوائے عقلی و دماغی کو قوت پہنچانے میں ساعی ہیں۔ ان کی تمام تر کوششیں مفید ہیں اور اس غرض کے تحت میں متفرق طور پر جہاں جہاں جس جس قسم کی رفتارِ عمل جاری ہے وہ نتیجہ خیز ہے۔

لیکن ایسی کوشش جو مسلمانوں کے قدیم قلمی ادبی علمی ذخیرہ کو، فن خوش نویسی اور خطّاطی کے کمال کو، اُن کی انشاء کے طرز و طریق کے نمونوں کو قدیم فرامین آئندہ کی تباہی اور بربادی سے محفوظ رکھ سکے (جہاں تک میری محدود معلومات کا ذریعہ ہے) کسی ذمہ دار جماعت کے اہتمام سے اب تک باقاعدہ

طور پر عمل میں نہیں لائی گئی اور نہ اس وقت تک لائی جا رہی ہے، لہٰذا اس کی حفاظت کی تدبیر کی عملاً اختیار کرنے کا وقت حد سے زیادہ گزر چکا ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ بقیہ نقیہ جس طرح بن پڑے سمیٹ کر اکٹھا کیا جائے اور اس کو درست حالت میں رکھنے کی توجہ کے ساتھ کوشش شروع کی جائے۔

قومی پستی کے اس آخری دور میں سر سید احمد خاں مرحوم کے دل و دماغ میں قومی ترقی اور بہبودی کے مختلف وسائل اور خیالات گردش کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اُن کا دماغ منزلِ مقصود پر پہنچنے کے لئے بہت سی تدبیریں سوچتا تھا جس کے مختلف خاکے وہ کھینچتے رہتے تھے۔ اُن کے اکثر مجوزہ خاکوں نے اُن کی زندگی میں مستقل نقشوں کی صورت حاصل کر کے عمارت کی شکل اختیار کی، بعض نقشے ناتمام اور ادھورے رہ گئے، بعض خاکوں کو نقشوں کی صورت بھی دیکھنا نصیب نہ ہوئی، جن کا قدم خیال اور تصور کی سرحد سے بھی آگے نہ بڑھنے پایا۔ منجملہ اور تدبیروں کے قوم میں زندگی پیدا کرنے کی ایک تدبیر اُن کے ذہن میں یہ تھی جس کا میں نے ذکر کیا، یعنی یہ کہ مسلمانوں کے علمی سرمایہ کی حفاظت کا اہتمام بھی ایک ذمہ دار انجمن کے ذریعہ سے ہو۔ نایاب اور قلمی ذخیرۂ کتب کی بربادی انھوں نے بہت کچھ اپنی آنکھوں سے زوالِ دہلی کے آخری زمانہ میں دیکھی تھی اور اس بربادی سے جو اثر قوم کی حالت پر اور اس کے احساسِ قومی پر اپنی علمی کم مائگی کی وجہ سے پڑنے والا تھا، اُن کی دوربین نگاہ اس خرابی کو تاڑ چکی تھی۔ چنانچہ ۱۸۸۶ء میں جب انھوں نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی اور اس جماعت کے قیام سے انھوں نے تعلیمی مشن کے کام لینے کا ارادہ کیا اور انجمن کے مقاصد و قواعد ترتیب دے کر چھاپے، تو مقاصد مذکورہ کی دفعہ (۷) ضمن (د) میں یہ غرض بھی شامل کی کہ:

"مسلمان مصنفوں کی تصنیفات جو نایاب ہیں اُن کے بہم پہنچانے کی تدبیر کرنا یا پتہ لگانا کہ وہ کس جگہ موجود ہیں۔"

اس کے بعد دفعہ مذکور ضمن (ز) میں یہ اضافہ کیا کہ

"فرامین شاہی کو بہم پہنچا کر ان سے ایک کتاب انشاء کا مرتب کرانا اور اُن کے مواہیر وطغرا کے نمونے فوٹوگراف سے قائم کرنا۔"

تیئیس ۲۳ برس گزرے کہ مذکورۂ بالا خیال مقاصد کانفرنس کے حروف میں محفوظ چلا آتا ہے جس پر کسی قسم کا عملی تصرف نہیں ہوا۔ اس کا بڑا سبب کانفرنس کے سرمایہ اور مکان کا مستقل نہ ہونا تھا۔

عرصۂ دراز سے مرحوم کا یہ خاکہ میرے بھی پیش نظر تھا اور مدت سے میرے دل میں اس تصور کی چبھتک موجود تھی، لیکن جب میرے ممتاز دوست آنریبل صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب (جن کی مساعی جمیلہ اغراض کانفرنس کی مقصد برآری میں بہت کچھ کامیابی حاصل کر چکی ہیں) ۱۹۱۷ء میں جناب وزیر ہند کی کونسل کے ممبر بن کر انگلستان تشریف لے جانے لگے اور ارباب حل و عقد نے کانفرنس کا نظام عمل میرے کمزور ہاتھوں میں دینا پسند کیا، تو اُسی وقت سے (جبکہ عملاً مقاصد کانفرنس کا پورا کرنا میرے ذمہ ہوا) یہ خیال میرے دل میں آیا کہ مشرقی کتاب خانہ کی بنیاد سلطان جہاں منزل (صدر دفتر کانفرنس) میں پڑ چکی ہے، اس کی توسیع کی بھی خاص طور پر کوشش ہونی چاہئے۔ قدیم کتابوں کے مکمل اور نامکمل پھٹے پرانے نسخے تلاش کئے جائیں، فرامین شاہی اور اُن کے پرزوں کو جہاں تک دستیاب ہو سکیں ایک جا جمع کر کے اُن کی اصلاح اور درستی کی جاوے۔ سرسید مرحوم کے خاکہ کے موافق اگر پوری کامیابی حاصل نہ ہو، تاہم تھوڑی بہت اس خاکہ میں رنگ آمیزی کر کے کم سے کم ایسا نقشہ تو تیار کر دیا جائے جس پر کوئی اور خدا کا بندہ اضافہ کر سکے۔

خدا کے فضل سے اور علیا حضرت سرکار عالیہ ہر ہائی نیس بیگم صاحبہ والیہ بھوپال کی قومی اور تعلیمی ہمدردی کی وجہ سے کانفرنس کا صدر دفتر اب ایسی دل چسپ، وسیع اور خوش نما عمارت میں موجود ہے جس میں ایسی ہی دل چسپ اور قیمتی کتب کے سرمایہ کی ضرورت ہے اور جو حاصل ہونے پر دست برد زمانہ سے ایک حد تک زمانہ دراز کے لئے محفوظ رہ سکتا ہے۔ میرے اس خیال نے بھی اس وقت تک کوئی عملی صورت نہیں ظاہر کی، البتہ برائے نام چند عمدہ کتابوں کا اور فرامین شاہی کا اضافہ ہوا ہے جو ہونے نہ ہونے کے برابر ہے یا یوں خیال کیجئے کہ ایک خیال کہن کی کارروائی کا آغاز کا ہے جس کا تمام ہونا خدا کے فضل اور قوم کی مدد پر منحصر ہے۔

سب سے بڑی رکاوٹ کا باعث سرمایہ کا نہ ہونا ہے۔ یہ کام اپنی اہمیت کے لحاظ سے مستقل

فنڈ چاہتا ہے۔ کانفرنس کی آمدنی بہت محدود ہے جس کے فقط دو ذریعہ ہیں۔ چند والیانِ ملک اور امرا کی اعانت مستقل گرانٹ کی شکل میں ہے جس میں سب سے بڑا حصہ اعلیٰ حضرت محی الملت والدین خسرو دکن خلد اللہ ملکہ کی اور سرکار عالیہ حضور بیگم صاحبہ فرمانروائے بھوپال و دریار بہاولپور کی دست گیری شامل ہے۔ دوسرے درجہ میں جناب سر راجہ صاحب محمود آباد، خان بہادر نواب محمد مزمل اللہ خاں صاحب او۔ بی۔ ای رئیس بھیکن پور وغیرہ کی مستقل امدادیں ہیں۔ اس کے بعد تیسرا درجہ کانفرنس کے سالانہ ممبروں کی فیس کا ہے جو پانچ روپیہ سالانہ کی شکل میں حاصل ہوتی ہے ممبران کانفرنس کی آمدنی دو تین سال کے زمانہ میں اس قدر قلیل ہوئی ہے کہ اس سے سالانہ رپورٹ کانفرنس کی چھپائی اور سفیران کانفرنس کی تنخواہوں کی بھی مشکل سے نکاسی ہوتی ہے۔ وظائف میں بھی آمدنی کے بہت کم وصول ہونے سے اس قدر رقم صرف نہ کی جاسکی جو ہمیشہ ہونہار اور قابلِ امداد طلبہ پر صرف کی جاتی تھی۔ اب رہے دفتر کے دیگر اخراجات، اُن کو بھی مشکل سے بچت کی تدبیریں نکال کر عملۂ کانفرنس میں تخفیف کرکے پورا کرنے کی کوشش کی گئی اور اس طرح بجٹ سالانہ کی منظور شدہ رقوم میں بھی کفایت شعاری سے کام کرکے اخراجات پورے کئے گئے۔ تعلیم کی طرف سے اور اس مقصد میں اعانت کرنے سے عام دلچسپی میں کئی سال سے جو نمایاں تنزل ہو رہا ہے وہ ابھی تک رواں ہے۔ ایسی حالت میں ایسے اہم کام کا جاری کرنا ظاہر ہے کہ بغیر خاص سرمایہ کے حصول کے نہایت دشوار ہے۔ قومی خیالات میں سکون نہ ہونے کی وجہ سے اس غرض کے لئے قوم سے درخواست کرنے اور اپیل کرنے کی بھی ہمت نہ پڑتی تھی۔ جمہوری اغراض کے واسطے جمہور کی مدد کا حاصل ہونا ہی لابد امر ہے۔ وقت کا انتظار پیش نظر رہا۔

اس مرتبہ سورت میں کانفرنس کا سالانہ اجلاس ہوا اور انتظام و اہتمام کانفرنس کی غرض سے مجھے صوبۂ گجرات جانے کا اتفاق ہوا۔ اثنائے قیام گجرات میں بہت سی اسلامی یادگاریں، عالی شان ایوانوں کے کھنڈروں، شکستہ مسجدوں، بے مثل تفریح گاہوں، بلند میناروں، ویران خانقاہوں کی شکل میں نظر سے گزریں، سورت، بڑودہ، احمد آباد میں اکثر نادر قلمی کتابوں اور فرامین شاہی کے دیکھنے کا بھی موقع ملا۔ جس حالت میں میں نے یہ چیزیں دیکھیں اور جو بے توجہی اُن کے ساتھ برتی جارہی

تھی آثارِ قدیمہ بصورتِ تعمیر کے اثر انگیز حالات سے گزر کر علمی ذخیروں کی تباہی اور بربادی نے میرے قلب
پر خاص اثر پیدا کیا جس کا ذکر دردانگیز داستان ہوگی۔

میں نے اچھی طرح دیکھا کہ اگر جلد سے جلد اس سرمایہ کی حفاظت کا سامان نہ ہوا تو عنقریب وہ
دن آنے والا ہی کہ جو سامان اس وقت خطۂ گجرات میں موجود ہی اُس کا پتہ لگانے سے بھی نشان نہ ملے گا۔
کچھ حریفوں کے دامنِ مقصود کی زینت ہوگا باقی کیڑوں اور دیمک کی غذا بنے گا۔ افسوس ہی کہ بہت
سا سرمایہ تلف ہوچکا بہت کم باقی ہی جو اب بھی بہت ہی۔

مسلمانانِ ہندوستان میں علوم وفنون کے مجتہد اور محقق مدتوں تک پیدا ہونے کی توقع مشکل سے
کی جاسکتی ہی۔

ایسی حالت میں اسلاف جو علمی سرمایہ چھوڑ گئے ہیں اور جو پورے طور سے برباد ہوچکا ہی اب اُس کے
بقیہ حصہ کو بطور یادگار اور نشانی کے رکھنا ہمارا فرض ہونا چاہیے۔

اگر اس مقصد کے لئے کافی روپیہ حاصل ہوجائے تو میرے نزدیک تلاش اور جستجو کے بعد اور
معاوضہ کی معقول رقم ادا کرنے پر کامیابی دشوار نہیں معلوم ہوتی، کیونکہ جن لوگوں کے پاس یہ
ذخیرہ ہی وہ اس کے قدرداں نہیں، تنگی اور عدم فراغت خالی کاغذوں کو پاس رکھنے کی روادار نہیں،
تھوڑے بہت معاوضہ زرِ نقد کی شکل میں ایسی چیزوں کا ملنا اب دشوار نہیں ہی۔ لہذا اربابِ کرم اور حامیانِ
علم اور پرستارانِ کمالاتِ اسلاف کی خدمت میں یہ حقیر درخواست بطور اپیل کے شائع کرکے استدعا
کرتا ہوں کہ وہ اس کام میں میری مدد فرمائیں۔ کام شروع کرنے کے واسطے سردست دس ہزار روپیہ
کی ضرورت ہی، جس کی عملی صورت یہ ہوگی کہ ایک لائق شخص جو اس کام کے لئے موزوں ہو سو روپیہ
ماہوار پر مقرر کیا جائے گا۔ وہ ایسے مقامات میں سفر کرے گا جہاں سے کتابوں کا ذخیرہ فراہم کرسکے،
تخمیناً پچاس روپیہ اس کو مصارفِ سفر کے واسطے دئے جائیں گے سردست دو سال کے تجربے کے واسطے
قریباً چار ہزار روپیہ سفیر کی تنخواہ وسفر خرچ میں صرف ہوں گے باقی روپیہ خریداری کتب وفراہمی
میں، اُن کے درست کرانے اور جلدیں بندھوانے میں صرف ہوگا۔ یہ تمام سامان جہاں منتقل

صدر دفتر کانفرنس کی عمارت میں رکھا جائے گا جس کی ذمہ داری آنریری جائنٹ سکرٹری کانفرنس کے متعلق ہو گی۔ دو سال کے تجربہ کے بعد انشاء اللہ تعالیٰ مستقل سرمایہ کے لئے قوم اور ملک سے اپیل کی جاوے گی اس لئے کہ عرصہ تک اس سلسلہ کا جاری رہنا لازم ہے، تاکہ ہندوستان بلکہ بیرونی ممالک سے بھی ذخیرۂ علمی فراہم ہو سکے۔

آخر میں یہ دردانگیز حکایت ختم کر کے پورے طور سے امید کی جاتی ہے کہ ہمدردانِ قوم اس تجویز کو عملی صورت میں لانے کے لئے معین و مددگار ہوں گے۔ ایسے اہم اور مفید مقصد کے واسطے دس ہزار روپیہ کا سرمایہ فراہم کر دینا قومی خودداری کے سامنے دشوار بات نہیں۔ امرار قوم اور علم دوست احباب کے طبقہ سے گزر کر اوسط درجہ کے تعلیم یافتہ اصحاب بھی اس کار خیر میں شریک ہو سکتے ہیں۔

اس مقصد کے حصول میں مجھ کو سب سے بڑی امید اعلیٰحضرت تاجدار دکن خلد اللہ ملکہٗ اور علیا حضرت بیگم صاحبہ بھوپال دام اقبالہا کی توجہ شاہانہ سے ہے جن کی ذات ستودہ صفات علم و عمل کی سب سے بڑھ کر کفیل اور ضامن ہے۔

جو صاحب زر چندہ عنایت فرمائیں وہ مہربانی کر کے رجسٹرار صاحب ایم اے او کالج علی گڑھ کے نام بھیجیں اور اُن کو تحریر فرما دیں کہ یہ روپیہ (فنڈ فراہمی کتب قدیمہ) میں جمع کیا جاوے۔ سپرنٹنڈنٹ صاحب دفتر کانفرنس کو ارسال چندہ سے براہ مہربانی اطلاع دیں۔ رسید عطیہ دفتر کانفرنس سے آنریری جائنٹ سکرٹری کانفرنس کے دستخط ہو کر معطی صاحبان کی خدمت میں باضابطہ ارسال ہوا کرے گی۔ معطیان گرامی قدر کے نام نامی معہ تعداد عطیہ ہر مہینے کانفرنس گزٹ میں شائع ہوا کریں گے۔ اس کے صرف سے کام کی نوعیت اور کتابوں کی کیفیت اور حالت سے بذریعہ رسالہ مذکورہ اطلاع دی جایا کرے گی۔

آخر میں خداوند تعالیٰ کے حضور میں التجاء ہے کہ وہ ہمارے نیک ارادوں میں ثابت قدمی بخشے اور اُن میں کامیابی دے، آمین!

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۲ر مارچ ۱۹۱۹ء)

فارسی کے دو نایاب دیوان

میرے مختصر سے کتاب خانہ میں فارسی کے دو دیوان قلمی ہیں جو اپنے اوصاف اور خصوصیات کے لحاظ سے نایاب خیال کئے جا سکتے ہیں۔ ان دونوں کو مرحوم علامہ شبلی کی یاد سے تعلق ہی۔ نیاز منزل دل کا تقاضا ہی کہ معارف کے ناظرین کرام سے ان کا تعارف ہو۔ اس طرح "استادِ محترم" کی یادتازہ ہوجائے گی اور "تلمیذ مکرم" کی فرمائش کی تعمیل۔ مانا کہ یہ ہدیہ ؎

پائے ملخے پیش سلیماں بردن ٹھہرے

تاہم مور ضعیف کا یہی تحفہ ہو سکتا ہے۔ حسرت شروانی

(۱) دیوانِ عرفی شیرازی

عرفی شیرازی نے وفات کے وقت اپنے مسودات کا مجموعہ پریشان خانخانان کی خدمت میں بھجوا دیا تھا کہ اس کی سرپرستی میں مدون ہو جائے۔ چنانچہ عرفی کی یہ تمنا پوری ہوئی۔ علامہ شبلی "شعر العجم" میں فرماتے ہیں "افسوس۔ یہ نسخہ آج نایاب ہی۔ ورنہ بہت سی دلچسپ باتیں معلوم ہوتیں"؛ اثرنیاز دیکھو۔ علامہ مرحوم کی آرزو حسرت کے حق میں پوری ہوئی۔ وہ نسخہ اُن کے نیاز مند کے ہاتھ آگیا۔ پارسال دلی کے ایک بزرگ (قدیم خاندان ہنر کی یادگار) بہت سے قطعات اور یہ نسخہ فروخت کے لئے لائے۔ میں نے دیکھا تو خوبی خط وغیرہ کے لحاظ سے نادر معلوم ہوا۔ لے لیا۔ ثابت ہوا کہ یہ نسخہ اُسی دیوان کا ہی جو وفاتِ عرفی کے بعد خانخانان کے حکم سے محمد قاسم سراج نے مدون کیا تھا۔ اور مآثر رحیمی کے مؤلف عبد الباقی نے اُس پر دیباچہ لکھا تھا۔ اس کا سنہ کتابت ہی ۱۰۰۱ ہجری، محب علی بن حاجی یوسف شیرازی کاتب ہی۔

خانِ خانان کے حکم سے جو نسخہ مرتب ہوا تھا، وہ تقریباً ۱۰۲۶ھ ہجری میں مکمل ہوا۔ اس طرح میرا نسخہ اصل دیوان کی ترتیب سے چوالیس۴۴ برس بعد لکھا گیا، جو بہت زمانہ نہیں ہے۔ خط، کاغذ اور نقاشی کے لحاظ سے یہ نسخہ اس عہد کی قلمی کتابوں کا ایک عمدہ نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ اوسط تقطیع پر باریک قلم سے لکھا ہوا ہے۔ جو صفحہ پورا لکھا ہے اس میں ۱۶ سطریں ہیں۔ حجم ۴۲۲ صفحات کا ہے۔ قصائد کے چند صفحات درمیان میں معدوم ہیں۔ ترتیب کلام حسبِ ذیل ہے:۔

دیباچہ عبدالباقی[1]	۱۵ صفحہ	رسالہ نفسیہ[2]	۱۳ صفحہ	مثنوی مجمع الابکار[3]	۵۸ صفحہ
مثنوی فرہاد و شیریں[4]	۲۷ صفحہ	قصائد[5]	۶۲ عدد	ترکیب بند[6]	ایک
ترجیع بند[7]	ایک	قطعات[8]	۳۲ عدد	ساقی نامہ[9]	ایک
غزلیات[10]	۵۱۹	رباعیات[11]	۲۳۲	(جن میں بعض ناقص ہیں)	

کل تعدادِ اشعار ۸۱۱۲ ہے۔ اصل دیوان میں ۱۴۰۰۰ اشعار تھے۔ اس طرح عرفی کے چھ ہزار شعر چند ہی سال میں پھر معدوم ہو گئے۔ چھ ہزار کا دیوان اُس کی زندگی میں تلف ہو چکا تھا جس کے افسوس میں اُس نے کہا تھا۔

رسد شریعِ ہنر چوں نشود محو کہ من
شش ہزار آیتِ احکامِ ہنر باختہ ام

دیباچہ میں عبدالباقی نے لکھا ہے کہ "عرفی نے وفات کے وقت اپنے مسودات کا پریشان مجموعہ خانِ خانان کے پاس اس التماس کے ساتھ بھجوا دیا تھا کہ مدون کرا دیا جائے۔ یہ اوراق عرصہ تک خانِ خانان کے کتاب خانہ میں (جو "مکتب خانۂ اہلِ عرفان" تھا) محفوظ رہے۔ اور مختلف موانع کی وجہ سے خان خانان کو اُن کی طرف توجہ کرنے کی مہلت نہ ملی۔ آخر ۱۰۲۴ھ ہجری میں۔ عرفی کی وفات کے پچیس برس بعد۔ عرفی کے حقوق یاد آئے۔ اور "اس مربیِ کمال و اہلِ کمال" نے محمد قاسم۔ خلفِ خواجہ محمد علی اصفہانی کو جو سراجا کے لقب سے مشہور تھا حکم دیا کہ مسوداتِ مذکورہ کی تدوین کرے۔ سراجا کی تعریف عبدالباقی نے ان الفاظ میں کی ہے۔ "از آدمی زادگانِ اصفہان است"۔ ڈیڑھ برس کی سخت محنت کے بعد اُس نے

دیوان ترتیب دیا - اس دیوان میں قصیدہ، غزل، رباعی، قطعہ، مثنوی، ترکیب بند، اور ترجیع بند کے چودہ ہزار شعر تھے - عبدالباقی نے ترتیب و مقابلہ کے زمانہ میں مسودات کو دیکھا تھا - اُس کا بیان ہے کہ نہایت ابتر تھے - اسی بنیاد پر سراجا کی محنت کی داد ان الفاظ میں دی ہے "الحق دریں کار ید بیضا نمود"۔ بعد ترتیب سراجا نے یہ مجموعہ خان خانان کے ملاحظہ میں بمقام برہان پور (خاندیس) پیش کیا - اُس وقت عبدالباقی بھی "خواشی نشینان بزم فیاض" میں سے تھا - خان خانان نے دیکھ کر پسند کیا، اور انواع و اقسام کے صلے اور انعام دے کر سراجا کی عزت افزائی کی - یہ نسخہ خان خانان کے کتاب خانہ میں رکھا گیا - اہلِ استعداد کو نقل کا شوق ہوا تو وہیں سے نقلیں حاصل کیں - اس عہد میں "مستعدانِ ہندوستان" کے نزدیک جو نسخہ معتبر تھا وہ اسی نسخہ کی نقل تھی - (انتہیٰ خلاصۃً)۔

عرفی کے واقعات حسبِ ذیل اس دیباچہ سے معلوم ہوتے ہیں :-

عرفی کا نام خواجہ سیدی محمد تھا - باپ کا نام خواجہ زین الدین علی شیرازی - اُس کا خاندان ولایت فارس میں صاحبِ قدر و منزلت تھا - خواجہ زین الدین علی عہدہائے "پیشوائے حرسۂ شیراز" اور "وزیر داروغہ شہر" پر ممتاز رہا - اسی زمانہ میں عرفی نے "بعض مقدماتِ علمی" حاصل کیے اور "حیثیات عالیہ" خط ملیح خوب لکھتا تھا - فنِ موسیقی میں دخل تھا - اسی دوران میں شعرا کی ہمنشینی کا شوق پیدا ہوا - اور شعر و شاعری کے میدان میں قدم رکھا - چونکہ اُس کے والد وزیر داروغۂ شہر تھے اس لئے شرعی و عرفی کی مناسبت پر لحاظ کر کے عرفی تخلص پسند کیا - دارالفاضل شیراز کے موزوں طبعوں کی صحبت میں تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ عرفی کے جوہر چمک اٹھے - اور اشعار آبدار سامعہ افروز ہونے لگے چونکہ طبیعت ایجاد پسند پائی تھی اس لئے تازہ گوئی کے میدان میں اتر آیا - اب اُس کو ایک اُستاد و مرشد درکار تھا جو شیراز میں نہ تھا اسی اثنا میں اُس نے ہندوستان کی سخن سنجی و نکتہ دانی کا غلغلہ سنا اور اُسی کے ساتھ اس کو یہ بھی معلوم ہوا کہ تکلیبی اصفہانی، نظیری نیشاپوری، انیسی، شریعت کاشی، کامی سبزواری، بقائی خراسانی، محوی، غنی ہمدانی اور اور مستعدان روزگار کے جوہر خان خانان کے دربار میں جلا پا کر عالم افروز ہو رہے ہیں - اور سپہ سالار کی خدمت میں جس طرح ان نکتہ دانوں نے تربیت پائی تھی اُس کی حقیقت بھی منکشف

ہوئی۔ یہ حالات سُن کر عرفی نے ہندوستان آنے اور خانِ خانان کی ہمنشینی سے فیض حاصل کرنے کا قصد مصمم کر لیا اور اسی شوق میں وارد ہندوستان ہوا اول چند روز حکیم ابوالفتح گیلانی کی خدمت میں رہا۔ اس زمانہ میں حکیم ابوالفتح کی بزم ادب حسین ثنائی، سید محمد نجفی حیاتی گیلانی اور بہت سے اور شعرائے نامی سے آراستہ تھی۔ عرفی نے اس انجمن میں اپنی قادرالکلامی کا سکہ بٹھا دیا۔ اور صدر نشین سے لیکر ارکان تک سب نے اُس کے کلام کو پسند کیا۔ اسی عرصہ میں اُس کی ملاقات فیضی سے ہوئی۔ جو شاہزادوں کا اُستاد اور بادشاہ کا مقرب تھا۔ اُس کو بھی عرفی کی طرز جدید مرغوب ہوئی۔ ان منازل کو طے کرتا ہوا عرفی خان خانان کی بارگاہ میں باریاب ہوا اور اس بزم گرامی کے شعرائے نامور کی صحبت سے فیض یاب۔ خانِ خانان نے عرفی کی پوری قدر کی۔ چنانچہ معمولی آداب اور کورنش سے اُس کی باریابی مستثنیٰ تھی اور مجالس میں نشست بالاتر۔ اس زمانہ میں عرفی کا میلانِ طبع کلام عاشقانہ عارفانہ کی طرف رہا۔ اور اُسی میں ترقی کرتا رہا۔ نہایت بلند ہمت اور عالی فطرت تھا۔ اور اہلِ زمانہ بلند ہمتی اور حُسن کلام کی وجہ سے اُس کا اعزاز کرتے تھے۔ سنہ ۹۹۹ ہجری میں بمقام لاہور رحلت کی کسی نے تاریخ کہی۔ "استاد البشر"۔ لاہور ہی میں دفن ہوا۔ سنہ ۱۰۲۷ ہجری میں میر صابر اصفہانی نے اُس کی لاش نجفِ اشرف میں لیجا کر دفن کر دی۔ یہ اُس حُسنِ عقیدت کا صلہ تھا جس کا ظہور اس شعر میں ہوا ؎

بکاوشِ مژہ از گور تا نجف بروم
اگر بہ ہند بخاکم کنند و گر بہ تتار (انتہیٰ خلاصتہً)

عجیب اتفاق ہے۔ تقریباً سنہ ۱۰۲۷ ہجری میں عرفی کا کلیات مرتب ہوا۔ سنہ ۱۰۲۸ ہجری میں اُس کے جسم نے بھی ہندوستان کو خیرباد کہدی۔ گویا وہ اس انتظار میں تھا کہ اُس کا ادبی کارنامہ پایۂ تکمیل کو پہنچ لے تو وہ اس سرزمین سے قطع تعلق کر لے۔

عرفی کا اندازِ سخن

مؤلفِ دیباچہ عبدالباقی نے مختلف ادوار کے طرز سخن سے بحث کی ہے۔ لکھتا ہے کہ شعرا کے طبقے چھ ہیں۔ عنصری، رُودکی وغیرہ نے کوس اُستادی بجایا۔ اس طبقے کے بعد سلسلۂ بیان مولانا نظامی اور امیر خسرو تک پہنچا دیا ہے۔ اس طبقے کے بعد اور اساتذہ ہوئے۔

یہاں تک کہ "بادشاہ دانا دلِ سخن شناس" سلطان حسین مرزا فرمانروائے ہرات کا زمانہ آیا۔ اس عہد کے اساتذہ مولانا جامی۔ میر علی شیر نوائی۔ بابا فغانی۔ اہلی شیرازی۔ بکسی۔ خواجہ آصفی۔ اور میر شاہی نے انداز کلام میں ایک گونہ جدّت پیدا کر کے ایسی طرز ایجاد کی جو روشِ متقدمین سے متجاوز اور اس عہد کے مستعدوں کی طرز سے ملتی جلتی ہے (واضح ہو کہ اس موقع پر دیباچہ نگار نے خلطِ مبحث کر دیا ہے در اصل تجدیدِ روش کا سہرا فغانی کے سر ہے۔ باقی جن اساتذہ کا نام لیا گیا ہے اُن کی طرز عرفی وغیرہ کے کلام سے بالکل جدا و متغائر تھی۔ بابر خواجہ آصفی کے کلام کی بے نمکی سے سخت نالاں ہے) اس طرز کو اہلِ ذوق نے پسند کیا اور طرزِ قدما طاق و صندوق میں آرام گزیں ہو گئی۔ اس طبقہ کے بعد ایک اور طبقہ بزم سخن میں آیا۔ مثلاً مرزا اشرف جہاں لسانی۔ شریف تبریزی۔ محتشم کاشی۔ وحشی یافقی۔ ان استادوں نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اور انداز متاخرین سے قریب تر آ گئے۔ اب نوبت مرزا علی قلی میلی۔ خواجہ حسین ثنائی۔ ولی دشت بیاضی۔ ملک قمی۔ مرزا حسابی۔ نظیری۔ عرفی وغیرہ شعرائے بلادِ خراسان کی آئی۔ یہ طبقہ یکسر طرزِ متقدمین سے منکر ہو گیا۔ خواجہ حسین ثنائی نے سب سے زیادہ طرزِ تازہ میں گام زنی کی۔ تمام ایران اس طرز کا دلدادہ ہو گیا۔ اور اس طبقہ کے اشعار کو سفینۂ سینہ میں ثبت کر لیا۔ جو کلام اُن کی زبان سے نکلتا تھا بادِ صبا کی طرح ایران کے اس سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جاتا تھا مولانا عرفی کا دور آیا تو اُس نے طرز متقدمین و متاخرین دونوں کو منسوخ کر کے وہ طرز اختیار کی جس کے سننے سے گوشِ اہلِ ہوش مخزنِ دُرِّ عدن بن گئے اور وہ اندازِ سخن رائج کیا جس کا سکہ اب ربع مسکوں میں رواں ہے۔ ہندوستان میں فیضی نے اور ایران میں حکیم رکنائی مسیحی، حکیم شفائی، شانی تکلو نے اپنی اپنی طرز کو طرزِ عرفی سے آشنا کر دیا۔ اس طرز میں عرفی سے پہلے کسی نے استقلال پیدا نہیں کیا تھا۔ ابتدائً عرفی کی جدّت طرازی کو نہ صرف لوگوں نے ناپسند کیا تھا بلکہ اُس پر اعتراض کرتے تھے۔ خان خاناں کی تربیت و سرپرستی نے اُس کا سکہ سارے عالم کے دلوں پر بٹھا دیا۔" این چراغ از فکرتِ طبع او افروخت

و این نامِ نامی بدولتِ تربیت و اصلاح ایشاں بہم رسانید۔"

رسالۂ نفسیہ | عبدالباقی کے دیباچہ کے بعد کلیات عرفی شروع ہوتا ہے۔ اول رسالۂ نفسیہ ہے۔

"اے نفس" "اے نفس" کہہ کر نفس کو نصیحتیں کی ہیں۔ فرصت کو غنیمت سمجھنے، ریا و کبر و خود پسندی سے بچنے، ہمت کو بلند رکھنے، معرفتِ الٰہی خالصاً لوجہ اللہ حاصل کرنے۔ وغیرہ مطالب کی تاکید و تشویق پر زور الفاظ میں ہے۔

مثنوی رسالۂ بالا کے بعد دو مثنویاں ہیں۔ ایک مجمع الابکار مولانا نظامی کی "مخزن الاسرار" کے جواب ہیں۔ مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ یہ چھپ گئی ہے۔ دوسری فرہاد و شیریں بجواب شیریں خسرو مولانا نے لکھا ہے کہ آتشکدہ اور مجمع الفصحا میں اس کے اشعار نقل کئے ہیں۔ حق یہ ہے کہ یہ چھوٹی سی مثنوی عرفی کی شیوا بیانی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ گرمیِ سخن ملاحظہ ہو ؎

خداوندا۔ دلم بے نور تنگ است ۔۔۔ دلِ من سنگ و کوہِ طور سنگ است
دلم را غوطہ دہ در چشمۂ نور ۔۔۔ تجلی کن کہ موسیٰ ہست در طور
وگر۔ زیں نامزا دل۔ عار داری ۔۔۔ کرم بسیار و دل بسیار داری
دلے دہ۔ چوں محبت۔ پاکدامان ۔۔۔ دلے۔ پاکیزہ گوہر تر۔ ز ایماں
دلے۔ مرہم گداز۔ آرام نشناس ۔۔۔ لبش مستِ مکید نہائے الماس
دلے۔ ریشے۔ کہ وقتِ کاوشِ نیش ۔۔۔ نہ او از نیش۔ نیش از وے شود ریش
برافروز آتشے در سینۂ من ۔۔۔ کہ سوز و راحتِ دیرینۂ من
در آں آتش فگن جانِ مرا فرش ۔۔۔ ولیکن شو پناہِ فرش تا عرش
بر دنم ز آتشِ دل۔ دار در تب ۔۔۔ ق ۔۔۔ دروں بحرے کن از آتش لبالب
در آں بحرِ لبالب ز آتشِ تیز ۔۔۔ ۲ ۔۔۔ چناں طوفانِ بے تابی بر انگیز
کہ ہنگامِ ہجوم موج بر موج ۔۔۔ ۳ ۔۔۔ حضیضش مضطرب تر باشد از اوج
بپوشاں چہرہ ام را خلعتِ زرد ۔۔۔ ق ۔۔۔ بنوشاں سینہ ام را شربتِ درد
چہ شربت! آبِ کوثر اُمّتِ اُو ۔۔۔ ۲ ۔۔۔ گلو سوزِ محبت لذّتِ او

قصائد قصیدے تعداد میں چھیاسٹھ ۶۶ ہیں۔ مطبوعہ نسخہ (مدراس ۱۲۶۶ھ ہجری) میں باون ۵۲ ہیں۔ اس طرح قلمی نسخہ میں چودہ ۱۴ قصیدے زائد ہیں۔ ان میں سے بعض ناتمام ہیں۔ قصائد کے بعض اوراق

بھی درمیان میں سے تلف ہوگئے ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے زیادہ نہیں۔

غزلیات

غزلیں ۵۱۹ ہیں۔ مطبوعہ نسخہ مدراس میں ایک غزل بھی نہیں ہے[1]۔ عرفی کی اصل سحر آفرینی غزل میں ہے۔ نمونہ ملاحظہ ہو ؎

گفتگوے غمِ یعقوب بود پیشۂ ما — بوے پیراہنِ یوسف بود اندیشۂ ما
اندر آں بیشہ۔ کہ ما شیر و شیمِ آفت نیست — روبہ۔ از بیجگری۔ رم کند از بیشۂ ما
کوہکن صنعت ما داشت۔ ولے فرق بسے ست — قوتِ بازوے دل۔ می طلبد تیشۂ ما
در دلِ ما۔ غمِ دنیا۔ غمِ معشوق شود — بادہ گر خام بود۔ پختہ کند شیشۂ ما
عرفی افسانہ تراشی بخموشی بفروخت — للہ الحمد۔ کہ آزاد شد از پیشۂ ما

دیگر

مروّ بہ بادیہ گردی۔ کہ زرق و شیدائی است — برہنگی مطلب۔ کاں لباسِ رعنائی است
زباں ببند۔ و نظر باز کن۔ کہ۔ منعِ کلیم — کنایت از ادب آموزئ تقاضائی است
دماغِ یوسف اگر تر کنند۔ کف ببرد — ازاں شراب۔ کہ در ساغرِ تماشائی است
نقاب می کشد اے دل۔ تمام حوصلہ شو — کہ باز وقتِ شراب کرشمہ پیمائی است
چنیں کہ بر دمِ شمشیر و دشنہ می غلطم — حسود در ارسد۔ ار گویدم کہ "ہرجائی است"
شہیدِ عاطفتِ آں کرشمہ ام۔ کز مہر — تمام نقش طرازی و مشہد آرائی است
بشوقِ دوست چہ سازم؟ کہ در شریعتِ عشق — خیال بے ادبی و نگاہ رسوائی است
مگو "کہ نیست گنہگار تر ز من" عرفی — کہ۔ ایں حدیثِ گرانمایہ۔ لافِ یکتائی است

دیگر

مرا۔ ز عکدۂ سینہ۔ داغ میروید — ز بزمگاہِ محبت۔ چراغ میروید
تو پائے کعبہ روٗ۔ آمادہ کن۔ کہ در ہر گام — ہزار خضر۔ براہِ سراغ میروید

---

[1] نسخہ مطبوعہ مطبع منشی نولکشور لکھنؤ ۱۲۹۷ھ میں ۴۲۳ غزلیں ہیں جن کے اشعار کی تعداد ۳۰۲۵ ہے۔ قلمی نسخے میں ۹۶ غزلیں زیادہ ہیں۔

بہشت کو کہ تماشا کند کہ حسنِ ترا
ز باغ لالہ و از لالہ باغ میروید

مسیح گو گہرِ آفتاب را مفروش
کہ از خرابۂ ما شب چراغ میروید

نسیمِ باغ کہ بر مغز آستیں افشاند
کہ روضہ روضہ گُلم از دماغ میروید

مگر ترانۂ عرفیؔ کسے بہ گلشن بُرد
کہ بانگِ درد ز دستانِ زاغ میروید

دیگر

نفسے کہ غمزۂ او بہ صفِ بلا نشستہ
بہ ہوائے دل مسیحا برہِ فنا نشستہ

چو رسی بہ تربتِ ما مفشاں نیاز دامن
کہ غبارِ درد و حسرت بمزارِ ما نشستہ

نشود آشکار فردا کہ براہِ وعدۂ او
ز غمِ بہشت و دوزخ دو جہاں جُدا نشستہ

نہ رود وفا دریں کو کہ گزشتہ دامن افشاں
کہ غبارِ کوچۂ ما بر توتیا نشستہ

روم از جہان و شادم کہ براہ تا قیامت
ز خیالِ غمزۂ او حشمِ بلا نشستہ

ز دعا چہ کام جویم کہ میانِ تنگدستاں
بہزار نا اُمیدی اثرِ دعا نشستہ

تو و بزمِ عیش عرفیؔ من و کوچۂ کہ ہر سو
سرِ خوں چکاں فتادہ دلِ بینوا نشستہ

یہ غزل حضرت امیر خسرو کی طرح پر ہے۔ اُن کا مطلع ملاحظہ ہو۔ دوسرے مصرع میں ندرتِ تشبیہ قابلِ داد ہے ؎

بحوالیِ دو چشمش حشمِ بلا نشستہ
چو قبیلہ گردِ لیلیٰ ہمہ جا بجا نشستہ

رُباعی

رفتم بہ جنازۂ یکے تن کہ خسرو
صد سال ز باغِ عیش گل چید و بمُرد
گفتم چہ بروں بُردی ازیں باغ و بہار؟
گفتہ "دلِ پُر خوں۔ و تو ہم خواہی بُرد"

دیگر

گاہے ہوس افروزِ غنیمت بینم
گہہ مضطرب از نہیبِ جحیمت بینم
با دوست درآویز و بیاسا تا چند
بازیچۂ دستِ ہر نسیمت بینم

دیگر

جہدے۔ کہ گسستنِ نفس نزدیک است — فریادے کن کہ دادرس نزدیک است
گر قافلہ بگزشت۔ قدم سست مکن — بشتاب۔ کہ آوازِ جرس نزدیک است

دیگر

جمعے بہ درت گریہ و آہ آوردند — جمعے ہمہ دیدند و نگاہ آوردند
جمعے دیدند۔ خواہشِ عفوت را — رفتند۔ و جہاں جہاں گناہ آوردند

شوخ چشمی معاف۔ مصرع اول میں "خواہش" کی جگہ "عالم" ہوتا تو کیا خوب ہوتا۔ جناب باری عز اسمہ کے لئے خواہش کا لفظ مناسب نہیں معلوم ہوتا پھر "جہاں جہاں" کے لئے عالم کس قدر مناسب و موزوں ہے۔

حال میں طاہر نصیر آبادی کا تذکرہ نایاب دستیاب ہوا۔ واغستانی اور میر آزاد بلگرامی نے اکثر اس تذکرے کا حوالہ دیا ہے۔ طاہر نے (جو نظیری و عرفی کا ہم عصر ہے) معاصرین کا تذکرہ لکھا ہے۔ اس لئے واقعات کے لحاظ سے خاص پایہ رکھتا ہے۔ عرفی کے حال میں لکھا ہے "صفائے ذہن" اور "ذکائے طبع سلیم" میں تمام شعرائے فارس و خراسان سے ممتاز تھا۔ غیرتی۔ فہمی۔ قدری کے ہمصحبتوں میں سے تھا۔ اس کی ابتدائی عمر شیراز میں گزری۔ آغازِ کار میں شعراء اور علماء کی صحبت میں مباحثہ اور مناظرہ کے موقعے اس کو ملے اور قوانینِ شعر میں مہارت حاصل کی اور حل و عقدِ نظم اور فنونِ سخن سے زائد وصف آگاہی ۹۹۲ھ ہجری میں ہندوستان روانہ ہوا (گویا ۲۹ برس کی عمر میں ہندوستان آ گیا) جن لوگوں نے اُسے دیکھا ہے اُن کا بیان ہے کہ خوش طبع۔ ظرافت دوست تھا باوجود دعوئے شاعری کے معاصرین سے ملاقات کے وقت خوش طبعی کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتا تھا۔ (اس تعدیل سے "کم بینی" اور "غرور" کی جرح کی تلخی کم ہو جاتی ہے) امید ہے کہ رفتہ رفتہ سلامت نفس بھی پیدا کر لے گا۔ اس لئے کہ "طبعِ مستقیم" کو "نفسِ سلیم" درکار ہے۔ طاہر نے "گویند" کر کے عرفی کی تاریخ وفات ۱۰۰۲ھ ہجری لکھی ہے۔ جو صحیح نہیں۔

لکھا ہے کہ مرض موت میں یہ دو رباعیاں زبان پر تھیں ؎

(۱)

اے مرگ۔ مرا ز یار شرمندہ مکن   نومیدم ازاں گوہر ارزندہ مکن
یار آید و جاں رود۔ خدایا۔ نفسے   مہلت دہ و در قیامتم زندہ مکن

(۲)

عُرفی۔ دمِ نزع ست و ہماں مستی۔ تو   آیا بہ چہ مایہ؟۔ بار بستی۔ تو
فرداست کہ دوست نقد فروش۔ بہ کف   جویائے متاع ست و تہیدستی۔ تو

دوسری رُباعی کا جواب مرزا یوسف خاں مشہدی نے دیا ہے

عُرفی! رفتی۔ بدوست پیوستی تو   وز کشمکشِ زمانہ وارستی تو
آنجا۔ غمِ دوست۔ مایۂ دست تہی ست   خوش باش۔ کزیں مایہ۔ قوی دستی تو

اول رباعی میں دیکھو کہ ایک دم کے مشاہدۂ جمال پر عمر ابد کو قربان کر گیا۔ دوسرا پہلو نہیں چاہتا کہ دمِ آخر جو مشاہدۂ جمال کی نعمت حاصل ہوئی اُس کے سُرور میں ہنگامۂ قیامت خلل انداز ہو۔[۱]

نگاہ روبرو۔ واقعات ختم ہوئے۔ افسانہ نہیں۔ واقعات۔ واقعات کے نتائج پر غور ہمیشہ سبق آموز ہے آج "تعلیم و تربیت" بچہ بچہ کی زبان پر ہے اور گردنِ غرور کی بلندی حقیقت کے مشاہدے معذور کر چکی ہے انصاف سے دیکھو کہ آج کوئی تربیت گاہ ایسی ہے جہاں عرفی کی قابلیت کے ادیب پیدا ہوں۔ نہ کہنا کہ عرفی کی کیا ضرورت ہے بیسیوں یونیورسٹیاں آج بھی خاقانی۔ و عرفی کا کلام پڑھا رہی ہیں عرفی و خاقانی درکنار۔ اُن کے کلام کے اہل ذوق سمجھنے والے بھی پیدا نہیں کر سکتیں۔ مانو گے کہ عرفی کا مرکّبِ فن خانِ خانان تھا۔ جو جواہر ایران نہ چمکا سکا بلکہ جن جوہروں کی آبداری سے ایرانیوں کی آنکھیں خیرگی کو تھیں وہ ہندوستان کے ایک امیر کے دیوان خانے میں آکر اس آب و تاب سے چمکے

---

[۱] قیامت میں دوبارہ زندہ کیا جانا بھی ایک بڑی طولانی زندگی ہے عرفی اب مرتے وقت محض دیدار یار کی خاطر ذرا سی مہلت مانگتا ہے اور اس مہلت کے معاوضہ میں وہ دوسری زندگی جو قیامت میں ملنے والی ہے دیئے دیتا ہے مطلب یہ ہے کہ اے پروردگار مجھے اس وقت ذرا سی مہلت دیدے کہ دیدار یار کر لوں اور اس مہلت کا معاوضہ میں یہ دیتا ہوں کہ قیامت میں تو مجھے دوسری بار زندہ نہ کرنا۔
معین الدین

کہ ایک عالم روشن ہوگیا۔ خان خاناں میدان میں ایک فاتح ہے، اپنے وقت کا بہترین سپہ سالار۔ بزم میں ایک اولوالعزم، فیاض مربیِ علم و فن۔ امیر ابن امیر۔ اس بوقلمونی کو دیکھو۔ تلوار اور قلم۔ دونوں جوہر ریز ہیں۔ کلام پڑھو ندرت میں ممتاز ہے ؎

بہ سنگ رخنہ شد از بس گریستم بے تو
ز سنگ سخت ترم بین کہ زیستم بے تو

دیگر

بہ کیشِ مہر و وفا حرفِ عہد بیکار است
نگاہِ اہلِ محبت ۔ تمام سوگند است

ہمہ گیری ملاحظہ ہو۔ ایک طرف عرفی و نظیری اور بہت سے ایرانی شعرا فیضِ تربیت سے مدارج ترقی حاصل کر رہے ہیں۔ دوسری طرف بھاشا کے کبیشر اصلاح لے رہے ہیں۔ بھاشا کا ادب ترقی پا رہا ہے۔ جن لوگوں نے بھاشا کے علم ادب کی تاریخ لکھی ہے اس کا ایک دور خان خاناں کے زیرِ تربیت قائم کیا ہے۔ تیسری طرف واقعات بابری کا ترجمہ ترکی سے فارسی میں ہو رہا ہے۔ یہ زمانہ تو کمالاتِ انسانی کی معراج کا ہے۔ میری تنگ اور محدود معلومات میں قابلِ شکر اضافہ ہو اگر ان حیثیات کا جامع زندہ انسان بتایا جائے جو خان خاناں میں جمع تھیں۔

طلسم کدۂ حیرت ہنوز ختم نہیں ہوا۔ عرفی و نظیری کے کمال کا مربی (یعنی خان خاناں خود) کس کے دامنِ تربیت میں پلا تھا؟ جلال الدین اکبر کے جو اُمّیِ محض تھا۔ بیرم خاں، عبدالرحیم (خان خاناں) کو چار برس کا چھوڑ کر اس عالم سے راہی ہوا تھا۔ تاریخ دیکھو۔ اکبر نے دشمن کی یادگار کو دربار میں شامل کرکے اپنی نگاہ کے سامنے پرورش کیا۔ سترہ برس کی عمر میں پہلے معرکۂ جنگ میں سرخرو ہوا۔ اکبر کی تربیت نے علم و ہنر کے جو دریا بہائے تاریخ فارسی تو اس سے بے بہرہ نہیں۔ مگر حریفوں نے ایک سبق ہم کو یاد کرا دیا ہے "اکبر مسلمان نہ تھا اس لئے ملک نے ترقی کی"۔ مسلمانوں کی تاریخ اس قدر مردم خیز ہے کہ اس میں نہ اکبر عجیب ہے نہ خان خاناں۔ مگر عجیب امر یہ ہے کہ مسلمان اپنی ہی تاریخ

سے سب سے زیادہ بدگمان ہیں۔ وجہ؟ جہل ولاعلمی۔ فاعتبروا یا اُولی الابصار فقط

(رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ نومبر ۱۹۲۲ء)

(۲) دیوان طالب آملی

طالب آملی۔ دربار جہانگیری کا ملک الشعرا تھا۔ اُس کا کلام عام طور پر نایاب ہے۔ مجھ کو دیوان طالب کے دو نسخے ملے۔ ایک ابتدا میں دلّی سے[1]۔ یہ نسخہ معمولی خط کا بہت غلط ہے۔ مگر اکثر جگہ غلطی سمجھ میں آجاتی ہے۔ کثرت کلام کے لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔

دوسرا نسخہ لکھنؤ سے دستیاب ہوا۔ اہتمام تحریر کے لحاظ سے نادر ہے۔ میں یہیں تک اُس کی قدر کرتا تھا۔ مرحوم علامہ شبلی نے طلب فرما کر عرصہ تک زیرِ مطالعہ رکھا۔ اُن کی جوہر شناس نظر نے اُس کا خاص جوہر پرکھا۔ ع قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری

واپس فرمایا تو لکھا "کہ یہ نسخہ خود طالب آملی کی تحریروں سے مزیّن ہے"۔ میں نے بھی اسی خیال سے دیکھا تو علامہ کی رائے کو صحیح پایا۔ دلائل حسب ذیل ہیں :۔

اس نسخہ کے کاتب نے اپنا نام میرزا جان اجمیری لکھا ہے۔ سنہ کتابت نہیں لکھا۔ عموماً قصائد وغیرہ کے عنوان اصل کاتب نے نہیں لکھے۔ جا بجا خصوصاً غیر مانوس ردیفوں کے موقع پر متن میں ایک غزل و دو غزل کے انداز سے بیاض چھوٹی ہوئی ہے۔ اصل کاتب کی تحریر باستثنار آخر کی چند رباعیوں کے پختہ نستعلیق ہے۔ جو عنوان قصائد کے خالی ہیں اُن کے عنوان۔ بعض رباعیوں کے عنوان اُن بیاضوں میں (جو اصل کاتب نے چھوڑیں) بعض غزلیں ایک اور قلم کی لکھی ہوئی ہیں جو اصل کاتب کے قلم سے صاف طور پر ممتاز ہے۔ قصائد کے عنوان اس نہج سے لکھے گئے ہیں کہ یہ واضح ہوتا ہے کہ کاتب ممدوح کا ہم عصر اور متوسل ہے۔ مثلاً "طالب" کے مربی میرزا غازی ترخان (امیر جہانگیری) کی شان میں جو قصائد ہیں اُن کے عنوانوں میں کسی جگہ سُرخ روشنائی سے تحریر ہے "در مدح مرحومی میرزا غازی ترخان"۔ ایک جگہ لکھا ہے "در مدح

---

[1] مولوی سلیم الدین خان مرحوم تاجر کتب قلمی سے خریدا۔ عفرلہٗ شروانی

نواب مرحومی غازی ترخان"۔ جہانگیر بادشاہ کی مدح کے ایک قصیدے کا عنوان ہے "در مدح حضرت ظلِ الٰہی مدّ اللہ ظلہ"۔ ایک اور قصیدے کا عنوان "بمدح مدظلہ" اعتماد الدولہ وزیر جہانگیر۔ طالب کا رشتہ دار تھا۔ یا کی مدح کے قصیدے کا عنوان ہے "در مدح نواب قبلہ گاہی ام اعتماد الدولۃ العلیۃ مدظلہ"۔ دوسرے قصیدہ کا عنوان ہے "بمدحہ مدظلہ"۔ نورجہاں کے ایک مدحیہ قصیدے کا عنوان ہے "در مدح مہد علیا نور محل بیگم گفتہ شد" علیٰ ہذا القیاس۔ ان عنوانوں سے معاصرت اور تعلق دونوں ثابت ہوئے ہوں گے۔ نورجہاں کی مدح کے قصیدے کا عنوان اُس وقت لکھا گیا جب کہ وہ نور محل تھی، نورجہاں نہوئی تھی۔ یہ تمام عبارتیں سُرخ قلم سے ایک ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔ ایک اور خصوصیت ہے۔ بعض ردیفوں کی تکمیل اسی قلم سے اُن بیاضوں میں ہے جو کاتب نے چھوڑ دی تھیں۔ معلوم ہوا کہ اصل کاتب کو یہ غزل نہ ملی تھی۔ یا موزوں نہ ہوئی تھی۔ اور اُس کے انتظار میں یہ بیاض چھوڑ دی گئی تھی۔ اسی قلم سے جا بجا اصلاحیں ہیں۔ اصلاح کی بحث تفصیل سے آگے آتی ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خط و قلم کس کا ہے۔ جواب قطعی یہ ہے کہ "خود طالب آملی کا" کیوں؟ اس وجہ سے کہ حاشیہ پر جا بجا متن ہیں۔ اسی قلم کا لکھا ہوا "طالب" کا کلام ہے جس پر لکھا ہے نیز "لراقمہ طالب" معلوم ہوا کہ قائل کلام اور راقم کلام ایک ہی ہے۔ اور یہ مانی ہوئی اصطلاح ہے۔ ان غزلوں کے مقطعوں میں لفظ "طالب" کی شانِ تحریر عموماً یہ ہے "طلب"۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ بہت سی اصلاحیں اسی قلم کی ایسی ہیں جو تصحیح کتابت نہیں بلکہ اصلاحِ کلام ہیں۔ معلوم ہوا کہ خود طالب نے اپنے کلام میں اصلاحیں نظر ثانی کے وقت کی ہیں۔ ان دلائل کی بنیاد پر یہ کہنا بجا ہے کہ یہ دیوان بطور بیاض کے خود طالب کے لئے لکھا گیا تھا جو اُس کے پاس رہا اور وقتاً فوقتاً اُس کے قلم سے فیضیاب ہوتا رہا۔ ایسے نسخہ پر ہر کتاب خانہ فخر کر سکتا ہے۔ میرے کتاب خانے کو یہ سرمایۂ فخر علامہ شبلی مرحوم کی جوہر شناس نظر کے فیض سے حاصل ہوا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔ طالب کا خط پختہ شفیعہ ہے اور قلم باریک۔

اصلاحیں | اصلاحیں بجائے خود سرمایۂ ندرت ہیں۔ بعض تو محض کتابت کی تصحیح ہیں کہیں کاتب سے لفظ چھوٹ گیا تھا اضافہ کر دیا ہے۔ کہیں لفظ غلط لکھ گیا تھا کاٹ کر صحیح کر دیا ہے۔ کہیں

مصرعے ردّ و بدل ہو گئے تھے وہاں خط کھینچ کر ایک شعر کے دونوں مصرعوں کو مربوط کر دیا ہے۔ علیٰ ہٰذالقیاس۔ قابلِ دید وہ اصلاحیں ہیں جو کلام میں کی گئی ہیں۔ ان اصلاحوں نے پایۂ کلام بلند سے بلند تر کر دیا ہے۔ اس سے طالب کی قوتِ طبع کا اندازہ ہوتا ہے۔

مثالاً دو چار نمونے ملاحظہ ہوں:۔

ایک قطعہ ہے جس کا قافیہ ہے۔ تاجداری۔ خاکساری۔ اُس کا ایک شعر ہے ؎

تپِ غیرتم سوخت یاراں چہ سازم
بلائیست در آدمی جُز و ناری

ایک دو بار پڑھ کر دیکھئے کہ کہیں جوڑ بند ڈھیلے تو نہیں۔ اب اصلاح دیکھئے۔ مصرعہ اوّل:۔ "تپِ غیرتم در عرق دارد آرے" اندازہ کیجئے۔ گرمی کلام کس درجہ پر پہنچ گئی۔ تپ کے واسطے "عرق" مصرعہ، جو نئے بلاغت میں غوطہ کھا کر نکھر گیا۔

ایک اور شعر ؎

دستِ ہوس قوی شدہ در کشور وجود
ترسم کہ عیش رخنہ بناموسِ غم کند

اول مصرع میں اصلاح ہوئی۔ ع "دستِ ہوس قوی شدہ بازوئے دل ضعیف" ایک بار غیر اصلاحی مصرع کو مکرّر پڑھ کر اصلاح شدہ سے مقابلہ کیجئے۔ کڑی کمان کا زور محسوس ہونے لگے گا۔

تیسرا شعر ؎

چناں گداختہ جوشِ خیال طالب را
کہ مُویہ موشدہ چوں طبعِ خویشتن نازک

اصلاح میں "طبع" کا لفظ "فکر" سے بدل دیا گیا۔ نزاکتِ فکر داد طلب۔

چوتھا شعر ؎
گر دید آب دیدۂ طالب چمن شناس
زیں پس حرام گشت بہ شبنم وضوئے گل

مصرعۂ اول میں اصلاح ہوئی۔ بجائے "گردید" "شد باز" اب مصرع یہ ہے۔ "شد باز آب دیدۂ طالب چمن شناس"۔ غور کیجئے مضمون میں کس قدر وسعت پیدا ہوگئی۔ "گردید" سے یہ مفہوم ہوتا تھا کہ آب دیدہ اوّل مرتبہ چمن شناس ہو رہا ہے۔ اور آغاز گریہ وزاری ہے۔ "شد باز" سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ پہلے بھی یہ چشمہ رواں رہ چکا ہے۔ درمیان میں خزاں تھی تو رک گیا تھا۔ بہار آئی تو پھر جاری ہوا۔ جب رکا ہوا تھا تو مجبوراً پھول شبنم سے وضو کرتے تھے۔ اب روانی آگئی تو دار الافتائے محبت سے فتویٰ جاری ہوا کہ "آب آمد تیمم برخاست" ماء کثیر کے ہوتے ہوئے "اوس" سے پیاس کیوں بجھائی جائے روانی آب کے لئے باز۔ للّٰہ دَرّہٗ! اگر آپ "چمن شناس"۔ "شد باز"۔ "وضوئے گل"۔ "شبنم"۔ ان الفاظ پر فرداً فرداً دوبارہ بحیثیت مجموعی غور کریں گے تو پورے مضمون کی تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے گی۔

اب طالب کی دو غزلیں پوری سن لیجئے۔ اس کے بعد طالب رخصت ہوتا ہوں۔

علامہ شبلی نے طرز طالب کی خصوصیت حسب ذیل الفاظ میں بیان فرمائی ہے۔ "ندرت تشبیہ و لطف استعارہ"۔ میرا خیال ہے کہ "سرخوشی و نزاکت"۔ (جو دربار جہانگیر و نور جہاں کا طرۂ امتیاز تھی) کلام طالب کی شان امتیاز ہے۔ دیکھو عرفی و طالب دونوں کشمیر دیکھتے ہیں۔ اس کی روح پرور ہوا اور رنگ بہار سے متاثر ہوتے ہیں۔ دلی خیال الفاظ شعر میں تراوش کرتا ہے۔ عرفی کہتا ہے ؎

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر درآید　　　گر مرغ کباب است کہ با بال و پر آید

طالب زمزمہ سنج ہوتا ہے ؎

فیض پیالہ بخشد آب و ہوائے کشمیر
از خشت خم نہادند گویا بنائے کشمیر

دو غزلیں سنانی تھیں مضمون میں مضمون پیدا ہو گیا۔ ان غزلوں میں طالب کا اصلی رنگ صاف نمایاں ہے ؎

غزل

بہار آمد کہ گردد جسم و جاں مست　　　شود دل مست چوں بلبل زباں مست

بہار آمد کہ از بوے گل و مے | زمیں بیہوش گرد د آسماں مست
چرا مستانہ می غلطد بہر سوے | بجدول نیست گر آبِ رواں مست
ازاں پیمانہ - کامد اولیں دور | زکم ظرفی شدم از بوے آں مست
نشد تغیر - در کیفیتم - ہیچ | ہماں مستم ہماں مستم ہماں مست
زمانے نیست - کز گلبانگ شوقم | نیفتد بلبلے از آشیاں مست
چو بر مستاں نہ باشد ہیچ تکلیف | چرا طالب نباشم جاوداں مست

مقطع سے اوپر کا شعر کس قدر نادر اور بلیغ ہے بلبل کے مست کرنے کے واسطے جو نوا ہے وہ بھی گلبانگ ہی - نظیری نے بھی اس مضمون کو لیا ہی - مگر اپنے رنگ ہیں ؎

بزیر شاخِ گُل - افعی گزیدہ بلبل را | نوا گرانِ نخوردہ گزند - را چہ خبر

غزل

کرشمہ نازک، ولب نازک وسخن نازک | ز فرق تا بقدم ہمچو طبع من نازک
کسے کہ دیدہ بنا گوشِ اُو شبے در خواب | نیایدش بنظر برگِ یاسمن نازک
بعہدِ نازکی لالہ زارِ عارضِ او | گماں مبر کہ گلے روید از چمن نازک
ہزار سوزنِ اشکم فزود بر مژگاں | کسے کہ بر تنِ او دوخت پیرہن نازک
فغاں - کہ از گل و آبِ صنم نمی جوشد | کرشمہ - کہ شود طبعِ برہمن نازک
گر ز غمزہ شیریں بہ تیشہ داد الماس | کہ لوحِ فتنہ تراشید کوہکن نازک
چناں گداختہ جوشِ خیال طالب را | کہ مُو بمو شدہ چوں فکرِ خویشتن نازک

دیکھنا - پانچویں شعر ہیں کتنی دور کی بات کہہ گیا - والسلام بالاکرام - فقط

(رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۲۲ء)

اتفاقاتِ حسنہ

(شیخ عبدالحق محدثؒ دہلویؒ کی ایک قلمی تحریر)

گزشتہ محرم الحرام (۱۳۴۲ھ) کی ساتویں تاریخ کو میں نے اول مرتبہ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہٗ العزیز کے مزار پُر انوار پر فاتحہ پڑھنے کا شرف حاصل کیا۔ ۶ صفرالمظفر کو صبح کے وقت تفاؤل شرعی کے طور پر دیوان حافظ دیکھا تو یہ شعر سرِ صفحہ نکلا ؎

ستارۂ بدرخشید و ماہِ مجلس شد
دلِ رمیدۂ مارا انیس و مونس شد

اُسی روز دوپہرسے پہلے حضرت شیخ کی "اشعۃ اللمعات" شرح فارسی "مشکوٰۃ" کا قلمی[۱] نسخہ دیدہ افروز ہوا جو آبخوردہ اور بوسیدہ ہے۔ مگر خوشخط اور اہتمام سے لکھا ہوا۔

آگے پڑھنے سے پہلے "ستارۂ بدرخشید اور ماہِ مجلس کا مقابلہ اشعۃ اللمعات اور مشکوٰۃ سے کرلو۔ نورٌ علیٰ نور۔ سرِ صفحہ کے پائیں میں یہ عبارت تحریر ہے "ترجمہ مشکوٰۃ الشریف تصنیف حضرت شیخ عبدالحق قدس سرہٗ کہ در خاتمۂ کتاب دستخط حضرت شیخ دسج است۔ یہ ہدیہ یک ہزار و دو صد روپیہ گرفتہ نواب صاحب قبلہ مدظلہ اللہ تعالیٰ"۔ یہ خط گھنگی کی شان لئے ہوئے ہے۔ مہریں مٹ گئی ہیں۔ اس لئے "نواب صاحب قبلہ" کون تھے معلوم نہیں ہوتا۔ آخری صفحہ کے آخر میں جو بیاض تھی اس میں حضرت شیخ کے قلم کی عبارت جلوہ افروز ہے خط صاف اور پختہ ہے۔ جملہ بارہ سطریں ہیں۔

میر غلام علی آزاد نے سبحۃ المرجان میں حضرت شیخ کی وفات ۱۰۵۲ ہجری میں لکھی ہے۔ تاریخ وفات "علماء اُمتی کانبیاء بنی اسرائیل" سے برآمد ہوتی ہے۔ علماء اور انبیاء کی "ہمزوں" کے دو عدد محسوب ہیں۔

---

[۱] چند سال پہلے "مشکوٰۃ المصابیح" کا نسخہ ملا ہے جس پر شیخ نورالحق فرزند شیخ محدث کے ہاتھ کی عبارت تحریر ہے ۱۲ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ انتساب صحیح نہیں۔ شروانی

سنہ ولادت ۹۵۸ھ ہجری ہے۔ حضرت شیخ نے ۹۴ برس کی عمر پائی۔ عبارتِ زیر بحث کی تحریر کے وقت سن شریف ۹۱ برس کا تھا مگر خط میں ہاتھ کی کمزوری یا نگاہ کے ضعف کا بال برابر اثر نہیں ہے!۔

کاتبِ کتاب نے اپنا نام محمد علی دہلوی لکھا ہے۔ سنہ کتابت ہندسوں میں لکھا تھا جو محکوک ہو چکے تاہم ۴ کا ہندسہ درمیان میں نگاہِ انداز دیکھ سکتی ہے۔ اس طرح ۱۰۴۰ھ تک سنہ کتابت ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ ۱۰۲۹ھ میں ختم ہوئی ہو۔ جو حضرت شیخ کی عبارت کا سال تحریر ہے۔ حاشیۂ کتاب پر حضرت شیخ کے خط سے ملتی جلتی تحریر میں اصلاحی الفاظ لکھے ہوئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نسخۂ ہذا حضرت کے مطالعہ میں رہا ہے۔ کیا عجب ہے کہ خانقاہِ قادریہ کے کتاب خانے کے لئے لکھا گیا ہو۔

چلتے چلتے قیمت کتاب پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ بارہ سو روپیہ قیمت ہے۔ جامعہ عثمانیہ نے جو تاریخ ہند شائع کی ہے اس میں اعداد شمار سے ثابت کیا ہے کہ آج کا روپیہ عہد مغلیہ کے روپیہ سے قیمت میں دس گنا کم ہے۔ لہذا مخطوطہ مطلوبہ آج کل کے حساب سے دس ہزار روپیہ قیمت کی جا سکتی ہے مصرع "یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا"۔ اب کہ شیرازۂ جمعیت بکھر چکا ہے! یورپ اور امریکہ کے مقابلہ پر مسلمانوں سے (معارف کے شذرات میں) قدردانی کا سوال جرح نمک بر جراحت کا کام دے جاتا ہے۔

حضرت شیخ کی عبارت یہ ہے :۔

"تمام شد تسوید ایں کتاب عشیۂ یوم الاربعا بیست وچہارم ربیع الآخر سنہ ہزار وبیست وپنج از ہجرت سید المرسلین وخاتم النبیین صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین وبود ابتدا تالیف سیزدہم ذی الحجہ سنہ یک ہزار ونوزدہ۔ وبہ تحقیق درآمد درمیان مشاغل دیگر از تالیفات دیگر کہ مجموع سہ سال وکسرے باشد وتمام شد در خانقاہ قادریہ در دہلی کہ ایں بندہ خدمت میکند اورا وجاروب (می کشد) می افروزد چراغ آں را۔ وبود ابتدا وختم در یک مکان گویا در مجلس واحد تمام شد مقصود بیان توفیق الٰہی ست سبحانہ واعطائے وے استقامت مرا وتخصیص وے تعالیٰ بندۂ مسکین را بسلامت و عافیت والحمد للہ۔ اولاً وآخراً وظاہراً وباطناً حررت ہذہ الاسطر علی ید مؤلفہا الفقیر الحقیر عبد الحق

---

[۵] قیاساً ۱۲ سے ۵ حرف پڑھے نہیں گئے۔ بعد کو مکرر غور سے "مجلس واحد" الفاظ پڑھے گئے اور اصل مضمون میں بڑھا دئے گئے۔

بن سیف الدین القادری الدہلوی البخاری ضحوۃ یوم الجمعہ سنہ ۱۰۴۹ھ الف وتسع واربعین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین"۔

آخر میں سوال یہ ہو کہ حاضری درگاہ۔ فرد دۂ لسان الغیب اور اس نعمت کے حاصل ہونے میں کوئی بشارت ارتباط ہے؟ مصرع ؎

آن کس ست اہل بشارت کہ اشارت داند

(رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۳ء)

مکرر:۔ یہ نسخہ اس حالت میں ہاتھ آیا تھا کہ آب رسیدگی سے تمام اوراق چسپیدہ ہو کر کتاب ایک تودۂ کاغذ بن کر رہ گئی تھی۔ کوئی ورق جدا نہ تھا اخیر ورق کا نصف حصہ جس پر حضرت شیخ کی تحریر تھی بصد دشواری جدا کر کے عبارت پڑھی گئی تھی۔

کتاب خانہ آصفیہ حیدرآباد کے نوجوان صحاف غلام حسین مرحوم نے اُن تمام اوراق کو نہایت صفائی سے علیحدہ کیا۔ اور عہد جہانگیری کے نمونے کی جلد باندھ دی۔ میں نے اوراق کی علیحدگی پر حیرت ظاہر کی تو کہا بہت آسانی سے کھل جاتے ہیں۔ دیگچی میں پانی بھر کر آگ پر خوب جوش دیا جائے۔ اس کے منہ پر باریک کپڑا ڈھک کر کتاب کپڑے پر رکھدی جائے۔ بخارات نفوذ کر کے رطوبت پہنچاتے ہیں اور ورق اس کے اثر سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ غفرلہ

حبیب الرحمن
۱۳ ربیع الاول سنہ ۱۳۶۱ھ (مطابق ۳۱ مارچ ۱۹۴۲ء)

تذکرۂ مخزن الغرائب

ملا احمد علی ہاشمی سندیلہ کے باشندے گزشتہ صدی ہجری کی ابتدا کے فارسی اہل قلم میں سے ہیں میرزا قتیل کے شاگرد تھے۔ خادم تخلص تھا۔ انھوں نے فارسی کے شعرا کا ایک ضخیم اور حجیم تذکرہ لکھا ہے۔ تین ہزار سے زائد شعرا کا کلام اور حال ہے۔ سنہ ۱۲۱۸ ہجری میں ختم ہوا۔ "ختم صحف" تاریخ اختتام ہے۔ حال میں ایک عزیز کے ہاتھ آیا ہے۔ خریداری لطیفہ ہے۔ گفت وشنود کے بعد فی شاعر ایک پیسہ قیمت ٹھہری۔ اس شرح سے

کتاب تو چونی روپیے کی ہوگئی۔ مگر شاعر بیچارے "پیسہ اخبار" کے اسٹاف میں بھرتی ہوگئے۔

آمدم بر سرِ مطلب:۔ تذکرہ میں ذکر اور انتخاب تو معمولی ہے۔ معاصرین کے حالات البتہ وقیع ہیں۔ اُس عہد کے علم و فن کا ذکر ہوا اور دہلی مرحوم کی یاد تازہ نہ ہو، ممکن نہیں۔ ملّا احمد علی، نواب ذوالفقار الدولہ نجف خاں کی سرکار میں ملازم تھے۔ وہاں اہلِ کمال کا مجمع تھا۔ ان کو بھی استفادہ کا موقع ملا۔ اسی فیضِ صحبت کا نتیجہ یہ تذکرہ ہے۔

سرسری مطالعہ میں انشاء اللہ خاں۔ انشا کا حال نظر سے گزرا۔ حالات گرانقدر محسوس ہوئے آبحیات سے مقابلہ کیا۔ بعض واقعات کے لحاظ سے ظلمات اور نور کا فرق معلوم ہوا۔ ہدیۂ اہلِ نظر ہیں:۔

انشا۔ مخیر الدولہ حکیم ماشاء اللہ جعفری کے بیٹے تھے۔ نجفی الاصل۔ اُن کے والد نور اللہ نجفی۔ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ درویش منش تھے۔ ماشاء اللہ خاں نے دنیا کا جاہ و جلال پیدا کیا۔ طب میں کمال حاصل کرکے بنگالہ میں معرکہ کے علاج کئے۔ لڑائی کے معرکوں میں بھی نام پایا۔ سارا جسم جراحت گاہ تھا۔ مرشدآباد کی سرکار میں معزز تھے۔ اس دربار کو تنزل ہوا تو قاسم علی خاں کے عہد میں، نواب شجاع الدولہ کے دربار میں آئے۔ انیس ہاتھی ساتھ تھے۔ اگرچہ بے سروسامان تھے (یہ ہماری بے سروسامانی تھی) آج سر ہے اور سامان کا سودا۔ سوداوروں کا ہو زیاں ہمارا۔ آہ! "لسان العصر" (اکبر) تیری قبر رحمت سے مالامال ہو۔ کیا کہہ گیا ہے ؎

محفل اُن کی، ساقی اُن کا
آنکھیں میری، باقی اُن کا

خیر۔ قدردانی نہ ہوئی۔ ناقدری نے گوشہ نشیں کر دیا۔ پٹھانوں کے حال پر کرم فرمایا۔ فرخ آباد میں سکونت اختیار کی۔ منظفر جنگ خدمت کرتے رہے۔ وہیں رحلت کی۔ اور دفن ہوئے۔ نہایت فیاض اور سیر چشم تھے۔ اسی کے ساتھ بہت سادہ روش۔ زمین پر سوتے تھے۔ شب بیدار تھے۔ تذکرہ کی تالیف سے چند سال پیشتر انتقال کیا۔

سیاقِ کلام سے واضح ہوتا ہے کہ چندروز دہلی میں بھی محمد بیگ خاں ہمدانی کی سرکار میں رہے تھے۔

اور عزت سے رہے تھے۔ دربار شاہی سے تعلق ثابت نہیں ہوتا۔

انشاء اللہ خاں نے لڑکپن میں صرف و نحو، منطق اور حکمت کی کتابیں صدرا تک پڑھیں۔ سولہ برس کے سن میں نواب شجاع الدولہ کے دربار میں پہنچ کر ندیموں میں شامل ہوئے۔ اسی سن میں بے مدد اُستاد ہندی کا دیوان ردیف وار مرتب کر چکے تھے۔ عربی فارسی اشعار بھی بقدر چند اوراق کے لکھ لئے تھے۔ صورت جمیل تھی تقریر دل پذیر۔ سارے دربار میں کوئی حسنِ کلام میں اُن کا حریف نہ تھا۔ شجاع الدولہ کی عنایتوں نے محسود دربار بنا دیا تھا۔ چند روز کے بعد نواب نے وفات پائی۔ نواب آصف الدولہ کے دربار میں اراذل کا دور دورہ ہوا تو یہ کنارہ کش ہو گئے۔ چندے نواب نجف خاں کی سرکار میں رہے، کچھ دن بُندیل کھنڈ میں۔ باپ کے ساتھ کچھ زمانہ دلی میں محمد خان ہمدانی کی سرکار میں بسر کیا اور عزت سے بسر کیا۔ لڑائی کے معرکوں میں توپ، بندوق، اور تیر و تبر سے بے جگری سے سینہ سپر ہوتے رہے۔ زندگی تھی بچ بچ گئے۔ جے نگر میں کسی بات پر بگڑ کر محمد بیگ ہمدانی کے بھائی میرزا اسمعیل بیگ پر کٹا۔ نکال لی۔ اور جو زبان سے نکلا کہا۔ مرنے سے بال بال بچے۔ بالآخر لکھنؤ پھر آئے۔ عرصہ تک مرزا سلیمان شکوہ بہادر کی سرکار میں توسل رہا۔ نازک مزاجی نے وہاں بھی نباہ نہ ہونے دیا۔ وہاں سے علیحدہ ہو کر الماس علی خاں کی رفاقت میں رہے۔ بعد چندے یمین الدولہ مرزا سعادت علی خاں بہادر مبارز جنگ نے اپنے مصاحبوں میں شامل کر لیا۔ تذکرہ کی تحریر کے وقت اسی دربار میں تھے۔ دونوں وقت خاصے میں شریک ہوتے تھے۔ مؤلف تذکرہ کو انشا کی خدمت میں نیاز تھا، اور آغاز ملاقات سے شفقت فرمائی کا سلسلہ قائم۔ عالم آشنا پرستی میں انشا بے نظیر تھے۔ شعر ہندی میں طرز جدید کے موجد۔ اُن کی صحبت میں آدمی سارے غم بھول جاتا تھا۔ باوجود اس شجاعت و جوانمردی کے جن کا امتحان میدانِ رزم میں بارہا ہو چکا تھا، بزم میں اپنے آپ کو ایک بچے سے بھی زیادہ کم ہمت خیال کرتے تھے۔ کبھی مذاق سوجھتا ہے تو ناچیز سے آدمی سے دل لگی شروع کر دیتے ہیں۔ وہ چپ رہا تو خیر ورنہ وہ گالیاں دیتا ہے یہ ہنستے ہیں۔ کم مرتبہ آدمیوں سے یہ برتاؤ تھا۔ اسی کے ساتھ ہفت ہزاری کی یہ مجال نہ تھی کہ خلافِ مزاج کوئی بات زبان سے نکالے۔ ایک مرتبہ سالار جنگ کے بیٹے میرزا قاسم علی خاں کو سر دربار

جناب عالی کے رُو برو ایک شعر پر رُسوا کر ڈالا۔ چار زبانوں میں شعر کہتے تھے: ہندی، فارسی، عربی، ترکی۔ عربی عبارت، بے نقط۔ بتائے ہوئے مضامین پر چار چار ورق لکھتے چلے جاتے تھے۔ چند سورتوں کی تفسیر بھی بے نقط لکھی تھی۔ شعرائے معاصرین میں کبھی کسی سے نگاہ نیچی نہیں کی۔ صرف میرزا قتیل کو مانا۔ اُن سے الفاظ کی تحقیق کرتے تھے، اور اپنے اشعار کے حسن و قبح دریافت۔ احباب میں اُن کو ممتاز مانتے اور جانتے تھے۔ تحریر تذکرہ سے چند سال پہلے مصحفی ریختہ گو کو رُسوائے کوچہ و بازار کیا۔ گدھے پر سوار کرنا رہ گیا تھا۔ اور کوئی ذلت باقی نہ رہی تھی۔ خلاصہ عجیب آدمی ہیں۔ خدا سلامت رکھے۔

فارسی کلام کا نمونہ ؎ رباعی

گیرم کہ مُدام دیدہ ات پُر آب ست   وز سوز درون جان و دلت بیتاب ست

"انشاء اللہ" کام دل ے یابی   خوش باش۔ خدا مسبب الاسباب ست

"انشاء اللہ" کا لطف ماشاء اللہ۔ تذکرۂ آبحیات پہ بیانِ بالا سے حسب ذیل اضافہ ہوسکتا ہے:۔

انشا کے دادا کا ذکر۔ انشا کا سولہ برس کی عمر میں صاحبِ دیوان اور عربی فارسی شعر پر قادر ہونا۔ تعلیم کا اندازہ اُن کا مرد میدان اور نبرد آزما ہونا۔ زندگی کی بعض اور جزئیات۔ اُمور ذیل میں اختلافات ہیں:۔

اُن کے کشمیری الاصل ہونے کا ذکر نہیں۔ دربار شاہی سے اُن کا یا اُن کے والد کا تعلق ہونا نہیں پایا جاتا۔ لکھنو شجاع الدولہ کے عہد میں گئے نہ کہ آصف الدولہ کے عہد میں۔ بلکہ آصف الدولہ کے دربار سے ناقدری کے ہاتھوں کنارہ کشی کی۔ چونکہ مخزن الغرائب کے مؤلف انشا کے دوست قدیم اور ہمدم تھے اس لئے اُن کی تحقیقات پر وثوق بیجا نہ ہوگا۔ فقط

(رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ مارچ سنہ ۱۹۲۷ء)

ایک شروانی

امسال ہنگامۂ نمائش علی گڑھ کی چپقلش میں دلچسپی کی ایک زندہ چلتی پھرتی تصویر نظر پڑی۔ میرے دل کو یہ دیکھ کر ایک روحانی مسرت حاصل ہوئی کہ ہمارے خاندان شروانی کا ایک شخص گھوڑوں کی سوداگری کرتا وہاں وارد تھا۔ مجھ سے ملاقات ہوئی اور بوقت مکالمت معلوم ہوا کہ سوداگر مذکور شروانی تھا جن کی قرابت قریبہ سلیمان خیل وغیرہ سے (تماتھانئے غلزئی) سے ہے۔ اس بیان سے اُس روایت کی تصدیق ہوئی جو حیات افغانی وغیرہ میں شروانیوں کی نسبت درج ہے۔ اُس کا بیان تھا کہ ماں کی طرف سے ہماری قوم میں سید کا میل ہے۔ یہ لوگ ضلع قندھار میں دو مقام پر آباد ہیں۔ ایک چار منزل قندھار سے بجانب ہرات۔ اس مقام کا نام گرم سیر ہے اور اس جگہ قریب تین ہزار کے شروانی آباد ہیں۔ شروانی مذکور اسی مقام کا باشندہ تھا اور اُس کے گانو کا نام شلگر ہے۔ یہ لوگ اکثر زراعت پیشہ ہیں۔ کچھ اونٹوں کے ذریعہ سے معاش حاصل کرتے ہیں۔ دوسرا مقام ان کی سکونت کا قندھار کی جانب آخر یعنی اول الذکر آبادی کی سمت مقابل پر ہے۔ یہاں بھی اسی قدر نفوس رہتے ہیں اور وہی طرز زندگی ہے۔ شروانی مذکور کی حالت تمدنی عام افغانیوں سے بہت ممتاز تھی۔ گفتگو نشست برخاست کے آداب کا لحاظ بہت کچھ اُس کو تھا۔ یہ غالباً قرب خراسان کا اثر ہے۔ شروانیوں کے پڑوس میں دُرانی و اتنگ بستے ہیں۔ دُرانیوں سے معاندت ہے اور اُتنگ ان کے حلیف ہیں اور جب درانیوں سے معرکہ ہوتا ہے تو شروانی دُاتنگ متفق ہو کر اُن کے مقابل ہوتے ہیں۔ فقط

۷ رمضان مبارک سنہ ۱۳۱۱ھ

(غیر شائع شدہ)

مُسلم یونیورسٹی اور اسلامی آرٹ

ایڈیٹر صاحب انسٹی ٹیوٹ گزٹ! آپ کے ۱۲ر نومبر سنہ حال کے اخبار میں ایک عالم خاتون کے مسلم یونیورسٹی میں آنے اور اسلامی آرٹ پر اُن کے لیکچر ہونے کا تذکرہ ہے۔ اسی سال کے شروع میں ایک ہندو صاحب ذوق نے مسلمانوں کی مصوری پر مسلم یونیورسٹی میں لیکچر دیا تھا۔ قدرتی طور پر یہ پُرحسرت سوال دل میں پیدا ہوتا ہے کہ عیسائی اور ہندو اہل ذوق کی کرم فرمائی کے بعد خود مسلم یونیورسٹی نے اسلامی آرٹ کے متعلق اپنے فرض کا احساس کیا۔ صرف بیرونی اہل ذوق کے لیکچر سُن لینا شاید ایک یونیورسٹی کی علم پروری کی واضح دلیل نہیں ہے مسلم یونیورسٹی میں اسلامی آرٹ کے متعلق علم، تعلیم، ذوق اور نمونوں کا ایسا ذخیرہ ہونا چاہیئے تھا کہ اس ہنر کے قدردان اور طالب علم، اکتساب علم اور حصول ترقی کے لئے دور دراز ممالک سے یہاں آتے۔ یہاں کے لیکچر دینے والے دنیا کی یونیورسٹیوں میں بلائے جاتے۔ یہ تو ایک اعلیٰ معیار ہے۔ کم از کم ذوقِ ہنر ہی کارفرما ہوتا، اس سے بھی کمتر (بلکہ کمترین) درجہ یہ ہے کہ ذوق پیدا کرنے کی فکرِ صحیح ہوئی ہوتی۔ افسوس ہے کہ یہ بھی نہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ جو لیکچرار اسلامی آرٹ پر لیکچر دینے ہماری یونیورسٹی میں آئے ہیں انھوں نے ہمارے ذوقِ ہنر کی بے مائگی پر دل میں رحم کھایا ہے یا نفرت کی ہے۔ جب انھوں نے مسجد اور سرسید کورٹ کو دیکھ کر نسٹو سرکل کی عمارت دیکھی ہوگی تو ذوق ہنر کی ترقی کی داد بے ساختہ اُن کے دل سے نکلی ہوگی!!

آخر مضمون میں یہ مژدہ ہے کہ لیکچرار خاتون آرٹ کی ایک سوسائٹی بھی مسلم یونیورسٹی میں قائم کر گئی ہیں۔ معلوم نہیں پرسیر موقع اس سوسائٹی سے کیا توقعات ہیں۔ مگر تجربہ نے تو گزشتہ کانفرنس کے اجلاس میں ایک نکتہ سنج لیکچرار سے یہ کہلوایا تھا کہ "ہمارے کالج میں سوسائٹیوں کا گورستان انسانی گورستان سے کم آباد نہیں"۔ خاتون لیکچرار نے اپنا لیکچر "فانوسِ جادو" کی اعانت سے ذہن نشیں کیا تھا۔ فانوس جادو کے نقش ونگار سپید چادر پر اسی وقت تک نمایاں رہتے ہیں، جب تک روشنی کی محاذات

رہتی ہے۔ جب روشنی ہٹی تاریکی اور سادہ چادر کے سوائے کمرہ میں کچھ نہیں رہتا۔ مجھ کو اندیشہ ہو کہ کہیں یہی تماشا ہماری جدید آرٹ سوسائٹی نہ دکھائے۔ کاش کوئی یہ سمجھا دیتا کہ صرف فانوس جادو کی جلوہ گری ہنرپرور نہیں۔ فانوسِ سینہ میں شوق اور ذوق کی شمع روشن ہو تو کالج کے تمام در و دیوار ہنر کی نقش و نگار چادر بن جائیں گے اور وہ نقش "نقشِ حجر" ہوگا۔ اب جن لکچراروں کا تم منہ دیکھتے ہو وہ تمہاری چشم و ابرو کی جنبش سے، حرکات و سکنات سے ہنر کے نکتے حل کرنے آئیں گے اور تمہاری شاگردی پر نازاں جائیں گے۔

اسلامی آرٹ کا مفہوم بھی تفصیل طلب ہے۔ سب سے بڑا اسلامی آرٹ وہ "حسین زندگی" ہے جو عالم انسانی میں خالق جمیل کے جمال کامل کے پرتو سے جلوہ فرما ہوئی۔ اسلام ہی نے مخلوق کو بلا واسطہ خالق کے سامنے بٹھا کر یہ حسن و زیبائی زندگی میں پیدا کی، حبیب کبریا (روحی فداہ) کی حیات طیبہ حسن و جمال سے لبریز ہے اور اسلامی آرٹ کا اعلیٰ اور اشرف نمونہ۔ اس کے بعد قرآن و خالص اسلامی علوم ہیں۔ پھر اسلامی تاریخ ہے جو دلوں پر تصرف و فرماں روائی کی دل کش مثالوں سے معمور ہے۔ اس فرماں روائی کا کمال وہاں جلوہ افروز پاؤ گے جہاں ایک شخص تنہا بہ یک بینی و دوگوش جان بچانے کو اجنبی ملک[1] میں جاتا ہے، مگر وہاں جاکر ایک سلطنت قائم کر دیتا ہے جو پشتوں تک اور صدیوں تک قائم رہتی ہے، اور خوش حالی و فارغ البالی سے ملک کو رشک گلزار بنا دیتی ہے۔ کمال یہ ہے کہ دس بارہ برس کے لڑکے بھی ان فرماں رواؤں کے گروہ میں آن بان سے قدم جمائے کھڑے ملیں گے۔

اس کے بعد شاعری ہے، پھر عمارت و صنعت ہے، پھر خطاطی، سب سے آخر میں مصوری۔ چونکہ تصویر بنانا شرع میں ممنوع ہے اس لئے کم تر طبیعتیں اس جانب مائل ہوئیں۔ مگر اہل کمال نے حرفوں کے نقوش میں عالم تصویر دکھا دیا۔ ایک استاد خطاط کا قطعہ ہنر بیں نگاہ کو وہی ذوق بخشتا ہے جو ایک کامل مصور کی تصویر۔ عماد اور میر علی کے "عین" اور "صاد" میں انسانی حسین آنکھ کی دلربائی عیاں ہے۔

آپ کے اخبار میں عالم لکچرار خاتون کے لکچروں کا اعادہ یا خلاصہ نہیں۔ اس لئے معلوم نہیں

---

[1] اندلس (اسپین) امیر عبدالرحمٰن داخل ۱۲

ہوتا کہ اُن کے موضوع بیان کو وسعت کہاں تک تھی اور حقیقت سنجی کس حد تک۔ تقلیدی اور فیشن کے خیالات سے کہاں تک اُن کا تخیل آزاد تھا۔ تاج کا طرۂ امتیاز اٹلی کے سر پر رکھنے یا کم از کم اُس کا ذکر ہی کرنے سے تو فیشن زدہی کی بو آتی ہے۔ دلّی اور آگرہ میں اس خیال کی تردید مجسم موجود ہے۔ ہمایوں کا مقبرہ اور سکندرہ کے دروازہ کے چاروں مینار تاج کا نقش اول بنا رہے ہیں۔ یہ نکتہ یہاں کے آثار قدیمہ کے باخبر ناظم نے مجکو بتایا۔ شاہجہاں کی پاکیزگی مذاق نے ترتیب بدل کر کچھ ایسا طلسم باندھا کہ آگرہ میں اٹلی نظر آنے لگی۔ شاید یہی فانوس جادو کی جلوہ گری ہے۔ اگر دہلی اور آگرہ کے ساتھ کلکتہ بھی ملا لیا جائے تو ثبوت کامل ہو جاتا ہے۔ کلکتہ کا اضافہ کیوں؟ اس کو ارباب فہم سوچیں۔

خلاصۂ کلام۔ جب تک مسلم یونیورسٹی میں علم پرور آب وہوا اور ہنر آفریں فضا پیدا نہیں ہوتی اُس وقت تک "آرٹ کے لکچر اور سوسائٹیاں" فانوس جادو "سیمیائی جلوے ہیں جو نگاہوں کو خیرہ اور فیشن کے مذاق کو مسرور کرنے میں ضرور کامیاب ہو سکتے ہیں۔ مگر حقیقی ذوق پیدا نہیں کر سکتے۔ جب تک زمین قابل اور آب وہوا راس نہ ہو کوئی قلم ممکن نہیں، اُس کو رشک گلزار بنادے۔ [۵]

حافظؒ نشانِ مہر و وفا نیست در تبسّمِ گل
بنالِ بلبلِ بیدل کہ جائے فریاد ست

(مسلم یونیورسٹی گزٹ علی گڑھ مورخہ ۳ دسمبر ۱۹۲۴ء)

---

[۵] اشارہ بہ عمارت وکٹوریہ میموریل۔

تعلیم و تربیت

(مضمونِ ذیل ۲؍فروری ۱۹۳۵ء کو حسب فرمایش محبوب علی صاحب ناظم حیدرآباد دکن میں براڈکاسٹ کیا گیا)

آدمی دُنیا میں قابلیت کے خزانے لے کر آیا ہے۔ اسی قابلیت کی بدولت وہ ساری مخلوق سے اعلیٰ ہے۔ آسمانی کتاب میں فرمایا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ تمہارے واسطے ہے۔

قدرت نے آدمیوں میں طرح طرح کی قابلیتیں رکھی ہیں۔ کوئی ڈاکٹر بن جاتا ہے، کوئی حکیم، ایک شاعر ہو جاتا ہے تو دوسرا فلسفی۔

آپ دیکھتے ہیں کہ خزانے زمین کے اندر چھپے ہوئے ہیں۔ جواہرات، سونا، چاندی، کوئلہ، تیل غرض بیسیوں قسم کی کانیں ہیں جو زمین کے پردوں میں چھپی ہوئی ہیں۔ معدنیات کے ماہر زمین کو کھودتے ہیں۔ اس کے اندر سے کچی دھاتیں نکالتے ہیں۔ اُن کو پکاتے ہیں۔ صاف کرتے ہیں، جب اُن کے جوہر چمکتے ہیں۔ اور کام کے قابل ہوتی ہیں۔

کچھ ایسا ہی حال اُن خزانوں کا ہے جو انسان کے اندر ہیں۔ تعلیم کا اصلی کمال انہی خزانوں کا نمایاں کرنا اور اُن کو کارآمد بنانا ہے۔ ایک ماہر اُستاد دیکھتا ہے کہ اُس کے شاگرد میں قدرت نے کیا خاص قابلیتیں رکھی ہیں۔ وہ کاوش کرتا ہے کہ ان قابلیتوں کو صاف اور ظاہر کرے۔ بڑھائے۔ ترقی دے اور کارآمد کرے تاکہ اُس کا شاگرد اور دوسرے آدمی اُس سے فائدہ حاصل کریں۔

انسان میں دو طرح کی قابلیتیں ہیں۔ ایک علم کی۔ دوسری عمل کی۔ علم ہی کی شان تھی کہ انسان کو فرشتوں نے سجدہ کیا۔ شیطان نے غرور سے سر نہ جھکایا مردود ٹھہرا۔

ایک اُستاد کی تعلیم کی عظمت اس میں ہے کہ وہ شاگرد کی دونوں قابلیتوں کو پروان چڑھائے علم بھی سکھائے اور عمل پر بھی قائم کردے۔ علم کے سکھانے کے یہ معنی نہیں کہ کسی فن کے مسائل حافظہ میں جمع ہوں اور زبان پر رواں۔ بلکہ اس سکھانے کا کمال یہ ہے کہ علم نہ صرف شاگرد کے حافظہ میں

اور زبان پر ہو بلکہ اُس کا ذوق وشوق دِل کے راستہ سے روح تک پہنچے۔ اور دل و دماغ کا جزو بن جائے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک انسان کے دامن میں لذیذ اور جزوِ بدن ہونے والی غذائیں بھری ہوئی ہوں۔ نہ صرف بھری ہوئی ہوں بلکہ وہ وقتاً فوقتاً اُن کو دکھاتا بھی ہو۔ اُن کے فائدے بھی خوب بیان کرتا ہو۔ لیکن اُن کو کھا کر جزوِ بدن نہ بنائے اور اس طرح اُن کے فائدوں سے محروم رہے۔ یہ مثال اُن آدمیوں کی ہے جن کی تحصیل علم کی حد یہ ہو کہ علم کے مسائل حافظہ میں ہوں۔ اُن کا بیان زبان پر ہو۔ لیکن اُسی کے ساتھ دل اور روح علم کی لذت سے آشنا نہ ہوئے ہوں۔ اور علم دِل اور دماغ کے اندر پیوست ہو کر اُن کا جوہر نہ بن گیا ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ علم کی اصلی نعمت سے محروم رہے جس طرح عمدہ غذاؤں کا دامن میں جمع رکھنے والا اور اُن کی تعریف کرنے والا اُن کے حقیقی فائدہ سے محروم رہا۔

دوسرے انسان وہ ہیں جو عمدہ اور کارآمد غذاؤں کا ذخیرہ فراہم کرتے ہیں۔ حفظانِ صحت کے قواعد کی پابندی کے ساتھ اُن کو معدہ میں پہنچاتے، صحت آفریں ورزشوں کے ذریعہ سے اُن کو ہضم کر کے جزوِ بدن بناتے اور قوت وصحت حاصل کرتے ہیں۔ یہ مثال اُن طلبا کی ہے جو اپنے ماہر اُستاد کی تعلیم سے صحیح علم کا سرمایہ حافظہ میں محفوظ کرتے ہیں۔ علمی مسائل کی مشق اور تکرار سے نہ صرف اُن کو یاد کرتے ہیں بلکہ شوق اور ذوق کی گرمی سے اپنی روح و دماغ میں جذب کرتے ہیں بعینہٖ اُس طرح جس طرح معدہ کی گرمی سے غذا انسانی جسم کا جزو بنتی ہے۔ دل و دماغ علم کو جذب کر کے منور اور زندہ ہو جاتے ہیں۔ اُن میں یہ قدرت وقوت پیدا ہو جاتی ہے کہ جو سیکھا ہے اُس پر مضبوطی سے عمل کریں اور بنی نوع انسان کو اُس سے فائدہ پہنچائیں۔

آپ نے میرے اوپر کے بیان سے سمجھا ہو گا کہ کامل تعلیم وہی ہے جس کا نتیجہ علم سکھانا اور چھپے ہوئے صفاتِ انسانی کی تربیت کرنا ہے۔ تربیت کے معنی ہیں رفتہ رفتہ بڑھانا، پرورش کرنا، ترقی دینا اور اس طرح بڑا اور قوی بنا دینا۔

دیکھو مالی زمین کو سینچ کر، کھود کر اُس کے اندر کے بیج کو نازک پودے کی شکل میں زمین سے

اوپر لاکر اُس کی خدمت کرتا ہی۔ برابر سینچتا ہی۔ کھود لگاتا ہی۔ گھاس کوڑے سے اُس کی کیاری کو صاف کرتا ہی اور رفتہ رفتہ اُس نازک پودے کو جو گھاس کے مثل کمزور تھا ایک تناور درخت بنا دیتا ہی۔

درختوں کے مالی کی طرح انسانی صفات کا باغبان جو استاد معلم کہلاتا ہی اسی طرح اپنے شاگرد کی باطنی زمین کے اندر اُس کے اچھے صفات کے بیجوں کو اپنے فیض تعلیم سے نمایاں کرتا ہی اپنی شفقت کے اثر سے سینچتا ہی۔ بری عادتوں اور بدصفتوں کے زہریلے خس و خاشاک اور کانٹوں سے صاف اور اُس کے دل و دماغ اور روح کو پاک کرکے صفاتِ انسانی کے درخت کو قوی اور تناور بنا دیتا ہی۔

دیکھو اگر پودے کو پانی نہ دیا جائے اور اُس کی کیاری خس و خاشاک سے صاف نہ کی جائے تو اچھے اچھے پودے مرجھا کر سوکھ جاتے ہیں۔ جل کر خاک ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اگر انسانی صفتوں کی غور و پرداخت استاد شفقت سے نہ کرے، بد عادتوں اور بُری صفتوں کی اصلاح کرکے روح اور دل کو اُن سے صاف نہ کرے تو اعلیٰ اور اشرف صفاتِ انسان مثلاً راست بازی، غیرت، شجاعت، ہمدردی مُرجھا کر فنا ہو جائیں گے، اور انسان لکھ پڑھ کر عیار، خود غرض، نفسانی خواہشوں سے مغلوب، اور خودداری اور عزتِ نفس سے کورا رہ جائے گا۔ ظاہر ہی کہ ایسا انسان کیا عزت پا سکتا ہی، اور اصلی کامیابی کب حاصل کر سکتا ہی۔ پس جو تعلیم و تربیت کا حقیقی اہتمام نہ کرے اُس کے نتائج ایسے ہی نکلیں گے۔

ایک بات اور سن لینی چاہیئے۔ استاد کی تعلیم و تربیت پوری طرح فائدہ نہیں بخش سکتی جب تک کہ شاگرد کے ماں باپ اور خود شاگرد استاد کی مدد نہ کریں۔ اگر ماں باپ کی تربیت خراب ہوا اور وہ بچّہ کی عادت اور زندگی کی نگرانی صحیح قاعدہ کے موافق نہ کریں اور بچہ کی عادت اور طبیعت خراب ہو جائے تو ظاہر ہی کہ استاد کی محنت بہت کچھ ضائع ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر شاگرد اپنے سنتے ہیں اور اپنی تعلیم و تربیت میں استاد کی مدد نہ کرے تو استاد کی ساری کوشش بیکار رہے گی۔ اس پر تعجب نہ کرو کتنے طالب علم ہیں جو مدرسوں پڑھتے ہیں۔ استاد اُن پر محنت کرتے ہیں مگر وہ جاہل رہتے ہیں۔ وجہ یہ ہی کہ وہ دل نہیں لگاتے۔ محنت نہیں کرتے۔ استاد کی تعلیم کو دل نشیں

کرکے اُس پر عمل کی کوشش نہیں کرتے۔ طالب علم کے لئے لازم ہے کہ استاد کی تعلیم کو غور سے سُن کر اُس کو مُسلسل غور کی قوت سے دل پر نقش کرے اور اُس کے بعد اُس پر عمل کی پوری کوشش کرے۔ بُری خصلتوں کے چھوڑنے اور اچھی خصلتوں کے اختیار کرنے کی پوری سعی کرے اور اس طرح اپنا خود استاد اور مربی بنے۔

جو قوت عمل اور اعلیٰ خصلت اور کیریکٹر کی قدرت نے انسان میں رکھی ہے اُس کو حرکت میں لانے والے اور قوت بخشنے کے سرچشمے تین ہو سکتے ہیں۔ مذہب، بزرگوں کی مثالیں، ملک و وطن کی محبت۔ ہم کو کوشش کرنی چاہیئے کہ مذہب کے احکام کی صداقت کے عقیدت کے ساتھ پابند رہیں۔ اُس کی تعلیم کو اپنی روحانی اور اخلاقی پاکیزگی کا ذریعہ بنائیں۔ مذہب کو دوسرے سے لڑنے کا آلہ نہ قرار دیں۔ بلکہ اُس کو خود اپنی بُری صفتوں سے اور عیبوں سے جنگ کرنے کا ہتھیار بنائیں۔ خدا کے بندوں سے (خواہ وہ کسی مذہب کے پیرو ہوں) رحم ہمدردی اور انصاف کا برتاؤ کریں۔ صحیح تاریخ کے مطالعہ سے اکابر کے حالات کو دل پر نقش کریں اور اُن کو اپنے واسطے مثال اور نمونہ بنائیں۔ اور ان کی پیروی کی کوشش کریں خواہ کتنی ہی تکلیف برداشت کرنی پڑے۔ اپنے وطن اور ملک کی خدمت اور بہبودی کو نصب العین قرار دیں۔ اس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کے لئے تیار رہیں اور ذاتی نفع یا آرام کے لئے کبھی ملک کو دغا نہ دیں۔

اگر ہم اوپر کے بیان کئے ہوئے تینوں سرچشموں کے فیض سے اپنے دلوں کو سیراب کریں گے تو بالضرور ہماری تعلیم و تربیت کامل ہو کر ہم کو دنیا کا کارآمد انسان اور بنی نوع انسان کا کارآمد خادم بنادے گی۔ اور ہمارے اُستاد اور ہماری مادر درسگاہ ہمارے وجود پر فخر کریں گے۔ اور یہ ایک انسان کی بہترین سعادت اور عزت ہے۔

زلزلہ

مدت العمر میں اول مرتبہ جنبش زمین کا مجھ کو اُس روز ۴ جنوری ۱۸۹۴ء کو مشاہدہ ہوا۔ قریب مغرب میں باغ میں لب حوض کرسی پر بیٹھا ہوا تھا کہ دفعتہً مجھ کو کرسی متحرک محسوس ہوئی۔ میں سمجھا کہ کوئی شخص پشت پر کھڑا کرسی کو حرکت دیتا ہے میں نے پھر کر دیکھا تو کوئی نہ تھا حرکت اب بھی معلوم ہوتی تھی۔ اب مجھ کو یہ توہم ہوا کہ شاید میرا بدن ہلتا ہے میں

اسی تفکر میں تھا کہ جناب قبلہ گاہی صاحب نے (جو وہیں رونق افروز تھے) فرمایا کہ میری کرسی ہلی شاید زلزلہ آیا۔ وہیں میرزا وحید الدین حیدر بیٹھے تھے انہوں نے بھی اس کی تصدیق کی اتنی باتیں جتنے عرصے میں ہوئیں اُتنے زمانہ تک حرکت محسوس ہوتی رہی۔ حرکت بہت خفیف لیکن خوب محسوس تھی اور تھم تھم کر ہوتی تھی اُس کی سمت شمال سے جنوب کو معلوم ہوتی تھی۔ بعد دریافت منکشف ہوا کہ گڑھی کے اندر اور حویلی میں بھی اس جنبش کی حس لوگوں کو ہوئی۔ اخباروں کے ذریعے سے واضح ہوا کہ اُسی شام کو الہ آباد لکھنؤ رانی کھیت وغیرہ میں بھی یہ حرکت محسوس ہوئی تھی لیکن سب مقاموں پر بے ضرر۔

(۹ جنوری ۱۸۹۴ء) (غیر شائع شدہ)

صحیح مسلم کا ایک قلمی نسخہ

مدت سے معارف کے صفحات کتاب خانہ حبیب گنج کی کارگزاری کے بیان سے خالی ہیں۔ عدم کارگزاری باعث نہیں بلکہ عدم بیان ہے۔ تھوڑی سی تلافی مافات کی جاتی ہے۔

بلگرام دارالکرام کے اعیان میں ایک نامور صاحب السیف والقلم روح الامین خان تھے۔ مآثر الکرام میں میر آزاد مرحوم نے حسب ذیل اُن کا حال لکھا ہے:۔

"روح الامین خاں۔ شیخ عثمانی باشندہ محلہ قاضی پورہ تھے۔ فنونِ عربی، فارسی، ہندی میں یکتا حسنِ خلق میں ممتاز۔ ظریف طبع، خوش بیان، لطیفہ سنج۔ حافظہ بہت قوی تھا۔ مذکورہ بالا تینوں زبانوں کے اشعار قصائد اور مثنویاں طولانی از بر تھیں۔ اسی طرح مسائل علمی اور حکایات جس علم کا سوال کوئی کرتا جواب حاضر..... سید العارفین سید لطف اللہ قدس سرہ سے بیعت تھی۔

معنوی صفات کے ساتھ حسن ظاہری میں بھی بلند پایہ رکھتے تھے۔ سخاوت و شجاعت کا شہرہ تھا امیرانہ شان سے زندگی بسر کی۔ کچھ دن پنجاب کے بائیں محال کے جن میں سیالکوٹ اور جالندھر

بھی شامل تھے حاکم رہے۔ اودھ کے نائب صوبہ دار رہے۔ بالآخر برہان الملک سعادت خان کی رفاقت اختیار کی۔ باوجود ان تمام مشاغل کے کتاب کبھی ہاتھ سے نہ چھوٹی۔ آخر عمر میں (کہ ستر برس سے زیادہ سن ہو چکا تھا) صحیح بخاری اور صحیح مسلم اپنے ہاتھ سے لکھیں اور محشی کیں عجیب استغراق حدیث شریف کی خدمت کا نصیب ہو گیا تھا۔ انجام کار ۱۱۵۱ھ میں پانی پت کے معرکۂ نادری میں مردانہ لڑ کر سرخرو ہوئے۔ع "سال ہجرت یک ہزار و یک صد و پنجاہ و یک"[۱] ۔
صوری و معنوی تاریخ ہے۔

حسن اتفاق۔ نصیب حبیب۔ مذکورۂ بالا دو پاک نسخوں میں سے ایک یعنی صحیح مسلم میرے کتاب خانہ کا شرف افزا ہوا۔ یہ نسخہ ۱۴۔ انچہ طویل اور ۱۰۔ انچہ عریض ہے۔ تعداد اوراق ۲۰۰۔ سطریں فی صفحہ ۳۷ ہیں۔ اول سے آخر تک سراپا محشی ہے۔ حواشی میں رجال، حل لغات، تحقیق مطالب، سب ہی کچھ ہے۔ نسخ و شفیعہ دونو خط پاکیزہ و پختہ ہیں، نیز جلی۔ ابتدا میں حسب معمول متعدد اوراق پر متعدد فوائد لکھے ہیں۔ نقل کی کیفیت خود کاتب روح الامین خان کے قلم کی زبانی سنو۔ خاتمہ میں لکھتے ہیں۔ (خلاصۃً)

"اس نسخہ کی نقل ۱۴۔ رجب۔ روز پنجشنبہ کو شروع کی۔ ذیقعدہ کی ۱۹ کو ختم ہوا ۱۱۴۵ھ تھا اس طرح چار ماہ پانچ دن میں کتاب ختم ہوئی۔ "کاتبہ بندۂ روح الامین بلگرامی" سے سنہ کتابت نکلتے ہیں۔

"جب میں حضرت صحیح بخاری کے لکھنے سے فارغ ہوا تو حضرت صحیح مسلم کی تلاش میں بہت دن تک شب و روز مشغول رہا۔ دو سال کی جستجو کے بعد شاہجہان آباد میں ایک نسخہ ملا۔ مگر صحت اطمینان کے قابل نہ تھی۔ اس لئے نہ خریدا۔ اتفاقاً ۱۱۴۵ھ ہجری میں الہ آباد جانا ہوا۔ وہاں بھی تمام مدارس میں تلاش کیا۔ بالآخر سیدی و سندی محمد فاخر کے مدرسہ میں ایک نسخہ ملا۔ کیسا نسخہ۔ خالص عربی نژاد عجمی اس کے پڑھنے سے عاجز۔

نقطہ اور اعراب کا نام نہ تھا۔ دو سطریں بھی پڑھنا خون جگر کھانا تھا۔ ایک صفحے میں سطریں ۵۵ سے بھی زیادہ تھیں۔ پڑھتے پڑھتے نظر سے غائب ہو ہو جاتی تھیں۔ تاہم میں نے ہمت کی۔ بارگاہ نبوی سے

---

[۱] آخر عمر میں (جب کہ سن ستر برس سے زائد ہو چکا تھا) صحیح مسلم ۱۱۴۳ھ میں لکھی۔ اس کے لکھنے کے سات برس بعد ۱۱۵۱ھ میں وفات پائی اس طرح اندازاً اسی برس کی عمر ہوئی۔ اور اس سن میں شمشیر بکف میدان جنگ میں معرکہ آرا ہو کر سرخ رو ہوئے۔ حبیب الرحمٰن۔ ۹ ربیع الاول ۱۳۶۲ھ

اعانت چاہی۔ اول کتاب کو من اولہ الی آخرہ پڑھا۔ اب وہ اتنی آسان ہوگئی کہ گویا خود میں نے لکھی تھی۔ اس کے بعد نقل کی جرأت کی۔ بفضلِ خدائے تعالیٰ چار مہینے میں ختم ہوگئی۔ اس عمر میں کتابیں میں نے بہت لکھی ہیں۔ مگر اُن میں سے زیادہ آخرت چارہ ہو سکتی ہیں۔ دو تفسیریں۔ تفسیر حسینی اور معالم التنزیل اور حدیث میں صحیحین۔ "منقول عنہ نسخہ" مدینہ شریف میں مسجد نبوی کے باب السلام میں لکھا گیا تھا۔ ہندوستان میں ایسا صحیح نسخہ کم آیا ہے۔ یہ نسخہ ۹۲۳ھ کا لکھا ہوا بقلم یوسف بن محمد الوارث حنفی ہے"۔

بیان بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس عہد کے دنیا دار بھی کیسے بالغ نظر صاحبِ کمالات ہوتے تھے اہم واقعہ یہ ہے کہ اُس عہد میں کتبِ حدیث کی نایابی کا کیا حال تھا۔ صحیح مسلم کا صحیح نسخہ دو برس کی تلاش میں بھی شاہجہاں آباد میں نہ مل سکا۔

آج حدیث کی کتابوں سے ہندوستان کے کتاب خانے معمور و پُر نور ہیں۔ اللہ تعالےٰ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اور اُن کے خاندان کی قبروں کو منور اور روشن فرمائے کہ یہ انھیں کی مساعی حسنہ کا نتیجہ ہے۔

(رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ فروری ۱۹۲۹ء)

کلامِ خواجہ سنائی غزنوی

ستمبر سنہ حال کے معارف میں یہ مژدہ نظر سے گزرا کہ افغانستان کے ادیب فاضل سرور خاں گویا نے حکیم سنائی کے کلام کا ایک نہایت نادر و قدیم مجموعہ دریافت کیا ہے۔ اگرچہ معارف کے فاضل مدیر نے اس انکشاف پر خوش ہونے کا "حق فضلائے ہندوستان" کے لئے مخصوص فرما دیا ہے تاہم سرخوش نادانی شروانی بھی بیحد خوش ہوا۔ دو وجہ سے۔ اول ایک بیش بہا علمی سرمایہ کی دریافت پر۔ دوم اپنے وطن کے اس فخر پر کہ وہاں وہ گوہر شاہوار تاباں ہوا جس سے ایران کا دامن خالی نکلا ہر چند شروانی کے بزرگوں کو نواحِ قندھار سے آئے ہوئے پانسو برس ہو چکے تاہم للہ الحمد حبِ وطن کی چنگاری ہنوز سینے میں زیر خاکستر دوری دبی ہوئی ہے۔ قرطِ تحریر میں جب یہ مایہ شروانی نے اپنی گدڑی کو ٹٹولا تو الحمد للہ چند لعلِ بے بہا اس میں سے بھی نکلے۔ معارف پرور قلوب کی ضیافت کے لئے اُن کے جوہر ذیل میں نمایاں کرتا ہوں۔ یہ ضیافت مدیر معارف کی صحت یابی کی نذر تصور فرمائی جائے۔

حبیب گنج کے کتاب خانے میں چھ نسخے کلام سنائی کے ہیں۔ ۲ دو مطبوعہ۔ ۴ چار قلمی۔

مطبوعہ میں:- ۱- پہلا نسخہ مثنوی حدیقہ سنائی کا ہے جو سنہ ۱۸۸۵ء میں مطبع نولکشور میں چھپا تھا۔ اس میں خاص بات وہ دیباچہ نثری ہے جو خود سنائی نے حدیقہ پر لکھا تھا۔ مطبع نے اس کو شارح حدیقہ و مثنوی معنوی خواجہ عبداللطیف عباسی کی شرح سے نقل کر کے فیض عام کر دیا ہے۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ خواجہ موصوف کی شرح حدیقہ مسمّٰی بہ لطائف الحدائق حاشیہ پر چڑھا دی ہے۔ شارح عباسی نے شرح کے مقدمے میں نسخہ حدیقہ کے اہتمام تصحیح کی تشریح کرتے ہوئے اس نسخے کا ذکر کیا ہے جو دور اکبری کے امیر عزیز خاں کوکلتاش نے حکیم سنائی کے مزار سے حاصل کیا تھا اور جو عہد مصنف کے قریب ہی زمانہ میں لکھا گیا تھا۔ مطبوعہ نسخہ جلی قلم خوشخط ہے۔

۲- دوسرا نسخہ مطبوعہ وہ ہے جو نواب علاؤالدین خاں علائی والی لوہارو نے اپنے مطبع فخر المطابع واقع لوہارو میں چھپوایا تھا۔ خود تصحیح کی تھی۔ خود شرح بھی لکھی تھی جس کا نام طریقہ بر حدیقہ ہے اور جو حاشیے پر چڑھی ہوئی ہے۔ یہ سنہ ۱۲۹۰ھ مطابق سنہ ۱۸۷۳ء میں لکھی گئی۔ ایک خاص لطف اس نسخہ کا یہ ہے کہ علائی مرحوم کی طرف سے قاضی حسام الدین احمد سکندر آبادی کو ہدیۃً بھیجا گیا تھا۔ یہ نسخہ صرف مقصد اول تک چھپا ہے۔

قلمی نسخوں میں:- ۳- ایک نسخہ مثنوی حدیقہ کا ہے۔ یہ نسخہ سنہ ۱۰۳۷ھ کا لکھا ہوا ہے۔ مقابلہ شدہ ہے۔

۴- دوسرا قلمی مجموعہ قصائد وغیرہ کا ہے جو بلحاظ خط و کاغذ نوادر میں سے ہے۔ سنہ ۱۰۰۵ھ میں امام علی کرمانی نے لکھا تھا۔ پورے ساڑھے تین سو برس ۳۵۰ گزر جانے پر بھی کاغذ کی آب و تاب اور مضبوطی قابل دید ہے۔ اس میں پانسو چوبیس ۵۲۴ صفحے ہیں۔ ان میں سے ۲۵۰ صفحوں پر قصائد و غزلیات ہیں۔ ۱۶ صفحے ہجویات کے ہیں۔ ہجو کے بعد مرثیے ہیں۔ مرثیوں کے بعد مقطعات۔ مقطعات کے بعد رباعیات۔ رباعی میں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ ردیف و قافیہ چاروں مصرعوں میں یکساں ہے۔ رباعیات پر نسخہ ختم ہو جاتا ہے۔

۵- تیسرا قلمی مجموعہ جس کا حجم چھ سو چھ ۶۰۶ صفحات کا ہے سنہ ۱۰۱۲ ہجری میں بمقام آگرہ لکھا گیا۔ کاتب کا نام نہیں۔ اس مجموعہ میں اول قصائد ہیں جو حمد، نعت، الزہد والحکمۃ اور مدح میں ہیں۔ قصائد کے بعد غزلیات ہیں (جو بہ ردیف الف مرتب نہیں) غزلیات کے بعد ملمعات، ہجویات، قطعات و رباعیات ہیں۔ اس حصہ کا نام الحدائق فی الخلائق ہے۔ دوسرا حصہ جو مستقل رسالے کی شکل میں ہے المسمّٰی بہ "کارنامہ بلخ بہ غزنین فرستادہ"۔ تیسرا حصہ مثنوی مسمّٰی بہ سنائی آباد و حدیقۃ الحدیقہ۔ چوتھا حصہ کنوز الرموز۔ اس مثنوی سے پہلے ایک قصیدہ شیخ الاسلام محمد بن منصور کی مدح میں ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس مجموعہ کے بعض حصے اول و آخر سے کم ہیں۔ اس لئے کہ اس کی ابتدا اگرچہ بسم اللہ سے ہے تاہم شروع

کا عنوان ہے "قسم دوم در توحید رب العالمین جل جلالہٗ" آخری حصہ کا عنوان ہے قسم دہم مثنویات۔ اول کنوز الرموز دوم سیر العباد الی المعاد۔ دو مراتب حال انسانی" آخری دو مثنویاں مجموعۂ ہذا میں نہیں ہیں۔ صرف کنوز الرموز ہے۔

(۴) چوتھا قلمی نسخہ مکاتیب سنائی کا ہے۔ تقطیع چھوٹی۔ خوشخط نسخ۔ ۱۲ خط ہیں۔ ایک خواجہ احمد بن مسعود کے نام جن کی فرمایش سے حکیم سنائی نے اپنا دیوان مرتب کیا تھا۔ ایک خط خواجہ قوام الدین وزیر عراق کے نام ہے۔ ایک حکیم عمر خیام کے نام باقی علیٰ ہذا القیاس۔ حکیم عمر خیام کے القاب میں "فرید الزمانی فریع الدہر" لکھا ہے۔ درمیان خطا میں ایک جگہ "پیشوائے حکیماں" کے لفظ سے خطاب کیا ہے۔ مکاتیب کی تحریر کا سنہ اور کاتب کا نام درج نہیں خط اور کاغذ کے انداز سے نسخہ قدیم معلوم ہوتا ہے۔

(رسالہ معارف اعظم گڑھ ماہ دسمبر ۱۹۳۶ء)

المبین[1]

(ریویو)

تقریباً چالیس برس کا زمانہ گزرتا ہے علامہ شبلی مرحوم کی تحریک سے میں نے جرجی زیدان کا رسالہ الہلال خریدنا اور پڑھنا شروع کیا تھا۔ ایسا خیال ہوتا ہے کہ ایک آدھ مرتبہ مراسلت بھی ہوئی۔ اس زمانہ میں اعتدال اور وسعت مشرب کے لحاظ سے الہلال کے مضامین قابل پسند ہوتے تھے۔ علامہ مرحوم نے بھی اس کی تعریف ایک بار سے زیادہ فرمائی تھی۔ رفتہ رفتہ طبیعت کا اصلی رنگ نمایاں ہوتا گیا۔ اور یہ صاف نظر آنے لگا کہ "مدیر الہلال" کو عربوں سے نفرت نہیں، تو کاوش ضرور ہے۔ اسی لئے بنی امیہ کی خلافت کی تنقیص اور خلافت عباسیہ کی توصیف اس کا شعار تھا۔ علیٰ ہذا القیاس اسی عرصہ میں ایک سے زیادہ ناول اس کے شائع ہوئے۔ ان میں بھی متمدن پیرایہ میں عرب اور اسلام کی منقصت پیش نظر رہتی تھی۔ لیکن یہ تدلیس اس قدر دل فریب ہوتی تھی کہ خود مسلمان اس کے احساس سے عاری رہتے تھے۔ چنانچہ ان میں سے ایک سے زیادہ کا ترجمہ خود مسلمانوں نے کیا۔ اور ہاتھوں ہاتھ بکا۔ بالآخر علامہ مرحوم نے اس کو ضروری سمجھا کہ مسلمانوں کو خصوصاً اور اہل علم کو عموماً جرجی زیدان کی تدلیس سے بچائیں۔ عربی زبان میں ایک رسالہ لکھا اور نقادانہ انداز میں جرجی زیدان کی غلط بیانیوں اور تدلیسات کو واضح کیا۔ یہ رسالہ مصر میں طبع ہو کر شائع ہوا تو شیخ رشید رضا (مدیر المنار) نے بہت

[1] ملنے کا پتہ: مطبع شروانی، علی گڑھ۔

گرم جوشی سے اُس کا خیر مقدم کیا اور لکھا کہ "خود وہ اس ضرورت کو محسوس کر رہے تھے۔ لیکن جرجی زیدان کی تدلیسات اور فریب کا دائرہ اس قدر وسیع تھا کہ اس کو قابو میں لاکر تردید کرنا ممکن نہ ہوسکا۔ مولانا شبلی کی قوتِ دماغی قابلِ داد ہے کہ اُنھوں نے قابو پاکر یہ علمی خدمت ادا کی۔ اور اہلِ علم کو دھوکا کھانے سے بچا لیا۔" یہ تو پارینہ داستان تھی۔ المبین کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ جہاں الہلال کے ذریعہ سے عربی تمدن، تاریخ اور دین کی بیخ کنی کی جاتی تھی وہاں فلسفۃ اللغتہ العربیہ عربی زبان کی عظمت کو مٹانے کی کوشش ہے۔ بہر حال عربوں سے وحشت کا یہ بھی ایک انداز ہے۔ مباحث کا جو خلاصہ المبین میں ہے اُس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج تمدن کے مقبول و محبوب انداز وطرزِ استدلال سے فلسفۃ اللغتہ العربیہ کے مؤلف نے بھی فیض پایا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ "ضرورت کے وقت جزئی کو کلی کر دینا۔ خاص کو عام بنا دینا۔ اپنے قیاس کو واقعہ کا جزو یا واقعات کی کڑی قرار دیکر حقائق کو اُن کی اصلیت سے پھیرنا۔ اُن سے اپنے موافق نتیجہ نکال لینا۔" محولۂ بالا جو خدمتِ علمی پہلے مولانا شبلی مرحوم نے ادا فرمائی تھی اُس کی تکمیل گویا المبین کے مؤلف مولانا سید سلیمان اشرف صاحب کے قلم سے ہوئی اور ممدوح نے خصوصاً اہلِ لغت پر احسان فرمایا ہے کہ اُن کو ایک سخت مہلک مغالطہ سے بچالیا ہے۔ المبین میں صرف یہی نہیں ہے کہ جرجی زیدان کی لغزشوں اور غلط کاریوں کی تصحیح وتسدید فرمائی گئی ہے بلکہ عربی زبان کی خصوصیات اس کاوش اور تحقیق سے قلمبند فرمائی ہیں کہ بے مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک ایسا نیا فن مدوّن فرما دیا ہے جس کے دُھندھلے سے متفرق آثار اگلوں کی تصانیف میں نظر آجاتے تھے۔

المبین کے سات باب ہیں۔ اُن میں حروف کی بحث سے لیکر کمالِ گویائی تک تمام مدارج اور منازل میں عربی زبان کی فضیلت و عظمت اس خوبی سے بیان فرمائی ہے کہ پڑھنے والا محوِ حیرت رہ جاتا ہے۔ یہ نہ خیال فرمایا جائے کہ فضائل کا قصیدہ پڑھا گیا ہے یا خطبہ دیا گیا ہے۔ نہیں۔ علم اصولِ لغت، فلسفہ اور منطق، تعمق نظر اور قوتِ بحث سے حقائق کو واضح اور منکشف فرمایا ہے۔ درس نظامی کی استعداد آفرینی علمی حلقوں میں مسلّم ہے۔ مگر المبین کو پڑھ کر واضح ہوا کہ درس مذکور نہ صرف استعداد آفریں تھا بلکہ مجتہدانہ قوت بھی پیدا کر سکتا تھا۔ المبین میں مؤلف محقق کے قلم نے اُن دشوار گزار میدانوں کو فاتحانہ طے کیا ہے

جن کا نشان بھی اگلی کتابوں میں نہیں۔ اور اگر ہے تو جیسا میں نے اوپر عرض کیا مجمل اور مبہم سا۔ لفظ "قطن" کی بابت (جہاں جرجی زیدان نے قلم رکھ دیا تھا) تو ایسا دقیق نکتہ زیب قلم ہوا ہے کہ جس کو پڑھ کر قلب پر وہی کیفیت طاری ہوتی ہے جو برجستہ شعر کے سننے سے طاری ہوتی ہے۔ عربی زبان سے گو مجھے تھوڑا بہت تعلق نصف صدی سے ہے۔ مگر جو مضامین المبین میں پڑھے کبھی اس کا واہمہ بھی نہ ہوا تھا کہ زبان عربی ان حقائق و معارف سے مالا مال ہے۔ بیان اتنا مدلل اور صاف ہے کہ ذہن بے تکلف اس کو قبول کرتا ہے۔ ہاں عناد و ضد کا علاج نہیں۔ دقیق علمی مضامین کو اس قدر واضح بیان کر دینا مؤلف المبین کا حصہ تھا۔

مصنف علّام نے المبین کو سات بابوں پر تقسیم کیا ہے۔ بے مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک زبان کی حقیقت واضح کرنے کے واسطے جتنے پہلوؤں سے بحث کی جا سکتی ہے وہ تمام پہلو ان ابواب میں زیر بحث آ گئے ہیں۔ حرف سے لیکر معانی کے فلسفہ تک کلام کے تمام مراتب پر بحث کی گئی ہے۔ بحث میں ایک حکیم کی دقت نظر، ایک ادیب کے ذوق، ایک لغوی کی ہمہ گیری سے کام لیا گیا ہے۔ اور جو دعویٰ کیا گیا ہے اس کے ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ کتاب پڑھنے والوں کے واسطے بلند مرتبہ حکیمانہ مطالب کا ذخیرہ مہیا کیا گیا ہے جن کو کشادہ دلی سے پڑھ کر انسان زبان عربی کے کمالات کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہ سکتا اور اس کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ عربوں کا دوسرے ملک کے باشندوں کو عجمی کہنا بیجا نہ تھا۔ اور یہی مصنف کا مقصد ہے۔ اب ہم ساتوں بابوں کے مباحث کی مختصر کیفیت پیش کرتے ہیں تاکہ اہل نظر "نمونے" سے اندازہ فرما سکیں کہ خروار کیسا ہے۔

باب اول میں عربی زبان کے مخصوص فضائل ہیں۔ ان میں سب سے اول وضع لغت کے معرکۃ الآرا مسئلے سے بحث کی ہے اور اس بارے میں جو مختلف اقوال ہیں ان کو مفصل بیان کیا ہے۔ ان کا خلاصہ چار قول ہیں۔ اول الہامی یعنی انسان اپنی گوناں گوں قابلیتوں کے ساتھ گویائی کی قابلیت بھی اپنے اندر لے کر اس عالم میں آیا۔ دوسرا قول۔ خارجی آوازوں سے متاثر ہو کر ان سے الفاظ بنا لیے۔ خارجی آوازیں اور جانوروں کی تھیں۔ یہاں ایک دلچسپ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ یہ کس تاریخ سے ثابت ہے کہ اس خاکدان میں اول چرند و پرند آئے ان کے بعد انسان۔ اس سے بھی زیادہ دقیق سوال یہ

ہو سکتا ہے کہ انسان الفاظ کے وضع کرنے میں فضائے عالم اور جانوروں کی آوازوں سے سبق حاصل کرنے کا محتاج تھا۔ اُن سے یہ سبق پڑھا۔ لیکن دوسرے گوناگوں کمالاتِ عالیہ کا خزانہ انسان کے دل و دماغ میں بھرا ہوا ہے۔ مثلاً فکر اور فکر کے بعد ترتیبِ مقدمات۔ اور ترتیب مقدمات کے بعد اخذ نتائج اور اخذ نتائج کے بعد اُن پر عمل۔ یہ تمام سبق انسان نے کس سے حاصل کئے۔ ظاہر ہے کہ اس کے سکھانے سے تو تمام ماحول عاجز و ساکت ہے۔ اس صورت میں ضرور یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ جہاں تمام کمالات کے خزانے فطرتِ انسانی میں ودیعت تھے وہاں کلام کا بھی کمال تھا۔

اسی ضمن میں ایک قول یہ بھی ہے کہ خود اپنی فطری آوازوں سے وضع الفاظ کا سبق سیکھا۔ مثلاً شدت کرب میں "چیخ" درد میں "ہائے" "واے"۔ خوشی میں "واہ"۔

تیسرا قول۔ عالم میں جو آواز بھی کہیں پیدا ہو وہ مختلف چیزوں کے باہم ٹکرانے سے پیدا ہوتی ہے۔ انسان کی ادراک کرنے والی قوتوں نے جن مختلف خیالات سے ٹکریں کھائیں تو اُن ٹکروں سے باطنی آوازیں دماغ میں پیدا ہوئیں۔ آوازیں زبانوں تک آکر لفظ بن گئیں۔

عربی زبان کی خصوصیات کے تحت میں اوّل مخارج سے بحث کی ہے جو کلام کی سب سے پہلی منزل یا سیڑھی ہے۔ بدیہی طور پر ثابت کر دیا ہے کہ قدرت نے جس قدر مخرج انسان کے اندر حروف کے رکھے تھے اُن سے پورا پورا کام صرف عربوں نے لیا۔ غیر عرب ان میں سے اکثر کو غیر مستعمل چھوڑ کر ہاتھ سے کھو چکے۔ ایک واقعہ یاد آگیا۔ ایک یوروپین عالم کو (جو عربی زبان کے امتحانوں میں کامیاب تھے) دعویٰ تھا کہ وہ عین اُس کے مخرج سے ادا کر سکتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک ہاتھ کے انگوٹھے سے حلق کی جڑ کو دباتے تھے اُس کے بعد زور کر کے اُس مقام سے آواز نکالنے کی سخت کوشش کرتے تھے۔ چہرہ سُرخ ہو جاتا تھا آنکھیں نکل آتی تھیں۔ مگر عین کی پوری آواز نہ نکلتی تھی۔ کچھ ضرور ادا ہو جاتی تھی۔ مخارج کے بعد حروف کے صفات بیان کئے ہیں۔ اس خصوصیت میں بھی عربی زبان صاف ممتاز ہو جاتی ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ مصنف نے یہ خصوصیات خود تراش لی ہیں جیسے اُن کے مقابل حریفوں کا عمل ہے۔ بلکہ ان قوانین پر بحث کی بنیاد رکھی ہے جو صدیوں کی تحقیق کے بعد ثابت اور مدوّن ہو چکے ہیں۔ اس بحث کے

مختلف پہلو پڑھنے اور پڑھ کر لطف اٹھانے کے قابل ہیں۔

دوسرے باب میں مخارج وصفات کی بحث کو اور زیادہ وسیع کیا ہی جس سے گویا وہ جدید بحث بن گئی ہی۔ اسی کے ساتھ اعراب سے بھی بحث کی ہی۔ اس باب میں دکھایا ہی کہ الفاظ میں حروف کی کمی بیشی یا حرکات کی خفّت وشدّت سے کس طرح اُن کے معانی میں مختلف مراتب خفّت وشدّت کے پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور اس سے ثابت کیا ہی کہ عربی میں الفاظ کے اعراب اور حرکات کی وضع بھی ضابطہ وقانون سے خارج نہیں۔ بلکہ واضع نے اُن کو معانی کے تغیر وتبدل کا اسی طرح آلہ بنایا جس طرح اُن کی صورت کے تغیر وتبدل کا۔ جس طرح یہ بات بلحاظ اپنے مطالب کے پہلے باب سے زیادہ بلند اور دقیق ہی اُسی طرح اُس کی بحث اور اُس کا استدلال بھی زیادہ بلند پایہ ہی۔ اور یہ مؤلف علاّمہ کی تحریر کی خصوصیت ہی کہ جس قدر آیندہ ابواب میں دعوے بلند تر ہوتے گئے ہیں اُسی قدر اُن کی دلیل بلند ومضبوط ہوتی گئی ہے۔ اور مطالب کی دقّت، بیان کی صفائی کی بدولت۔ فہم کے لئے مشکل نہیں بن جاتی بلکہ آسان اور سریع الفہم رہتی ہے۔

اول اور دوسرے باب میں مفرداتِ حروف کی بحث سے فارغ ہو کر تیسرے باب میں ترکیب حروف سے بحث کی ہی۔ اور یہاں بھی محض قیاسات سے نہیں، دلائل سے ثابت کیا ہی کہ مختلف حروف کس طرح باہم مل کر اپنی مخصوص ترکیب سے اپنے معانی کا نشان دیتے ہیں۔ اور جس طرح علم کیمیا کا ایک ماہر ثابت کرتا ہی کہ کن صفات کی دو مختلف چیزیں باہم مل کر ایک خاص تیسری چیز پیدا کریں گی اسی طرح اس فن کا ماہر بتا دے گا کہ عربی میں جب فلاں صفات کے حروف سے لفظ بنے گا اُس میں فلاں معنی ہوں گے اگرچہ اُس نے لغت میں اُس لفظ کے معنی نہ دیکھے ہوں۔ اس بحث میں اول حروف کے صفات بتلائے ہیں جو علم تجوید میں ثابت ہیں۔ اُس کے بعد دکھایا ہی کہ کس طرح اُن کے اجتماع سے اُن صفات کے مناسب معنی پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً حرف "جیم" اور "میم" اپنے صفاتِ مقررہ کے لحاظ سے جس لفظ میں مل جائیں گے اُس میں فراہمی اور اجتماع کے معنی پائے جائیں گے۔ جیسے "جم" بہت "جماۃ" گروہ۔ "جمہرۃ" تودہ۔ یکایک۔ اس طرح بہت سے حروف کی صفات مقررہ بتا کر اُن کی کثیر مثالوں سے ثابت کیا ہی کہ حروف

کی صفات کا اثر معانی پر بطور قاعدہ کلیہ پڑتا ہی جن کو تھوڑی سی مناسبت زبانِ عربی سے ہو اُن کو ان مباحث
ین وہی لطف آئے گا جو اقلیدس کی شکلیں حل کرنے میں حاصل ہوتا ہے۔

چوتھا باب جرجی زیدان کے اُس مغالطہ کا مدلل جواب دیتا ہی کہ زبانِ عربی کے الفاظ کا مادہ صرف
دو حرف ہیں یعنی عربی کے تمام الفاظ "ثنائی" ہیں تین یا چار حرف سے نہیں بنتے یعنی "ثلاثی" یا "رباعی"
کوئی لفظ عربی میں نہیں۔ اگرچہ یہ دعویٰ بلا دلیل تھا مگر مصنف المبین نے اس کی تردید بھی حکیمانہ پیرایہ میں کی
ہی اور فلسفیانہ بحث سے ثابت کیا ہی کہ کیوں عربی لفظ کے مادّے کی تکمیل محض دو حرفوں سے نہیں ہوتی بلکہ
ایک تیسرے اصلی حرف کے ملانے کی ضرورت ہی۔ اور تیسرے حرف کے ملنے کا معنی پر کیا اثر ہوتا ہی۔ اس
سلسلۂ بیان میں جرجی زیدان کی ہمہ دانی جس طرح بے نقاب ہوجاتی ہی ارباب فہم کے لئے عبرت افزا ہی۔
جرجی زیدان کا لفظ "قط" کو "ثنائی" بتانا اُس کے علاّمۂ لغت ہونے کی ایسی روشن دلیل ہی جس کے
خلاف دم مارنے کی مجال نہیں ہوسکتی۔ اس بحث میں "قطن" کے لفظ کی جس کے سامنے جرجی زیدان
نے ہتھیار ڈال دئے تحقیق ایسی لطیف و نادر ہے کہ بہت سے برجستہ اشعار اُس پہ قربان کئے جاسکتے ہیں
"نون" کا اپنی صفت (غُنّہ) کے ساتھ "قاف" اور "طا" سے مل کر "قطن" کی صورت پیدا کرنا اور اس
مجموعہ کا اثر معنی میں یہ ظاہر کرنا کہ "روئی" نشو و نما کے بعد اندر سے اپنے گولڑ کو پھاڑ کر باہر آتی ہے۔
ایسی دقیق بحث ہی جس کی داد کا دنیا بہت مشکل ہی۔

پانچواں باب۔ اس میں ارتقائے لسان سے بحث فرمائی گئی ہی۔ اول مستشرقین کے مقرر کردہ
اصول ارتقا تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ اُس کے بعد ارتقا کو انسانی ارتقا سے عمرانیات کی مثال دے کر
واضح کیا ہی۔ پھر یہ بیان کیا ہی کہ مستشرقین مذکور کے یہ اصول جدید نہیں بلکہ وہی ہیں جو صدہا برس پہلے
ابو ہاشم معتزلی نے بیان کئے تھے۔ اس کے بعد بہت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ مسلکِ بالا پر بحث
فرمائی ہی اور ثابت کیا ہی کہ مستشرقین کی یہ رائیں ایسے قیاسات ہیں جن کا ساتھ واقعات اور حقائق نہیں دیتے
ان مباحث کے پڑھنے سے صاف واضح ہوجاتا ہی کہ مؤلف کے دماغ کی بلند پروازیِ تحقیق اُس فضا تک
جا پہنچی ہی جہاں مستشرقین کے قیاسات پست ہوکر رہ جاتے ہیں اور یہ امر قابل فخر ہی کہ جو مباحث دلائل

جدید تعلیم یافتہ طبع کو ساکت و مبہوت بنا دیتے ہیں ایک قدیم درس گاہ کا فیض یافتہ عالِم نہ صرف یہ کہ اُن سے مرعوب نہیں ہوتا بلکہ قوتِ استدلال سے اُن کی کمزوریاں ظاہر فرما کر طالبانِ علم کو صحیح راستہ تحقیق کا دکھا دیتا ہے۔

چھٹا باب۔ فلسفہ اشتقاق پر ہے اور گویا جانِ سخن ہے۔ اس میں اشتقاق صغیر و کبیر کی تعریف کے بعد صغیر و کبیر کا فرق دکھایا ہے۔ اُس کے بعد اشتقاقِ کبیر سے مفصل بحث کی ہے۔ اشتقاقِ کبیر زبان عربی کی ایسی خصوصیاتِ عالیہ میں سے ہے جس کے سامنے تمام زبانیں سپر ڈال دیتی ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ صفت ایک زبان میں کیسے پیدا ہوئی۔ مؤلف علّام کا یہ کمال ہے کہ اس مسئلے میں جو تفصیل آج تک نہ ہوئی تھی وہ المبین کے ذریعہ سے ہماری آنکھوں کے سامنے آگئی اور پہلے لغت کے امام جس قاعدہ کو وضع کر کے اُس کی چند ہی مثالیں لکھ گئے تھے۔ مولانا نے اُس کی صدہا مثالیں لکھ دی ہیں۔ درس نظامی کی یہ بھی حیرت انگیز استعداد آفرینی ہے کہ اُس کے فیض یافتہ ہر نئی مشکل پر غالب آجاتے ہیں۔ صدہا مثالوں کے ذریعہ سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچا دیا ہے کہ یہ عربی زبان کی خصوصی شان ہے کہ اُس کے الفاظ کی ترکیب کو چاہے جس طرح اُلٹو پلٹو نہ صرف یہ کہ وہ مُہمل نہ ہوں گے بلکہ یہ کہ اپنے مخصوص معنی کو برابر قائم رکھیں گے مثلاً ق م ر کی ترکیب سے جو لفظ بنے گا بامعنی ہوگا اور اُس میں بلحاظ ان حروف کی شخصی و ترکیبی صفات کے اُس کے معنی میں "بتدریج ظاہر ہونا" پایا جائے گا۔ مختلف ترکیبیں ملاحظہ ہوں۔ "قمر" چاند۔ (آہستہ آہستہ گھٹتا بڑھتا ہے) "رقم" لکھنا (ایک حرف کے بعد دوسرا اور ایک لفظ کے بعد دوسرا درجہ بدرجہ لکھا جاتا ہے) "مرق" شوربہ (آہستہ آہستہ تیار ہوتا ہے) "قرم" سردار قوم (مرتبہ سرداری تک انسان بتدریج پہنچتا ہے) "رمق" تھوڑی سی جان جو باقی ہو (ایسی حالت میں سانس اور نبض دونوں آہستہ آہستہ چلنے لگتے ہیں) "مقر" زہر قاتل (زہر کا اثر بتدریج ہوتا ہے) اس سے بڑھ کر لطافت "عسل" شہد۔ اس کا اُلٹا "لسع" ڈنک۔ شہد کی مکھی میں ایک طرف شہد ہے تو دوسری طرف ڈنک۔

اسی سلسلہ میں بعض الفاظ عربی جو عجمی الاصل خیال کر لئے گئے تھے مثلاً "سراج" چراغ اور "لجام" لگام۔ اُن کا عربی الاصل ہونا اُن قوتِ استدلال سے ثابت کیا ہے کہ بے اختیار تحسین زبان سے نکلتی ہے اسی سلسلہ

میں یورپ کے مستشرقین کی رایوں کی کمزوریاں متعدد پیرایوں میں ظاہر فرمائی ہیں۔

ساتواں باب آخری باب ہے۔ اور اس میں عربی زبان کا حیرت انگیز کمال گویائی دکھایا ہے۔ اس باب میں یہ بحث ہے کہ عربی زبان کے الفاظ کا صرف یہی کمال نہیں کہ وہ اپنے معنی کے ساتھ ایک نظم و تناسب رکھتا ہے نہیں، بلکہ اس کے معنی کو جب دقت و تعمق کی نظر سے دیکھا جائے تو اس شئے کی ایسی حقیقت سامنے آجاتی ہے جس کے اظہار کے لئے عجمیوں کو صدیاں درکار ہوئیں اور پھر بھی اس کا بیان ایک لفظ سے نہ کرسکے۔ اور اس تعجب خیز دعوی کو متعدد مثالوں سے ثابت فرمایا ہے۔ ایک دوسرا پہلو وضع الفاظ کے کمال کا یہ دکھایا ہے کہ عرب اگر کسی مہمل آواز کی بھی نقل کرتے تھے تو وہ با معنی ہو جاتا تھا۔ اور ایسا با معنی جو اپنی اصل کے ساتھ پوری پوری مناسبت رکھتا تھا مثلاً کوے کے بولنے گھوڑے کی ٹاپ اور ہانڈی کے جوش کھانے کی آواز کی جب عربوں نے محاکات کی تو اس کی نقل کے لئے جو الفاظ وضع کئے ان کے معنی اصل کے ساتھ مناسبت تام ملحوظ رکھی۔ مثلاً کوے کی آواز کی نقل عربی زبان میں "غاق غاق" ہے۔ چونکہ یہ نقل ایک سیاہ جانور کی آواز کی تھی اس لئے اس مادے سے جو الفاظ لیجئے ان کے معنی میں سیاہی کا مفہوم موجود ہے۔ دیکھو۔ "تغیق بصرہ" (اس کی بینائی تاریک ہوگئی) "غیق فی رایہ" اس کو تیرہ رائے کر دیا۔ علیٰ ہذا القیاس۔

خاتمۃ الباب میں "بے مثل مطالعہ صحیفہ کائنات" کی بحث ہے۔ عربوں نے دفتر کائنات کا مطالعہ جس عمیق نظر سے کرکے ہر ہر پہلو اور تعین مدارج کو جدا جدا الفاظ کے ذریعہ سے بتایا اور دکھایا وہ انھیں کا حصہ تھا۔

عرب لکھنے پڑھنے سے عام طور پر بے بہرہ تھے تاہم لکھنے پڑھنے کے سامان کی مختلف حیثیتوں کے لئے جس قدر الفاظ عربی زبان میں ہیں شاید ہی کسی اور زبان میں ہوں۔ دیکھو جس "نے" سے قلم بنایا جاتا ہے جب تک اصلی حالت میں ہے "انبوبۃ" ہے۔ اب قلم تراشنا شروع ہوا جو ریزے کٹ کر گرتے گئے ان کا نام "براء" یا "برایۃ"۔ قلم کے شگاف کو جس سے وسیع کرتے ہیں اس کے لئے لفظ "لیطۃ"۔ نوک کاٹنے کو "قط" جس پر قط لگایا جائے وہ "مقط"۔ جب بن کر درست ہوگیا تو اس کا نام "قلم" ہوا۔ طرف قط کو "رشا" کہتے ہیں۔ قلم کی تعریف ہے "قلم رشاش" (محرف قلم) جب قلم چلا تو اس کی آواز کا نام "صریر" ہے۔

اسی طرح دوات اور روشنائی اور کتاب کے واسطے الفاظ ہیں۔ اس دقّت نظر اور باریک بینی کو مولانا نے بہت سی مثالیں دے کر واضح اور مدلل فرمادیا ہے۔ یہ بحث جس قدر نازک ہے اسی قدر پر لطف اور خرد افروز ہے اسی پر کتاب کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

بیان بالا سے آپ کو واضح ہوا ہوگا کہ "المبین" نے عربی الفاظ کی پیدائش (مخارج) سے لے کر کمالِ عمر (کمالِ وضعِ الفاظ) تک کی ہر منزل سے بحث فرمائی ہے؟ اور میرا یقین ہے کہ مدلل بحث فرمائی ہے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ علم دوست احباب و اصحاب اس کے مطالعہ سے لطف و بصیرت حاصل فرمائیں طلبا کو اس کے مطالعہ کا موقع دیا جائے تا کہ وہ بھی تحقیق (اور آزادانہ تحقیقات) کے انداز سیکھیں، اس کے خوگر ہوں۔ علما اس کو مطالعہ فرما کر تحقیقات کا قدم اور آگے بڑھائیں۔ کاش اس رسالے کا ترجمہ عربی[ل] اور کسی یورپین زبان میں ہوتا تا کہ دوسرے ممالک کے اہلِ کمال بھی مؤلف علّام کی محنت و تحقیق کی داد دے سکتے۔ فقط

ل خود مولانا مرحوم نے اس کا عربی ترجمہ ایک صاحب معروف بہ "شامی صاحب" سے کرایا تھا جو "المبین" کی تالیف واشاعت کے زمانہ میں مسلم یونیورسٹی میں عربی کے معلم تھے، اور اس خدمت کے معاوضہ میں شامی صاحب کی کتاب "تعلیم العربیہ" باہتمام بندہ اپنے صرف سے چھپوا دی تھی اور ان کا ارادہ یہ ترجمہ بھی چھپوانے کا تھا مگر حالات نے مساعدت نہ کی اور مسودہ غالباً ان کے متروکہ سامان کے ساتھ ان کے ورثا کے قبضہ میں گیا۔ محمد مقتدیٰ خاں شروانی

(رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ اگست ۱۹۳۰ء)

صحیح بخاری کا ایک عتیق نسخہ

(کتاب خانہ حبیب گنج میں)

شہر ربیع الاول سنہ حال (۱۳۴۹) کے معارف میں کتاب خانہ ریاست رام پور کے صحیح مسلم کے نسخہ عتیق کا ذکر ہے۔ "الشئی بالشئی یذکر" میرے کتاب خانہ میں ایک نسخہ صحیح بخاری کا عتیق ہے جلد اول۔ یہ نسخہ بخط عرب سمرقندی کاغذ پر لکھا ہوا ہے۔ سطر فی صفحہ ۳۱۔ لوح پر شمسہ طلائی و لاجوردی ہے۔ اس میں یہ عبارت بخط نسخ شنجرفی جلی خوشخط درج ہے "جلد اول صحیح بخاری بخط نسخ عرب در آخر کتاب خط حضرت شیخ المحدثین عفیف الدین گازرونی است جلد سیاہ و ترنج سرخ و جدول طلا نوبستہ بابتہ فتح شہر محمد آباد المعروف

میں یورپ کے مستشرقین کی رایوں کی کمزوریاں متعدد پیرایوں میں ظاہر فرمائی ہیں۔

ساتواں باب آخری باب ہے۔ اور اس میں عربی زبان کا حیرت انگیز کمال گویائی دکھایا ہے۔ اس باب میں یہ بحث ہے کہ عربی زبان کے الفاظ کا صرف یہی کمال نہیں کہ وہ اپنے معنی کے ساتھ ایک نظم و تناسب رکھتا ہے۔ نہیں، بلکہ اس کے معنی کو جب دقت و تعمق کی نظر سے دیکھا جائے تو اس شے کی ایسی حقیقت سامنے آجاتی ہے جس کے اظہار کے لئے عجمیوں کو صدیاں درکار ہوئیں اور پھر بھی اس کا بیان ایک لفظ سے نہ کر سکے۔ اور اس تعجب خیز دعوی کو متعدد مثالوں سے ثابت فرمایا ہے۔ ایک دوسرا پہلو وضع الفاظ کے کمال کا یہ دکھایا ہے کہ عرب اگر کسی مہمل آواز کی بھی نقل کرتے تھے تو وہ بامعنی ہو جاتا تھا۔ اور ایسا بامعنی جو اپنی اصل کے ساتھ پوری پوری مناسبت رکھتا تھا مثلاً کوے کے بولنے گھوڑے کی ٹاپ اور ہانڈی کے جوش کھانے کی آواز کی جب عربوں نے محاکات کی تو اس کی نقل کے لئے جو الفاظ وضع کئے ان کے معنی اصل کے ساتھ مناسبت تام ملحوظ رکھی۔ مثلاً کوے کی آواز کی نقل عربی زبان میں "غاق غاق" ہے۔ چونکہ یہ نقل ایک سیاہ جانور کی آواز کی تھی اس لئے اس مادے سے جو الفاظ لیجئے ان کے معنی میں سیاہی کا مفہوم موجود ہے۔ دیکھو "تغیق بصرہ" (اس کی بینائی تاریک ہوگئی) "غیق فی رایہ" اس کو تیرہ رائے کردیا۔ علیٰ ہذا القیاس۔

خاتمۃ الباب میں "بے مثل مطالعہ صحیفۂ کائنات" کی بحث ہے۔ عربوں نے دفتر کائنات کا مطالعہ جس عمیق نظر سے کرکے ہر ہر پہلو اور تعیین مدارج کو جدا جدا الفاظ کے ذریعہ سے بتایا اور دکھایا وہ انھیں کا حصہ تھا۔

عرب لکھنے پڑھنے سے عام طور پر بے بہرہ تھے تاہم لکھنے پڑھنے کے سامان کی مختلف حیثیتوں کے لئے جس قدر الفاظ عربی زبان میں ہیں شاید ہی کسی اور زبان میں ہوں۔ دیکھو جس "نے" سے قلم بنایا جاتا ہے جب تک اصلی حالت میں ہے "انبوبہ" ہے۔ اب قلم تراشنا شروع ہوا جو ریزے کٹ کر گرتے گئے ان کا نام "براء" یا "برایہ"۔ قلم کے شگاف کو جس سے وسیع کرتے ہیں اس کے لئے لفظ "لیطہ"۔ نوک کاٹنے کو "قط"۔ جس پر قط لگایا جائے وہ "مقط"۔ جب بن کر درست ہوگیا تو اس کا نام "قلم" ہوا۔ طرف قط کو "رشا" کہتے ہیں۔ قلم کی تعریف ہے "قلم رشاش" (محرف قلم) جب قلم چلا تو اس کی آواز کا نام "صریر" ہے۔

اِسی طرح دوات اور روشنائی اور کتاب کے واسطے الفاظ ہیں۔ اس دقّت نظر اور باریک بینی کو مولانا نے بہت سی مثالیں دے کر واضح اور مدلّل فرما دیا ہی۔ یہ بحث جس قدر نازک ہی اُسی قدر پرلطف اور خرد افروز ہی اسی پر کتاب کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

بیانِ بالا سے آپ کو واضح ہوا ہوگا کہ "المبین" نے عربی الفاظ کی پیدائش (مخارج) سے لے کر کمالِ عمر (کمالِ وضعِ الفاظ) تک کی ہر منزل سے بحث فرمائی ہے؛ اور میرا یقین ہی کہ مدلّل بحث فرمائی ہی۔ یہ کتاب اس قابل ہی کہ علم دوست احباب و اصحاب اِس کے مطالعہ سے لطف و بصیرت حاصل فرمائیں طلبا کو اُس کے مطالعہ کا موقع دیا جائے تاکہ وہ بھی تحقیق (اور آزادانہ تحقیقات) کے انداز سیکھیں، اُس کے خوگر ہوں۔ علما اُس کو مطالعہ فرما کر تحقیقات کا قدم اور آگے بڑھائیں۔ کاش اس رسالے کا ترجمہ عربی اور کسی یورپین زبان میں ہوتا تاکہ دوسرے ممالک کے اہلِ کمال بھی مؤلف علّام کی محنت و تحقیق کی داد دے سکتے۔ فقط[۱]

[۱] خود مولانا مرحوم نے اس کا عربی ترجمہ ایک صاحب معروف بہ "شامی صاحب" سے کرایا تھا جو "المبین" کی تالیف و اشاعت کے زمانہ میں مسلم یونیورسٹی میں عربی کے معلم تھے، اور اس خدمت کے معاوضہ میں شامی صاحب کی کتاب "تعلیم العربیہ" باہتمام بندہ اپنے صرف سے چھپوا دی تھی اور ان کا ارادہ یہ ترجمہ بھی چھپوانے کا تھا مگر حالات نے مساعدت نہ کی اور مسودہ غالباً ان کے متروکہ سامان کے ساتھ ان کے ورثا کے قبضہ میں گیا۔ محمد مقتدیٰ خاں شروانی (رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ اگست ۱۹۳۰ء)

صحیح بخاری کا ایک عتیق نسخہ

(کتاب خانہ حبیب گنج میں)

شہر ربیع الاول سنہ حال (۱۳۴۹) کے معارف میں کتاب خانہ ریاست رام پور کے صحیح مسلم کے نسخۂ عتیق کا ذکر ہی۔ "الشیٔ بالشیٔ یذکر" میرے کتاب خانہ میں ایک نسخہ صحیح بخاری کا عتیق ہی جلد اول۔ یہ نسخہ بخط عرب سمرقندی کاغذ پر لکھا ہوا ہی۔ سطر فی صفحہ ۳۱۔ لوح پر شمسہ طلائی و لاجوردی ہی۔ اُس میں یہ عبارت بخط نسخ شنجرفی جلی خوشخط درج ہی: "جلد اول صحیح بخاری بخط نسخ عرب در آخر کتاب خط حضرت شیخ المحدثین عفیف الدین گازرونی است جلد سیاہ و ترنج سرخ و جدول طلا نوشتہ بابتہ فتح شہر محمد آباد المعروف

یہ بیاد جمع کتاب خانہ معمورہ عالم پناہ ابراہیم عادل شاہ خلد ملکہ شدہ ۹ شعبان ۱۰۰۸ ہجری"۔ آخر کتاب میں لکھا ہے۔ "بلغ مقابلہ فی رجب ۷۸۰ھ ثمانین وسبعمائۃ"۔ شیخ عفیف الدین گازرونیؒ شارحین صحیح بخاری میں ہیں۔

صاحب کشف الظنون نے شروح صحیح کے ضمن میں شیخ ممدوح کا ذکر کیا ہے۔ عبارت یہ ہے "وشرح الامام عفیف الدین سعید بن مسعود الکازرونی الذی فرغ منہ فی شہر ربیع الاول ۷۶۶ھ"۔ شیخ کی عبارت مذکورہ بالا ۸۸۸ھ ربیع الاول کی لکھی ہوئی ہے۔ اُس کے نیچے اُن کے پوتے عبدالکریم بن عبداللطیف کے ہاتھ کی عبارت اجازت ہے مورخہ ربیع الآخر ۸۸۸ھ۔ خود کتاب کا سنہ کتابت نہیں۔ بہرحال ۸۸۸ھ سے پہلے کی لکھی ہوئی ہے۔ یہ نسخہ محشّٰی و محفوظ ہے۔ ۲۲۰ ورق ہیں۔

اِن نسخوں کا شاہی کتاب خانوں میں ہونا مُسلم۔ سوال یہ ہے کہ مثل مشارق الانوار وہ کہیں نظر افروز بھی ہوتے تھے؟ علما میں متداول تھے؟ داخل درس تھے؟ ان سوالوں کا جواب بظاہر نفی میں ہے۔ اگر نفی میں ہے تو نسخہائے عتیقہ کی برکت شاہی کتب خانوں تک محدود و منتہی ہوگی۔ فقط

(رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۳۰ء)

مُلّا سعدؒ پٹنوی

مُلّا صاحب کی تین تصنیفیں ترتیبِ فہرست کتاب خانہ کی ضمن میں نظر سے گزریں تینوں مثنوی مولانا رومؒ کے متعلق ہیں۔

(۱) باغ گلبن۔ تاریخی نام ۱۱۰۵ھ کی تصنیف۔ مثنوی شریف کا انتخاب "مشتمل بر داستان چند" یہ نسخہ ۱۱۰۶ھ کا لکھا ہوا ہے۔ شاہی کتاب خانہ اودھ میں رہ چکا ہے۔ نصیر الدین حیدر، سلیمان جاہ اور امجد علی شاہ کی مہریں ہیں۔

(۲) ہر شش دفتر مثنوی کے خطبات کا فارسی ترجمہ ۱۱۱۱ھ کا لکھا ہوا۔

(۳) شرح مختصر فرہنگ لغاتِ مثنوی ۱۳۶ ورق مورخہ ۱۱۱۷ھ ہجری کاتب و مالک میر عبد القادر ابن میر محمد مراد ابن سید نور محمد الحسینی الرضوی الکروی زی الوری۔

فرزندانِ بہار میں سے کوئی صاحب ملّا صاحب کے حالات پر روشنی ڈالیں تو چشم ما روشن دلِ ما شاد۔ فقط

(رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ اکتوبر ۱۹۳۰ء)

عرب و ہند کے تعلّقات

"جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی جو حضرت استاذ مرحوم کے حلقۂ احباب میں میرے واجب التعظیم مخدوم ہیں، انھوں نے میری حقیر تازہ تالیف "عرب و ہند" پر تبصرہ لکھ کر ذرہ نوازی فرمائی ہے حضرت استاذ مرحوم کے ساتھ موصوف کی یہ سُنّتِ قدیم رہی ہے کہ اُن کی تصانیف پر وہ اکثر اور سب سے پیشتر تبصرے لکھا کرتے تھے جو بجائے خود ادب و انشا کے جواہر ہوتے تھے۔ موصوف نے "عرب و ہند" پر تبصرہ لکھ کر غالباً اُسی سنت کو قایم رکھا ہے اور اپنی بزرگانہ پاس وضع کا یہ ایک نیا ثبوت پیش کیا ہے۔ مصرع "بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل بود بس است

سلیمان"

قدرت نے عرب و ہند کا رشتۂ تعلق سمندر کے ذریعہ سے قائم فرمایا ہے۔ رہروانِ شوق ساحلِ ہند کو چھوڑ کر بے واسطہ زمین سرزمین عرب میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہ ایما اور اشارہ تھا کہ ہند و عرب کے تعلقات میں بھی وہی صفائی اور دلکشائی رہی ہو گی جو سمندر کا خاصّہ ہے۔

اغراض نے اور نظر کی کوتاہیوں نے سرچشمۂ صفا و وفا کو خس و خاشاک سے پاٹ دیا۔ وسعتِ مشرب کے سمندر کو چھوڑ کر تنگ اور تاریک خلیجیں پسند کر لی گئیں جن کا پانی رکاوٹ اور بندش سے متعفن ہو کر دل و دماغ کے لئے سمِ قاتل بن چکا تھا۔ جب عرب و ہند کے تعلقات کا تصور کیا جاتا غیبر

کے سربفلک پہاڑ سنگ افشاں نظر آتے جن سے کبھی سر چکنا چور ہوتے کبھی ہاتھ پانوں پاش پاش۔ ضرورت تھی کہ گہری نگاہیں گوہر مقصود کا پتہ لگائیں، خس و خاشاک کو دور کرکے اصلیت کی تہ تک پہنچیں اور آج جب کہ دل مل جانے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، دکھائیں کہ کبھی اس سرزمین پر محبت و ہمدردی کا ابر رحمت بھی برساتھا۔ اس کے لئے تصنع کی حاجت نہ تھی۔ واقعات کو بگاڑنے اور بنانے کی ضرورت نہ تھی۔ صرف چہرۂ حقیقت کو بے نقاب کردینا کافی تھا۔ مگر شاہد مقصود تک باریابی ہر ایک کی قسمت میں نہیں آئی ہے۔ کارکنانِ قضا و قدر نے یہ فتحیابی "سلیمانِ وقت" کے لئے محفوظ و مخصوص فرما دی تھی ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا　　　　ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

ہندوستانی ایکاڈیمی مبارکباد کے قابل ہے کہ اس نے انتخاب بجا اور بہت بجا کیا۔ مجلس مذکور نے مولوی سید سلیمان صاحب ندوی کو مدعو کیا کہ عرب و ہند کے تعلقات پر الٰہ آباد آکر لکچر دیں[1]۔ شاید الٰہ آباد گنگا جمنا کا سنگم ہونے کی وجہ سے اس کے لئے سب سے زیادہ موزوں مقام تھا۔ ان خطبات کی کامیابی کا اصلی راز وہ بنیاد ہے جن پر ان کی عمارت تیار ہوئی ہے۔

اگر ایرانی اور ہندوستانی مورخوں کی طرف ہمارا فاضل دوست رخ کرتا تو یقیناً قبلۂ مقصود کج ہوجاتا۔ دقیقہ سنجی اور بلند نظری اس میدانِ دلکشا میں ان کو لے پہنچی جہاں عرب کی پاک و صاف ہوائیں روح پرور تھیں، تعصبات کی گندگی نے جہاں رسائی حاصل نہ کی تھی۔

سلیمانِ زماں نے دیو و پری کی داستانوں کا سننا باعثِ عار سمجھا اور ان نکتہ سنج حقیقت نگار مصنفین اور سیاحوں کو اپنا رفیقِ طریق بنایا جن کی فکر اور نظر میں اسلامی وسعت اور صدق پسندی تھی۔ سلیمان تاجر، ابن خردازبہ، ابو دلف، مسعودی، ابن حوقل، بشاری، ابن بطوطہ اور ایسے بہت سے محقق سیاح، جغرافیہ نویس، تاریخ نگار ہیں جن کی کتابوں میں اسلامی تعلیم کے اثر سے مذکورۂ بالا صفات پوری طرح جلوہ فرما ہیں، فاضل خطیب نے انھیں کتابوں سے کام لیا ہے۔ نہ خیال کرنا کہ یہ کتابیں کہیں خس و خاشاک کے انبار میں ان کے ہاتھ آگئی ہیں۔ نہیں۔ قریباً سب کی سب یورپ کی شائع کردہ اور پسندیدہ

---

[1] یہ لکچر مجموعہ کی شکل میں ایکاڈیمی کی طرف سے ٹائپ میں چھپے ہیں۔ اور دفتر ایکاڈیمی الٰہ آباد سے مل سکتے ہیں۔ ضخامت ۴۰۰ صفحے قیمت مجلد للعہ

ہیں لیکن افسوس ہی کہ ان سے یہ کام اب تک نہ لیا گیا۔ ورنہ تعلقات کی یہ بربادکن صورت نہ ہوتی ان لکچروں کی وسعت چارسو ٹائپ کے چھپے ہوئے صفحات سے زیادہ ہی۔ تاہم یہ بیان مبالغہ سے خالی ہی کہ وہ خیالی مضامین یا عبارت آرائی سے بالکل پاک صاف ہیں۔ واقعات پر مورخانہ اور فلسفیانہ بحث کی ہی اور بحث کے صحیح نتائج سامعین وناظرین کو سنائے اور دکھائے ہیں جو اہم اور نتیجہ خیز مطالب اس کتاب میں ہیں اُن کی فہرست ۲۵ صفحوں سے زیادہ پر ہی۔ اور خود اُن کی تعداد کم وبیش ۷۰۵ ہے۔ اس سے آپ اندازہ کرسکیں گے کہ کس قدر غور وفکر اور وسیع اور عمیق مطالعہ کے بعد یہ لکچر تیار ہوئے ہوں گے۔

اس کتاب میں پانچ باب ہیں سب پہلے باب کا عنوان "تعلقات کا آغاز اور ہندوستان کے عرب سیاح" ہی۔ اس باب میں جن مطالب سے بحث ہی اُن کا نمونہ ان عنوانوں سے معلوم ہوسکے گا۔ "ہندوستان مسلمانوں کا پدری وطن"۔ "ہندوستان کا بہشتی دریا"۔ "نورِ محمدی کا ظہور ہندوستان میں"۔ "سادات نیم ہندوستانی ہیں"۔ "لفظ ہند"۔ "ٹھاکر عربی زبان میں"۔ "جاٹ صحابہ کے زمانہ میں"۔ علیٰ ہذالقیاس۔ اسی سلسلہ میں ہندوستان کے عرب سیاحوں کا ذکر آتا ہی اور ابن خردازبہ، سلیمان تاجر، ابوزید سیرافی، ابودلف، بزرگ بن شہریار ملاح، مسعودی، ابن حوقل، بشاری، البیرونی، ابن بطوطہ اور ان کے سوا اور مورخین اور جغرافیہ نویسوں سے اس باب میں تعارف ہو جاتا ہی۔

اپنے مشاہدوں میں جو حالات اور واقعات ان حقیقت نگار مصنفوں نے دیکھے اور لکھے ہیں اُن سے بحث کی ہی۔ مثلاً یہ اہم سوال کہ سندھ میں مسلمانوں کا مقابلہ کس سے ہوا۔ عام طور پر مقابل ہندو مانے جاتے ہیں۔ مگر دراصل وہ بدھ تھے۔ سندھ کا نقشہ جو ابن حوقل نے تیار کیا (جس کی نقل شامل کتاب ہے) ہندوستان کی بولیاں، الیٹ کی تاریخ کی تکمیل کی بابت کارآمد مشورہ، یورپین مورخوں کے یونانی بیانات کو ہندوستان کی قدیم تاریخ کا واحد ماخذ ماننے پر بجا گرفت۔

دوسرے باب میں تجارتی تعلقات سے بحث ہے۔ اس باب میں اُن تعلقات کا دروازہ کھول دیا گیا ہی جو قدرتاً ملنساری اور خوشگوار پرامن راہ ورسم کے متقاضی ہیں یعنی تجارتی تعلقات (مگر شاید آج یہ کلیہ ٹوٹ چکا ہی) اس باب کی شانِ تحریر بالکل تاجرانہ نقطۂ نظر سے ہے۔ بحری راستے، بندرگاہیں،

منزلیں اور مسافتیں۔ ہندوستانی پیداوار (جن میں یادش بخیر آم اور پان بھی ہیں) اور بیوپار، مصنوعات، بحرِ ہند کے جہازات، ایک عرب ہندوستانی کا وطنی گیت۔ غرض وہ سب کچھ اس باب میں موجود ہے جو بحری تجارت کا لوازمہ ہے۔ اور جن سے بحث تاجرانہ ذوق کی متقاضی ہے۔ اس باب میں بعض اور دلچسپ واقعات بھی آجاتے ہیں۔ مثلاً قرآن کریم میں تین ہندی نام، بنیا عرب جہازوں میں، ہندوستان کے قدیم روسی تاجر۔

تیسرا باب دوسرے باب سے بھی زیادہ بلند پایہ ہے۔ اس لئے کہ اس میں علمی تعلقات سے بحث ہے۔ اس باب میں بھی دقیق اور سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ اس کے مطالعہ میں ہم جاحظ بصری، یعقوبی، ابن ندیم بغدادی ابوریحان بیرونی، قاضی صاعد اندلسی وغیرہم عالی مرتبہ علما سے فیض یاب ہوتے ہیں۔

اس باب کی جانِ سخن "برامکہ" کے لفظ کی بے نظیر تحقیق ہے جس پر میں اپنے عزیز کو دلی مبارکباد دیتا ہوں۔ اور کہتا ہوں کہ تحقیق کا یہ نقش، ایک "ہماری قلم" کے انتظار میں پس پردہ تقدیر تھا ؎

آخر آمد زپس پردۂ تقدیر پدید

شروع سے دیکھئے۔ قدیم مورخوں کی نظر تو لفظ تک محدود رہی۔ برمک کو قدرۃً فارسی لفظ سمجھ کر زہر کا قصہ بیان کردیا۔ جس نے ساری عمارت ڈھا دی۔ برامکہ کا دورِ حاضر کا محقق مورخ پیرِ مغاں کے ساغر سے سرشار ہو کر رہ گیا۔ معزز خطیب کی بحث کو بغور پڑھئے تو آپ پر واضح ہوگا کہ کس تحقیق سے یہ ثابت فرمایا گیا ہے کہ بلخ کا "نوبہار" جس کے پجاری برامکہ تھے آتش کدہ نہ تھا۔ بلکہ بدھوں کی خانقاہ تھی۔ عربوں نے اس کا نقشہ، اس کے رسوم، اس کے لوازم سب ہی تو بیان کر دئے ہیں۔ اس مصالح کی بنیاد پر ثابت کیا گیا ہے کہ نوبہار۔ نوا و بہار تھا۔ فارسی لہجہ میں "نوبہار" بن گیا۔ جس طرح ہندی "دیہار" بھی "بہار" ہو گیا۔

برامکہ بودھ تھے اور برمک دراصل سنسکرت کا لفظ پرمک تھا جس کے معنی برتر اور بڑے مرتبہ والے کے ہیں۔

چوتھا باب مذہبی تعلقات کے متعلق ہے۔ اس باب کی بحث کی بنیاد خصوصاً "کتاب البدء والتاریخ"۔ ابوالعباس ایرانشہری، عبدالکریم شہرستانی، عبدالقاہر بغدادی اور مرتضیٰ زبیدی کی تصانیف ہیں۔ بابِ ہذا

کی بیت الغزل وہ بحث ہی جس میں عرب اور ترک۔ ومغل فاتحوں کا فرق بتایا ہی۔ پوری بحث کتاب میں غور اور کشادہ دماغ سے پڑھو اور تحقیق پر آفریں کہو۔

خلاصہ یہ ہی کہ غوری، غزنوی اور خلجی وغیرہ قبائل نومسلم تازہ اسلام تھے اُن کی رگ وپے میں اسلام نے ایسی سرایت نہ کی تھی جو اُن کی کایا پلٹ کرکے افغانی وحشت اور ترکانی سفاکی کو یکسر اسلامی اخوت وہمدردی سے بدل دیتا۔ میں اس بحث کو لکھتا تو خلاصتًہ یہ کہدیتا کہ اُن کو قرونِ خیر کا فیض نہ پہنچا تھا اور وہ اُستاد نہ ملے تھے جن کا تصرف انسانی دل ودماغ کو توحید کے نشہ سے سرشار کرکے مخلوق سے اُخوت ومساوات اور ہمدردی کا سبق یاد کرا دیتا تھا۔

ہمارا ملک قیامت تک ماتم میں رہے گا کہ یہاں صحابۂ کرام کا فیضِ تعلیم وتربیت نہ پھیلا۔ ورنہ آج ہندوستان کی ترقی میں کثرت وقلت، چھوت اور اچھوت کے روڑے نہ اٹکائے جا سکتے۔

واقعاتِ بابری دیکھو۔ خود بابر کہتا ہے کہ تورۂ چنگیزخانی اُس کے زمانہ تک سلاطینِ مغل کا دستورالعمل تھا جس کے مقابلہ میں اسلامی احکام موثر نہ تھے۔ حالانکہ مغلوں کو مسلمان ہوئے صدیاں گزر چکی تھیں۔ شکر ہی کہ خود بابر اس تورے سے بیزار تھا اور مذہبی احکام کے مقابلہ میں اُن کو توڑ دیتا تھا۔ خلاصہ۔ افغانوں اور ترکوں کے "اُدخلوا فی السلمِ کافّۃ" کا مصداق نہ ہونے کی وجہ سے اُن کی پالسی اور زندگی میں اسلامی تعلیم کی وہ وسعت اور رواداری پیدا نہیں ہوئی جو عربوں میں تھی۔ ایک حال کا واقعہ سن لیجئے سرحدی حصہ میں ایک پٹھان نے اپنے دشمن کو پکڑ پایا۔ حنیفہ رمضان کا تھا۔ فیصلہ کیا کہ روزے میں مسلمان کا قتل درست نہیں۔ روزہ کھول کر گولی کا نشانہ بنانا چاہیئے۔ چنانچہ ہاتھ پاؤں باندھ کر ایک طرف ڈال دیا۔ شام کو کھانے پینے کی فکر ہوئی۔ لکڑی لینے جنگل میں نکل گیا۔ اسیر جفا نے کوشش کرکے ہاتھ کی رسّی ڈھیلی کی۔ ہاتھ نکل آیا تو سب رسّیاں کھول ڈالیں۔ رفل جو وہیں رکھا تھا ہاتھ میں لے لیا۔ جوں ہی اُس کا مہربان نمودار ہوا ایک فیر میں کام تمام تھا۔ رفل اور کپڑے لے کر قیدی نے گھر کا راستہ لیا۔

آمدم برسرِ مطلب:۔ نومسلم ترک وافغان کے مقابلہ میں عرب قدیم الاسلام تھے۔ سرچشمۂ اسلام سے ایسے سیراب کہ خود چشمۂ توحید اُن کے دلوں سے بہہ رہا تھا۔

اِن دونوں بیانوں کے بعد دکھایا ہو کہ عرب فاتحوں کا عمل کیا تھا اور اُس عمل کا اثر ملک کی ترقی پر کیا ہوا (خواہ وہ ترقی اخلاقی تھی یا معاشرتی، تمدنی تھی یا ملکی) سندھ کی وہ تاریخ جو عربی دورِ حکومت میں بنی، اُس تاریخ سے بدرجہا اعلیٰ اور اشرف ہو جس کو افغان، تُرک اور مغل بنا سکے۔

اِسی سلسلہ میں یہ بیان آجاتا ہو کہ عرب ہندوؤں کو کیا سمجھتے تھے ثابت کیا ہو کہ اہلِ کتاب تو نہ سمجھتے تھے البتہ مُشابہ اہل کتاب مانتے تھے۔ اور یہی فیصلہ بُنیاد اُس تمام برتاؤ کا تھا جو اُن کا ہندوؤں کے ساتھ تھا۔ یہ بیان فاضل مؤلف کی قوتِ اجتہاد کا شاہد عادل ہو۔ اس بحث کو پڑھ کر میرے دماغ نے یہ محسوس کیا کہ تاریخ کے منطقۂ لحاظہ سے (جس کو ہمارے مہربانوں نے دِل سوز بھٹی بنا دیا ہو) نکل کر جان بخش اور روح پرور آب و ہوا میں آگیا۔ اس باب کو پڑھو اور واقعات کی شہادت پر مان لو کہ مسلمانوں کی حقیقی خالص سلطنت ہندوستان میں اُس سے بہت بہتر تھی جس کا بیان غزنوی دور کے آغاز سے مغلوں کے خاتمہ تک تاریخ میں ملتا ہے۔

پانچواں باب "ہندوستان میں مسلمان، فتوحات سے پہلے" پر بحث کرتا ہو۔ اس باب میں بہت سے دلچسپ اور ضروری حالات اور مسائل پر روشنی ڈالی ہو۔ غور کے قابل یہ مسألہ ہو کہ علاوہ فاتح و مفتوح کے تعلقات کے دوسری قسم کے تعلقات ہندو مسلمانوں کے کیسے اور کیا تھے۔ واقعات شہادت دیتے ہیں کہ یہ تعلقات ہر لحاظ سے ہمدردی اور کشادہ دلی کا نمونہ تھے۔ ہندوؤں کی حکومت میں مسلمان ہر حیثیت سے (خواہ وہ جنگی ہو یا ملکی، مذہبی ہو یا علمی، تاجرانہ ہو یا حاکمانہ) عزت اور اثر کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اسلامی فتوحات سے بہت پہلے ملتان، منصورہ، دیبل، مسلمان عُلما کے برکات سے مُشرف ہو چکے تھے۔ منجملہ اُن کے ایک ابوالمعشر نجیح سندھی اس پایہ کے امام تھے کہ خود اولوالعزم عباسی خلیفہ مہدی نے اُن کے جنازہ کی نماز پڑھائی۔ اسی عہد میں ابوعطا شاعر بھی تھا۔

اس باب میں دلچسپ بیان اُن اسلامی فرقوں کا بھی ہو جو اُس زمانہ میں سندھ میں تھے۔ اس سے اُن فرقوں کی تاریخ پر روشنی پڑتی ہو جو آج بھی صوبہ بمبئی میں موجود ہیں۔

آج تبلیغ کی گرمیٔ ہنگامہ کے سلسلہ میں باب ہذا کا وہ بیان پڑھنے کے قابل ہو جس میں شیخ الاسلام

حضرت زکریا ملتانی، حضرت سید جلال بخاری قدس سرہما کے فیوضِ تبلیغی کا ذکر ہی۔ کاش آج کوئی شیخ الاسلام پیدا ہو جائے تو رنگ ہی دوسرا ہو جاتا ہی۔ سومریوں کے متعلق بحث پڑھنے کے قابل ہی۔

عالم خطیب نے ایک دوسرے میدانِ قلم میں بھی اپنی محققانہ رائے کا ثبوت دیا ہی۔ ایک سے زاید مقام پر یورپین علما کی غلطیوں پر گرفت کی ہی اور اُن کو صحیح راستہ دکھایا ہی۔

اس سلسلہ میں یہ کہنا ہم ضروری خیال کرتے ہیں کہ جہاں ایک حق شناس مؤلف یا خطیب کا فرض ہی کہ غلطیوں کی اصلاح کرے، بے راہی پر ٹوکے وہاں یہ بھی اخلاقی فرض ہی کہ پیرایۂ اعتراض ایسا ہو جس میں سختی یا خود شناسی کا واہمہ پیدا نہ ہو۔ مثلاً کسی کی رائے کی بابت کہنا کہ "قطعاً غلط ہے"۔ افسوس ہی کہ ایسا پیرایہ علامہ شبلی مرحوم کی تحریروں میں بھی ہی۔ جس رائے یا خیال کو غلط سمجھتے ہیں اُس پر شاہین کی طرح گرتے ہیں۔ میرا گمان ہی کہ یہ سر سید مرحوم کی صحبت کا اثر تھا تفسیر احمدی میں مفسرین اور دیگر اکابر کو جن الفاظ سے یاد کیا ہی وہ اس کا بیّن ثبوت ہی۔

آخر میں ہم مکرر ہندوستانی اکیڈیمی، خصوصاً اپنے مہربان سر تیج بہادر سپرو کو مبارکباد دیتے ہیں کہ اُن کی سعی سے ملکی ادب میں ایسی نادر کتاب کا اضافہ ہوا جیسی "عرب و ہند کے تعلقات" ہے۔ فقط

(رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ نومبر ۱۹۳۰ء)

قاری عبدالرحمٰن صاحب محدث پانی پت

حیدرآباد سے واپسی کے بعد مولانا اپنی قلمی کتابوں کی فہرست بنانے میں منہمک رہی۔ چنانچہ ۲۳ رمضان ۱۳۴۹ھ کو نو مہینے آٹھ دن کے بعد اس اہم کام سے فراغت پائی۔ اوسطاً ساڑھے تین گھنٹے روزانہ کام کرتے رہے۔ اس اختتام کی خوشی میں آج سے اڑتیس برس قبل کی ایک یادداشت کی نقل معارف کے لئے عنایت فرماتے ہیں یادداشت کے سادہ لفظوں میں جس پرکیف ملاقات کا حال درج ہوا ہی اُس کی مستی آج بھی آنکھوں کی راہ دل میں سما جاتی ہے۔ معارف

۹ رجب ۱۳۱۱ ہجری کو زیارتِ جناب قاری صاحب کے قصد سے دلی سے روانہ ہوا۔ پانی پت پہنچ کر بعد نماز عصر مسجد محلہ انصار میں قاری صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ برادرم مولوی محمد یونس خاں صاحب رئیس دتاولی بھی ہم سفر تھے۔ بعد سلام و پرسشِ مزاج بجواب سوال قاری صاحب میں نے کہا بھیکن پور رہتا ہوں اور محمد خان زماں خاں مرحوم کا پوتا ہوں جنھوں نے مسائل اربعین کے جواب لکھوائے تھے۔ خوش ہو کر فرمایا جس زمانہ میں مولوی امین الدین جواب لکھوا رہے تھے میں طالب علم کی حیثیت سے حاضر مدرسہ ہوا کرتا تھا۔ بعد مکالمہ کے میں نے شاہ ولی اللہ صاحب کی اربعین پڑھی (جو میں ساتھ لے گیا تھا) میں قاری تھا، برادر موصوف سامع۔ رسالۂ مذکور قاری صاحب کے بیان کردہ مطالب حاشیہ پر لکھ کر میں نے داخل کتاب خانۂ حبیب گنج کر دیا ہے۔ اس کے ختم ہونے پر برادر موصوف نے صحیح بخاری کی حدیث اول پڑھی۔ وہ قاری تھے اور میں سامع۔ قاری صاحب کی تقریر اربعین کے مطالب کے بیان میں بہت جچی تلی تھی۔ الفاظ بے تکلف ایک ایک ہو کر علیحدہ علیحدہ زبان پر آتے تھے۔ بیان صاف تھا، الفاظ بقدر معانی محتاطانہ۔ احتیاط کلام سے ہویدا تھی۔ پہلی حدیث کا مطلب بیان فرما کر پوچھا "میں نے کیا کہا؟" چونکہ سرسری تقریر سنی تھی میں نے تامل سے الفاظ یاد کر کے بیان کیے۔ بے تکلف فرمایا "میں نے یہ نہیں کہا"۔ مکرر سابق تقریر کا بجنسہ اعادہ فرمایا اور سوال مکرر۔ اب الفاظ بمقابلہ پہلے کے میں نے زیادہ مطابق تقریر ادا کیے۔ پھر فرمایا "میں نے یہ نہیں کہا"۔ تیسری مرتبہ تقریر کی۔ اب میں نے بجنسہ نقل الفاظ کر دی۔ اسی طرح ہر حدیث کے مطلب کا بجنسہ اعادہ کرایا۔ ایک دو حدیث کے بعد توجہ تام ہو گئی تھی۔ اس لئے میں پہلی ہی تقریر کے بعد اعادہ کر دیتا تھا۔ مثلاً حدیثِ توبہ کے بیان میں یہ الفاظ فرمائے تھے: "توبہ کے تین رکن ہیں۔ ترکِ معصیت نقد الوقت۔ ایسا پچھتانا کہ بھری مجلس میں رسوائی ہو گئی۔ آئندہ معصیت مذکور نہ کرنے کا عہد۔"

اثنائے گفتگو میں شاہ عبد العزیز صاحب کا ذکر فرمایا کہ شباب میں بینائی بالکل جاتی رہی تھی۔ اکثر تصانیف حالت نابینائی کی ہیں۔ میں نے شاہ صاحب کے کتاب خانہ کا حال پوچھا تو فرمایا کہ جو بہت پسندیدہ کتابیں تھیں وہ شاہ اسحق مرحوم بوقتِ ہجرت اپنے ساتھ لے گئے تھے اور وہ وزن میں ۹ من تھیں۔ باقی

کتابیں اُن کے ایما سے میں نے اور نواب قطب الدین خاں نے ہرّاج (نیلام) کر دی تھیں۔ اپنے تلمذ کے متعلق فرمایا کہ میں نے صحاح ستّہ شاہ اسحٰق صاحب سے پڑھیں اور پھر سالہا سال تک مدرسہ میں صبح سے عشا تک حاضر رہا۔ اس حاضری میں بہت سی کتابیں سماع میں آئیں۔ کلام مجید کی تفسیر تمام و کمال جناب میاں صاحب موصوف کی زبان سے وعظ میں سُنی۔ مولوی عالم علی صاحب مرادآبادی، مولوی علیم الدین صاحب کاندھلہ کے باشندے اور دو ایک اور صاحب میرے ہمدرس و ہم سبق تھے۔ مولوی احمد علی صاحب سہارن پوری کی نسبت فرمایا کہ انھوں نے ہندوستان میں حدیث میاں صاحب سے نہیں پڑھی، مکہ مکرمہ میں پڑھی تھی۔ جامع ترمذی اور تیسیر الوصول پوری تنقید سے پڑھیں۔ صحیح مسلم جب میں نے وہاں جاکر پڑھی تو وہ سامع تھے۔ فرمایا صحیح مسلم میں نے تین بار میاں صاحب سے پڑھی۔ ایک مرتبہ تمام و کمال۔ دوسری مرتبہ اول کا حصہ اور تیسری بار آخر کا۔ ایک دفعہ میاں صاحب بواسیر کے سخت دورے میں مبتلا ہو گئے تھے۔ چھ مہینے تک ایک عالم یاس رہا۔ اس عرصہ میں قاری صاحب اور اُن کے ساتھی حدیث مولوی حسن علی صاحب لکھنوی سے پڑھتے رہے۔ قاری صاحب کی ایک اجازت مولوی صاحب موصوف سے بھی ہے۔ مولوی حسن علی صاحب مولوی الٰہی بخش صاحب کے شاگرد تھے، مولوی الٰہی بخش صاحب شاہ عبدالعزیز صاحب کے۔ قاری صاحب کو اجازتِ حدیث بعض مشائخِ عرب سے بھی تھی، جن میں سے بعض کی سند کا سلسلہ شیخ ابراہیم کردی سے تھا، بعض کا شیخ ابو طاہر سے۔

فنِ تجوید قاری صاحب نے امروہہ جاکر قاری امام الدین صاحب سے حاصل کیا تھا۔ مخرج ضاد کی بابت (بجواب سوال مولوی یونس خاں) فرمایا کہ زبان کا پہلو بائیں جانب اوپر کی بائیں ڈاڑھوں کی جڑوں سے رگڑ کر نکلے تو یہ حرف ادا ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص عمداً بجائے اُس کے ظ کی آواز نکالے تو نماز باطل ہے۔ مجبوراً کرے تو وہ جاہل ہے۔ اُس کی نماز خود تو درست ہوگی، قابل امامت نہیں۔

برادر موصوف نے مولود شریف میں قیام کی بابت سوال کیا تو فرمایا۔ میں کیا کہوں۔ قرآن و حدیث و فقہ میں اس کا ذکر نہیں۔ جب متقدمین کی تصانیف عالم وجود میں آئیں اُس وقت تک اس کا

وجود نہ تھا۔ متأخرین نے یہ طریقہ ایجاد کیا اور ان کا ذکر اپنی تصانیف میں کیا ہے۔ ان کو ہم نہیں مانتے۔
ایک طرف یہ ہے کہ اس مجلس خاص میں تو قیام کرنا عین ایمان ہوا اور ویسے آپ کا ذکر بار ہا ہوئے میلاد کا بھی ذکر آئے، اور احوالِ مبارک بھی بیان ہوں، اُس میں کوئی کھڑا نہ ہو۔ یہ عجیب بات ہے۔ دوسری طرف یہ شدت ہے کہ کفر و شرک بتاتے ہیں۔ آخر رسول اللہ کی تعظیم تو ہے۔ (دوسری طرف .... الخ یہ عبارت پوری یاد نہیں اس وقت لکھی ہے) اس لئے میں کچھ نہیں کہتا"

برادرِ موصوف نے مولوی نذیر حسین صاحب دہلوی کے تلمذ کی بابت دریافت کیا تو فرمایا کہ جس روز میاں صاحب ہجرت کر کے روانہ ہوئے اُس روز یہ اُن کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور چند کتابوں کی اوائل کی ایک ایک حدیث پڑھی اور پڑھ کر کل کتابوں کی اجازت حاصل کی۔ میاں صاحب نے ایک چھوٹے کاغذ پر ہی واقعہ لکھ کر دے دیا۔ اس سے پہلے مدرسہ میں پڑھنے کو کبھی نہیں آئے۔ کوئی مسئلہ پوچھنا ہوتا تھا تو دوسرے تیسرے مہینے آجاتے تھے۔ میاں صاحب کا مدرسہ بیرم خاں کے ترا ہے پر تھا۔ شاہ عبدالعزیز صاحب نے اپنی زندگی میں اُن کے واسطے یہ مدرسہ بنوا دیا تھا۔

میں نے قاری صاحب کے سن کی بابت دریافت کیا۔ فرمایا ٹھیک یاد نہیں۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کے وعظ میں اپنے والد کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ اور کلام اللہ حفظ کر چکا تھا۔ (اس حساب سے ملاقات کے وقت قاری صاحب کا سن کم و بیش ننانوے برس کا تھا) قاری صاحب کا بدن لاغر، قد لانبا، رنگ گندمی، آنکھ اور ناک بڑی، آواز بھاری تھی۔ مزاج میں تیزی معلوم ہوتی تھی۔ رائے کے اظہار میں قطعاً بے دھڑک تھے۔ کبرسن کے آثار صحت پر غالب آچکے تھے۔ ڈاڑھی گھنی تھی، قدرتاً چھوٹی، مہندی لگی ہوئی۔ سر پر بال پورے۔ لباس، انگرکھا بدوں کرتے کے۔ سر پر عمامہ سپید۔ پاجامہ غالباً تنگ (میں نے قاری صاحب کو بیٹھا دیکھا تھا اس لئے ٹھیک اندازہ نہ کر سکا)۔

قصبہ میں کچھ املاک ہے اُس سے بفراغت بسر ہوتی ہے (یہ یادداشت ملاقات کے تیسرے روز ۱۱ رجب المرجب روز جمعہ ۱۳۱۱ ہجری کو کتاب پر قلمبند کی گئی)۔

اب افسوس ہوتا ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ اسحٰق صاحب کا حلیہ قاری صاحب سے نہ پوچھا۔ رحمہم اللہ تعالیٰ۔ فقط

(رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ مارچ ۱۹۳۱ء)

حبیب گنج کا کتاب خانہ کس طرح جمع ہوا

یہ تو یاد نہیں کہ میری عمر اُس وقت کیا تھی مگر یہ کہہ سکتا ہوں کہ محض بچّہ تھا جب یہ دیکھتا تھا کہ والد مرحوم کو کتابوں کا اور کتاب دیکھنے کا شوق تھا۔ شب کو ایک مُعیّن وقت پر کھانے سے پہلے کتاب دیکھتے تھے۔ زیادہ تر فارسی کی تاریخیں مثلاً تاریخ فرشتہ، سیر المتاخّرین یا ادب اُردو مثلاً بوستانِ خیال۔ گفتگو میں اکثر بادشاہوں کے تاریخی واقعات بیان فرماتے۔ دوپہر کو لیٹ کر سونے سے قبل بھی کتاب دیکھتے۔ جب میں اُردو پڑھنے لگا تو مرزا غالب کی اُردوئے معلّٰی کا نسخہ مجھ کو عنایت ہوا تھا۔ میں اس کو دیکھتا۔ کچھ سمجھتا بہت کچھ نہ سمجھتا۔ تاہم دیکھے جاتا۔ اور اتنا دیکھتا کہ والد مرحوم تنگ آجاتے منع فرماتے۔ ذوقِ ادب کی یہ بُنیاد تھی۔

ایک کتاب فروش تھے عبدالرحیم نامی۔ اپنی گٹھری لے کر مکتب میں درسی کتابیں بیچنے آتے۔ درسی کتابوں کے سوا چھوٹی چھوٹی نظم کی کتابیں دکھا کر شوق دلاتے کہ بچے خریدیں مثلاً نور نامہ۔ حضرتِ بلال رضؓ کا قصہ۔ جملۂ معترضہ۔ ہم کتابیں دیکھتے تو استاد کہتے جاتے "لڑکو مصطفائی یا نظامی مطبع کی کتاب لینا نولکشوری نہ لینا" یہ صحیح کتاب کا اہتمام تھا۔ درسی کتابوں کی قیمت تو بزرگوں کی سرکار سے ملتی۔ غیر درسی کی خود دینی ہوتی۔ اتوار کے دن ہمارے یہاں بازار لگتا تھا۔ اُس میں پیسے ملتے تھے۔ انھیں میں سے اس کام میں صرف ہوتے۔ خوب یاد ہے کہ ایک بار کتاب فروش کے ایک روپیہ چھ آنے میرے ذمہ واجب ہوگئے۔ میرے پاس صرف چھ پیسے تھے۔ تقاضا کے بعد دھمکی دی کہ "خاں صاحب سے کہوں گا" یہ بڑی دھمکی تھی۔ قرض کی چیز لینا سخت جُرم تھا۔ اُس رات جو فکر رہی وہ آج تک یاد ہے۔ دوسرے روز کچھ کتابیں واپس دیں۔ کچھ بدلے میں دیں۔ پاس کے پیسے دئے جب تقاضا ہلکا ہوا۔ بچپن کے اسی شوق کا یہ اثر تھا کہ رات کو زنانہ میں یہ کھیل ہوتا کہ کوئی چادر بچھا دی جائے نماز مل جاتی تو لپیٹ کر گٹھری بنائی جاتی اور کتابیں بیچی جاتیں۔ بیبیاں دیکھ کر تعجب کرتیں۔

بہر حال یہ شوق کتابیں دیکھنے کا عبدالرحیم موصوف نے لگایا تھا غفرلہ۔ استعداد کے ساتھ کتابوں کا معیار بھی بڑھتا گیا۔ اب نورنامہ وغیرہ تو موجود نہیں۔ البتہ اُن سے خریدی ہوئی شرح سہ نثر ظہوری وغیرہ کتابیں موجود ہیں۔ اُن میں سے بعض پر ۱۳۰۰ھ ہجری میرے قلم سے درج ہے۔ انھیں کتابوں کی خریداری کے ساتھ اُردو دواوین کا شوق ہوا۔ ایک واقعہ کی مدد سے یاد آتا ہے کہ ۱۸۸۳ء تک سو سوا سو کتابیں جمع ہو چکی تھیں۔ ایک صندوق پلنگ کے پاس رہتا تھا۔ اس میں یہ کتابیں اور لکھنے پڑھنے کا سامان رہتا۔ اسی طرح کتابیں بڑھتی رہیں۔ جب علیحدہ کمرہ رہنے کو ملا تو والد مرحوم نے اُس میں ایک الماری کتابوں کے واسطے بنوا دی۔ یہ الماری جب تک بھری نہ تھی۔ یہ اُس وقت کا ذکر ہے کہ قطبی وغیرہ کتابیں پڑھتا تھا۔ ۱۸۸۵ء میں انگریزی پڑھنے کے لئے آگرہ گیا۔ وہاں قلمی کتابیں دیکھنے اور خریدنے کا موقع ملا۔ یاد آتا ہے کہ سب سے پہلے قاضی ابو زید مرلوسی کا رسالہ مساحت خریدا۔ واقعاتِ بابری کا ایک نادر قلمی نسخہ آگرہ کالج کی لائبریری میں تھا جو ندرت کی وجہ سے سیف میں رکھا جاتا تھا۔ عمِ محترم مرحوم کی اجازت سے اُس کی نقل ۱۸۸۶ء میں کرائی۔ اسی زمانہ میں علامہ شبلی مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ اُن کے فیض صحبت سے وسعتِ نظر پیدا ہوئی۔ پٹنہ، رامپور وغیرہ کے کتاب خانوں کے حالات سُنے۔

یہی زمانہ تھا کہ والدہ مرحومہ کے معالجے کے سلسلہ میں دلّی جانا اور رہنا ہوا۔ خریداری کتب کا شوق ساتھ تھا۔ مولوی سلیم الدین خاں صاحب مرحوم بہت وسیع پیمانہ پر قلمی کتابوں کی فروخت کا کاروبار کرتے تھے قیمت پوری لیتے تھے۔ اُن سے بلا بعض کتابیں خریدیں مثلاً دیوان طالب آملی کا قلمی نسخہ۔ ایک کباڑی کے یہاں سے کشف الحجاب فی علم الاصطرلاب کا عمدہ نسخہ خریدا۔ اُسی کی معرفت بعض اور کتابیں اور خوشخط قطعات خریدے۔ قطعات کا یہ پہلا شوق اور خریداری تھی۔ جملہ معترضہ "زر زر کشد" کا تجربہ ہوا۔ حکیم سعد الدین احمد صاحب ہمارے یہاں لکھنؤ کے ایک طبیب تھے۔ حکیم یعقوب صاحب مرحوم کے شاگرد۔ اُس عہد کی تہذیب کے موافق خوشخط تھے۔ خطاطی کی باقاعدہ مشق کی تھی۔ میں نے دلّی کے قطعات کا سرمایہ اُن کو دکھایا تو میرا شوق دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ جو قطعے اُستادوں کی نشانی اُن کے پاس تھے وہ مجھ کو عنایت کر دئے۔ اب تک اُن کی یادگار کی تصریح کے ساتھ کتاب خانہ میں محفوظ ہیں۔

آمدم برسر مطلب۔ جو قلمی چیز خریدی جاتی علّامہ مرحوم کو دکھائی جاتی۔ جرح کرتے اور کوشش فرماتے کہ نگاہ بلند ہو۔ انھیں کے ذریعہ سے لکھنؤ کے قلمی کتاب فروشوں سے سابقہ ہوا۔ جن کو مولانا "فارتگر" کہتے تھے۔ وہ کتاب ایسی دکھاتے تھے کہ نہ لینا ممکن نہ ہوتا۔ قیمت ایسی طلب کرتے کہ دیوالیہ کر دیتے۔ اب بھی اُن کی قیمت دیکھتا ہوں تو گرانباری محسوس ہوتی ہے۔ لکھنؤ کی مدد سے قلمی کتابوں کا سرمایہ بڑھتا رہا۔ دوسرے مقامات سے بھی کتابیں ملتی رہیں۔ اب اتنا سرمایہ ہو گیا تھا کہ رہنے کے کمرہ میں چاروں طرف چھوٹی بڑی الماریاں کتابوں سے معمور پیش نظر رہتی تھیں۔ حفاظت سے رکھتا۔ تھوڑی بہت فہرست، یہ سب اپنے ہی ہاتھ سے کرتا۔

ایک بار استاذ العلما مولانا لطف اللہ صاحب مرحوم کی ایک صاحبزادی کی شادی مولانا کے وطن پلکھنے میں ہوئی۔ میں بھی حاضر ہوا۔ عجیب عالم تھا۔ تلامذہ کا کثیر مجمع تھا جن میں نامور علما بھی شامل تھے مثلاً مولانا سید محمد علی صاحب مولانا احمد حسن صاحب۔ مولانا عبد الغنی خاں صاحب۔ مولانا عبد الجمیل صاحب۔ لطف یہ تھا کہ مہمانوں کے سامان پہچانے پر ہر طرف مولوی ہی مولوی نظر آتے تھے۔ پلنگ، پانی، برتن، غرض جملہ اشیا اہل علم ہی کے ہاتھ سے پہنچ رہی تھیں۔ میرے یہاں جب سامان لانے لگے تو میں نے معذرت کی کہ آپ نہ لائیں۔ ایک صاحب[1] نے جو واقف تھے ہنس کر کہا کہ "یہاں مولویوں کے سوا اور ہی کون جو تمہارے لئے سامان لائے گا"۔ غرض ان حضرات میں سے بعض کو میں نے تکلیف دی کہ شادی کے بعد حبیب گنج تشریف لائیں۔ کرم فرمایا۔ کتاب خانہ دیکھا۔ متعارف فنون کا اتنا سرمایہ جمع ہو چکا تھا کہ قابلِ تحسین ٹھہرا۔

مولانا سید محمد علی صاحب اور علّامہ شبلی کی تشویق سے بیرونی ممالک کی کتابوں کے خریدنے کا شوق ہوا۔ ندوۃ العلما کے جلسوں کے سلسلہ میں کانپور جانا ہوتا تو مولوی نور الدین مرحوم اور مولوی سلیمان صاحب تاجر کتب مصریہ کی فہرستیں دیکھ کر کتابیں خریدی جاتیں۔

قدم آگے بڑھا تو بمبئی، مصر، شام اور یورپ سے کتابیں آنے لگیں۔ متفرق طور سے بھی کتابیں

---

[1] مولوی سید ظہور الاسلام صاحب فتحپوری غفر لہ ۱۲

(اور نادر کتابیں) ہاتھ آتی رہیں۔ یہ ارزاں مل جاتیں۔ مثلاً مباحث مشرقیہ امام رازی کا نسخہ ایک بیوہ شریف زادی کے یہاں سے تین روپیہ کو ملا۔ الٰہ آباد سے ایک صاحب نے ایک بیوہ کا نال گلستان کا نادر مصور نسخہ بے طلب بھیجدیا جب دس[1] روپیہ قیمت بھیجی تو دعا اور شکریہ بھی ملا۔ جو نادر کتاب ہاتھ آتی علامہ شبلی مرحوم کو مطلع کرتا وہاں سے تحسین آتی۔ یاقوت مستعصمی کا لکھا ہوا کلام مجید کا نسخہ ہاتھ آیا تو نیاز نامہ کے جواب میں فرمایا "گانوں میں بیٹھے ہوئے بغداد تک چھاپے مارتے ہو"۔ اس کلام مجید کے دستیاب ہونے کا واقعہ بھی شنیدنی ہے۔

ایک علمی اور درویشی خاندان کے صاحبزادہ نے روش خاندانی بدل کر باپ کی موجودگی میں سرمایۂ علمی پر دست درازی شروع کردی۔ ایک بار ایک نادر نسخہ معمولی داموں پر یہاں فروخت کر گئے۔ چلتے وقت کتاب دار سے کہا کہ یہ تو معمولی چیز تھی۔ ہمت ہو تو ایک چیز لاؤں۔ کہا گیا۔ "ضرور"۔ دوبارہ آئے تو یاقوت مستعصمی کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن شریف کا وہ نادر روزگار نسخہ لائے کہ آنکھیں کھل گئیں۔ ظفر خاں شاہ جہانی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ عبارت اس پر تھی "بقلم یاقوت مستعصمی کہ بہتر ازیں نوشتہ اند"۔ ہدیہ چالیس روپیہ لے گئے۔ چند روز بعد اہل خاندان کو خبر ہوئی۔ وہ اس کے ذریعہ سے زیادہ نفع کے امیدوار تھے۔ بعد مشورہ چالیس روپیہ دے کر صاحبزادے کے والد کو میرے پاس بھیجا میں ایک جگہ عزیز داری میں گیا ہوا تھا وہاں ملے۔ تخلیہ کی فرمائش کی۔ کھٹک گیا۔ تنہائی میں لڑکے کی نالائقی کا شکوہ فرما کر دریافت کیا کہ آیا کلام مجید کا نسخہ حبیب گنج پہنچنے کی خبر صحیح ہے۔ مشکل کا سامنا ہوا۔ آپ خیال کر سکتے ہیں کہ شوق کا تقاضا کیا ہوا ہوگا۔ دل نے کہا کہ خطاب کرنے والے سیدؔ معاملہ کلام مجید کا۔ جھوٹ بولنا روا نہیں۔ صاف واقعہ کہدیا' اور واپسی کا وعدہ کیا۔ سید صاحب یہاں تشریف لائے تو نسخہ واپس کر دیا۔ چلتے وقت فرمایا "وقف ہے۔ حفاظت نہ ہو سکی تو تمہارے پاس امانتاً رکھوا دوں گا"۔ آگے سُنئے۔ صاحبزادے چالیس روپیہ میں ہدیہ کر گئے تھے خود. بزرگوار نے بارہ روپیہ میں گروی رکھ دیا۔ مجھ کو کسی

---

[1] اس نسخے پر سلاطین اودھ کی مہریں ہیں۔ بیوہ سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اُن کے نانا غازی الدین حیدر بادشاہ کو کتاب سنایا کرتے تھے۔

ذریعہ سے معلوم ہوا تو زر رہن بھیج کر نسخہ اپنے پاس منگوا لیا۔ سید صاحب نے پھر کرم فرمایا۔ نسخہ پھر حوالے کر دیا گیا۔ اس مرتبہ اُن کے زر طلب عزیز ایک ریاست میں لے گئے اور ساڑھے گیارہ سو روپیہ میں ہمیشہ کے لئے اپنے آپ سے اس عزیز کو جدا کر دیا۔ میں نے اس واقعہ کا پہلا حصہ علامہ شبلی سے بیان کیا تو فرمایا "تمہاری شرافت تمہارے شوق پر غالب آئی ہے"

جب حیدرآباد میں تعلق ہوا تو وہاں بھی عمدہ موقعے کتابوں کے حاصل کرنے کے ملے۔ خود اپنے بزرگوں کے کتاب خانوں کے سرمایہ سے بھی اضافہ ہوا ہے۔ منجملہ اُن کے بعض نادر نسخے ہیں مثلاً تفسیر جلالین کا ایک نسخہ عہد قطب شاہی کا نفیس لکھا ہوا۔ تانا شاہ کے بعض حاشیے اس پر درج ہیں۔

داستان بالا سے معلوم ہوا ہوگا کہ یہ میرا مختصر کتاب خانہ نصف صدی سے زیادہ کی تلاش کا سرمایہ ہے۔ الحمد للہ کہ اس میں ایک نسخہ بھی سرقہ یا ناجائز ذریعہ کا حاصل کیا ہوا نہیں ہے۔ بلکہ ایسا ہوا ہے کہ فروشندہ نے ناواقفیت سے کم قیمت مانگی میں نے زیادہ دام دئے۔ بہت سی کتابیں نقل کے ذریعہ سے بھی حاصل ہوئی ہیں۔ سفر حج میں حرمین شریفین میں بھی کتابیں ہاتھ آئیں۔ احباب اور اعزّہ کے ہدایا نے بھی سرمایہ بڑھایا۔ تحفۂ اثنا عشری کا نسخہ منشی احتشام علی صاحب کا عطیہ ہے۔ جو خود شاہ صاحب نے صحیح کرا دیا تھا۔ بعض دفعہ حماقتیں ہوئیں جن پر اب تک افسوس ہے۔ ایک حماقت سُن لیجئے۔ بوستان سعدی کا ایک نسخہ آیا۔ مشہور خطاط (غالباً اسحٰق) کے ہاتھ کا لکھا ہوا بفرمائش شاہی۔ کئی مغل بادشاہوں کی مُہریں اور دستی عبارتیں لکھی ہوئیں، جن میں جہانگیر اور شاہ جہاں شامل تھے۔ اُس کی آراستگی قابلِ دید تھی۔ تین سو روپیہ قیمت تھی۔ ایک دوست نے بھیجا۔ چند روز رکھا رہا نہ معلوم دماغ اُن ایام میں صحت کے کس درجہ میں تھا کہ نہ لیا۔ واپس کر دیا۔ خود اُن دوست نے خرید لیا۔ اب میں ہوں اور وہ دوست۔ طرح طرح سے پھسلاتا ہوں مگر اُن کا دل نہیں پسیجتا۔ اگر معارف کے قارئین میں سے کوئی صاحب میری مدد فرمائیں تو اُن کا نام بھی بتا دوں۔

کتابوں کے جمع کرنے میں زیادہ اہتمام قلمی نسخوں کا رہا ہے۔ مطبوعہ علمی اور فنّی کتابیں جمع کی ہیں۔ معمولی کتابوں سے تعداد بڑھانا کبھی پیشِ نظر نہیں رہا۔

اس تمام تجربہ سے قدیم زمانہ کے علمی و کتابی شوق کا جو اندازہ ہوا ہے اُس کے مقابلہ میں عہد حاضر کی بد ذوقی بلکہ بد ذوقی دیکھ کر دل دُکھتا ہے۔

اس وقت کتاب خانہ میں کل جلدیں ۴۱۷۳ ہیں۔ ان میں سے ۳۱۱۱ مطبوعہ ہیں۔ اور ۱۰۶۲ قلمی۔ اب ایک وسیع عمارت بھی اس سرمایہ کے لئے تنگی کر رہی ہے جو اوسط پیمانہ کے صندوق سے شروع ہوا تھا۔

ترتیب فن وار ہے۔ کتابیں عربی، فارسی، اُردو۔ تینوں زبانوں کی ہیں۔ انگریزی کی بھی ۱۸۷ ہیں۔ جو فہرست بالا سے خارج ہیں۔ فہرستیں ایک سے زیادہ مرتب ہو چکی ہیں اور بعض ہنوز زیر ترتیب ہیں۔ سرمایہ الحمد للہ برابر ترقی پذیر ہے۔ حال میں دلّی کے ایک کباڑی کے یہاں سے قدیم مطبوعات کے بہت سے نسخے ملے ہیں ؎

ہنوز آں ابر رحمت دُر فشانست

خم و خمخانہ با مُہر و نشانست

(رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ اکتوبر ۱۹۳۱ء)

آج یہ مقالہ ارتجالاً پڑھا۔ اب کتابوں کی تعداد اس کتاب خانے میں ۶۰۹۰ مندرجہ فہرست ہے۔ تعداد مندرجہ مقالہ سے ۱۹۱۷ زائد یعنی ڈیوڑھی تعداد ہو گئی۔ فالحمد للہ تعالیٰ علیٰ ذٰلک۔ اور یہ بارہ سال میں ہوئی ہے۔ اس طرح فی سال ڈیڑھ سو ۱۵۰ سے زائد کتابوں کا اضافہ ہوا۔ علاوہ فہرست بھی کتابیں ہیں جو ہنوز درج فہرست نہیں ہوئی ہیں۔

حبیب الرحمٰن۔ ۹ جمادی الاول ۱۳۶۳ھ

(۳ مئی ۱۹۴۴ء)

ے وسے خانہ

کتب خانۂ حبیب گنج کی فہرست کا گوشوارہ

سابق میں اپنے کتاب خانہ کے قلمی سرمایہ کی فہرست مرتب کرنے کی اطلاع معارف کے ذریعہ سے اہل علم کو کی تھی۔ اس کے بعد ایک مرحلہ اور طے ہوا۔ اپنے ذوق کے مطابق ایک گوشوارہ تیار کیا ہے۔ اس کے عنوان بھی خود ہی تجویز کئے ہیں۔ قارئین معارف کی خدمت میں اصلاح و اطلاع کے لئے پیش کرتا ہوں۔ ممکن ہے دوسرے کتاب خانے ان میں سے کسی عنوان کو اپنے لئے پسند فرمائیں اس گوشوارے کا خیال یوں بھی ہوا کہ ایک امریکن[1] خاتون یہاں صرف مطلا و مذہب کتابیں دیکھنے آئی تھیں دکھائی گئیں۔ مگر فہرست جداگانہ نہ ہونے سے ملاحظہ تام نہ ہو سکا۔ گوشوارہ کے عنوان حسب ذیل ہیں:

(عنوان چونکہ جدید ہیں اس لئے شاید نامانوس ہوں یا ناموزوں۔ عدم موزونیت کی اصلاح کا ارباب ذوق سے آرزومند رہوں گا)۔

(۱) **الذہبیات**۔ اس عنوان کے تحت صرف وہ کتابیں ہیں جو طلائی کام کے لحاظ سے امتیاز رکھتی ہیں۔ ان کتابوں کی مدد سے مختلف عہدوں اور ملکوں کے انداز اور ذوق کا پتہ لگ سکتا ہے یا ورار النہر ایران، عرب، ترکی، کشمیر، ہندوستان وغیرہ ممالک کا ہنر سامنے آجاتا ہے۔ مختلف ادوار کی ترقی و تنزل مذاق کا پتہ لگ سکتا ہے۔

(۲) **الخطاطیات**۔ اس عنوان کے تحت میں مسلّم خطاطوں کے قلم کی کتابیں درج ہیں مثلاً میر عماد، میر علی کاتب وغیرہ۔

(۳) **الخطیات**۔ یہ وہ کتابیں ہیں جو اعیانِ ملک کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں یا اُن کے خط سے مزین ہیں مثلاً ابو الحسن آصف خاں شاہ جہانی، حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی۔

(۴) **المجلدات**۔ قدیم جلد سازی کے نمونے۔

---

[1] لیڈی کرامپٹن

(۵) **السلطانیات** ۔ جن کتابوں کا سلاطین سے خاص تعلق ہے، وہ اس عنوان میں لکھی گئی ہیں۔ مثلاً ابراہیم عادل شاہ کے کتاب خانہ کی صحیح بخاری، حصنِ حصین کا نسخہ پیشکش شاہزادۂ عالی جاہ اعظم شاہ بحضرت عالمگیر بادشاہ در سنہ جلوس۔

(۶) **الفتوحیات** ۔ وہ کتابیں جو سلاطین کے کتاب خانوں میں فتح کے مال غنیمت میں سے داخل ہوئیں مثلاً مثنوی گوئے چوگان ملا عارفی نوشتہ میر علی کاتب جو عالمگیر بادشاہ کے کتاب خانہ میں گولکنڈہ کی فتح کے مالِ غنیمت میں سے داخل ہوئی۔

(۷) **المقامیات** ۔ وہ کتابیں جن پر مقام تحریر وغیرہ درج ہے۔ مثلاً قسطنطنیہ، مدینہ منورہ، مکہ مکرمہ، بلخ، بخارا، وغیرہ دار السلطنتوں سے لے کر دیہات تک سب درجوں کے نام اس فہرست میں ہیں۔ کبھی ہمارے علمی فیض سے ایک عالم منور تھا۔ اب یاد ہے اور حسرت۔ ایک مقام "قوہ ون" ہے۔ معجم البلدان میں اس کا پتا نہیں۔ شاید اہل معارف پتا بتا سکیں۔

(۸) **الختمیات** ۔ جن کتابوں پر مہریں ہیں۔ اس فہرست سے ذوقِ ادب کے سوا مہروں کی تاریخ عیاں ہو جاتی ہے۔ بعض مہریں کس قدر دلگیر ہیں۔ "نظام الدین بیچارہ نہ این نہ آن"۔ "این نیز بگزرد"۔ اس مہر کو بار بار پڑھا۔ کتاب کو دیکھا۔ دل نے کہا "آخر گزر ہی گیا"۔ جب سے اب تک خدا معلوم کیا کیا اور کون کون گزر گیا۔ ایک مہر عجیب ہے، مدوّر، بڑی امرا شاہی کی شان کی۔ نہایت خوشخط واضح الحروف ہے۔ الفاظ بجنسہٖ نقل کیے جاتے ہیں۔ شاید کسی طرف سے روشنی پڑے کہ یہ کون امیر تھے، کس نسل یا ملک کے۔ نقش (دوینگ ویل ویریانوں فدوی محمد شاہ بادشاہ غازی ۱۱۵۰) یہ مہر جس کتاب پر ہے وہ زبور کا ترجمہ ہے۔

۱؎ دار السلطنۃ دہلی میں ایک پرتگالی خاندان تھا جس کو دربار بہادر شاہ اول سے بارہ گاؤں کی جاگیر کا پروانہ عطا ہوا تھا۔ یہ جاگیر انگریزی عملداری میں بھی جاری رہی۔ اس خاندان کا ایک فرد جنرل ماتول ویریانوں ۱۸۲۹ء میں بمقام دہلی فوت ہوا جس کی قبر کشن گنج کے قبرستان عیسوی مدفن میں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ صاحب مہر اسی خاندان سے عہد محمد شاہی میں تھا۔ مہر کے الفاظ کو یوں پڑھنا چاہیے:
"دوینگ ویل ویریانوں فدوی محمد شاہ بادشاہ غازی ۱۱۵۰" اصل پرتگالی نام کا املا بخط انگریزی

[illegible] ن سے نون غنہ کی دہری آواز پرتگالی
زبان میں دیتا ہے۔ (اقتباس از خط مسٹر عبداللہ یوسف علی سابق سولین صوبہ متحدہ بحوالہ پنجاب یونیورسٹی ہسٹاریکل سوسائٹی جرنل بابتہ دسمبر سنہ ۱۹۳۲ء صفحات ۱۵۵-۱۶۰)

(۹) الاقاربیّات - یہ وہ کتابیں ہیں جن کا میرے رشتہ داروں سے تعلق ہے۔ ان کی تالیف ہیں۔ حواشی سے مزین ہیں - فرمائش سے لکھی گئی ہیں۔ یا اُن کے کتاب خانوں سے ملیں۔ وغیر ذالک۔

(۱۰) الاُستاذیات - اس عنوان میں وہ کتابیں رکھی گئی ہیں جو میرے اُستادوں کے سلسلہ میں سے کسی بزرگ کی لکھی ہوئی ہیں - یا محشّٰی بقلم خاص ہیں - یا اُن کے خط سے کسی دوسرے عنوان سے مزین ہیں - وغیر ذالک۔

(۱۱) الحسنیّات - ان میں وہ کتابیں ہیں جو بلحاظ خط نادر ہیں۔ (غیر خطاطیات)

(۱۲) القرطاسیّات - اس میں کاغذوں کے اقسام دکھائے گئے ہیں مثلاً گجراتی، سمرقندی، وغیرہ

(۱۳) العتیقات - نویں صدی ہجری یا اُس سے قبل کی کتابیں۔ سب سے قدیم نسخہ پانچویں صدی کا ہے۔

(۱۴) الخطوط - اس میں مختلف خطوں کی تشریح ہے مثلاً خط نسخ عربی، بغدادی، ایرانی، کشمیری، ہندی بہاری وغیرہ۔

(۱۵) المصنفیات - بخط مصنف - یا نسخہ مُصنف سے منقول - یا مقابلہ شدہ وغیرہ مثلاً الاجوبہ والاسولہ للامام القشیریؒ خود امام کے ہاتھ کی لکھی ہوئی - ارتیاح الاکباد یا ریاح فقدالاولاد بلحافظ شمس الدین سخاویؒ اُن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی - (بعض حصے) فقط

شنویاتِ سرور

(ریویو)

نواب اعظم الدولہ محمد میر خاں معظم جنگ بہادر خلفِ نواب اعظم الدولہ مظفر جنگ دہلوی سید رضوی اور دلی کے نامی گرامی امرا میں سے تھے۔ بادشاہی سیندھیا کے مختار مظہور معتمد شاہ جی کے پوتے تھے۔ دربار شاہی میں معزز۔ فارسی میں مرزا جان بیگ صافی کے شاگرد۔ شاعری میں ابتدا میر فرزند علی موزوں سے تلمذ تھا۔ پھر اپنے والد کے شاگرد ہوئے۔ جن کا تخلص صباحی تھا۔ سید محمد زکریا خاں زکی شاگرد مرزا غالب سرور کے پوتے تھے۔ غالب نے جو سند زکی کو لکھ کر دی تھی اس میں سرور کی دالادودمانی اور امارت کی تصدیق کی ہے۔ اس سرٹیفکٹ کی نقل دیوانِ زکی مطبوعہ مطبع رضوی دہلی ۱۳۱۲ھ کے دیباچہ میں شامل ہے۔

موزوں ساماتہ کے رہنے والے تھے۔ دلی میں رہے۔ وہاں سے لکھنؤ چلے گئے۔ میر شمس الدین فقیر کے شاگرد تھے۔ فارسی اور اردو دونوں میں شعر کہتے تھے۔ سرور بھی اردو فارسی دونوں میں شعر کہتے تھے۔ اردو شعرا کا تذکرہ بہت عمدہ لکھا تھا۔ تذکرۂ شعرائے ہند میں لکھا ہے کہ تذکرۂ مذکور دہلی میں بہت مشہور تھا۔ نیز یہ کہ شیفتہ وغیرہ نے اسی تذکرہ سے فائدہ اٹھایا۔

شوال ۱۲۵۰ہجری میں سرور نے وفات پائی۔ تذکرۂ مذکور میں اُن کی عادت کی بابت لکھا ہے "نہایت خوش طبع، کشادہ پیشانی، ہنستی صورت، نیک اختلاط، پاکیزہ زندگی"۔ صاحبِ دیوان تھے۔

غزل کا نمونہ

کوچۂ یار میں خوابیدہ اس آرام سے ہوں
شورِ محشر کو بھی ہوئے گا جگانا مشکل

ولہ

دیدۂ تر سے لگا خط کو نہ اُس کے سرور
یار کے ہاتھ کا لکھا ہے۔ مبادا مٹ جائے

ولہ

غیر لایا ہے اُسے بہرِ تماشا۔ دمِ نزع
دوستوں سے نہ ہوا وہ جو ہوا دشمن سے

ولہ

مرگ بہتر ہی۔ گر نہ ہو تو پاس   ہے مزہ تجھ سے زندگانی کا

ولہ

اُس کو شاید کہ ہی یہاں رشکنی اب منظور   اور کے چاہنے کا مجھ پہ جو بہتان رکھا

مثنویات سرورؔ - تذکرہ نویسوں نے سرور کے تذکرہ اور دیوان کا تو ذکر کیا ہی مگر مثنویوں کا ذکر پیش نظر تذکروں میں سے کسی تذکرے میں نظر سے نہیں گزرا۔ البتہ زکی دہلوی اپنے تذکرہ بالا دیوان کے فارسی دیباچہ میں لکھتے ہیں۔ "حضرت سرورؔ را دیوانے و مثنویات سبعہ سیارہ و تذکرہ شعرائے اُردو بود۔" یہ بھی لکھا ہی کہ یہ سارا سرمایہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں برباد ہو گیا۔

میں جس نسخہ کو اس مقالے کے ذریعہ سے روشناس کرانا چاہتا ہوں وہ ۵۵/۳۷ چھوٹی تقطیع پر نہایت خوشخط جلی قلم سے کسی خطاط کا لکھا ہوا ہی۔ طرز خط میر پنجہ کش کے انداز سے ملتی ہوئی ہی۔ کاغذ دبز وفتی نما ہی۔ تعداد صفحات ۱۱۶۔ فی صفحہ ۶ سطر (درمیان میں جابجا اوراق غائب ہیں) جدول طلائی عریض سُرخ وسپید۔ عنوان ہر مثنوی کا طلائی کار۔ رنگ آمیز بطرز جدا۔ صفحہ اول طلاکار زر افشاں۔

اس نسخہ میں تین مثنویاں ہیں۔ اول یوسف زلیخا، دوسری لیلیٰ مجنوں تیسری وامق و عذرا۔ آخرالذکر ناقص ہی۔ اس لئے سنہ کتابت، نام کاتب و مؤلف مفقود ہی۔ تخلص سرورؔ البتہ جابجا موجود ہی۔ تذکروں میں پرانے شعرا کے تذکرمیں سرور تخلص صرف نواب اعظم الدولہ کا مذکور ہی۔ نسخۂ ہذا کم سے کم ساٹھ ستر برس اُدھر کا لکھا ہوا ہی۔

مناجات یوسف زلیخا میں سرورؔ لکھتے ہیں:-

کروں دیوانگی میں شور و غوغا   پڑھوں جب قصۂ یوسف زلیخا
کہے عذرا و وامق کی حقیقت   کروں ابیات میں موزوں بحسرت
کبھو کر یاد حالِ قیس و لیلیٰ   کروں میں وقف لب صد ولئے ویلا
کبھو فرہاد و شیریں کا فسانہ   سُناؤں دل کو اپنے بیخودانہ

حکایت شمع و پروانے کی گر ہے ۔۔۔ سُناؤں گر دلِ دیوانہ چاہے

نظر ہیں گر گُل و بلبل کا عالم ۔۔۔ نوا سنجی میں ہوں مصروف ہر دم

ان اشعار میں چھ مثنویوں کے نام آ گئے۔ یوسف زلیخا، وامق و عذرا، لیلیٰ مجنوں، فرہاد و شیریں، شمع و پروانہ، گل و بلبل۔ اس لئے میں یہ تصور کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا مثنویاں نواب اعظم الدولہ سرور کی ہیں۔

نمونہ کلام یوسف زلیخا

الٰہی۔ کر عنایت دل میں وہ سوز ۔۔۔ کہ ہووے نالہ میرا شعلہ افروز

رہے افروختہ سینہ میں آتش ۔۔۔ بنے تن۔ داغِ سوزاں سے منقش

چمک سکھے یہ۔ آہِ شعلہ افشاں ۔۔۔ جسے ہو برق سوزاں دیکھ حیراں

رہیں آنکھوں سے جھڑے اشک جاری ۔۔۔ بنیں مژگاں۔ رگِ ابر بہاری

رہوں بیہوش میں آشفتگی سے ۔۔۔ نہ رکھوں کام نیکی اور بدی سے

اٹھاؤں ہر گھڑی شورِ قیامت ۔۔۔ بنوں میں ساکن کوے ملامت

جنوں سے روز و شب ہمخانہ ہوں میں ۔۔۔ ہمیشہ عقل سے بیگانہ ہوں میں

مرا وحشت میں ٹھہرے دشت مسکن ۔۔۔ گریباں چاک رہوے تا بہ دامن

طفیلِ ساقیِ کوثر۔ پلا۔ اب ۔۔۔ شرابِ عشق سے جام لبالب

کہ بن عشق۔ آدمی کی کچھ نہیں شان ۔۔۔ جو اُس سے آشنا ہو وہ ہی انسان

دلِ فارغ ز دردِ عشق دل نیست ۔۔۔ تنِ بیدرد دل جز آب و گِل نیست

عجب ہے عشق کی نیرنگ سازی ۔۔۔ نئی ہر جا ہے اُس کی ترک تازی

جدھر دیکھو اُدھر ہے جلوہ گر عشق ۔۔۔ لئے پھرتا ہے سب کو دربدر عشق

فلک سرگشتہ از سودائے عشقت ۔۔۔ جہاں پُر فتنہ از غوغائے عشقت

اگر حاصل ہو عمرِ جاودانی ۔۔۔ نہیں بن عشق لطف زندگانی

اسی کا جلوہ ہے دونوں جہاں میں ۔۔۔ سمایا ہے مکان و لامکاں میں

مزا ہو عشق کا جس کو یہ مرغوب
نہیں وہ زمرۂ احیا میں محسوب

سناؤں فاضل نامی کی یہ بیت
سند ہے حضرت جامی کی یہ بیت

"غمِ عشق از دلِ کس کم مبادا
دلِ بے عشق در عالم مبادا"

اگرچہ عشق میں آفت ہے یکسر
نہیں پر شغل کوئی اس سے بہتر

بظاہر گر بلائے ناگہاں ہے
دلِ غمگیں کا پر راحت رساں ہے

یہ ہے شمعِ شبِ ہجرانِ عاشق
منور جس سے ہے ایوانِ عاشق

یہ ہے آرامِ جانِ بیقراراں
تسلیِ دلِ الفت شعاراں

یہی ہے کلبۂ احزاں کی رونق
گلِ بستانِ عاشق ہے یہ الحق

یہ ہے مرہم برائے سینہ چاکاں
یہ ہے درمانِ دردِ دردناکاں

یہی ہے مونس و غمخوارِ عاشق
یہی ہے گرمیِ بازارِ عاشق

لکھوں وصفِ جنابِ عشق کیونکر
زبانِ خامہ ہے یاں کند یکسر

اسی سلسلہ میں اس شعر میں تخلص آتا ہے :-

مجھے کہتا ہے میرا دل کہ سرور
عجب یہ قصۂ دلکش ہے یکسر

نمونہ مثنوی لیلیٰ مجنوں (حمد)

اے مالکِ لاشریک مطلق
صانع اشیا کا تو ہے الحق

اے ربِّ ودود تو ہے معبود
ہے حکم سے تیرے بود نابود

ستّارِ عیوب بے مثالی
غفّارِ ذنوب - لایزالی

تجھ سے ہے سبھوں کو استعانت
ہے امر کی فرض تیرے طاعت

ہے ذات تری کریم لاشک
وابستہ ہے تجھ سے کار ہر یک

اے رازقِ واہب العطایا
وے خالقِ غافر الخطایا

اے قادر و کارساز عالم
محتاج سبھی ہیں تیرے ہر دم

اے عالمِ سرّ و آشکارا
ہرگز نہیں ہے یہ مجھ میں یارا

نعت

از بہر نبی رسولِ مقبول   دنیا کی تلاش جاؤں میں بھول
وہ خاتمِ انبیا ہے برحق   اسلام نے پائی جس سے رونق
وہ باعثِ اختراعِ کونین   ہے شان میں جس کی قابَ قوسین
ہے سب کو اطاعت اُس کی نافع   ہوگا وہی روزِ حشر شافع
اے حامیِ شرع و دینِ اسلام   وے ماحیِ کفر عہدِ اصنام
نازل صلواتِ حق ہو تجھ پر   تیرا ہے غلام دل سے سرور

منقبت

جتنے ترے ہیں آل و اصحاب   باہم ہیں وہ دوست اور احباب
پہنچے اُن پر درود وافی   میری بخشش کو ہیں وہ کافی

مناجات

اس شیشۂ دل کو بھر دے یارب   کر بادۂ عشق سے لبالب
مجھ کو رہے عشق سے سروکار   اس نشہ کا دل سے ہوں طلبگار
ساقی یہاں آ فداک روحی   بھر جام میں تو مئے صبوحی
دے مجھ کو کہ پی کے اُس کو وہیں   اشعار سناؤں الفت آئیں
یعنی کہ لکھوں فسانۂ عشق   کہتے ہیں جسے ترانۂ عشق
رکھتا ہے زبسکہ رتبہ عالی   ہے عشق جناب لاابالی
پنہاں ہے وہی ۔ وہی ہے پیدا   ق   گو اُس کے سبب سے کتنے شیدا
وحشت زدہ ہو کے مر گئے ہیں   آخر جی سے گزر گئے ہیں
ہے اُس سے ہی ذکرِ قیس مہجور   لیلیٰ کو کیا اسی نے مشہور
ماہیت عشق کون پا دے   دوں جان بھی گر یہ ہاتھ آوے
ہے عشق سے آبروئے عاشق   ہے اس سے ہی ہائے ہوئے عاشق

اندوہ میں اُس کے راحتیں ہیں
مرغوب اُس کی اذیتیں ہیں

نمونہ وامق و عذرا
(حمد)

اے خدائے دو جہاں بندہ نواز — کوئی تیسرا نہیں اصلا انباز
مالک الملک ہے تو اے قادر — راز پوشیدہ ہی تجھ پر ظاہر
تو نے پیدا ہیں کئے کون و مکان — تیرے مخلوق ہیں سب اہل جہاں
تیری محتاج ہے خلقت ہردم — بہرہ ور تجھ سے ہیں اہل عالم
تو ہی معبود ہی سب کا بے شک — تیری قدرت کا مُقر ہے ہر یک

(نعت)

اے خداوند مرے عزّ و جل — ہے جو تیرا وہ نبی مرسل
واضع شرع جناب اطہر — فخر کونین و شفیع محشر
نام نامی ہے محمد جس کا — سب پہ احسان ہی بے حد جس کا
شان میں اس کی ہی نازل لیٰین — شق اشارے سے کیا ماہ مُبیں
منبع لطف ہے وہ کانِ کرم — وہ ہی ہے مرجع اربابِ ہمم
ساقی کوثر و تسنیم ہے وہ — حق یہ ہے لایق تعظیم ہے وہ
تجھ پہ اے تابعِ امرِ معبود — پہنچے ہر دم صلوات اور درود

(منقبت)

آل و اصحاب ترے پاک سیر — میرے ہیں حشر میں حامی یکسر
پہنچے ہر لحظہ انھوں پہ بھی سلام — اُن سے اسلام کو رونق ہی تمام

تخلص کا ایک شعر ؎

بسکہ عاجز ہی بہت اے داور — عرض کرتا ہے یہ تجھ سے سرور

تعریف عشق ؎

دلِ ناکام کو ہے عشق سے کام — گرچہ اُس میں ہیں بہت سے آلام
عشق ہوتا نہیں عاشق سے جدا — جھوٹ اس میں نہیں شاہد ہی خدا
کیوں نہ سمجھوں میں اُسے جزو بدن — عشق نے دل میں بنایا مسکن
عشق ہی عشق نظر میں آیا — جلوہ گر ارض و سما میں پایا
ممکنات اُس سے نہیں ہیں خالی — عشق کی ہے وہ جناب عالی

ہر دو عالم میں کیا عشق نے ہے — دفتر نیستی و ہستی طے

کلام عاشق در عذر بے ہوشی

سن کے وامق نے یہ عذرا کا کلام — ہوش میں آ کے کہا دل کو تھام

اے گل تازۂ باغ خوبی — وے نہال چمن محبوبی

مرہم زخم نہان عاشق — تجھ پہ قربان ہے جان عاشق

مجھ سے آزردہ نہ ہو اے مغرور — اپنے دل سے تو مجھے پھینک نہ دور

عذر بے تابی دل کر تو معاف — ہوں میں ناچار نہیں لاف و گزاف

حکم سے تیرے نہیں کچھ انکار — ہوں ترا بندۂ فرمانبردار

ہو کے آزردہ نہ دے مجھ کو عذاب — دیکھ کر تجھ کو ہوا میں بیتاب

جلوہ افروز ہو معشوق جہاں — کیونکہ عاشق میں رہے تاب و تواں

ہجر میں حال زار وامق

گاہ و بیگاہ وہ بے شورش و شین — دم نہ لیتا تھا نہ بس تھا بے چین

ہوتے اس سے نہ جدا اک ساعت — قلق و یاس و فراق و حسرت

بے قرارانہ سحر سے تا شام — تھا اسے گریہ و زاری سے کام

دشنۂ غم جو لگا تھا کاری — خون دل چشم سے رہتا جاری

کھینچتا نالۂ جانکاہ اکثر — مارتا دل پہ اٹھا کر پتھر

شعلۂ ہجر سے جلتا تھا وہ — ہاتھ افسوس سے ملتا تھا وہ

آستیں دیدۂ نم سے ہر دم — موج و دریا کی نمط تھے باہم

دامن و جیب کیا تھا صد چاک — کس قدر دست جنوں تھا چالاک

ہو کے حیرت زدگی سے ناچار — تھا کبھو جیسے کہ نقش دیوار

تپش دل سے کبھو تھا بیتاب — مضطرب حال بسان سیماب

عذرا کا حال ہجر میں

حال وامق تو یہ تھا فرقت میں — دل عذرا بھی تھا زحمت میں

روز و شب وہ بت غارتگر ہوش — آہ و نالہ سے نہ رہتی خاموش

ہر گھڑی اُس کو غشی طاری تھی	فرقتِ یار کی بیماری تھی
کارگر ہجر کا آزار رہا	زرد وہ چہرۂ گلنار رہا
ہر بہانہ سے وہ رہتی گریاں	مطلق اُس میں نہ رہا تاب و تواں
ناتوانی کی اذیّت جو سہی	طاقتِ جنبشِ مژگاں نہ رہی
رشکِ شمشاد قد اُس کا یکبار	جھک گیا جیسے کہ شاخ خمدار
دُوریِ یار سے گھبرائی وہ	ایسے جینے سے یہ تنگ آئی وہ

(رسالہ ہندوستانی بابتہ ماہ اپریل ۱۹۳۲ء)

مثنوی کرامات پیران پیر جہاں

(ریویو)

حکیم ابوالقاسم قدرت اللہ خاں، قاسمؔ تخلص کا نام دنیائے ادب میں اُن کے تذکرۂ شعرا موسوم بہ "مجموعۂ نغز" کی وجہ سے مشہور ہے۔ دہلوی تھے۔ اُن کا خاندان علم اور فقر میں مشہور تھا۔ حضرت مولانا فخرالدین کے قادریہ سلسلے میں مُرید تھے۔ عربی علوم کی تحصیل خواجہ احمد جان سے کی تھی۔ طب میں حکیم محمد شریف خاں صاحب کے شاگرد تھے۔ شاعری میں ہدایت اللہ خاں ہدایت سے تلمذ تھا۔ مطب کا شغل تھا۔ سنہ ۱۲۴۶ ہجری میں بڑی عمر پاکر وفات پائی۔ مثنوی مذکورۂ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ آٹھ برس کی عمر میں یتیم ہوگئے تھے۔ گیارہ برس کی عمر میں میر فتح علی خاں (اُن کے والد کے دوست) نے حضرت ممدوح الصدر کی خدمت میں پہنچا دیا اور حضرت کے مدرسہ میں پڑھنے لگے۔ مولوی سید احمد صاحب کے سپرد تعلیم تھی۔ بڑی محنت سے پڑھتے تھے۔ چنانچہ لکھا ہے :-

میں تھا گرم تحصیل جب اے خلیل	سدا تھی مجھے علم سے قال و قیل

مجھے جز کشتی تھی یاں آب و تاب | کہ تھا بس یہیں ملے یار و جز و کتاب
نہ چھٹتی تھی مجھ سے کتاب ایک پل | کہ کرتا تھا مشکل مسائل کا حل
غرض شام سے صبح تک یں بہ کد | مطالعہ کناں تھا پچو اہلِ خرد
لے اک ساتھ آٹے کا پیڑا یں خام | علی الصبح پڑھنے کو جاتا مُدام
پکا اُس کو تنّدور سے اور کھا | میں تا شام رہتا تھا پڑھتا سدا
مجھے بسکہ مقصد میاں علم تھا | میں تھا پیچھے باندھ اُس کے آٹا پڑا
کبھو بھی میں ناغہ نہ کرتا سبق | بلا ناغہ پڑھتا ورق دو ورق

تذکرۂ شعرائے ہند میں لکھا ہے۔ "ریختہ کہنے کا بہت شوق تھا۔ ایک مثنوی بھی ان کی کہی ہوئی ہے اور ایک دیوان موجود ہے اور ایک تذکرہ شعرائے ہند کا۔ حکیم ثناء اللہ خاں فراق طب میں اُن کے شاگرد تھے۔" تذکرۂ گلِ رعنا میں لکھا ہے۔ "دیوان دیکھنے میں نہیں آیا۔"

نمونۂ کلام

(۱) قاسم کے ساتھ بادہ خوری تھی تمام شب | اور نام سے ہے اُس کے تجاہل علی الصباح
(۲) سر بسر قول ترا اے بتِ خود کام غلط | دن غلط۔ رات غلط۔ صبح غلط۔ شام غلط
(۳) دشنام دے مناتے ہو رُوٹھے کو آن میں | کیا جانے کیا فسوں ہے تمھاری زبان میں
(۴) مسلمانو۔ بے پروا ہو گیا اچیار عاشق کی | وہ نصرانی بچہ عیسیٰ نفس تو ہے۔ پہ کافر ہے
(۵) جان جائے یا رہے قاسم۔ پہ دیکھیں گے اُسے | ہے ارادہ یہ مصمّم دیکھئے کیسے بنے

تذکرۂ قاسم کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے دیوان میں سات ہزار شعر تھے۔ دیوان کے علاوہ دو مثنویاں تھیں۔ ایک مولانا روم کی مثنوی کی بحر میں بیانِ معراج میں۔ دوسری مثنوی بوستان کی بحر میں حضرت غوثِ اعظم کی کرامات کے ذکر میں۔ تیسری مثنوی غزوۂ بدر کے حال میں لکھنے کا ارادہ مصمم تھا۔

میرے اس مقالے کا موضوع قاسم کی وہ مثنوی ہے جس کا تاریخی نام "کراماتِ پیرانِ پیر جہاں"

ہی اس سے ۱۱۹۶ھ ہجری برآمد ہوتے ہیں۔ یہ ایک ضخیم مثنوی ہے۔ ۲۲/۱۹ تقطیع۔ خط صاف جلی۔ شنجرفی آمیز۔ سطر فی صفحہ ۱۲ صفحات ۴۰۴۔ نسخہ کامل ہے۔ ۱۱۹۶ھ ہجری میں تالیف شروع کی۔ چنانچہ دیباچہ میں لکھا ہے:-

کہوں کیا یہ آغاز کے بعد پر | رہا سالہا طاق نسیان پر
برآیا پس از سال اکیس کے | فرامشگری کے یہ جزدان سے
بتائید و توفیق رب الانام | اُسی برس اس کو ہوا الفرام
رقم ہو چکا جب تمام و کمال | ہزار و دو صد اور ہفدہ تھا سال ۱۲۱۷
یہ مصرع ہے تاریخ کا دلپذیر | رموز کمالات پیران پیر (۱۲۱۷ھ)

بوستان کی بحر ہے۔ معہ دیباچہ ایک سو پانچ عنوان ہیں۔ ہر عنوان کے آخر میں فارسی کا ایک شعر شیخ سعدی وغیرہ شعرا کا لکھا ہے۔ کل اشعار کی تعداد پانچ ہزار ایک سو ساٹھ (۵۱۶۰) ہے۔ ہر ایک عنوان بھی منظوم ہے جس کی بحر اصل مثنوی سے جدا ہے۔ اس مثنوی میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ کے حالات مبارک ہیں۔ اور نسب و پیدائش سے لے کر آخر تک گیارہ باب باندھے ہیں۔ دیباچہ میں حمد، نعت، منقبت آل و اصحاب، منقبت پیران پیر رضی اللہ عنہ و منقبت حضرت مولانا فخرالدین ہے۔ مدح شاہ عالم بادشاہ اور سبب تالیف و تاریخ و فہرست کتاب ہے۔ آخر میں مناجات، مدح میر فتح علی خاں صاحب مدظلہ، مدح حضرت مولانا فخرالدینؒ، مدح حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ، مدح نواب نجیب الدولہ بہادر، مناجات مکرر، تاریخ از حکیم ثناء اللہ خاں فراق و عبدالصمد فدا۔ ان دونوں کی تاریخیں کی تقریب خود مؤلف مثنوی نے کی ہے۔

یہ نسخہ امیر الدین ولد میر علیم نے ۳۰ رمضان ۱۲۹۲ھ میں لکھا ہے۔ کاتب کے قلم سے ۱۱۹۲ھ نکل گیا ہے جو ظاہر ہے کہ صحیح نہیں ہو سکتا اس لئے کہ آغاز تالیف کتاب ۱۱۹۶ھ میں ہوا تھا۔

نمونہ کلام (حمد)

ہے یہ توحید خدا میں داستاں | گوش دل سے تم سنو اے دوستاں
کرے کیا کوئی حق کی مدح و ثنا | سراسر وہ ہے نور ارض و سما
جہاں اُس کے جلوہ سے معمور ہے | ہر اک پر نمایاں وہی نور ہے

بچھایا خلایق پہ فرشِ وجود — کیا آپ کو اُن سے یعنی نمود
حقیقت میں دیکھو تو ہے ایک نور — کیا ہی یہ سَو سَو طرح سے ظہور
کہیں ہے وہ لیلائے محمل نشیں — بنا ہے عزیزو وہ مجنوں کہیں
کہیں ہے وہ شیرین شیریں سخن — کہیں ہے وہ تیشہ کہیں کوہکن
کہیں بن کے موسیٰ کیا ہی ظہور — کہیں ہے تجلی کہیں کوہِ طور
کہیں ہی وہ بندہ کہیں ہے خدا — کہیں ہے سفینہ کہیں ناخدا
وہی جسمِ آدم وہی روح تھا — یہ طوفاں وہی تھا وہی نوح تھا
سکندر نہ تھا نے فریدون تھا — نہ بقراط تھا نے فلاطون تھا

نعت

محمدؐ کو سردارِ عالم کیا — اُسے سیّد ولدِ آدم کیا
یہ مقدور رکھتا ہے کوئی بشر — کرے نعت اُس کی جو وہ سربسر
وہ احمدؐ نبی خاتم المرسلین — کہ بندہ ہی جس در کا روح الامین
سرشت اُس کی ہوتی نہ گر دوستاں — نہ مخلوق ہوتے زمین و زماں
زباں کیوں نہ ہو وصف میں اُن کے لال — کسی کا یہ ہے حوصلہ - کیا مجال

منقبت غوث اعظم رحمہ

کے منؐ بعد اے دوستاں — ہزاروں ہوئے قطب و غوثِ زماں
ہر اک کو دیا حق نے عالی مقام — ہیں مقبول ذاتِ مقدس تمام
وے مرتبہ ہے ہر اک کا جدا — کوئی اُن میں چھوٹا ہے کوئی بڑا
سرے سب سے دیکھو گر انصاف کر — کدورت کو سینہ سے ہاں صاف کر
نہ پاؤگے جز غوثِ اعظم کوئی — کہ سردفترِ اولیا ہو - وہی
ہے دنیا میں نایاب اُس کا عدیل — وہ یکتائے عالم ہیں بے قال و قیل
وہ ہیں بلبلِ گلشنِ مصطفےٰ — وہ ہیں سروِ بستانِ آلِ عبا
وہ ہیں نورِ چشمِ حسن دوستاں — حسین ابنِ حیدر کے آرامِ جاں

گدا اُن کے کوچہ کا ہے ہر ولی — کہ ہیں وہ شہنشاہ - ابنِ علی
توسّل بِن اُن کے کوئی ذی کمال — جو چاہے ہو واصل بحق - کیا مجال
سعادت سمجھ سب نے ان کا قدم — رکھا اپنی گردن پہ بِل کر بہم
مگر ایک - شیخ صفاہان نے — کہ دی تھی دغا اُس کو شیطان نے
سو حق نے کیا اُس کا منصب تغیر — محقّر ہوا نزدِ برنا و پیر
رہا اُس کے چہرے پہ مطلق نہ نور — ہر ایک اُس کو کہنے لگا "دور دور"
عزیزے کہ از درگہش سر بتافت — بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت
(مدح مولانا فخرالدین) پس از مدح سلطانِ کون و مکان — شہنشاہِ جیلاں و قطبِ زماں
تو اے قاسمِ قادری باصفا — دل و جاں سے کر اُس ولی کی ثنا
کہ تھا یار وہ قبلۂ راستیں — بلا شبہ و شک فخرِ دنیا و دیں
(مدح شاہ عالم) عجب ہی بہ امن و اماں ہی یہ عہد — تمامی خلایق ہے آسودہ عہد
نہ ہو کیوں یہ ہے ہند کا بادشاہ — وہ گردوں وقار و وہ انجم سپاہ
کہ ہے آسماں جاہ و کوہِ شکوہ — فتوّت دثار و مروّت پژوہ
ہیں معدنِ جود و کانِ سخا — ہیں منبع فیض و بذل و عطا
طرازندۂ تختِ ظلِ الٰہی — فرازندۂ تاجِ شاہنشہی
عَلم کہکشاں - تخت نیلی فلک — سدا کو وہ زر بخش بے شبہ و شک
گہہِ بذل ہی سعد و نحس اُس کو ایک — کہ ہے وہ شہنشاہ خود سعد و نیک
مربع نشیں و مثلث نشاں — بہ تربیع و تثلیث گوہر فشاں
مربیِّ شرع و ہواخواہِ دین — مددگار ارکانِ دین متیں
دلِ اہل درد و سرِ اہلِ شوق — جگر بندِ معنی بصد شوق و ذوق
خدیو جواں بخت و فرخندہ رائے — شہنشاہِ گیتی و گیہاں خدائے

خدا ترس و ہشیار و والا نژاد　　خوش آئین و خوش دین و خوش اعتقاد

موحّد بہ جان - احمدی - حیدری　　حنیفی بدل - اشعری - قادری

حلیم و گنہ بخش و مخلص نواز　　دلیر و عدو مال و دشمن گداز

سر ربع مسکون و صاحب خبر　　شہ عالم و شاہ عالی گہر

جہانبانِ دوران و عالی جناب　　بہ چرخ شہی رشکِ مہ آفتاب

بنجم سعادت سے باہم ملے　　یہ خورشید رخشندہ یارب تجھے

چھٹے کفر کا اُس سے جلدی کسوف　　بحق نبی - اے رحیم و رؤف

رہے اُس کے سائے کے نیچے سدا　　خوشی خورم آسودہ خلق خدا

روا کر سدا اُس کی حاجات تو　　رہے تیری رحمت سے یہ خندہ رُو

برومند دارش درخت امید　　سرش سبز - و رویش برحمت سپید

اس مقالہ کا ماخذ حسب ذیل کتابیں ہیں :-

تذکرۂ[1] شعرائے ہند مولفہ منشی عبدالکریم دہلوی - تذکرۂ[2] گلشن بیخار نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ - تذکرۂ میر حسن[3] دہلوی - تذکرۂ[4] آبحیات محمد حسین آزاد دہلوی - تذکرۂ گل[5] رعنا مولوی سید عبدالحی صاحب -

تذکرۂ قاسم[6] کی عبارت کے لئے میں پروفیسر شیرانی لاہور اور اُن کے شاگرد مولوی عبداللطیف صاحب تپش کی عنایت کا ممنون ہوں - تذکرۂ[7] خمخانۂ جاوید لالہ سری رام ایم اے دہلوی، دیباچۂ دیوان حافظ زکریا خاں زکی دہلوی -

(رسالہ ہندوستانی بابتہ ماہ جولائی ۱۹۳۲ء)

مثنوی فتوح الحرمین۔ محی لاری

(ریویو)

اس مثنوی کا ایک نفیس قلمی نسخہ حیدرآباد سے حال ہی میں آکر داخل کتاب خانہ حبیب گنج ہوا ہے۔ خط بخلاف عام قلمی کتابوں کے خطاطی کی شان لئے ہوئے ہے۔ باقاعدہ ہے۔ جہاں تک پڑھا صحیح ہے۔ جدول طلائی و لاجوردی۔ کاغذ سمرقندی آب رسیدہ۔ قدرے کرم خوردہ۔ نقشے رنگین و طلا کار۔ عنوان طلا کار لاجوردی۔ نام کاتب و سنہ کتابت مفقود۔ قراین کی شہادت سے باطمینان کہا جا سکتا ہے کہ کم و بیش تین سو (۳۰۰) برس کا پرانا نسخہ ہے۔

محی لاری کا ذکر اکثر تذکروں میں ہے۔ کشف الظنون نے بھی فتوح الحرمین کے تحت میں لکھا ہے۔ ریاض الشعرا داغستانی میں ہے کہ محی لاری سلطان یعقوب کے عہد میں تھا۔ شاہ طہماسپ کے زمانہ تک رہا۔ کمالِ فضیلت سے ممتاز تھا۔ قصیدۂ تائیہ ابن فارض کی شرح لکھی ہے۔ حج سے واپس آکر سلطان مظفر بن محمود شاہ کے نام پر مثنوی فتوح الحرمین لکھی۔ ایک لاکھ سکۂ سکندری انعام پایا۔ خزانۂ عامرہ میں بھی یہی ذکر ہے۔ اتنا اضافہ ہے کہ محی لاری محقق دوانی کا شاگرد تھا۔ ہفت اقلیم اور مخزن الغرائب میں ذکر ہے۔ آخر الذکر نے بابا فغانی کا معاصر لکھا ہے۔ فہرست کتاب خانہ بانکی پور میں سنہ وفات ۹۳۳ھ درج ہے۔ (اس اطلاع کے لئے پروفیسر نظام الدین استاذ جامعۂ عثمانیہ کا سپاس گزار ہوں) کلام صاف۔ زبان شیریں ہے۔ حقیقت و اثر کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ مکہ کی تعریف ملاحظہ ہو: ؎

مکہ کہ شد قبلۂ اہلِ نجات	حرسہا اللہ عن الحادثات
طعنہ بر اکسیر زند خاکِ او	گل خجل است از خس خاشاکِ او
ریگ زمینش چو نجوم سماست	گمشدگاں را بہ یقیں رہنماست
جنتِ معنیست کہ بے زرع و کشت	جمع در و گشتہ نعیمِ بہشت

گل نہ و بادِ سحر شس مشکبوئے — مے نہ ومیخانہ پُر از ہائے وہوئے

زرع نہ وخرمنِ او دانہ بخش — غرس نہ وطوبیٔ او سایہ بخش

باغ نہ و میوۂ او طاہر است — راغ نہ و سبزۂ او ظاہر است

لالہ نیفروختہ در وے چراغ — بر دلش از حسرتِ آں ماہ داغ

تمام مناسکِ حج شوق کی تڑپ اور پاس ادب کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ حج کے بعد زیارت مدینہ طیبہ کی تفصیل شانِ بالا کے ساتھ ہے۔ ایک باب کا عنوان ہے "من نتائج انفاسِ مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامی۔ عنوان ہذا سے پہلے یہ شعر ہے ؎

گر بُوَدَت از سخنِ من ملال — گوش کُن از عارفِ جام ایں مقال

اس عنوان کے تحت چار صفحے مولانا جامی کے کلام کے ہیں۔ اخیر شعر یہ ہے ؎

یا رب از آنجا کہ کرمِ آنِ تست — چشمِ ہمہ بر درِ احسانِ تست

جامی اگر چند نہ صاحب دلیست — از تو بامید چنیں حاصلیست

نسخۂ ہذا کے ہاتھ آنے پر میں نے اپنے کتاب خانہ کا جائزہ لیا۔ تو دو نسخے نکلے۔ ایک قلمی، دوسرا مطبوعہ بہر دست مطبوعہ نسخہ سے بحث کرنی ہے کہ ایک فاش غلطی کی اصلاح ہو۔ یہ نسخہ مطبع نول کشور میں دوبارہ ۱۸۸۸ء میں بمقام لکھنؤ طبع ہوا ہے۔ کاغذ سپید ہے۔ خوشخط، جلی قلم، کاتب فدا حسین خوشنویس مطبع۔ آخر میں ۱۹ صفحے تقریظوں اور تاریخوں کے ہیں۔ جو تقریظ مالکِ مطبع کی طرف سے شامل کتاب ہے اس میں لکھا ہے۔ "نسخۂ صحیحہ فتوح الحرمین مصنفہ جناب تقدس قباب ...... محی الدین عبدالقادر جیلانی ..... اس کے آگے لکھا ہے کہ "اس مثنوی کا ایک نسخہ مرقوم بخوشترین خط نستعلیق ولایتی مولوی اشرف علی لکھنوی کے توسط سے ملا۔ اس کو دیکھتے ہی طبع کا شوق ہوا۔ دوسرا نسخہ باوجود تلاش نہ ملا۔ منشی محمد مرزا جان تصحیح پر مامور ہوئے (جن کے مذاقِ شعر و سخن کی مہارتِ تام کی تعریف بھی درج ہے)۔

ہم یہ مان لیتے ہیں کہ جو نسخہ مطبع کو ملا اس میں انتساب تصنیف حضرت غوثِ اعظم رضی اللہ عنہ کی جانب ہوگا۔ لیکن مطبع کی ذمہ داری اس پر ہی ختم نہیں ہو جاتی۔ حضرت کے حالات کی تحقیق کرنی تھی

کہ آپ نے فارسی میں کوئی مثنوی لکھی ہے۔ ظاہر ہے کہ مغالطہ "محی" کے لفظ سے کھایا ہے۔ لہذا شعرا کے تذکروں میں "محی" کا ذکر دیکھنا لازم تھا۔ انتہائی بے پروائی یہ بھی کہ تذکرۂ خزانۂ عامرہ اس مثنوی سے برسوں پہلے اسی مطبع میں طبع ہو چکا تھا۔ اس کو بھی دیکھنے کی تکلیف گوارا نہ کی۔

جو عنوان ہم نے مولانا جامی کے کلام کا قلمی مثنوی سے اوپر نقل کیا ہے۔ اگرچہ وہ مطبوعہ میں نہیں ہے تاہم مولانا جامی کے نعت کے دو مشہور بند درجِ مثنوی مطبوعہ ہیں (دیکھو صفحہ ۱۰۲ و ۱۰۳) مولانا کا کلیات بھی مطبع نول کشور میں ۱۸۸۱ء میں چھپا تھا۔ اس میں یہ بند بھی ہیں (ملاحظہ طلب صفحہ ۱۹ کلیات نولکشوری) کاش ان کو ہی اہلِ مطبع دیکھ لیتے۔ ان بندوں میں ایک شعر یہ ہے ؎

کز گدائے بینوا جامی عنایت وا مگیر　　　　کش عنانِ دل ز کفِ حرص و ہوا بربودہ اند

مثنوی مطبوعہ میں بجائے "جامی" کے "جام" ہے۔ اور مصرع اس طرح "کز گدائے بینوا جامِ عنایت وا مگیر"۔

بڑی زبردست شہادت اس مثنوی کی زبان اور طرزِ بیان ہے۔ حیف ہے کہ آج سے نصف صدی پہلے اہلِ مطبع میں ذوقِ فارسی اس قدر مفقود تھا کہ وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ مثنوی کی زبان نویں، دسویں صدی ہجری کی ہے جو فیضی اور جامی وغیرہ کی مثنویوں میں بے تکلف ملائی جا سکتی ہے۔ پانچویں یا چھٹی صدی ہجری کی زبان یا طرزِ سخن نہیں جو حضرت کی طرف منسوب ہو سکتی ہے۔ کاش شیخ عطار و حکیم سنائی کی مثنویوں سے ملا لیتے۔

ضمیمہ۔ مضمونِ بالا کی کتابت کے بعد صاحبِ مضمون کا حسبِ ذیل ضمیمہ موصول ہوا۔　　معارف

عجیب اتفاق ہے۔ پرانے خطوط ایک ضرورت سے دیکھے جا رہے تھے کہ علامہ شبلی مرحوم کی ایک تحریر مورخہ ۸ فروری ۱۹۱۶ء ہاتھ آئی لکھتے ہیں:۔

"فتوح الحرمین" حالاتِ حرمین میں ایک مثنوی ہے۔ مصنف کا نام محی ہے۔ لیکن کشف الظنون کے سوا کسی تذکرے میں پتہ نہیں لگتا۔ آپ اپنے دفتر میں تو دیکھئے"۔

عین اس وقت جبکہ میرا مضمون معارف میں چھپ رہا ہے اس تحریر کا بائیس برس بعد ہاتھ میں

آنا کیسا عجیب ہے۔ یہ تو یاد نہیں کہ اُس وقت جواب کیا دیا تھا لیکن اس سے ایک خاص لطف قلب محسوس کرتا ہے کہ ایک محترم فرمائش کی تعمیل ہو رہی ہے۔ معلوم نہیں مولوی صاحب نے کون سے تذکرے دیکھے جو مخفیؔ کے ذکر سے خالی تھے۔ ورنہ خزانۂ عامرہ، ریاض الشعرا وغیرہ تذکروں میں تو اُس کا ذکر موجود ہے۔

(رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ نومبر ۱۹۳۲ء)

ایک عُلوی منظر

(ایک تماشائی عالم کی نظر سے)

کل شام اپنے مختصر سے پائیں باغ میں تھا۔ گہرا ابر چھایا ہوا تھا جو کئی دن دل کھول کر برس چکا تھا۔ فضا شفاف تھی۔ ہوا خنک اور صاف۔ پتوں کی سبزی پھولوں کی سُرخی نگاہ افروز تھی، دلنواز تھی۔ دفعتہً مغرب میں بادل پھٹا۔ آفتاب لب بام کے نور سے بلند بالا درخت روشن ہو گئے۔ قوس قزح نے آسمانی فضا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اب عالم یہ ہے کہ باغ کا بالائی حصہ تابناک ہے۔ پائیں تاریک۔ اس دلکش منظر نے نگاہ شوق کو مائل کیا۔ رفتہ رفتہ شوق میں ذوق کی، ذوق میں محویت کی کیفیت پیدا ہوئی۔ محسوس ہونے لگا کہ قوس قزح کے محرابی دروازے میں سے دوسرا عالم نظر آ رہا ہے۔ آفتاب اور نیچا ہوا۔ نور نے مزید بلندی اختیار کی۔ اب بلند درختوں کی صرف چوٹیاں منوّر تھیں۔ کیف دوبالا ہوا، محویت بیخودی سے بدل گئی۔ ایک اونچے درخت کی بالائی شاخ پر قمری کا جوڑا نظر آیا۔ محبت کی تصویر، وفا کا پتلا، راحت کا مجسمہ۔ بسیرے کی آمد سے سراپا سرور۔ سورج کی کرنیں اس پر نور افشاں یہ سماں دیکھ کر سفلی دل میں رشک کی لہر آئی۔ معاً باصرہ کے ساتھ سامعہ کی لذت اندوزی کا بھی سامان ہوا۔ ایک غیبی آواز:۔

اے بھولے بھالے پرندوں پر رشک کرنے والے! سہ

بکشا بال وصفیر از شجر طوبیٰ زن — حیف باشد چو تو مرغے! کہ اسیر قفسی!!

پُر اثر آواز نے چونکا دیا۔ بے اختیار زبان سے نکلا: "شجر طوبیٰ یہاں کہاں! عالم سفلی اور جنت کا درخت!"۔

"تجھی میں شجر طوبیٰ ہے۔ تجھی میں خار و خس۔ عالم علوی بھی ہے خاکدانِ سفلی بھی۔ محبت کی بلند شاخوں کو نشیمن بنا۔ بلند ہستی اور صلح پسندی کو مقصدِ زندگی قرار دے۔ آج تجھ کو پرندوں پر رشک ہے کل ان صفات کی بدولت فرشتے تجھ پر رشک کریں گے۔ سرمدی نور کی بارش ہوگی۔ یہ بھی سُن لے کہ عظمت کی بلندی چھوڑ کر ہنگامۂ پستی میں مبتلا ہونے والے حسد، کینہ اور طمع کی تاریکی میں جا پھنستے ہیں۔ شیاطین اُن سے پناہ مانگتے ہیں۔ دیکھ وہ گلاب کا درخت تیرے سامنے ہے۔ تجھ کو پھول محبوب نہیں، مرغوب نہیں۔ کانٹے پسند ہیں۔ ان ہی میں پھنستا ہے۔ اُن ہی سے اُلجھتا ہے۔ اب اگر اعضا خوناخون اور کپڑے پارہ پارہ ہیں تو کس کا قصور۔ جب بغض و حسد اور حرص و طمع کے کانٹے دل و دماغ کو مجروح اور پاش پاش کر ڈالتے ہیں تو تو چلّاتا ہے کہ دنیا دار المحن ہے، مصیبت کا گھر ہے۔ دُنیا کو بُرا کہتا ہے۔ اپنے آپ کو ملامت نہیں کرتا۔ جو روحیں ساٹھ اور ستر برس سے اس خاکدان میں رہ نورد ہیں مگر باوجود گوناگوں تعلقات کے طمع سے پاک، حسد سے دور، کینہ سے مُبرّا۔ نہ کسی سے کاہش، نہ کسی سے خواہش۔ وہ اس قمری سے زیادہ مطمئن اور مسرور ہیں جس پر تجھ کو رشک آیا۔ قمری بسیرے کی آمد کا سرور محسوس کرتی ہے تو وہ ابدی راحت کی امید میں سراپا راحت ہیں۔ اُن کے لئے دنیا بھی دار سرور ہے اور آخرت بھی"۔

بیخودی کے اس تلاطم میں آفتاب غروب ہوگیا۔ تاریکی کی چادر میں دنیا جا چھپی۔ نہ قوسِ قزح رہا۔ نہ نورانی منظر۔ نہ قمری کا جوڑا۔ نہ بلند بالا درخت۔ محویت کافور ہوئی۔ ہوش و حواس بجا ہوگئے۔ بے اختیار زبان سے نکلا؎

"خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا"

(اخبار سچ لکھنؤ مورخہ ، اکتوبر ۱۹۳۲ء)

تاریخ الاسلام للذہبی

یکم اگست اور ۱۶ اگست سنہ حال کے کانفرنس گزٹ میں تاریخ الاسلام للذہبی پر ایک مضمون چھپا ہے جو ڈاکٹر سموگی کے مضمون کا ترجمہ ہے۔

مترجم لکھتے ہیں کہ وہ اصل مضمون پڑھ کر ڈاکٹر سموگی مضمون نگار کے گرویدہ ہوگئے۔ کاش وہ الذہبی اور عربی علوم کے بھی گرویدہ ہوئے ہوتے۔ نقل کو چھوڑ کر اصل کو لیتے۔

سخت ضرورت ہے کہ ہمارا انگریزی داں طبقہ اپنے اصلی علوم میں ماہر ہو کر یورپ کے مستشرقین کو فیض پہنچائے۔ اور بجائے کاسہ لیسی کے اُن کی میزبانی کا شرف حاصل کرے۔

یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ مستشرقین جو غلطیاں کرتے ہیں (اور اکثر کرتے ہیں) اُن کی اصلاح ہو۔ اُن غلطیوں کا منشا اکثر تو نقطۂ نگاہ کا تفاوت ہے جو ایشیا اور یورپ کی نظر میں ہے۔ اور ایک بار سے زیادہ تنگ نظری اور تعصب سدِ راہ ہو جاتا ہے۔ ہمت کا اقتضا یہ ہے کہ ہم خود اپنے مال کے محافظ ہوں۔ اُس سے دوسروں کو فیض پہنچائیں۔ نہ یہ کہ غیروں کو نگہبان بنا کر اُن کی مدح و ثنا کو اپنے لئے کافی خیال کریں

نفسِ مضمون اتنا طویل ہے کہ ایک رسالہ ہی کے لئے زیادہ موزوں تھا۔ کانفرنس گزٹ کے لئے مناسب خلاصہ بہتر ہوتا۔

آپ کا یہ خیال صحیح ہے کہ عربی الفاظ کی ہیئت ترجمہ در ترجمہ نے بہت کچھ متغیر کر دی ہے۔ دل اُن کے پڑھنے سے الجھتا ہے۔ مثالاً۔ الیونینی کو "الیونانی" لکھا ہے۔ مُدعا کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ (دیکھو محولہ مضمون کے حصۂ ثانی کی ابتدا)۔

عیون الانبار فی طبقات الاطبار کے مؤلف کا لقب ابن ابی اُصیبعہ ہے۔ مضمون میں تالیف و مؤلف دونوں کا نام بدل گیا ہے۔ الذہبی کو الذہابی لکھدیا ہے۔ اسی سلسلے میں ایک ترجمہ دیکھئے۔ قاضی ابن الشہبہ کا قول حاجی خلیفہ نے نقل کیا ہے۔ اصل عبارت عربی یہ ہے: "قال ابن الشہبہ والعجب انہ وقف

فی تاریخ الاسلام علیٰ سبعمائۃ سنہ ۷۰۰ھ۔ ولم یوصلہ الیٰ سنۃ اربعین سنہ ۷۴۰ھ کما فعل فی العبر فان بین یدیہ ذیل الیونینی الیٰ حین وفاتہ وذیل الجزری۔" انتہیٰ۔

صحیح ترجمہ۔ ابن الشہبہ نے کہا ہے کہ تعجب ہے کہ وہ (ذہبی) تاریخ الاسلام میں سنہ ۷۰۰ھ پر ٹھہر گئے اور اس کو چالیس سنہ ۷۴۰ھ تک نہ پہنچایا (یعنی سنہ ۷۴۰ ہجری تک) جیسا کہ العبر میں کیا ہے۔ تعجب اس لئے ہے کہ ان کے سامنے الیونینی کا ذیل جو انھوں نے اپنی وفات تک لکھا ہے اور ذیل الجزری موجود تھے۔"

اس ترجمہ کو مضمون کی عبارت سے ملا کر پڑھئے اور حیرت کیجئے۔ الفاظ "بین یدیہ" کا ترجمہ کیا سے کیا کردیا ہے۔ سنئے۔ "جیسے وہ العبر کو اپنی حیات میں "الیونانی" اور "الجزاری" سے لکھاتے رہے"۔ ڈاکٹر سمودگی نے الذہبی کی مطبوعہ کتابیں صرف دو لکھی ہیں (۱) المشتبہ فی اسماء الرجال (۲) میزان الاعتدال۔ واضح ہو کہ میزان الاعتدال "مشکوک یا غیر معتبر" روایتوں پر نہیں لکھی گئی ہے بلکہ اس میں رجال روایت ہیں ثقہ بھی اور ضعیف بھی۔

الذہبی کی دو معرکۃ الآرا کتابیں عرصہ دراز ہوا حیدرآباد کے دائرۃ المعارف میں چھپ چکی ہیں۔ ایک تذکرۃ الحفاظ (۴ جلد) جو چالیس برس پہلے چھپ چکا ہے۔ دوسری تاریخ دول الاسلام۔ معہ ذیل مطبوعہ سنہ ۱۳۳۷ھ (دو جلد) دول الاسلام میں حالات سنہ ۷۴۴ ہجری تک ہیں۔ اس طرح ایک حد تک ابن الشبہ کی شکایت دور ہو جاتی ہے۔

دول الاسلام معہ ذیل کا ایک نسخہ قلمی یہاں بھی ہے۔ جو امام ذہبی کے خط کی نقل ہے اس میں سنہ ۷۴۰ ہجری تک کے حالات ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چار سال کے حالات اس کے بعد امام ذہبی نے بڑھائے۔

جو فہرست غیر مطبوعہ کتابوں کی ڈاکٹر سمودگی نے لکھی ہے اُن میں سے الکاشف کا مکمل نسخہ یہاں ہے۔

(کانفرنس گزٹ علی گڑھ مورخہ ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۹۲۳ء)

تصانیف شیخ جمالی دہلوی

مئی ۱۹۳۳ء کے اورنٹیل کالج میگزین میں "سکندر لودھی اور اُس کے عہد کے بعض فارسی مصنفین کے" عنوان سے ایک محققانہ اور دلنشین مضمون چھپا ہے۔ اس میں شیخ جمالی کا بھی تذکرہ ہے۔ شیخ کی تصانیف کے سلسلہ میں تین کتابوں کے نام آئے ہیں: سیر العارفین[1]۔ اس پر تبصرہ کیا ہے۔ مثنوی مہر و ماہ[2] اور دیوان[3]۔ ان دونوں کو نایاب لکھا ہے جو امر واقع ہے۔

میرے یہاں علاوہ سیر العارفین کے دو اور کتابیں شیخ جمالی کی ہیں۔ ایک مثنوی مرآۃ المعانی دوم دیوان (ناقص الاوّل والآخر)۔

الف۔ مرآۃ المعانی تصوف میں ہے۔ اس میں سات سو شعر ہیں۔ مسائل تصوف کے بیان کئے ہیں چنانچہ سبب تالیف میں لکھا ہے ؎

ہرچہ بود از آشکارا و نہاں	اصطلاح عارفاں کردم بیاں
نامہ را چوں روشنائی برفزود	گشت مرآتے کہ روے حق نمود
چوں معانی کرد حق الہام اُو	گشت مرآۃ المعانی نام او

اولاً سراپا کے مختلف اعضا پر عارفانہ کلام کیا ہے اور اُن سے معرفت کے نکتے پیدا کئے ہیں بعض عنوان ملاحظہ ہوں:

در بیان "روے" کہ عبارت از وجہِ حقیقی باشد

در بیان "دہان" گوید کہ اشارت از سر خفی ست

در بیان زلف گوید کہ اشارت از جذبۂ حقیقی ست کہ طالب را از خودی بَبَرد۔ علیٰ ہذا القیاس۔

سراپا کے بعد مسائلِ تصوف پر صراحتہً بحث ہے مثالاً۔ در بیانِ صبر گوید۔ در بیان تسلیم و رضا گوید علیٰ ہذا۔ آغاز مثنوی حمد سے ہے۔ نعت کے بعد پیر کی مدح ہے۔ اُس کے بعد سبب تالیف۔ کلام پختہ صاف

صوفیانہ ہے حشو و زواید سے پاک۔

نمونۂ کلام (حمد) نامہ آغازم بنام ذوالجلال — آنکہ بیرون ذاتش از وہم و خیال
جانِ عالم پرتو انوار اوست — عرشِ اعظم نقطۂ پرکار اوست
صانعِ ہفت و نہ و پنج و چہار — خالقِ ماہ و خور و لیل و نہار
عالمِ اعیاں کہ آیاتِ ویست — حرفہائے مصحفِ ذاتِ ویست

(نعت) احمدِ مرسل کہ محبوبِ خداست — در صفتِ اول امامِ انبیاست
گوہرِ بحرِ صفات و ذاتِ اوست — بیگماں مقصودِ موجوداتِ اوست
گر نبودے ذاتِ آں عالی صفات — در عدم ماندے وجودِ کائنات
کائنات از نورِ او پیدا شدہ — عقلِ کل از عشقِ او شیدا شدہ

(مدحِ پیر) از پسِ توحید و نعتِ مصطفیٰ — بر کشایم مدحِ پیرِ باصفا
بلکہ اول واجب آمد بر مرید — تا بسازد نامِ پیرِ خود پدید
چوں کلیدِ نامِ پیر آمد بدست — بر کشاید قفلِ ہر گنجے کہ ہست
ہر کہ اول قدرِ پیرِ خود شناخت — با خدا آخر تواند عشق باخت
از جمالش شد جمالی آفتاب — زاں جمالی را جمالی شد خطاب

(خاتمہ) منتِ ایزد کہ در بحرِ عظیم — آشنا گشتم پئے دُرِّ یتیم
اندر آں دریائے پُر خونِ بے درنگ — خویش را انداختم مثلِ نہنگ
غوطہ خوردم ہمچو غواصاں درو — مشکلِ خود ساختم آساں درو
عینِ معنی چوں صدف بشگافتم — گوہرِ اسرارِ حق دریافتم
اے جمالی جملہ دریا نوش باش — چوں صدف پُر دُر شو و خاموش باش

نسخہ خوش خط، صحیح، بے عیب ہے۔ چھوٹی تقطیع کے ۱۱۴ صفحات ہیں۔ ہر صفحہ میں ۱۵ سطر۔ کاغذ کرم خوردہ ہے۔ تاریخ تحریر درج نہیں۔ بظاہر دو سو برس یا اس سے زیادہ زمانہ کا لکھا ہوا ہے۔ آخر کتاب پر خوشنما مہر مربع

میں میر محمد شاکر کندہ ہے۔

(ب) دیوان - ناقص الاول و آلاخر - بخط پختہ صاف - جلی قلم - جدول طلائی شنگرفی و لاجوردی - کاغذ حنائی رنگ گجراتی - کم کرم خوردہ - نسخہ دو ڈھائی سو برس اُدھر کا معلوم ہوتا ہے - تقطیع اوسط - تعداد صفحات ۱۴۶ - فی صفحہ ۱۵ سطر جملہ اشعار ۲۱۹۰ - عنوان وغیرہ کی جگہ خارج کرنے پر تعداد اشعار کم و بیش ۶۰ کم ہو جائے گی - بہر حال ۲۱۰۰ سے زیادہ اشعار ہیں معلوم نہیں کہ اول و آخر سے کس قدر کلام کم ہے - ابتدا میں زیادہ کم معلوم نہیں ہوتا - اس لئے کہ حمد کے تین قصیدے موجود ہیں - نعتیہ قصائد پانچ ہیں - اگر حمد کے قصائد بھی اسی قدر یا کچھ زائد ہوں گے تو ہمارا قیاس صحیح ہے کہ ابتدا میں زیادہ کمی نہیں - آخر کا اندازہ مشکل ہے - خصوصاً اگر غزلیات بھی اس میں شامل تھیں -

جیسا کہ اوپر بیان ہوا حمد کے قصیدے تین ہیں ۵ نعتیہ، بارہ مدح پیر میں، سات سکندر لودھی کی مدح میں اور چھ چھ بابر اور ہمایوں کی مدح میں جملہ قصائد ۳۹ ہیں - ترجیع بند - نعتیہ ایک - عارفانہ ایک جملہ دو - ترکیب بند (مراثی) مرثیہ سلطان سکندر ایک - مرثیہ پیر خود ایک - مرثیہ فرزند پیر دو - مرثیہ فرزند خود مسمّی بہ حسن ایک - جملہ پانچ - آخر میں ایک ترکیب بند عارفانہ ہے - جو ناقص ہے اور اسی پر ناتمام نسخہ تمام ہو جاتا ہے -

قصائد کے لوازم - شوکتِ الفاظ - بلندیٔ خیال اور بندش کی پختگی کی پوری پابندی معلوم ہوتی ہے - مضامین میں تازگی بھی ہے - محض قافیہ پیمائی یا رہ نوردی نہیں - گریز بھی خوبی رکھتی ہے - بعض بدیع ہیں - تشبیب مناسب و باموقع ہے - نمونۂ قصائد ملاحظہ ہو -

حمد - بر طرح مشہور

اے رُوئے خود ز پردہ نمودار ساختہ	خود را بحُسنِ خویش طلبگار ساختہ
تابِ رُخت بچہرۂ اعیانِ ثابتہ	بخشیدہ نورِ مظہرِ آثار ساختہ
چوں رُو کشودہ ذاتِ تو از پردۂ صفات	عالم عیاں ز پرتوِ رُخسار ساختہ
عکسے زدہ در آئینہ حُسنِ جمالِ تو	آئینہ را بحُسن گرفتار ساختہ
شاخ و درخت و باغچہ و کائنات را	فیضِ تو پُر ز برگ و گُل و خار ساختہ

یک دانهٔ زخرمنِ لطفت بباغِ خلد | اشجار را پُر از گل و اثمار ساختہ
یک رشحهٔ زفیضِ جمالت زروے لطف | حور و قصور و جنت و گلزار ساختہ
یک نفحهٔ وزید ز زُلفت بسوے چین | پُر مشک نافِ آہوئے تاتار ساختہ
یک موجۂ از محیطِ ہویّت برون دہ | صد بحر و جوے و جدولِ انہار ساختہ
یک پرتوِ تجلیِ حُسنت ہزار دل | در صد بلا کشیدہ و افگار ساختہ
یک نورِ پاک را بہ سپاہِ تجلیات | ذاتِ تو برگزیدہ و سردار ساختہ
نامش نہادہ احمد و محمود و ابطحی | در انبیا خلاصۂ ابرار ساختہ
از بہر پیشوائیِ انس و ملک ورا | در راہِ عشق قافلہ سالار ساختہ
مستانِ جامِ بادۂ عشقِ ترا مگر | آوازِ کُن کشیدہ و ہشیار ساختہ
چشمِ تو غمزۂ زدہ برترکشِ بتاں | خونخوار و دلفریب و ستمگار ساختہ
آنرا کہ کردہ دردِ غمت آشنائے خویش | از خویش و آشنا ہمہ بیزار ساختہ
آنرا کہ چشمِ قہر تو انداختت از نظر | در مردماں سرشک صفت خوار ساختہ
وانرا کہ دادہ لطفِ تو انوارِ مردمی | منظورِ دیدۂ اُولوالابصار ساختہ

نعت از ترجیع بند

دوش در مُلکِ ملک گلبانگ لاانفیا زدیم | اندراں وادی دم از مہر لحِّ اطلہ زدیم
از بساطِ قُدسیاں در بزمِ لاہوتی شدیم | پس درآں بزم از یداللہ ساغرِ صہبا زدیم
در ہوائے سایۂ بالِ ہمائے ہمّتش | در فضائے لامکاں پرواز یازآسا زدیم
بر سریر عرشِ اعظم نوبتِ شاہِ عرب | ہر نفس در ملکِ سُبحٰن الذی اسریٰ زدیم
تا شدیم از جاں غلام چاریار از یک دلی | چار طاقِ خسروی بر گنبدِ مینا زدیم
در ہوائے گلشنِ رُویش برآوردیم آہ | شعلۂ آتش بباغِ جنت الماوا زدیم
چوں مسیحا از کفِ عالم کشیدیم آستیں | دست در دامانِ آں خورشیدِ بے ہمتا زدیم

آنکہ چشمِ قدسیاں را سرمہ خاکِ پائے اوست ۔۔۔ نورِ مازاغ البصر در دیدۂ بینائے اوست

مدحِ پیر و مرشد ۔ تشبیبِ قصیدہ

شاہ را چترِ سیہ گرداں نہ گردِ افسر ست ۔۔۔ دودِ سرگردانیِ سودائے دنیا بر سر ست
عاشقِ عریاں تن ار لشکر ندارد بادشاست ۔۔۔ دودِ آہش چترِ مشکیں اشکِ رنگیں لشکر ست
سرورِ دنیاست کو پوشد قبائے ہفت رنگ ۔۔۔ چوں گدا یک رنگ باشد ور دو عالم سرور ست
ہر کرا در معرفت نورِ بصر سنجیدہ گشت ۔۔۔ پیشِ چشمِ روشنش ہر ذرہ مہرِ انور ست
روح را راحِ محبت دہ کہ آں جامِ جم ست ۔۔۔ قلب را تخشا صفا کائینۂ اسکندر ست
دل ز حرص و کینہ خالی کن کہ تا مونس شوی ۔۔۔ خوک و سگ بردن بہ بیت اللہ کارِ کافر ست
شو خلیل اللہ کہ تا آتش گلستانت بود ۔۔۔ بت پرستِ نفس نزدِ حق خلیلِ آذر ست
پاسِ انفاس ار نداری باغِ عمرت را خزانست ۔۔۔ ہر دمے کو را خدا ہمدم نباشد صرصر ست
ز آسماں گر تیغ بارد سر نخارد اہلِ دل ۔۔۔ نیشِ سوزن بر دلِ نامرد زخمِ خنجر ست
مرد نتواں گفت او را کو تن آراید بہ زر ۔۔۔ زینتِ مرداں ست آہن زر زناں را زیور ست
مرد را کردار عالی قدر گرداند ۔ نہ نام ۔۔۔ ہر کسے را کو علی نام ست نے چوں حیدر ست
از معانی افتخارِ سینۂ عالم بود ۔۔۔ عزتِ معدن نہ از کوہ ست بل از گوہر ست
سرخیِ روئے منافق لالہ را ماند ۔ کہ او ۔۔۔ اسود القلب ست اگرچہ رنگِ رویش احمر ست
نے کسے کاہل بیاباں شد ۔ دمِ وحدت زند ۔۔۔ خونِ ہر آہوئے صحرائی نہ مشکِ اذفر ست
اصلِ ایماں ور نیابی در فقیہِ بے اصول ۔۔۔ کامتحانِ دینِ او را اختصارِ مختصر ست

مدحِ سلطان السلاطین سکندر بڑے جوش سے کرتے ہیں ۔ ایک جگہ کہتے ہیں :۔

میانۂ من و تو دوستی ز بہرِ خداست ۔۔۔ نہ از برائے متاعِ زمانۂ غدار

ولہ

قد و رخسار و زلف و لعلِ روح افزائے آں دلبر ۔۔۔ یکے عرعر یکے اختر یکے عنبر یکے شکر
چہ عرعر عرعرِ رعنا ۔ چہ اختر اخترِ زیبا ۔۔۔ چہ عنبر عنبرِ سارا چہ شکر شکرِ عسکر

رخ و دندان و خط و موے مشک افشان او باشد — یکے لالہ یکے ژالہ - یکے ہالہ یکے عنبر
چہ لالہ لالۂ رنگیں - چہ ژالہ ژالۂ سیمیں — چہ ہالہ ہالۂ مشکیں چہ عنبر عنبر ابتر
دل و آہ و سرشک سرخ و رگہاے وجود من — یکے منقل یکے مشعل یکے جدول یکے مسطر
چہ منقل منقل پر خوں چہ مشعل مشعل گردوں — چہ جدول جدول گلگوں چہ مسطر مسطر دفتر
شہے کش ہست دربان و غلام و چاکر و خادم — یکے نوذر یکے سنجر یکے قیصر یکے سرور
چہ نوذر نوذر اعظم - چہ سنجر سنجر اکرم — چہ قیصر قیصر منعم چہ سرور سرور اکبر
سکندر شاہ کز دست و دل و قدر و شرف دارد — یکے قدرت یکے شوکت یکے رفعت یکے لشکر
چہ قدرت قدرت بیچوں چہ شوکت شوکت افزوں — چہ رفعت رفعت گردوں چہ لشکر لشکر بے مر
زنگر گوپال و تیر و ناوک و شمشیر تیز او — یکے مالک یکے سالک یکے ہالک یکے اژدر
چہ مالک مالک ہیجا چہ سالک سالک بے پا — چہ ہالک ہالک اعدا چہ اژدر اژدر اقہر
ز طبع و تیغ و جود دست او از فرق سرش تا زد — یکے ملت یکے نصرت یکے دولت یکے افسر
چہ ملت ملت احمد چہ نصرت نصرت بیحد — چہ دولت دولت سرمد چہ افسر افسر مفخر
ز فیض و لطف و جود و بذل او پیوستہ می کاہد — یکے مدفن یکے مخزن یکے معدن یکے گوہر
چہ مدفن مدفن کالا چہ مخزن مخزن دریا — چہ معدن معدن درہا چہ گوہر گوہر ازہر

مدح سلطان ظہیر الدین محمد بابر - بادشاہ در رزم جنگ پانی پت

رزم

ز افغاں فغاں برآمد آندم کہ شد حسامت — اشباح را مخرب - ارواح را محصل
از صدمۂ سمندت - ہر فیل کوہ پیکر — در خاک و خوں فرو شد ہمچوں حمار در گل
در حلقۂ سپاہت کامد عدو پر از خوں — چوں نقطۂ ز سرخی در چشم گشتہ داخل
چوں در دعا برآمد بسم اللہ از زبانت — از خنجرت ہمانی دم خصم گشت بسمل
یکدم ز قلب افغاں تیغت نگشتہ یک سو — کے آب در گرو یا خوں چہ گشت واصل

مُردن گزید خصمت بر زندگی کہ اُو را — مشکل نمود آساں۔ آساں نمود مشکل

بزم

در مکتبِ سعادت بہر قضائے گردو — برجبیں را ضمیرت آموختہ مسائل

در بزم نکتہ دانی ذکرِ تو مادہ مجلس — در مجمعِ معانی رائے تو شمعِ محفل

لعل و زمرد آرد برجائے سبزہ و گل — بارانِ ابرِ دستت جائیکہ گشت نازل

از دستِ دُرفشانت دیوانہ گشت دریا — باشد کشندا زآں رُو پیوستہ در سلاسل[1]

ایضاً۔ اس قصیدے کی تشبیب بابر کے تیموری ذوق کی ہو بہو تصویر ہے اور شاعر کے کمال کی سند:-

بادِ جاں پرور دزید لطفِ ابرِ نوروزی بہار — شد چمن سر سبز بر فرقش لآلی کن نثار

جار[2] باغِ بادشہ دارد نشانِ ہشت خلد — آبِ جو آمد مثالِ سلسبیلش در کنار

شد کنارِ جوئبار۔ از سبزہ مینائی بساط — تا دہد سلطانِ گل اندر کنارِ جوئبار

رشتہائے از ہوا چوں تارِ زر بیروں کشید — میکند ہر رشتہ پُر باراں بدُرِ شاہوار

لالہ دارد جامِ یاقوتی پُر از مے از چہ روئے — نرگس اندر عینِ مستی سرگراں گشت از خمار

تا کلیمِ عندلیب آید بہ دستاں در کلام — از برائے آں ہوا بر شاخِ گل افروخت نار

شاخسارِ سرو و اوراقِ شجر بنگر کہ ہست — در بر ہر برگ طوطی۔ بر سرِ ہر شاخ۔ سار

ہمچو لعلِ جانفزایاں غنچہ را شیریں دہن — ہمچو روئے دلکشایاں لالہ را رنگیں عذار

صوفیانِ سبز پوشِ باغ را وجد ست حال — از سرودِ بلبل و از دستکِ برگِ چنار

اندریں موسم کہ در کشتی نشیند بادشاہ — آفتابے داں کہ اندر ماہِ نو گیرد قرار

در بہارِ مجلسش میخواند بلبل ایں غزل — بر مثالِ عاشقِ شوریدہ دل بر بوئے یار

غزل

اے ز رشکِ عارضت پیوستہ گل در خار خار — در غمِ رُویت چمن جا کہ دادہ در سہ سو ہزار

از چہ رُو سر بر ندارد لالہ در صحنِ چمن — گر نماند از عارضِ رنگینت اے گل شرمسار

سنبلِ پیچانِ تو از سرکشی۔ مشکیں کند — نرگسِ فتانِ تو۔ از خوں خوری مردم شکار

---

[1] اس شعر کی ندرت قابلِ داد ہے۔ (شروانی)

[2] در آگرہ جالارام باغ نام دارد ۱۲ شروانی

چشمِ تو با طاق ابرو ہندوے محراب گیر ۔۔۔ خالِ تو با زلفِ مشکیں کافرِ زنّار دار

میدوَذ پیوستہ دل بر رشتۂ ہر موئے تو ۔۔۔ بر مثالِ عنکبوتے[1] کو دوَذ بر روے تار[2]

جانِ سرگرداں۔ زروزنہا۔ کہ دارد سینہ ام ۔۔۔ سوے خورشیدِ رخت رقصاں برآید ذرّہ وار

چشمِ تو در عینِ بیماری زخونِ مَرداں ۔۔۔ باز می نایذ۔ نمی ترسد زعدلِ شہریار

شاہ جم سیرت ظہیر الدین محمد بابرے آنکہ ۔۔۔ خاکِ درگاہش بُوَد مسجودِ شاہانِ کبار

از خراساں چوں بہندستاں شدی آمد ترا ۔۔۔ بخت و دولت در یمین و فتح و نصرت در یسار

دشمنت را زندگی شد خواب آسایش محال ۔۔۔ خود خیال و خواب را چنداں نباشد اعتبار

لہ (خوبی تشبیہ ملاحظہ ہو)۔ ٰ۲ہ اسی مضمون کو سیادت لاری نے باندھا ہے :-

ہمیں نہ دل بقفایش رَوَد زکوچۂ آہ ۔۔۔ چو عنکبوت دوَذ دیدہ ہم بہ تارِ نگاہ

دونوں شعروں کا فرق ظاہر۔ سیادت کی تشبیہہ زیادہ بلیغ ہے۔ پہلے مصرعہ میں کوچہ کی جگہ رشتہ زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ (حسرت شروانی)

در صفِ ہیجا شد از گرد و غبارِ موکبت ۔۔۔ چہرۂ افلاک قیرو دیدۂ خورشید قار

صورِ اسرافیل گشتہ بانگِ سُرنائے و نفیر ۔۔۔ فیلہا جنبیدہ ہر سو چوں بہ محشر کوہسار

خونِ بدخواہاں دمادم شد رواں تند جیحے ۔۔۔ نیزہا بنمود سروستان کنارِ جویبار

اندراں معرض ندا از ہاتفِ غیبی رسید ۔۔۔ سوئے تو نصرٌ من اللہ۔ سوے دشمن الفرار

از نہیبِ شوکتِ شیر افگنت در روزِ رزم ۔۔۔ شد زمین در اضطراب و آسماں در اضطرار

از جلوست شد مشرف تختِ دار الملکِ ہند ۔۔۔ آسماں بر پایۂ تختِ تو شد کوکب نثار

ملکِ ہندستاں ز انصافت چناں رونق گرفت ۔۔۔ رستہ بازار از دو سو شد ز کابل تا بہار

مراثی ۔ مرثیے بہت دردناک کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ خونِ جگر نوکِ قلم سے تراوش کر رہا ہے۔ سب مرثیے بصورت ترکیب بند ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو:-

مرثیہ پیر و مرشد | اے دیدہ خوں بریز کہ دلدار غائب است ۔۔۔ یعنی جمالِ آں مہِ رخسار غائب است

اے ظلمتِ ستم رُخِ آفاق را بپوش　　کاں آفتابِ عالمِ انوار غائب ست
شیخے کہ سرِّ حق ز لبش می شنود خلق　　اکنون میانِ عالمِ اسرار غائب ست
در غارِ غم رود کہ آں یارِ غارِ دیں　　ہمچوں نبی کنوں بدلِ غار غائب ست
زاں جاں ہمی کنیم کہ جاناں نہفت روئے　　زاں غم ہمی خوریم کہ غمخوار غائب ست
انوارِ آں جمال - بمعنی محیطِ ماست　　گر صورتش ز دیدۂ خونبار غائب ست
یا رب چہ حالت ست کہ امروز در جہاں　　صبر و قرار - از دلِ ابرار غائب ست

یعنی سمارِ دولت و دیں زیرِ خاک شد۔
زیں غم ہزار جامۂ اسلام چاک شد

مرثیہ فرزند پیر و مرشد۔ موسوم بہ عبد اللہ :-

بند دوم　یعنی از روے زمیں مطلعِ انوار برفت　　قرۃ العین سمار الحق ازیں دار برفت
در بیابانِ بلا ما ہمہ سرگردانیم　　پیشواے دل و دیں قافلہ سالار برفت
دل برآریم ز جاں جاں بدر آریم ز تن　　دل و جاں را چہ تواں کرد کہ دلدار برفت
جگرم پارہ شد و سینہ پر افگار بماند　　سیلِ خوں دم بدم از دیدہ بر خسار برفت
کوہ را طاقتِ آں نیست کہ ایں بار کشد　　آنچہ بر جانِ منِ خستہ دریں بار برفت
می خلد خارِ غم اندر جگر و سینہ از آنکہ　　گلِ رعنائے من از عرصۂ گلزار برفت
یا زجنبید نہ دانم ز کجا سیلِ فنا　　کہ از و خانۂ دیندار ز دیوار برفت
غمِ دل با کہ تواں گفت کہ از روے زمیں　　بقضائے فلک آں محرمِ اسرار برفت

طالباں از غمِ او جامۂ جاں چاک زدند
خویش را سینہ و در آتش زدہ بر خاک زدند

مرثیہ فرزند خود مسمٰی بہ حسن

روزگارِ بے وفا با من عجائب کار ساخت　　سینہ ام افگار کرد و دیدہ ام خونبار ساخت

بختِ من بیدار بود و فتنۂ محنت بخواب | بخت را در خواب کرد و فتنہ را بیدار ساخت
سوزِ غم را یا دل بے صبرِ من ہمدرد کرد | صبر را از سینۂ پُر دردِ من بیزار ساخت
اے عزیزاں یوسفم گم کرد ایں گرگِ کہن | دیدۂ یعقوب چوں اشکِ زلیخا خوار ساخت
صد ہزاراں داغِ محنت بر دلِ پُر خوں نہاد | مُردن آساں کرد بر من زندگی دشوار ساخت
دیدۂ ما ہر دَم از عکسِ رخش گلزار بود | دَورِ گردوں آں ہمہ گلزار را پُر خار ساخت
آنکہ از رُوئش در و دیوارِ ما پُر نور بود | روزگار اندر میانِ ما و او دیوار ساخت

دیدہ گریاں سینہ بریاں دل پریشاں جاں خراب
ہمچو مرغِ نیم بسمل می طپم در اضطراب

مرثیہ سلطان سکندر لودھی

خلق حیران و پریشانست شہنشاہ چہ شد | ہمہ بر سینہ زناں دست کہ اللہ چہ شد
مہر در آتشِ غم سوخت۔ شفق خوں بارید | انجم از چرخ فرو ریخت کہ آں ماہ چہ شد
ظلمت آباد شد آفاق ز شامِ غمِ او | یارب آں طلعتِ خورشید سحر گاہ چہ شد
خوں گرہ شد بگلو زآہ۔ دمم شد مسدود | در غمِ آں کہ مرا ہمدم و ہمراہ چہ شد
ویحک! آں فرحت و آں بہجت و آں حال چہ گشت | اوجِ آں دولت و آں مسند و آں گاہ چہ شد
تا بہ دُنبالِ وے افسوس کناں می رفتم | ہیچ مردے نشد از رفتنش آگاہ چہ شد
نیک خواہان وے ایں لحظہ اجل خواہ شدند | کاں خدا داں و خدا بیں و خدا خواہ چہ شد

ہاتفم گفت مپندار کہ او در خاکست
قدمش ہمچو پیمبر بسر افلاکست

اس کا آخیر شعر ہے :۔

باد ہمچوں تو سزاوار سریر و دیہیم
مردمِ چشمِ تو۔ سلطانِ جہاں ابراہیم

ترجیع بند در معرفت

اے رخت در جمالِ تو پیدا　　وے جمالِ تو بر رخت شیدا
عارضت نورِ دیدۂ مردم　　مردم از عارضِ تو نا بینا
مانده تنها بعینِ تنهائی　　کرده پیوند با همه تنها
همه نامِ تو بر زباں دارند　　مومن و گبر و کافر و ترسا
گاه ناظر بدیدۂ وامق　　گاه منظور در رخِ عذرا
رفته از ذات در سرائے صفات　　بسته بر او غشاوۂ اسما
جمله اسم و صفات را ناگاه　　دیده در ذات ظاهر و پیدا
گاه دریا بموج کرده ظهور　　گاه شد موج عینِ آں دریا
یار با ما و ما همه بے او　　مانده تنها چو او و بے ما
گر نهانست چیست چندیں شور　　ور عیانست چیست ایں غوغا
مطربِ دل به پرده میگوید　　تنا تن تنا - و تن درنا

که همو عابد و همو معبود
لیس فی الدار غیرهٔ موجود

ترکیب بند معرفت

مائیم خلاصۂ دو عالم　　تفسیرِ حروفِ اسمِ اعظم
هم ذاتِ خدا بما مبیّن　　هم نورِ صفت بما مسلّم
مشهورِ رخِ صفات و اسما　　مسجودِ فرشتۂ معظم
همواره بما کمال مضمر　　پیوسته بما جمال مدغم
از بهرِ ظهورِ صورتِ دوست　　آئینۂ معنی است آدم
دریائے محیطِ بیکرانه　　ایں طرفه که شد عیاں ز شبنم
هر قطره که شد ز موج پیدا　　هم موج فروکشید و هم یم
آں کس که شود نهنگِ ایں بحر　　باشد به نهیب ورطه بے غم

نے خوش زثنا نہ ناخوش از ذم   نے تنگ ز شر نہ خرّم از خیر

آزاد ز جنّت و جہنم   بیزار ز قیدِ کفر و اسلام

اینست کمال رہروِ دیں

ایں جا ازل و ابد یکے ہیں

یہ ترکیب بند نا تمام رہتا ہی اور نا تمام کتاب تمام ہو جاتی ہی۔ سارا ترکیب بند جوش اور زورِ کلام کا آئینہ ہے۔

غزل

ہم نے اوپر بیان کیا ہی کہ اس مجموعہ میں غزل نہیں۔ خوش قسمتی سے دو غزلیں قصیدوں کی ضمن میں آگئی ہیں۔ ایک لکھی جا چکی ہی۔ دوسری ملاحظہ ہو جو پیر و مرشد کے قصیدے میں لکھی ہی۔ شعر قصیدہ ۔۵

در ہوائے مجلسش میخواند بلبل ایں غزل

زد گریباں تا بدامن چاک ازیں گفتارِ گل

اے قدت شمشاد و عارض لالہ و رخسار گل   لالہ ات ریحاں دَمد شمشادت آرد بارِ گل

در گلستاں سنبل از نسریں برافگن کز حیا   باز گردد غنچۂ و باشد نہاں رخسارِ گل

تا نہاں کردی رخ اے سروِ روانم از نظر   می فشانم دمبدم از دیدۂ خونبارِ گل

گرچہ رنگین و لطیف و نازک آمد در چمن   پیشِ رخسارت ندارد قیمت و مقدارِ گل

بت پرست شد نشانِ زردِ کفرش بر جبیں   ریسماں دارد بگردن بستہ چوں زنّارِ گل

در فراقت نالۂ زارِ من آرد گریہ گوش   از نوائے نغمۂ بلبل بود بیزارِ گل

ناظرِ رویت رقیب و من بفریاد و فغاں   بلبل اندر نالہ و در چشمِ پوتیمارِ گل

باشد از خارِ جفائے عارضِ رنگینِ تو   چوں دلِ بلبل ہمہ تن در چمن افگارِ گل

اندکے با روئے رنگینت نباشد نسبتش   گرچہ شوید ز آبِ شبنم روئے خود بسیارِ گل

بر گلستانِ رخت ہر تارِ زلفت حلقہ زد   می نماید روئے تو از حلقۂ ہر تارِ گل

تا خیالِ رویت اے گل خانۂ چشمم گرفت ... در نظر می آیدم ہر سو در و دیوار گل
چشمِ من در انتظارت ہمچو نسریں شد سپید ... تا بہ زلفینِ سیہ کردی نہاں اے یار گل
می سزد گر نایدت عارے ازیں تارِ ضعیف ... زانکہ از خارے ندارد در گلستاں عار گل

پیشِ مخدومِ جہاں نالم چو بلبل از غمت
زانکہ لطفش در اماں دارد ز جور خار گل

(کلامِ پدر اے راز حسرت شروانی)

جمالی را جمالِ شعر زیبا ... فریبِ چشمِ ساقی ہاں مگر نیست
برائے شاعری آمادہ ہر چیز ... "ورائے شاعری چیزے دگر نیست"

وہ جو آلِ تیمور کے شاعروں کے یہاں ہے۔

(رسالہ اورنٹیل کالج میگزین لاہور بابتہ ماہ نومبر ۱۹۳۳ء)

مقدمۂ کلیاتِ عزیز

لکھنؤ کے دورِ آخر کو جن اہلِ کمال پر ناز اور بجا ناز تھا اُن میں خواجہ عزیز الدین عزیزؔ مرحوم ممتاز ہیں امتیاز کی وجہ یہ ہے کہ ادب فارسی میں کمال حاصل کیا اور ان میدانوں میں علم استادی بلند کیا۔ جو متاخرین کی دسترس سے باہر تھے۔ یعنی مثنوی و قصیدہ۔ اصنافِ سخن میں سب سے زیادہ مختصر رباعی ہے جو سب سے زیادہ مشکل ہے۔ دیکھو صدیوں کے دوران میں صرف چار یا پانچ ہی استاد رباعی گزرے ہیں۔ حضرت ابوالخیر ابو سعید۔ شیخ الاسلام انصاری۔ عمر خیام۔ سحابی نجفی۔ دل چاہے تو سرمد کو بھی یاد کر لو اس نے بھی ایک لطف پیدا کیا ہے۔

رباعی کے بعد مثنوی ہے۔ اس میں اساتذہ کی تعداد بیس[۲۰] سے زیادہ نہ ہوگی۔ مثنوی کے بعد قصیدہ ہے اس کے استاد دس[۱۰] کے اندر اندر رہیں گے۔ سب سے زیادہ آسان غزل ہے۔ استاد غزل بیسیوں مشاہیر غزل

سینکڑوں ہیں۔ کہنا یہ تھا کہ خواجہ عزیز صاحب امتیازیوں ہیں کہ انھوں نے مثنوی اور قصیدہ میں جوہر کمال دکھائے مذاق شعر کا پایہ بلند کیا۔ اس کا ثبوت آگے دیکھو۔

لکھنؤ کی سبزی منڈی میں خواجہ صاحب کی بارہ دری گویا خیابان شیراز تھی۔ انسان وہاں پہنچتا تو حافظ و سعدی کے کمال کی مہک پاتا رونق دوبالا ہو جاتی جب علامہ شبلی بھی وہاں ہوتے۔ اور یہ اکثر ہوتا۔ لکھنؤ کی حاضری میں خواجہ صاحب کی خدمت میں باریاب ہونا میرے لئے لازم تھا۔ جس وقت اطلاع پہنچتی محل سرا ئے سے اس شان سے برآمد ہوتے کہ لب پر تبسم ہوتا۔ ہاتھوں میں چاء کا سامان۔ بالاتر قلبی محبت کا اثر تمام حرکات و سکنات میں عیاں نظر آتا۔ مراتب پذیرائی کے بعد بیٹھتے باتیں کرتے چاء کی تیاری کا اہتمام جاری رہتا۔ ناممکن تھا کہ مہمان ہاتھ بٹائے۔ چاء میں زعفران ضرور پڑتی۔ شام سادہ صبح کو دودھ ناشتہ کے ساتھ۔ بازار کا دودھ جب چاء کو بد رنگ کر دیتا تو خواجہ صاحب کا جز بز ہو جانا قابل دید ہوتا۔ کم سخن تھے اور سادہ بیان۔ خودستائی سے نفور کوسوں دور اس لئے گفتگو میں خوش بیانی نہ تھی۔ ع

"ورلئے شاعری چیزے دگر بود"

خواجہ صاحب کے اوصاف کی وہ تاثیر تھی کہ سیدھی سادہ مختصر باتوں پر خوش بیانی کا دفتر قربان تھا۔ بارہا حاضر ہوا مگر کلام سننے یا حاصل کرنے میں اتنا کم کامیاب ہوا کہ گویا نہ ہوا۔ ہاں دوسروں کا کلام سناتے ادبی نکتے بیان فرماتے علمی سوالوں کا جواب شافی ملتا۔ ناممکن ہو کہ ان صحبتوں کا ذکر ہو اور خواجہ نور الدین مرحوم کی نورانی صورت یاد نہ آئے۔ اُن کا ایک طرف خاکسارانہ بیٹھنا۔ کلام کے مزے لینا۔ نکتہ سنجی۔ لطیف کلام۔ ایک خاص لطف رکھتا تھا جو برسیں گزر جانے پر بھی آج تک نقش دل ہو۔

خواجہ صاحب کی وفات سے آج تک دل کو ہمیشہ یہ قلق رہا کہ مرحوم کا کلام مرتب و شائع نہ ہوا۔ جب یہ خیال آتا کہ کس مپرسی میں کہیں تلف نہ ہو جائے تو دل پر ایک چوٹ سی لگتی۔ مسرت نہیں حیرت ہوئی جب میں نے دیکھا کہ چھپا چھپایا مجلد "کلیات عزیز" میری آنکھوں کے سامنے موجود ہو۔ قدرت نے یہ کام کس کے ہاتھوں سے لیا۔ اُس کے جس کو نہ شاعری سے لگاؤ ہو نہ شعر و سخن سے۔ خواجہ عزیز کے

فرزند عزیز خواجہ وصی الدین صاحب ہیں اور بہت سے جوہر ہیں مگر "موزونیت" تو اُن کی طبیعت سے بمراحل دور ہی با وجود اس کے اپنے باکمال والد کا کلام مرتب کرکے چھپوا دینا قابل صد ستایش اور دنیائے ادب پر عظیم احسان ہی۔ مقولہ ہی کہ نام آسمان سے اُترتے ہیں۔ ان کا نام شاید وصی الدین اسی لئے ہوا تھا کہ اشاعت کلام کی وصیت پوری کریں گے۔ انھوں نے اپنے نامور باپ کی روح کو شاد کیا۔ اللہ پاک ان کو دارین میں شاد با مراد رکھے۔

حالات خواجہ عزیز کے مورث خواجہ محمد مقیم آٹھویں صدی ہجری میں ترکستان سے حضرت سیّد شرف الدین بلال شاہ کے ساتھ کشمیر میں آکر مقیم ہوئے۔ یہ ہی حضرت بلبل شاہ ہیں جنھوں نے کشمیر کو اسلام پھیلا کر جنت نظیر بنایا۔ خواجہ مقیم تاجر تھے اور یہ پیشہ آخر تک اس خاندان میں رہا۔ خواجہ عزیز کے والد خواجہ امیر الدین نے تجارت کا دائرہ اتنا وسیع کیا کہ یورپ کو بھی پشمینہ پوش اور کشمیر کا حلقہ بگوش بنا دیا۔ فرانس خاص بازار تھا۔ یورپ کے تاجران کے یہاں آکر مہمان رہتے اور فرمایشیں تیار کرا کے واپس جاتے۔ خواجہ امیر الدین نے کشمیر کی سکونت ترک کرکے لکھنؤ میں بود و باش اختیار کی سبزی منڈی کی بارہ دری اُنھی کی بنا کردہ ہی۔ یہاں بھی شال کا کارخانہ وسیع پیمانہ پر قایم کیا۔ بالآخر تجارت کی کساد بازاری اور یورپ کی خود غرضی نے اس کارخانہ کو بھی سرد کر دیا۔ شکر ہی کہ خواجہ عزیز کی گرمیٔ سخن نے اُس کو وہ نور بخشا کہ آج تک روشن و منور ہی۔

خواجہ عزیز ۱۸۲۱ء میں ملک کشمیر میں پیدا ہوئے۔ آٹھ برس کی عمر تھی کہ باپ کے ساتھ لکھنؤ پہنچے اور یہیں تحصیل علم کی۔ افسوس ہی کہ خواجہ کی تحصیل علم کے حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ کیا پڑھا کس سے پڑھا۔ کچھ نہیں معلوم۔ فارسی پڑھی بلکہ اُس میں کمال حاصل کیا۔ اس میں کیا کلام ہو سکتا ہی۔ علوم عربیہ میں بھی صاحب استعداد تھے۔ خصوصاً ادب میں۔ حماسہ۔ متنبی۔ سبعہ معلقہ کا بارہ دری میں درس دیتے تھے۔ یہ بھی روایت ہی کہ ایک افغانی بزرگ کی صحبت میں (جو درگاہ حضرت شاہ مینا میں رہتے تھے) کلام فارسی میں ترقی کی۔ ان بزرگ کا نام عبداللہ تھا۔ ابتدائی شاعری کا نمونہ ؎

ما عاشقیم عشق بود کار ما عزیز   عاشق پسند ہست ہمانا کلام ما

خواجہ صاحب کی شادی داروغہ عاشق علی خاں کے یہاں ہوئی جو محمد علی شاہ بادشاہ کی سرکار میں توشہ خانہ کے داروغہ تھے اور حسین آباد کی تعمیر کے مہتمم۔ خواجہ صاحب کے اور اقربا بھی لکھنؤ اور کشمیر میں نامور رہے۔ نواب قمر الدولہ، ظہیر الدولہ اور شرف الدولہ کے نام شرف خاندانی کی روشن سند ہیں۔

۱۸۸۴ء میں خواجہ صاحب نے اپنے دوست شیخ واجد حسین صاحب تعلقدار کے اصرار پر کیننگ کالج میں فارسی کی پروفیسری قبول فرمائی اور نو سال تک اس فیض کو جاری رکھا۔ اس میں کون شبہ کر سکتا ہے کہ اس تعلق سے خود کیننگ کالج کا شرف بڑھا۔ ۱۹۰۹ء حیدرآباد دکن کے محکمۂ السنہ شرقیہ کے ممتحن مقرر ہوئے۔ خواجہ صاحب کی سوانح میں غالب دہلوی سے ملاقات کا واقعہ شان رکھتا ہے۔ سنہ ۱۲۸۰ھ میں اثنائے سفر کشمیر میں وارد دہلی ہوئے تو غالب کی زیارت کا شوق دل میں پیدا ہوا۔ مرزا کا یہ آخری زمانہ تھا۔ پلنگ پر لیٹے رہتے تھے۔ سماعت اس قدر کم ہو گئی تھی یا کم کر رکھی تھی کہ لوگ بجائے بات کرنے کے کاغذ پر مطلب کی بات لکھ کر پیش کرتے اور مرزا صاحب لیٹے لیٹے جواب لکھ دیتے یہی معاملہ خواجہ صاحب سے پیش آیا۔ تحریر سے ذوق شعر محسوس کر کے مرزا نے شعر کی فرمائش کی۔ خواجہ عزیز نے یہ شعر لکھ کر پیش کیا ؎

مہ مصر است داغ از رشک مہتابے کہ من دیدم
زلیخا کور شد در حسرتِ خوابے کہ من دیدم

غالب کو "مہ مصر" کی ترکیب میں تامل ہوا کہا "ماہ کنعاں سنا ہے مہ مصر نئی ترکیب ہے"۔ خواجہ عزیز نے صائب کا شعر سند میں پیش کیا تو مرزا بہت خوش ہوئے۔ شعر بار بار پڑھا اور تحسین بلیغ کی۔ خواجہ عزیز کا ایک نعتیہ شعر بہت بلند پایہ ہے ؎

دہد حق عشق احمد بندگانِ چیدۂ خود را
بخاصانِ شاہی بخشد مئی نوشیدۂ خود را

پٹنہ کے صاحب دل بزرگ مولانا محمد سعید حسرت تخلص نے یہ شعر سنا تو کیفیت وجد طاری ہو گیا۔ کلکتہ کی ایک مجلس میں جب کہ ہفت بند عزیزی پڑھا گیا تو ایرانیوں پر بھی کیفیت ذوق طاری ہوئی۔ خواجہ

صاحب نے کشمیر کا کئی بار سفر کیا تھا۔ منجملہ اُن کے ایک سفر کی یادگار مثنوی "ارمغانِ لاجواب" ہے۔
خواجہ صاحب نے ۵۰ برس کی عمر میں ۱۳۳۳ھ مطابق ۱۹۱۵ء میں بمقام لکھنؤ رحلت کی۔ کٹرہ ابو تراب خاں میں دفن ہوئے غفرلہٗ۔ ذبیح فرخ آبادی نے تاریخ خوب کہی۔ ع غریبِ مصرِ جناں خواجہ عزیز الدین۔
ایک عدد کا تعمیہ ہے۔

اخلاق خواجہ صاحب با اوقات عبادت گزار تھے۔ مذہب کی طہارت اور مشرب کی وسعت اُن کے جملہ حرکات و سکنات سے خود بخود عیاں ہوتی تھی "مشک آنست کہ خود ببوید"۔ نہایت غیور اور سیر چشم تھے۔ کسی کا بارِ احسان نہ اٹھا سکتے تھے۔ تحائف کا خوش اسلوبی سے فوراً عوض کرتے تھے۔ بعض دفعہ دستی پہنچنے کا موقع نہ ملا تو پارسل سے ڈاک میں یہاں پہنچا۔ باوجود وضع کی پابندی اور شانِ استغنا کے نہایت ملنسار اور متواضع تھے۔ آدمی جتنے دیر حاضر رہتا اخلاق کی پاکیزگی سے مسحور رہتا۔ حسنِ اخلاق مذہب اور فرقے کی قید سے بالاتر تھا۔ مسلمان۔ ہندو۔ عیسائی۔ سُنّی۔ شیعہ۔ سب کے ساتھ یکساں اخلاق سے پیش آتے تھے۔ محض ظاہری اخلاق نہیں وہ اخلاق جس کا اثر دل پر پڑتا۔ عارف جامی کا مشہور شعر گویا اُن کی زندگی کا اصول تھا ؎

پس چناں زی کہ بعد مردنِ تو
ہمہ گریاں بوند تو خنداں

احباب کا دائرہ وسیع تھا۔ مخصوص احباب پر دل سے فدا تھے۔ علامہ شبلی کی وفات کے بعد پہلی ملاقات میں مرحوم کا ذکر مجھ سے فرمایا تو با ایں ہمہ تمکین۔ آواز گلوگیر تھی اور آنکھوں سے آنسو جاری۔ کلیات کے ساتھ جو رقعات چھپے ہیں ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ معاصرین سے (جو ادبِ فارسی کے بقیۃ السیف تھے) خواجہ صاحب کے دوستانہ مراسم تھے۔ مثلاً منشی غلام غوث خاں بیخبر الہ آبادی۔ مولوی محمد سعید صاحب حسرت پٹنوی۔ علامہ شبلی۔ مولانا عبدالغنی خاں صاحب غنی۔ راجہ درگا پرشاد تعلقدار سندیلہ۔ منشی دلاور علی خانی۔

اولاد خواجہ صاحب کے چار لڑکے تھے۔ خواجہ خلیل الدین۔ خواجہ رشید الدین۔ خواجہ وصی الدین۔

حافظ محمد امین الدین۔ والد کی حیات میں حافظ محمد امین الدین مرحوم مہمانوں کی خدمت ایسی خوبی اور بے تکلفی سے کرتے تھے کہ دیکھنے والوں کو تعجب ہوتا کہ خواجہ صاحب کے صاحبزادے اور یہ شوق خدمت۔ علامہ شبلی نے ایک بار تعجب سے پوچھا کہ حافظ امین الدین اس قدر بے تکلفانہ خدمت کس طرح کرتے ہیں تو فرمایا کہ ہمارے گھروں میں بچّے مہمانوں کی خدمت کے عادی بنائے جاتے ہیں۔ خواجہ وصی الدین صاحب گریجوایٹ ہیں۔ ڈپٹی کلکٹری کے عہدے کا وظیفہ پارہے ہیں۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا اُن کا خاص کارنامہ یہ ہے کہ باوجود فارسی ادب سے مناسبت نہ ہونے کے مرحوم والد کی یادگار قایم رکھنے کو اُن کا کلیات مرتب اور شائع کیا۔ اہل سخن کو ممنون کرم بنایا جو دشواریاں اُن کو اس کام میں پیش آئیں اُن کا اندازہ آسان نہیں۔ اور ہاں نہ صرف کلیات عزیز کو شائع کیا بلکہ جس بارہ دری میں اس کی فکر ہوئی تھی اُس کو وسیع و دلآویز "عزیز منزل" بنا دیا۔ اسم بامسمیٰ ہوگئی۔

خواجہ صاحب کے پوتے خواجہ شریف الدین لکھنؤ کے مشہور ڈاکٹر ہیں۔

تلامذہ جن باادب تلامذہ کے نام معلوم ہوسکے وہ حسب ذیل ہیں:۔

(۱) مرزا محمد ہادی صاحب رسوا بی اے لکھنوی (۲) ریاض حسن خان صاحب دانش رئیس رسول پور (۳) قاضی محمد خلیل صاحب خلیل بریلوی (۴) مولوی شکراللہ صاحب سہیل میر دبیر بھوپال۔ (۵) منشی میکولال صاحب عشرت لکھنوی (۶) مولانا محمد نجیب اللہ صاحب نجیب فرنگی محلی۔

انداز اصلاح خواجہ صاحب کے شاگرد رشید سہیل کے الفاظ میں سنو۔ حضرت خواجہ صاحب کا طلبہ کے ساتھ خلق پدرانہ شفقت وقار و حلم اور تشفی بخش طرز افہام و تفہیم تھی۔ حضرت خواجہ صاحب کا طرز اصلاح خصوصیت کے ساتھ یہ تھا کہ اپنے شاگردوں کی نظم کے الفاظ کو خفیف سی ترمیم کے ساتھ کچھ اس خوبی سے تبدیل فرما دیتے تھے کہ شعر میں ادب و زبان اور خیال و بندش کی بیشمار خوبیاں پیدا ہوجاتیں احتیاط کا یہ حال تھا کہ کبھی ایسے محاورے کو جائز قرار نہیں دیتے تھے جس کی سند موجود نہ ہو۔ درس میں جب شاگردوں کو مضامین کے سمجھنے میں مشکلات پیش آتی تھیں۔ نہایت آسانی سے حل فرمادیا کرتے تھے۔ انتہیٰ۔

یہ میرا تجربہ ہی کہ خواجہ صاحب کلام بہت غور اور دقّت نظر سے سنتے تھے۔ ایک موقع پر میں نے شفائی اصفہانی کا یہ مطلع پڑھا۔ ؎

آمد بہار و جلوۂ بستانم آرزوست
ہمبا لگی بہ مرغ غزل خوانم آرزوست

میرے یہاں جو کلیات شفائی کا قلمی نسخہ ہی اُس میں "ہمبالگی" ہی تھا۔ اس کو پڑھ کر میں سنے اور اشعار پڑھے۔ مگر دیکھا کہ خواجہ صاحب متوجہ نہیں۔ آہستہ آہستہ شعر پڑھ کر اس کے الفاظ کو یوں دُہرانے لگے جیسے کسی کے نوالے میں کوئی ریزہ آجاتا ہی اور وہ اس کے نکالنے کی کوشش کرتا ہی۔ بعد تامل دوسرا مصرعہ اس طرح پڑھا۔ ع ہمنالگی بہ مرغ غزل خوانم آرزوست۔ پڑھ کر فرمایا "مجھ کو "ہمبالگی" میں تامل ہوا کہ بال سے بالگی کیونکر بنا۔ صحیح ہمنالگی ہی۔ اب مصرع چست ہے۔

دوسروں کا کلام سن کر داد بہت فراغ دلی اور کشادہ پیشانی سے دیتے۔ اساتذۂ فارسی میں مولانا نظامی کو بہت مانتے تھے۔ ایک بار میں نے نظامی کی خصوصیت پوچھی تو فرمایا الفاظ کا انتخاب ترتیب اور بندش ان تینوں مراتب میں نظامی ممتاز ہیں۔ بعینہ جس طرح ایک باکمال جوہری جواہر آب دار بے داغ کا انتخاب کرے۔ ان کی ترتیب میں جوہر دکھائے اور جڑاؤ میں قوت مہارت ۱۳۱۲ھ میں قیصر باغ کے اجلاس ندوۃ العلما میں ترکیب بند پڑھتے ہوئے میں نے سنا تھا پڑھنے کا انداز متین اور سادہ تھا اثر آفرینی کا اہتمام نہ تھا۔

کلام | خواجہ صاحب کا کلیات اگرچہ ضخیم نہیں اور اُس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ کل کلام نہیں تاہم اصناف سخن سے مملو ہی۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ غزل۔ ترکیب بند۔ قطعات۔ ہفت بند۔ رباعی۔ سب کچھ ہی۔ ہمہ نعمتیں موجود۔ اہل نظر ترتیب کلیات دیکھ کر مسرور نہ ہوں گے۔ مگر یہ ثبوت ہی خواجہ وحید الدین کی مشکلات کا اور اُس دشواری کا جو حصول کلام و ترتیب میں پیش آئی۔ عام انداز کلام۔ متانت۔ بندش کی چستی۔ حشو و زوائد سے پاکیزگی۔ مضامین کی بلندی ہی۔ مناسبت لفظی کا اہتمام بھی پیش نظر تھا۔ بالا تر یہ کہ فارسی ذوق ادب خود ساختہ نہ تھا۔ بلکہ وہ تھا جو استادوں کی پیروی کا پروردہ تھا۔ لہذا سندی تھا۔

نعت ومنقبت میں عقیدت کی گرمی وتاثیر صاف عیاں ہی۔ مثنویات چار ہیں۔ قیصر نامۂ بطرز سکندر نامہ۔ اس میں جنگ روم روس کی داستان ہی۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

حمد

بنام خداوند کار آفریں — ہزار آفریں صد ہزار آفریں
ازل تا ابد بارگاہِ ویست — کراں تا کراں در پناہِ ویست
اگر از جلالش زند دم زباں — بلرزد سپہر وبجنبد جہاں
بہ یکتائیش ہر کہ دم می زند — نہ دم بل دو عالم بہم می زند
رخ غازیاں را بخون غازہ ساز — بآبِ دم تیغِ جاں تازہ ساز
بحکمش ابابیل چوں پر زند — صف ژندہ پیلاں بہم بر زند

نعت

بہ معنی ز رحمت نخست آیتے — بظاہر ز دولت پسیں رایتے
زمیں تا فلک روشن از دینِ او — ز آئینہ روشن تر آئینِ او
ز مہر نبوت کہ بر پشت زد — بہ مہر سلیماں ز د انگشت زد
بدیدار آں روضہ شاداں شوم — اگر خار باشم گلستاں شوم
بخاک درش کاش خاکم کنند — کز آلائشِ خاک پاکم کنند

تالیف کتاب

کہن آتشِ پارسی پژمردہ بود — دل وجانِ گبراں ہم افسردہ بود
نہ آتش بجا و نہ آتشکدہ — در دیر را قفل محکم زدہ
من آوردم آں قفل را چوں کلید — در بستہ را شد کشادے پدید

مدح سلطان عبدالحمید خاں

با ورنگ شاہنشہی پائے اوست — ولے در دلِ عالمے جائے اوست
ہمیں پاسبانِ کہیں خانقاہ — کہیں دیدبانِ ہمیں خوابگاہ
ز پشتش قوی پشت اسلامیاں — بدورش بلند اختر شامیاں [۱]

---

[۱] آج "شام" کا روز سیاہ دیکھو ۱۲

درش مرجع ہفت ملت بود   دلے مرکز پنج نوبت بود

روانگی لشکر روم و روس۔

دو جمشید لشکر برانگیختند   بخوں ریختن می ز کف ریختند
دو اسکندر از راه ار زندگی   بخوں کرده بر چشمۂ زندگی
دو شمع از دو رخ برافروختند   نہ پروانہا جانہا سوختند
دو لشکر بروں شد بمیدان کیں   بجنبش درآمد زبانِ زمیں
درآمد بجنبش دو فوج گراں   دو کوه از دو سو گشتہ گوئی رواں

فوج پادشاه و عثمان پاشا

برآشفت سلطان ازیں دار و گیر   بفرمود بنوشت فرماں دبیر
کہ سالار عثمان جنگ آزمائے   ز ایوان بمیداں شود ره گرائے
برآراست اسپہبد صف شکن   قشونے ز ترکان شمشیر زن
ہمہ کارداں و قواعد شناس   چو ایمان خود جملہ محکم اساس
ہمہ تو جوانان ماہوت پوش   بخاکستری جامہ آتش فروش
بفرہنگ و آہنگ و ناموس و ننگ   سبق برده در جنگ از اہل فرنگ
پیاده چو آبے سواره چو باد   با عدائے نوح و یا شرار عاد

عثمان پاشا

سپہدار عثمان جنگ آزمائے   خردمند دانا دل تیز رائے
محیطے و چوں کوه آتش بجوش   نہنگے بکف اژدہائے بدوش

جوانانِ ترک

ازیں سوئے ترکان طاعت گزار   بکار خداوند سرگرم کار
وضو کرده ہر یک بخوناب خویش   بشوق سجودی سر افگنده پیش
نمازی بخوں جا بجا ساختہ   دل از مہر و آزرم پرداختہ
گہے در رکوع و گہے در سجود   گہے در قیام و گہے در قعود
یکے گرم سعی و یکے در طواف   یکے فدیہ گردیده خود در مصاف

شمردند محراب شمشیر را | رسانند بر عرشش تکبیر را
بہ پیکار کارے کہ تکبیر کرد | نہ شمشیر می کرد و نے تیر کرد
چناں سوئے شمشیر عریاں شدند | کہ گوئی ہم آغوش حوراں شدند

عثمان پاشا کا گھوڑا میدان کارزار میں کام آتا ہے ؎

سمندش کہ می گشت در کوہ و دشت
زبس تیز رفت از جہاں درگذشت

(جہاز سے اتر کر) عثمان پاشا امیر المومنین کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں ؎

نخستیں بپابوس سلطاں رسید | بلے قطرہ آخر بعمّان رسید
سزد مہر را داغ بر دل نہاد | کہ سلطان بہ پیشانیش بوسہ داد
مگر بوسہ تمغائے اخلاص بود | کہ تمغائے عثمانی خاص بود

خاتمہ جنگ و کلام

چو شمشیر ہا رفت اندر نیام
کشیدم زبان من ہم آخر یکام

یہ مثنوی ۱۲۹۶ھ میں مطبع نظامی میں چھپ کر شائع ہوئی تھی۔ اس وقت مسلمانوں کے لئے یہ مردوں کی زندہ داستان تھی۔ آج ہماری مردہ دلی سے مُردوں کی کہانی ہے۔ چند روز میں ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

مثنوی ید بیضا

یہ مثنوی شیرازی کی مشہور مثنوی سحر حلال کا جواب ہے۔ اور خواجہ صاحب کی قوت فکر و سخن آفرینی کی روشن دلیل۔ ذو بحرین ذو قافیتین مع التجنیس ہے۔ مثنوی ید بیضا ۱۳۱۰ھ میں مطبع اصح المطابع لکھنؤ میں (جو اُس وقت تک مطبع نظامی کی شاخ تھا) خواجہ عزیز کے شاگرد عزیز شیخ اصغر علی اصغر تعلقدار گنڈارہ کی فرمائش اور اُسی مرحوم کے تخشئے سے طبع ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان تمام شرائط کی پابندی کے ساتھ کلام سادہ نہیں رہ سکتا۔ دقیق اور عسیر الفہم ہو جائے گا۔ ہم بطور نمونہ اُس کا مطلع لکھے دیتے ہیں ؎

اے ز تو اندر سر من شور ہا | نام تو ہست افسر منشور ہا

تیسری مثنوی "ہدیۃ الثقلین" ہے اس میں ایک خواب کا جس میں دیدار حضرت رسالت پناہ سے مشرف ہوئے ذکر ہے۔

چوتھی مثنوی "ارمغان لاجواب" یہ مثنوی کشمیر ہی۔ کشمیر جنت نظیر کے مناظر اور مشہور مقامات کا ذکر ہی۔

قصائد | قصائد متعدد ہیں۔ ممدوح بھی شاندار ہیں۔ مثلاً سلطان عبدالحمید خان مرحوم۔ واجد علی شاہ بادشاہ اودھ۔ اعلیٰ حضرت میر محبوب علی خان بہادر آصف جاہ شاہ دکن۔ قاآنی کے طرز کا قصائد میں خوب اتباع کیا ہی۔ نمونہ ملاحظہ ہو ۔

دو شنبم بگوش آمدہ کاے بندۂ خدا | از بند خود بر آ ز در بندگی در آ

دستے فراز کن کہ نیازت شود قبول | صبحے نیاز کن کہ نمازت شود ادا

بردار سر زپیش و ز جیب فلک بر آر | بگذار پا نجویش و بعرش بریں بر آ

کبر تو چیست چرا نشکنی زہم | نفس تو کافرست چرا نفگنی زپا

طوفے بکوئے عشق کہ ہم کعبہ ہم حرم | سعی ز روئے صدق کہ ہم مروہ ہم صفا

رخش تو چرخ سیر چہ پوئی بہفت خواں | دست تو دیو گیر چہ پیچی بہ اژدہا

قطعات | قطعات بہت ہیں۔ تہنیتی اور تعزیتی۔ ہر قسم کی تاریخیں عموماً صاف اور حشو و زوائد سے پاک ہیں۔ منشی اطہر علی صاحب مرحوم کی تاریخ وفات کیا خوب ہوئی ہی۔ ع نام اطہر و طبع اطہر و جا اطہر یافت۔ مولوی محمد اکرم فرزند مولانا محمد نعیم فرنگی محل کی جوانمرگی کی تاریخ ملاحظہ ہو۔ ع بود اگلینے زباغ نعیم[1]

غزلیات | غزلیات کا انداز اشعار ذیل سے عیاں ہوگا۔

بیا ساقی سرت گردم رواں کن کشتی می را | باسم اللہ مجریہا باذن اللہ مرسٰہا

بود سر جوش ایں صہبا سراسر ہوش ہشیاری | دل دانا شنس بینا مغز دانہ پنبۂ مینا

عزیزا از گفتہ ات سرمست و سرخوش نشاطیں ہستی | حماک اللہ فی الدنیا سقاک اللہ فی العقبیٰ

---

[1] باغ نعیم کا لطف ملاحظہ طلب ۱۲

دہد حق عشق احمد بندگان چیدۂ خود را
بخاصان شاہ می بخشد مئی نوشیدۂ خود را

دو عالم را شب معراج بود و لیلۃ القدرے
کشادی چوں دو گیسوئے بہم پیچیدۂ خود را

بود پیمانہا لبریز و جانہا بر لب از حسرت
کہ کج دارد مریز آموخت یارب کج نگاہاں را

چہ منعمے کہ برو مفلساں حسد برند
بدل ز درد تو رشک است جملہ اعضا را

عزیز بندگیِ خواجۂ عنبرم کرد
کہ ہست بندۂ یکتا خدائے یکتا را

ز داغ سینہ رسد فیض جملہ اعضا را
یک آفتاب بود بس تمام دنیا را

بجرم عشق نیازم کہ جائے فسرد عمل
بدست دامن یوسف بود زلیخا را

بود نور خدا مشاطۂ حسن بے حجابش را
ید اللہ شانہ باشد گیسوئے پر پیچ و تابش را

ندانم تا بجیب و دامن عاشق چہ خواہد کرد
کہ ذوق جلوۂ خود می دراند ہم نقابش را

خم می پردار جلوہ می ہست اے غافل
چہ دانی چیست زیر خرقۂ مستاں خرابش را

فریب جلوہ صیدے می خورم ہر دم بصحرائے
کہ انداز رم آہوست ہر موج سرابش را

بشوق خلد در کام سقر انداختم خود را
حریف مستم و نہ شناسم از لطفش عتابش را

مرا خود کشتہ وافگندہ در حیرت جہانے را
بہ تیغ از ہر کسے پرسد کہ کشت ایں خستہ جانے را

ز عرض حال دل مکتوب قاصد برنمی آید
گر اندر نورد نامہ می پیچم زبانے را

در گلشن برویم باغباں بیہودہ می بندد
کہ چوں طاؤس من با خویش دارم گلستانے را

مہر ز لعل او بلب نطق سخن سرائے را
عقدہ ز زلف او بکار عقل گرہ کشائے را

بخون خفتہ شاید کارہا باقیست گردوں را
کہ بر خاک شہیداں آورد آں جامۂ گلگوں را

بیک دل چوں بروں آید کسے از عہدۂ نازش
خداوندا ولی کن در تنم ہر قطرۂ خوں را

بزم بادہ خواراں جرعۂ نمی ارزد
اگر صد اربعیں ہم بگذرد در خم فلاطوں را

نگہ از ضبط خوں گردید و شد وقف چکیدنہا
نقاب افگندن از رخسار و آنگہ منع دیدنہا

ترنج و کف چہ باشد چوں نقاب از رخ تو بر داری
چہ سرہا کان اودہر سو بتاراج بریدنہا

زدن شستیم داغ کلفت بیم و امید اینجا دو عالم یک سرشکی بود کز مژگان چکید اینجا

بدعوی گاه عشق از خون بها بگذر غنیمت دان که قاتل دست فرد خویش نخواهد از شهید اینجا

خوشم کاے بے وفا نا خوانده کردی چاک مکتوبم بعنوانے که حرف مدعا فهمیدهٔ گویا

پیمانهٔ ما پر شد و ما مست خماریم یارب که بساقی برساند خبر ما

چاک کن جامهٔ هستی که شود او پیدا تا گریبان ندرد گل نکند بو پیدا

هر بن مویم از و چشم ضیائے دارد روزنے هست درین خانه ز هر سو پیدا

من جدا چشم براهش دل بیدار جدا در جدا دیده جدا رخنهٔ دیوار جدا

بساده لوحی من کس مباد در عالم که کرده اند بوصلش اُمیدوار مرا

خدا سیاه کند روئے مرگ کز گیتی بیک دو گز کفنے کرد شرمسار مرا

عزیز مصر نیم بل عزیز ناچیزم شوم عزیز جهانے عزیز دار مرا

گر ببوئے نوازد چو متی را چه بعید در عجم تازه مشام آنکه کند مسلمان را

چون کتان صد پارهٔ دل را حیرت نظاره کرد صورت مه پارهٔ تصویر بر هر پاره کرد

غیرتش بازیچه پیش طبیبانم نخواست آنکه در دم داده بود او عاقبت چاره کرد

شیخ عهد خویش بودم می کجا و من کجا ذوق صحبتهائے میخواران مرا میخواره کرد

دیدمش صد بار و تسکین دلم حاصل نشد دیدن هر باره ام مشتاق دیگر باره کرد

در پریشان خاطری بخشیده خوش دلجمعے آنکه دل را پارهٔ و هر پاره را صد پاره کرد

ترک چشم روز مستی می زند شبخون بدل کثرت میخواری او را عاقبت میخواره کرد

داغ حسرت را بجز دل هیچ یک قابل نشد گرچه مه در نیم مه کامل شد اما دل نشد

ابر نیسان دیگر و فیض محبت دیگر است قطره بگذشت از خود و گوهر شد اما دل نشد

حسرت دیدار را میرم که بعد از کشتنم جان نه رفت از تن برون تا از نظر قاتل نشد

نگه تیر و مژه خنجر بسر از طره اش افسر سپاه ناز و خیل غمزه را شاه این چنین باشد

شب ہمہ شب بے تو لب بر بسترم ہمہ خاک بود — چشم انجم سوئے من چشمم سوئے افلاک بود

پیشش بر ناشستہ روئے جلوہ فرمودن نداشت — آں جمال پاک را در خود نگاہ پاک بود

دلم بہ غفلت شیخان بار بار لرزد — کہ ایں غزال شکاراں بخواب خرگوشند

آنانکہ سعی در طلبش چار سو کنند — اے کاشکے درون حریم دلش جستجو کنند

کاریکہ در شباب نشد کن بہ پیریش — شب آنچہ گم شود سحرش جستجو کنند

پردہ زاں جمال سوز افگنیم — داغ شمع را شمع محفل می کنیم

قرب او خواہیم دور از وے نہیم — سعی در تحصیل حاصل می کنیم

ضعفم از جنت بشارت می دہد — تکیہ بر شمشیر قاتل می کنیم

از خدائے بودہ ایم آگہ عزیز — فرق چوں در حق و باطل می کنیم

(از ہفت بند) از لب جاں بخشت آگہ چشمۂ حیواں چو گشت — از خجالت آب شد حقی تو ارث بالحجاب

گرچہ با یاد تو در خلدم ولی دل می کشد — اشتیاق منزلے کاں مسکن ماوای تست

افسر جم را شمارد کمتر از جام سفال — ہر کرا از دولت فقرت توانگر ساختند

قبلۂ کوے تو ہست امیدگاہے عالمے — یک نگہ کن سوے ما اے سویت نگاہ عالمے

رقعات | کلیات کا ضمیمہ مکتوبات ہیں۔ نثر میں بھی خواجہ صاحب کی طبیعت کی بلندی، متانت و مشکل پسندی، اطناب سے احتراز، مناسب الفاظ کا اہتمام قایم ہے۔

مقدمہ دیوان درد (اردو)

کوئی درد آشنا کہہ گیا ہے ؎

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار	زیک جامند در بزم سخن مست
ولے با بادۂ بعضِ حریفاں	خمار چشم ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم	ورائے شاعری چیزے دگر ہست

خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کے دم قدم سے "ورائے شاعری" مضامین سے اردو ادب فیض یاب ہوا ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدّعی کے واسطے دار و رسن کہاں!

عموماً اردو شاعری کا سرمایۂ ناز حسن ظاہری کے انداز ہیں جن میں حسن بیان نے چار چاند لگا دئے ہیں خواجہ صاحب کی چشم حق بیں جمال حقیقی کے جلووں سے منور تھی۔ وہی نور اُن کے کلام میں تاباں ہے میر تقی میر لکھتے ہیں: "گلچیں خیال او راگلِ معنی دامن دامن"۔ یہی وجہ ہے کہ خواجہ صاحب کے کلام کا پایہ عام شاعری سے بالاتر ہے۔

ادب اردو سید راس مسعود صاحب کے خاندان کی سرپرستی کا برسوں سے منت پذیر ہے۔ سرسید نے اردو نثر کو "بیانِ مطالب" کی قوت بخشی۔ نکتہ شناس "پوتے" نے نظم اردو کی خدمت کی۔ "انتخاب زرین" کی اشاعت سے اردو نظم کا نام روشن کیا۔ سونے میں سہاگہ ڈالا۔ اساتذہ اردو کے دواوین خوش اسلوبی سے شائع کرنے کا اہتمام کیا۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی "دیوان درد" بھی ہے شروانی دہقانی مقدمہ نگاری پر مامور ہے۔ عین سعادت کہ خواجہ صاحب کی بزم ادب میں باریابی کا ذریعہ ہاتھ آیا۔ ع

آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

خواجہ صاحب کے حالات

نام خواجہ میر۔ درد تخلص[۱] صحیح النسب حسینی سید ہیں۔ آبائی سلسلہ بارہویں[۱۲] پشت میں خواجہ بزرگ بہاؤالدین نقشبندی قدس سرہٗ سے اور چھبیسویں پشت میں حضرت امام عسکری رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے۔ مادری سلسلۂ نسب حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ تک منتہی ہوتا ہے۔ خواجہ صاحب کی دادی بھی حضرت غوث اعظم رضی اللہ عنہ کی اولاد میں تھیں۔ والد کا نام خواجہ ناصر، عندلیب تخلص۔ نانا میر سید محمد حسنی تھے۔ جو بیٹے تھے نواب میر احمد خان شہید کے۔ نواب صاحب پانی پت کے معرکہ میں نادر شاہ کے مقابلہ میں شہید ہوئے۔ جہاں کشائے نادری میں اُن کا ذکر ہے۔ میرزا رفیع سوداؔ کے ممدوح تھے۔ خواجہ صاحب کے نسب کے بیان میں تذکرہ نویسوں نے فاحش غلطیاں کی ہیں۔ ہمارا بیان خواجہ صاحب کی علم الکتاب سے ماخوذ ہے۔ مسکن پرانی دلّی میں تھا۔ اُسی محلہ میں شاہ ولی اللہ صاحب کی بھی سکونت تھی۔ "اجڑے دیار" کی آبادی و مردم خیزی۔ اللہ اکبر!۔

خواجہ ناصر صاحب کے والد بخارا سے تحصیل علم کے بعد عہد عالمگیری میں وارد ہندوستان ہوئے تھے۔

خواجہ محمد ناصر صاحب ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ابتداءً شاہی منصبداروں میں شامل تھے۔ آخر منصب ترک کرکے یادِ الٰہی میں مصروف ہو گئے۔ حضرت قبلۂ عالم خواجہ محمد زبیر سے بیعت ہیں حضرت شاہ گلشن پیر صحبت ہیں۔ شاہ گلشن کی نسبت خواجہ صاحب ایک موقع پر فرماتے ہیں "کہ اُن کے فارسی کلیات میں دو لاکھ کے قریب شعر تھے۔ فن موسیقی میں کامل مہارت تھی۔ حج سے مشرف ہوئے تھے۔ اُن کی مدح میں فرماتے ہیں ؎

---

۱ اس تخلص میں ایک خاص لطف ہے۔ حضرت شاہ گلشن حضرت شاہ محمد وحدت گل کے مرید تھے۔
اب شجرہ تخلص ملاحظہ ہو۔

شاہ محمد وحدت	گل
حضرت شاہ سعد اللہ	گلشن
خواجہ محمد ناصر صاحب	عندلیب
خواجہ میر صاحب	درد
خواجہ محمد میر صاحب	اثر

دیکھو "گل" کی جلوہ نمائی سے "گلشن" ہوا۔ گلشن نے نالۂ "عندلیب" پیدا کیا۔ نالۂ عندلیب سے "درد" جلوہ افروز ہوا۔ درد سے "اثر" ؎ این سلسلہ از طلائے ناب ست ؛ این خانہ تمام آفتاب ست

چوں مرقع صد بہار از فقر من گل می کند
در فقیری بہرہ مند از فیضِ شاہِ گلشنیم

حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی روح پر فتوح سے طریقۂ محمدیہ حاصل کیا۔ اُن کی تصنیف "نالۂ عندلیب" کا حجم اٹھارہ سو صفحے کا ہے۔ جس کو آزاد نے "ایک رسالہ" لکھا ہے۔ زبان فارسی ہے۔ قصے کے پیرایہ میں معارف بلند اور مطالب عالیہ بیان فرمائے ہیں۔ موقع موقع پر کثرت سے اشعار درج کئے ہیں۔ وجہ تصنیف خود یہ بیان فرمائی ہے کہ "اکثر آدمی مجھ سے مختلف مطالب اور مسائل دریافت کیا کرتے تھے۔ صوفی طریقت کے جویا تھے۔ مُلّا احکام شرعیہ پوچھتے تھے۔ مثلاً جبر و اختیار کا مسئلہ بعض جوان مذہب شیعہ و سنی کی تحقیق چاہتے تھے۔ بعض اخلاق ستودہ کے متلاشی تھے۔ کسی کو عشق بازی کی حکایتوں کا شوق تھا۔ اہل عقل کو عقلی پیرایہ کی جستجو تھی۔ اسی عرصہ میں حضرت قبلۂ عالم نے رحلت فرمائی۔ ادائے تعزیت کے لئے اعزّہ اور احباب کا مجمع میرے مکان پر ہوا۔ اسی موقع پر افسانہ کے پیرایہ میں "بزبان ہندی" مطالب بالا کے جوابات خواجہ صاحب نے بیان کئے۔ تین شب و روز یہ صحبت رہی۔ اپنے اپنے مطالب کے جواب پاکر سامعین پر عجیب عالم طاری ہوا۔ سامعین مصر ہوئے کہ اُس افسانہ کو قلمبند کر دوں۔ عرصہ تک ٹالا۔ آخر اشارہ غیبی پاکر فارسی زبان میں لکھ دیا۔ طریقۂ تالیف یہ تھا کہ عشا کے بعد مخصوص احباب کے روبرو زبانی بیان کرتا۔ میر درد لکھتے جاتے۔ احیاناً وہ نہ ہوتے تو بیدار میرے مرید قلمبند کرتے کبھی وہ بھی نہ ہوتے تو خود میں ہی لکھتا جاتا۔ اس طرح ۱۱۵۳ھ میں یہ کتاب ختم ہوئی۔ "نالۂ عندلیب" نام پایا میر درد صاحب نے تاریخ لکھی۔ ع "نالۂ عندلیبِ گلشنِ ماست"۔

کتاب کو پڑھو اور کمال اور بیان کی قوت کا اندازہ لگاؤ۔ خواجہ عندلیب صاحب نے ۶۶ برس کے سن میں شعبان ۱۱۷۲ھ میں رحلت فرمائی۔ رضی اللہ عنہ

حضرت خواجہ میر درد ۱۱۳۳ھ میں پیدا ہوئے۔ تحصیل علم اپنے والد ماجد سے کی۔ تفصیل تحصیل نظر سے نہیں گزری۔ لیکن تصانیف شاہد ہیں کہ نقلی اور عقلی علوم میں کامل تھے۔ خصوصاً علم الکتاب کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف اور معقولات میں پوری مہارت حاصل تھی۔ ابتدائے شباب میں

دنیا داری رہی۔ جاگیر اور معاش کے اہتمام میں پوری تگ و دو کی۔ امرائے شاہی اور مقربان بارگاہ کے ناز اٹھائے۔ ۲۸ برس کی عمر میں جذبۂ حق نے اپنی طرف کھینچا۔ سب کو چھوڑ کر اُدھر جھکے۔ لباس درویشی پہن کر آستانہ جاناں پر سر جھکا دیا۔ ۳۹ برس کی عمر میں خواجہ عندلیب صاحب کی رحلت کے بعد مسند نشین ارشاد ہوئے اور آخر دم تک قدم نہ ہٹا۔ مصیبتوں کے دریا چڑھے اور اُترے۔ یہاں پائے استقامت کو جنبش بھی نہ ہوئی۔ انہی مصائب میں "حملۂ نادری" بھی تھا۔ خواجہ صاحب بارہویں [12] صدی ہجری کے اولیائے کبار سے ہیں۔

تصانیف کا شوق ابتدائے عمر سے تھا اور آخر تک رہا۔ پندرہ برس کی عمر میں بحالۂ اعتکاف "رسالۂ اسرار الصلوٰۃ" لکھا۔ ۲۹ برس کی عمر میں رسالہ "واردات" لکھا۔ رسالہ مذکور ۱۱۷۲ھ میں ختم ہوا۔ اس کے بعد ایک مدت تک اس کی شرح "علم الکتاب" لکھی۔ علم الکتاب کے بعد "نالۂ درد" لکھا۔ جو ۱۱۹۰ھ میں پورا ہوا۔ میر اثر نے تاریخ کہی۔ ع نالۂ عندلیب دردِ من ست۔ نالۂ درد کے بعد ۱۱۹۲ھ میں رسالہ "آہ سرد" ختم ہوا۔ تاریخ از میر اثر ع "آہ سرد ما نماید گرمیٔ رفتار ما"۔ آہ سرد کے بعد "درد دل" کی نوبت آئی۔ اسی کے ساتھ ساتھ "رسالہ شمع محفل" لکھا گیا۔ دونوں کو ساتھ لکھنے کی وجہ یہ تحریر فرمائی ہے کہ "نالۂ درد اور آہ سرد" کی تالیف کے بعد جب رسالہ "درد دل" لکھنا شروع کیا تو خیال آیا کہ اس کے بعد ایک رسالہ "شمع محفل" کے نام سے لکھوں گا۔ مگر چونکہ سن باسٹھ [62] برس کا ہو چکا تھا۔ فرصت مفقود۔ لہٰذا دونوں کو ساتھ ساتھ لکھنا شروع کر دیا۔ صفر ۱۱۹۹ھ میں دونوں رسالے ختم ہوئے۔

فن موسیقی میں خواجہ صاحب کو پورا دخل تھا۔ میاں فیروز خاں گویّوں کا استاد حاضر ہو کر فن کے نکتے حل کرتا۔ دوسری اور چوبیسویں [24] تاریخ کو ہر مہینے میں ایک مجلس سماع مکان پر ہوتی۔ اس طرح کہ قوال بلا طلب حاضر ہو جاتے اور جب تک اُن کا دل چاہتا سناتے اور چلے جاتے۔ نہ بلائے جاتے نہ روکے جاتے۔ سماع کی نسبت خواجہ صاحب فرماتے ہیں "سماع من من جانب اللہ است وحق بریں امر ہمہ وقت گواہ کہ خود بخود گویندگان می آیند و ما دام کہ می خواہند می سرایند۔ نہ آنکہ فقیر اینہا را می طلبد۔ وشنیدن سرود را چون دیگراں عبادت می فہمد بلکہ ہماں معاملہ نہ انکار می کنم نہ این کار

می کنم در پیش است و عقیدۂ من ہمان ست کہ عقیدۂ بزرگاں من ست" (نالۂ درد ۳۷) ۲۴ صفر ۱۱۹۹ سنہ ہجری کو انتقال فرمایا۔ اور اپنے والد ماجد کے پہلو میں دفن ہوئے تاریخ وفات از بیدار ہے

آفتاب امت دین محمد خواجہ میر — مظہر علم علی و وارث اثنا عشر
حضرت دردآنکہ از درد فراق عندلیب — نالۂ با ناصر نفس می کرد بر دلہا اثر
حیف کز دنیا بعمر شصت و ہشتم سالگی (۶۸) — جانب اعلا علیین او کردہ سفر
بندۂ بیدار کاں ہست از غلامانش یکے — جست از وقت وصال و روز ماہش چوں خبر
یک پہر شب ماندہ ہاتف کرد واویلا و گفت — ہائے بود آدینہ و بست و چہارم (۲۴) از صفر

اس تاریخ میں خواجہ صاحب کی عمر اڑسٹھ (۶۸) برس کی لکھی ہے۔ حالانکہ خود خواجہ صاحب کے بیان سے چھیاسٹھ (۶۶) برس معلوم ہوتے ہیں، جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ مزار شہر پناہ کے باہر شاہ جی کے تالاب کے متصل ہے۔ میں بھی فاتحہ خوانی سے مشرف ہوا ہوں۔ والحمد للہ علیٰ ذٰلک۔ نزع میں یہ مصرع خواجہ صاحب کی زبان پر تھا۔ ع "درد ہم جاتے ہیں پر چھوڑے اثر جاتے ہیں۔ میر اثر خواجہ صاحب کے بعد سجادہ نشیں ہوئے۔ یہ سلسلہ خواجہ محمد نصیر متخلص بہ "رنج" تک جاری رہا۔ جو خواجہ صاحب کے نواسے تھے۔ خواجہ صاحب کے صاحبزادے ضیاء الناصر تھے۔ تخلص "الم" تھا۔

تصانیف | بیان بالا سے خواجہ صاحب کی تصانیف کے یہ نام معلوم ہوئے۔ اسرار الصلوٰۃ۔ رسالہ واردات۔ علم الکتاب۔ نالۂ درد۔ درد دل۔ آہ سرد۔ شمع محفل۔ ان کے علاوہ دیوان فارسی۔ دیوان اردو۔ جملہ تصانیف بالا شائع ہو چکی ہیں۔ اسرار الصلوٰۃ۔ چھوٹا سا رسالہ ہے جس میں نماز کے ارکان ہشتگانہ کے اسرار "سر سر" کر کے بیان فرمائے ہیں۔ واردات یہ ایک سو گیارہ واردات کا مجموعہ ہے۔ ہر وارد کا نام جداگانہ ہے۔ مثلاً وارد اول "فاتح الواردات"۔ وارد ثانی "نور من نور اللہ" علیٰ ہٰذا القیاس۔ وجہ تالیف "واردات" کی یہ ارشاد فرمائی ہے کہ اکثر اوقات غلبۂ حالات میں (جو عبارت ہے شدت مشاہدہ کی حالت سے اور استیلاء تاثر سے) جو معانی دل پر منکشف ہوتے تھے وہ رباعیوں کی صورت میں منظوم ہو جاتے تھے۔ جب یہ رسالہ تمام ہو گیا تو ۱۱۷۲ھ میں خواجہ عندلیب

صاحب کی خدمت میں پیش ہوا اور پسند فرمایا گیا۔ رسالہ واردات میں معرفت و حقیقت کے مطالب عالیہ بیان فرمائے گئے ہیں۔ ہر وارد کا ایک دیباچہ ہے۔ اول و آخر رباعی ہے۔ درمیان میں شارحانہ نثر۔ نمونہ وارد اوّل سے

رباعی اوّل

در خلوت ما کہ رشک صد انجمن است — با خویشتن زباں چو شمع گرم سخن ست
عالم آئینہ حسانہ است و ما را — ہر سو کہ اشارت ست با خویشتن ست

رباعی آخر کی

از فیض تو ہر خرابہ معمور آمد — وز لطف تو ہر غمزدہ مسرور آمد
بخت سیہش رخت ز عالم بربست — ہر سایہ کہ زیر سایۂ نور آمد

وارد دوم - رباعی آخر کی سے

ہستی و عدم خرابِ میخانۂ اوست — امکان و وجوب مستِ پیمانۂ اوست
چشم دل تو اگر حقیقت بین ست — ہر ذرۂ خلق روزنِ خانۂ اوست

"علم الکتاب" رسالۂ بالا کی شرح ہے۔ جو میر اثر کی فرمائش سے لکھی گئی۔ باریک خط کے بڑے بڑے صفحے ۸۴۰ ہیں۔ خواجہ صاحب کے علم الٰہی کا تبحر اور کمالات معرفت کی حقیقت اس تصنیف سے واضح ہوتی ہے۔ جا بجا عربی طویل عبارتیں بے تکلف غایت بلاغت کے ساتھ مثل چشمہ رواں ہیں۔ مطالب حقہ کا ہجوم ہے۔ آیات اور احادیث اس روانی اور آسانی سے ہر موقع پر درج ہوتی ہیں کہ پڑھنے والے کا قلب اُن کے انوار سے پُر نور و معمور ہو جاتا ہے۔ سلوک کے مسائل کو آیات و احادیث سے مجتہدانہ اور عارفانہ قوت کے ساتھ ثابت و مدلل فرمایا ہے۔ "نالۂ درد" میں فرماتے ہیں کہ "نالۂ درد" اور "علم الکتاب" طریقۂ محمدیہ کے سلوک کے لئے کافی ہیں۔ یہ کتاب متانت و قوتِ تحریر میں شاہ ولی اللہ صاحب کی بہترین تصانیف کے ہم پایہ ہے۔

"نالۂ درد" "علم الکتاب" کے بعد لکھا گیا۔ دیباچہ میں فرماتے ہیں۔ "علم الکتاب" کے ختم ہونے پر جو

مطالب "قلب حیران" پر تراوش کرتے تھے اُن کو میر اثر جمع کرتے گئے۔ جب مجموعہ تیار ہو گیا "نالۂ درد" نام رکھا۔" اس میں لفظ ناصر کے ہم عدد ۳۴۱ نالے ہیں۔ یہ رسالہ سوز و گداز اور ولولۂ شوق سے معمور ہے چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

شمعِ دردِ دل ست نالۂ درد درد می بار دازرسالۂ درد

"آہ سرد" اس میں بھی ۳۴۱ سرد آہیں ہیں۔ "نالۂ درد" و "آہ سرد" دونوں مل کر گویا ایک کتاب ہیں۔ "درد دل"، "نالۂ درد"، "آہ سرد"، دونوں ختم ہوگئے مگر درد دل بدستور تھا۔ ناچار "دردِ دل" لکھا۔ اس میں ۳۴۱ درد ہیں۔ ہر درد میں مطالب عرفان کی شرح ہے۔

"شمع محفل" اس میں ۳۴۱ نور ہیں۔ اور ہر نور معارف بلند سے معمور۔ رسالہ کا آغاز خواجہ صاحب کی عمر کے باسٹھویں سال میں ہوا تھا۔ چھیاسٹھ برس کی عمر تک درد دل کے ساتھ اس کی تحریر جاری رہی۔ اس رسالہ کا خاتمہ حیرت خیز اور واقعہ عبرت انگیز ہے۔ خاتمہ میں فرماتے ہیں۔ "اب میری عمر کا چھیاسٹھواں سال ہے اور یہ رسالہ ختم ہو رہا ہے۔ بمبارک اسم اللہ ۶۶ ہیں۔ صحیفہ واردات ۱۱۷۲ھ میں ختم ہوا تھا۔ اُسی سال والد عالی مرتبہ نے چھیاسٹھ برس کی عمر میں رحلت فرمائی تھی حسن اتفاق کہ اس رسالہ کا خاتمہ اسال ہوا جو میرا سال ارتحال ہے یہ رسالہ۔ رسالہ شمع محفل کے ساتھ ۱۱۹۰ھ میں شروع ہوا تھا ۱۱۹۹ھ میں ختم ہو رہا ہے۔ ظاہرا یہ خاتمہ توام ہے سکوتِ خاتمہ بالخیر راقم رسالہ سے۔" خواجہ صاحب کے کلام کا خلاصہ ختم ہوا۔ دیکھو اسی صفر کی ۲۴ تاریخ کو خواجہ صاحب نے رحلت فرمائی۔ یہ کیا تھا۔ سائنس کے رمز شناس سوچیں۔ "شمع محفل" کا نور (۳۲۹) اس راز پر روشنی ڈالتا ہے۔ جہاں فرماتے ہیں کہ مجھ سے وعدہ فرمایا گیا ہے کہ سال ارتحال و حال انتقال تجھ کو پیشتر سے بتلا دیا جائے گا۔ برید اجل ناگہاں نہیں پہنچے گا۔ چاروں مذکورۂ بالا رسالوں میں یہ التزام ہے کہ سوائے اپنے اشعار فارسی کے کسی اور شاعر کا کلام درج نہیں کیا۔

"دیوان فارسی" دیوان فارسی مختصر ہے ۱۳۰۹ھ میں مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوا ہے۔ غزلیں ہیں رباعیاں ہیں۔ مخمس وغیرہ بھی ہیں۔ زبان کا وہی انداز ہے جو فارسی شعراء ہند خان آرزو وغیرہ کا ہے۔

معرفت کی قوت کے لحاظ سے بہت بلند پایہ ہے ایک شعر سن لیجئے ؎

شد منشأ ظہور دو عالم وجود ما
جوشید نشأتین ز جوش شراب ما

اس شعر سے زور کلام اور قوت نسبت کا اندازہ کیجئے۔ اگر "نالۂ درد" وغیرہ کے اشعار بھی شامل دیوان ہو جائیں تو ایک ضخیم مجموعہ مرتب ہو جائے۔

نمونۂ غزل فارسی

جوش زد بادۂ توحید بہ میخانۂ ما — بحر دارد بہ گرہ قطرۂ پیمانۂ ما
بیخودی پردہ کشائے حرم دل باشد — بستہ احرام رہش لغزش مستانۂ ما
دیدہا آئینہ باشد بامیدے کہ کند — جلوۂ یار قدم رنجہ بکاشانۂ ما
زینت و زیب تو ناں باد مبارک بزناں — ساز دنیا نہ کند ہمت مردانۂ ما
منت طبع رسا درد بمنت نہ کشم — آشنا کردہ بہ معنی بیگانۂ ما

(دیگر)

آئینہ ایم فرما تا در حضور آئیم — ہر جلوۂ کہ داری در خود ترا نمائیم
عرفان تیز بین را حیرت گرفت آخر — اکنوں بنور ایماں چشم یقیں کشائیم
از آشنائی ما بیگانگی ست او را — بیگانہ وار ہستیم از بسکہ آشنائیم
ما چشم نقش پائیم دید قصور داریم — گو در رہش فتادیم اما برہ نمائیم
او دلبر و دل آزار ما دل ز دست دادہ — یا رب چہ پیش آمد آمادۂ بلائیم
ما از وفا بہ پرسیم تو از جفا نگوئی — تا چند آزمائی تا چند آزمائیم
یاران ز ہر بانی دانند ہر چہ دانند — ما خوب می شناسیم اے درد آنچہ مائیم

متفرق

در د سلطان بحر و بر گشتم — کہ لب خشک و چشم تر دارم
صبح روز فراق شام بود — اے شب وصل شام تو سحر ست
فروغ ماہ در شبہا تواں دید — بہ ہندستاں نماید نور ایماں

در دست چراغے کہ دریں راہ بگیرم   آئینہ بہ کف از دل آگاہ بگیرم

" دیوان اردو" اس کا بیان آگے آتا ہے۔

ادب اُردو

خواجہ صاحب اردو شعراء کے تیسرے دور میں ہیں۔ میر و مرزا معاصر تھے۔ دور سوم کے شعراء کی نسبت آزاد آب حیات میں لکھتے ہیں" زبان اردو ابتدا میں کچا سونا تھی۔ ان بزرگوں نے اُسے کدورتوں سے پاک صاف کیا۔ اور ایسا بنا دیا ہی کہ جس سے ہزاروں ضروری کام اور آرائشوں کے سامان حسینوں کے زیور بلکہ بادشاہوں کے تاج و افسر تیار ہوتے ہیں۔.......
یہ اپنی صنعت میں کچھ کچھ تکلف بھی کریں گے مگر ایسا جیسے گلاب کے پھول پر شبنم یا تصویر پر آئینہ۔ ان کا تکلف بھی اصل لطافت پر کچھ لطف زیادہ کرے گا۔ اس کی خوبی پر پردہ نہ ہوگا۔ تم میر صاحب اور خواجہ میر درد کو دیکھو گے کہ اثر میں ڈوبے ہوں گے"۔ آگے چل کر لکھتے ہیں" اپنے استادوں اور بزرگوں سے یہی سنا کہ مرزا جان جاناں۔ سودا۔ میر۔ خواجہ میر درد۔ یہ چار شخص تھے کہ جنھوں نے اُردو کو خراد پر اُتارا ہے"۔

کلام بالا سے خواجہ صاحب کے ادبی صفات یہ واضح ہوئے۔ زبان کو پاک اور کلام کو آراستہ کیا۔ خراد اُتارا۔ اس سے بھی بڑھ کر شہادت میر تقی میر اور میر حسن کی ہی۔ میر صاحب جب اکبرآباد سے دلی آئے تو خواجہ صاحب کی خدمت میں شرف اندوز ہوتے رہے۔ اُن کے مشاعرہ میں شریک ہوکر دارالخلافہ کے مذاق سے آشنا ہوئے۔ اور اہل زبان کی صحبت سے فیض حاصل کرنے کا موقع اُن کو ملا۔ میر صاحب کی ترقی دیکھ کر خواجہ صاحب فرماتے ہیں" میر تقی تو میر مجلس خواہی شد"۔ جب وہ مشاعرہ خواجہ صاحب کے یہاں بند ہوگیا۔ تو میر صاحب نے اُن کی فرمائش سے اپنے یہاں مقرر کیا۔ اپنے مشاعرہ کی نسبت کہتے ہیں" واللہ کہ بذات ہمیں بزرگ ست"۔ میر صاحب کو صاف اقرار ہی کہ اُن کا کمال خواجہ صاحب کے پاک انفاس کا ممنون کرم ہی۔ چنانچہ لکھتے ہیں" الحمدللہ والمنۃ کہ حرف آں سر سلسلۂ خدا پرستان مؤثر افتاد۔ باطن آں خضر قافلۂ اہل عرفان کہ از ظاہرش ظاہر پرست زود کار کرد (دیکھو تذکرہ میر تقی حالات خواجہ صاحب) میر حسن نے بھی ابتدائے ذوق شاعری کی پختگی خواجہ صاحب کی

صحبت میں حاصل کی۔ کریم الدین لکھتے ہیں "بچپن سے میر حسن کو شوق نظم کا تھا۔ جب اس شوق کی ترقی چاہی خواجہ میر درد کی صحبت میں رہے۔ اسی فیض صحبت سے وہ اپنے ارادہ پر مضبوط اور قایم رہے۔" (ترجمہ گارساں دی تاسی) خود میر صاحب اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ "میرے استاد میر ضیا رہیں مگر مجھ سے اُن کے طرز کا کما حقہ نباہ نہ ہو سکا۔ اس لئے میں نے دوسرے بزرگوں کی (مثل خواجہ میر درد۔ میرزا رفیع سودا۔ اور میر تقی میر) پیروی کی۔" خواجہ صاحب کی خصوصیت خاص یہ ہی کہ اردو شاعری کے قالب میں حقیقت و معرفت کی روح پھونکی۔ مردہ جسم کو زندہ کیا۔ نمایاں وصف یہ ہی کہ اردو ادب میں مذاق صحیح پیدا کیا۔ میر تقی میر اور میر حسن اُن کے صحبت یافتہ ہیں۔ اثر اور قایم ان کے شاگرد ہیں۔ نیز فراق۔ بھکاری داس۔ عزیز نثار۔ الم۔ صاحبزادے ہیں۔ ایک قریبی رشتہ دار شاعر تخلص ہیں۔

میر اثر کی مثنوی "خواب و خیال" افسوس ہی کہ اب تک دستیاب نہیں ہوئی مگر جو اشعار اس کے محفوظ ہیں اُن سے اور خواجہ حالی کی شہادت سے عیاں ہی کہ مثنوی مذکورہ ایک نمونہ تھی حسن ادب کا۔ آب حیات میں آزاد نے تصریح کی ہی کہ میر حسن جو انداز بیان دلّی سے لائے تھے وہ اُن کے خاندان نے آخر تک قایم رکھا۔ چنانچہ میر انیس کہہ دیتے تھے کہ "یہ میرے گھر کی زبان ہی۔ حضرات لکھنؤ اس طرح نہیں فرماتے۔" نہ صرف یہ بلکہ انداز گفتگو۔ طرز معاشرت میں بھی آخر تک امتیاز قایم رہا۔ جن صاحبوں نے میر نفیس اور میرزا اوج کو دیکھا ہی وہ میرے بیان کی تصدیق کریں گے۔ اب یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مثنوی خواب و خیال۔ مثنوی بدر منیر۔ اور مراثی انیس سے جو فخر و شرف ادب اردو کو حاصل ہوا وہ خواجہ صاحب کی فیض تربیت کا ممنون ہی۔

خواجہ صاحب شاعری کی نسبت ایک موقعہ پر فرماتے ہیں (اس سے اندازہ کرو کہ کیسی شاعری کا مفہوم خواجہ صاحب کے ذہن میں تھا) "شاعری ایسا کمال نہیں جس کو مرد آدمی اپنا پیشہ بنالے۔ اور اُس پر ناز کرے۔ البتہ انسانی ہنروں میں سے ایک ہنر ہی بشرطیکہ صلہ حاصل کرنے اور دربدر پھرنے کا آلہ نہ بنے۔ اور مدح اور ہجو دنیا کمانے کے لئے نہ کہے۔ ورنہ گداگری کی ایک صورت ہی اور طماعی اور بدنفسی کی دلیل۔" (نالۂ درد - ٢٨) ایک اور موقع پر فرماتے ہیں۔ "اس سے پہلے بہت ہی کم آدمی ایسے نظر آسکتے تھے

جو سلسلۂ جنبانِ سخن" ہوں آپ کہیں دوسروں سے سنیں۔ دل بے اختیار چاہتا تھا کہ دل پر جو معارف تازہ وارد ہوتے تھے اُن کو سخن فہم نکتہ سنجوں کے سامنے بیان کروں اور اُن سے ہم کلام ہوں۔ یہ نتیجۂ انسانیت ہے اور نشانِ آدمیت۔ کلام مربوط عجیب لذت رکھتا ہے اور دل کو شگفتہ کر دیتا ہے۔ عَلّمہ البیان کا یہی خلعت ہے جو خلیفۃ اللہ کو پہنایا گیا ہے۔ پاک فرشتوں کی مسجودیہ مشت خاک اسی نعمت کی بدولت ہوئی ہے اب یہ معنی فہم انسانوں سے زمانہ بالکل خالی ہو چکا ہے بعض جہلا توحید اس انداز سے بیان کرتے ہیں جو عین الحاد ہے۔ بعض جنگ جو مذہب و ملّت کی باتیں اس طرح کرتے ہیں جو منتشار فساد ہو جاتی ہیں۔ کچھ خام طبع باہم مل کر جوشِ اخلاق کا اظہار کرتے ہیں اور بیہودہ گوئی کے معرکے گرم کرتے ہیں۔ عقل و فہم کہاں۔ خدا ایسی صحبتوں کے شر سے محفوظ رکھے۔"

خود اپنی شاعری کی نسبت فرماتے ہیں۔ "فقیر کے اشعار باوجود رتبۂ شعری کی رعایت کے پیشۂ شاعری اور اندیشۂ ظاہری کے نتائج نہیں۔ بندہ نے کبھی شعر بدوں آمد کے، اہتمام آورد سے موزوں نہیں کیا۔ اور بہ تکلف کبھی شعر و سخن میں مستغرق نہیں ہوا کبھی کسی کی مدح یا ہجو نہیں لکھی۔ کبھی فرمایش یا آزمایش سے متاثر ہو کر شعر نہیں کہا۔" (علم الکتاب صفحہ ۹۱) عشقِ مجازی کا مفہوم خواجہ صاحب کے یہاں معمولی سطح سے بلند تر ہے۔ فرماتے ہیں۔ "بوالہوسی عشقِ مجازی نہیں ہے۔ اور اس مجاز کو حقیقت کی راہ نہیں کہہ سکتے۔ پیر کی محبت وہ عشقِ مجازی ہے جو مطلوبِ حقیقی تک پہنچا دیتی ہے ؎

دردمن میخواستم دردِ دلے   وردِ سر افزود از عشقِ بتاں

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں۔ "میں کبھی رسمی عشق بازی میں گرفتار نہیں ہوا لیکن دلِ عاشقانہ صادقانہ" پایا ہے محبوبوں سے تو کبھی سابقہ نہیں رہا البتہ دوستوں کی صحبت بے تکلفانہ میں وقت گذارا ہے۔ دوستانِ ہمدم جب جمع ہوں اور "محفل زندہ دلی" گرم فرمائیں اس "مردہ دل افسردہ خاطر" کو بھی یاد کرلیں اور فاتحہ خیر سے شاد۔"

مضامین بالا سے واضح ہوا ہوگا کہ خواجہ صاحب کی شاعری کی نوعیت اور تخیّل شعر کی حقیقت کیا تھی خواجہ صاحب کا "دیوان اردو" مختصر ہے۔ عام طور پر جو مطبوعہ نسخے ملتے ہیں بہت غلط ہیں۔ اسی

لئے جناب سید راس مسعود صاحب کو صحیح نسخے کا خیال پیدا ہوا۔ اور بہت صحیح پیدا ہوا۔ حیدرآباد میں ایک سے زائد قلمی دیوان دردؔ کے نسخے میرے ہاتھ آئے۔ سید صاحب کی فرمائش سے میں نے سید معین الدین صاحب شاہ جہاں پوری (مترجم نپولین اعظم وغیرہ) کو تصحیح و مقابلے کی تکلیف دی۔ اہل ادب کو ممنون ہونا چاہئے کہ نہایت محنت و دیدہ ریزی سے انھوں نے ایک صحیح نسخہ مرتب فرمایا اُسی نسخہ سے یہ دیوان طبع ہوا ہے۔ طبع کے بعد جب میں حیدرآباد سے حبیب گنج آیا تو کتاب خانہ میں ایک قدیم مطبوعہ نسخہ موجود ملا جو دہلی کے مطبع مصطفائی میں ۱۲۶۸ھ میں اہتمام سے طبع ہوا تھا۔ یہ نسخہ بہت صحیح ہے۔ اور متعدد صحیح نسخوں کے مقابلے سے چھاپا گیا تھا۔ میں نے اس نسخے سے بھی مقابلہ کرنے کی خواہش سید معین الدین صاحب سے کی اور انھوں نے مہربانی سے محنت کر کے مقابلہ کیا۔ یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ حالیہ مطبوعہ نسخہ قدیم سے بالکل مطابق نکلا۔ صحت میں بھی اور مقدار کلام میں بھی۔

خواجہ صاحب کے کلام میں بعض ایسے الفاظ ضرور ہیں جو اب متروک ہو چکے ہیں۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ جو زبان آج فصیح سمجھی جاتی ہے کل اُس کے کتنے الفاظ غیر فصیح اور نامانوس مانے جائیں گے۔ لیکن اسی کے ساتھ معرفت اور حقیقت کا رنگ کلام کی پاکیزگی تخیل کی بلندی درد کی چاشنی سوز و گداز کا کندن ہر جگہ عیاں ہے تاباں ہے۔ اشعار ذیل اس دعوے کے شاہد ہیں ؎

مقدور ہمیں کب ترے وصفوں کی رقم کا — حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا

جس مسند عزت پہ کہ تو جلوہ نما ہے — کیا تاب گزر ہووے تعقل کے قدم کا

بستے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہمن — آباد ہے تجھ سے ہی تو گھر دیر و حرم کا

ہے خوف اگر جی میں تو ہے تیرے غضب کا — اور دل میں بھروسا ہے تو تیرے ہی کرم کا

مانند حباب آنکھ تو اے دردؔ کھلی تھی

کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا

مژگان تر ہوں یا رگ تاکِ بُریدہ ہوں — جو کچھ کہ ہوں سو ہوں غرض آفت رسیدہ ہوں

کھینچے ہے دور آپ کو میری فروتنی — افتادہ ہوں پہ سایۂ قد کشیدہ ہوں

ہر شام مثل شام ہوں میں تیرہ روزگار   ہر صبح مثل صبح گریباں دریدہ ہوں

کرتی ہے بوئے گل تو میرے ساتھ اختلاط   پر آہ میں تو موج نسیم وزیدہ ہوں

چاہے ہے یہ مری تپش دل کہ بعد مرگ   کنج مزار میں بھی نہ میں آرمیدہ ہوں

اے دردؔ جا چکا ہے مرا کام ضبط سے
میں غمزدہ تو قطرۂ اشک چکیدہ ہوں

ہر طرح زمانے کے ہاتھوں سے ستم دیدہ   گر دل ہوں تو آزردہ خاطر ہوں تو رنجیدہ

ہم گلشن دوراں میں اے خفتگی طالع   سر سبز تو ہیں لیکن جوں سبزۂ خوابیدہ

اے شور قیامت رہ اودھر ہی میں کہتا ہوں   چونکے ہے ابھی یاں سے کوئی دل شوریدہ

اوروں سے تو ہنستے ہو نظروں سے ملا نظریں   ایدھر کو نظر کوئی پھینکی بھی تو دزدیدہ

مجھ پر تو یہ عقدہ ہی تو کھول صبا یارے   زلفوں نے کسے بھیجا یہ نامۂ پیچیدہ

بدخواہ سبھی عالم گو ہووے تو ہو لیکن   یارب نہ کسی کے ہوں دشمن یہ دل و دیدہ

کرتا ہے جگہ دل میں جوں ابروئے پیوستہ
اے دردؔ یہ تیرا تو ہر مصرعۂ چسپیدہ

کاش تا شمع نہ ہوتا گزر پروانہ   تم نے کیا قہر کیا بال و پر پروانہ

شمع کے صدقے تو ہوتے ہی بھی کیوں اٹھا لے   پھر جو دیکھا تو نہ پایا اثر پروانہ

کیوں اسے آتش سوزاں میں لیے جاتی ہے   سوجھتا بھی ہے تجھے کچھ نظر پروانہ

ایک ہی جست میں لی منزل مقصود اس نے   راہ رو رشک کی جا ہے نظر پروانہ

شمع تو جل بجھی اور صبح نمودار ہوئی
پوچھوں اے دردؔ میں کس سے خبر پروانہ

اس کی بہار حسن کا دل میں ہمارے جوش ہے   فصل بہار جس کے ہاں ایک یہ گل فروش ہے

غارت دل نے کر دیا اپنے حواس میں خلل   حسن بلائے چشم ہے نغمہ وبال گوش ہے

ہوئے تو درمیاں سے اپنے تئیں اٹھائیے ۔۔۔ بار نہیں ہے اور کچھ ۔ سر ہی وبالِ دوش ہے
نالہ و آہ کیجئے خون جگر ہی پیجئے ۔۔۔ عہدِ شباب کہتے ہیں موسمِ نائو نوش ہے
خیر تجھے جو چاہیئے بدرقۂ جنوں نہ چھوڑ ۔۔۔ ہم نے جہاں کی سیر کی ۔ رہزن خلق ہوش ہے
غیرِ ملال زاہدا ۔ کیا ہے طریق زہد میں ۔۔۔ دل ہو شگفتہ جس جگہ ۔ کوچۂ میفروش ہے

اپنے تئیں تو کام کچھ خرقہ و جامہ سے نہیں
درد اگر لباس ہے دیدۂ عیب پوش ہے

آفت جان و دل تو یاں وہ بتِ خود فروش ہے ۔۔۔ پہلے ہی جس کے پیشکش ۔ صبر و قرار و ہوش ہے
دل کو سیاہ مت کر ۔ کچھ بھی سمجھے جو ہوش ہے ۔۔۔ کہتے ہیں کعبہ اس کو ۔ اور کعبہ سیاہ پوش ہے
کس کی یہ ہوتی ہے صبا ۔ گفت و شنید باغ میں ۔۔۔ غنچے سبھی دہان ہیں ۔ گل بھی تمام گوش ہے
آتشِ گل جنوں مرا گرم کرے سو یہ نہیں ۔۔۔ سینہ ہمیشہ آگ ہے ۔ دل میں سدا ہی جوش ہے
حادثۂ زمانہ کیا تیری جفا سو کیا بلا ۔۔۔ ہم کو سپہر مت ڈرا نیش بھی یاں تو نوش ہے
ہم نے تو ایک معصیت چاہی چھپے نہ چھپ سکی ۔۔۔ اپنے گناہ کو ترا عفو ہی پردہ پوش ہے
آہ کہیں یہ ناتواں حال کرے سو کیا بیاں ۔۔۔ منہ پہ ہے مہرِ خامشی دل میں بھرا خروش ہے
دور نہیں ہوا ہمیں رنجِ شعور ساقیا ۔۔۔ اک دو سہ جام اور بھی باقی ابھی تو ہوش ہے

محنت و رنج و غم سے یاں درد نہ جی چھپائیے
بار سبھی اٹھائیے جب تئیں سر ہے دوش ہے

آخر میں یہ لکھ دینا ضروری ہے کہ جو حالات اس مقدمے میں لکھے گئے ہیں اُن کا ماخذ خود خواجہ صاحب کی تصانیف ہیں ۔ بعض حالات یا مضامین ایسے بھی درج ہوئے جو دوسری کتابوں سے ماخوذ ہیں ۔ اُن کا حوالہ موقع پر دے دیا گیا ہے ۔

میں ممنون ہوں کہ سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی سے قیمتی مدد ملی ہے ۔ ناشکری ہوگی اگر میں نہ لکھوں کہ خواجہ صاحب کی نادر اور نایاب تصانیف (علم الکتاب و نالۂ درد وغیرہ) اور خواجہ عندلیب

صاحب کی نالۂ عندلیب کی اشاعت کی سعادت نواب سید نورالحسن خاں مرحوم بھوپالی کو نصیب ہوئی۔ یہ دین و علم کی ایسی بیش بہا خدمت تھی جو ہمیشہ اہل دل کو اُن کا ممنون رکھے گی۔ جزاکاللہ خیراً۔

اللہ بس۔ باقی ہوس

۱۵ رمحرم الحرام ۱۳۴۲ھ
۲۹ راگست ۱۹۲۳ء
یوم چہارشنبہ

قصائدِ مظہرؒ

معلوم ہوتا ہے کہ خود ظہور و خفا بھی کسی مخفی قانون کے تابع ہے۔ حضرت شیخ دہلوی نے تذکرۃ المصنفین میں دیوان مظہر کو کمیاب بلکہ نایاب لکھا ہے۔ (اورنٹیل کالج میگزین مئی ۱۹۳۵ء) یہ آج سے تین سو برس پہلے کا واقعہ ہے۔ صدیوں تک گوشۂ گمنامی میں آسودہ رہ کر مظہر کا کلام اب ظہور پزیر ہوتا ہے۔ اور اس وقت کے ساتھ کہ اسی صوبے کے دو شہروں میں یہ یک وقت اُس کے ظہور کا سامان ہوا۔

لکھنؤ میں پروفیسر وحید مرزا صاحب نے حکیم آشفتہ صاحب کے نسخے پر تبصرہ کر کے حق تحقیق ادا کیا۔ اسی زمانہ میں مولوی ابوبکر شیث صاحب ناظم دینیات نے مسلم یونیورسٹی میں ازراہ معارف پروری اُن قلمی نسخوں کی فہرست نویسی شروع کی جو ہنوز تشنۂ توجہ تھے۔ اسی سلسلہ میں ایک قصائد فارسی کا نسخہ سامنے آیا جس کے مؤلف کا نام پردۂ خفا میں تھا اور نام سے خالی تھی۔ اندرونِ کتاب بھی تفتیش کی حاجت تھی۔ براہ کرم ناظم صاحب نے مجھ پر اعتماد کر کے نسخہ تحقیقِ مؤلف کے لئے عنایت کیا۔ کسی قدر کاوش کے بعد مظہر تخلص ملا۔ مصرع (مظہر بندۂ کمتر کہ میراثِ پدر دارد) قصیدۂ ۱۵۔ دو جگہ اور یہ تخلص نظر سے گزرا۔ ترکیب بند ۱۴۔

مظہر در ثنا خوانی چو دُر افشانست در پایت کنونت از سر اخلاص دست اندر دُعا کردہ

قصیدۂ نمبر ۴۴۔

از زبانِ مُطہّرِ مسکیں
شاہ را ایں دعا مُبارکباد

ایک جگہ کاتب نے تخلص صاف مظفرؔ لکھ دیا ہے (دیکھو قصیدہ ۔ ۴۴) ظاہر ہے کہ یہ قلم کی لغزش ہے۔ شوق مزید تفتیش کا متقاضی ہوا۔ اپنے یہاں کے محدود وسائل سے کام لینا شروع کیا۔ یہ کاہش جاری تھی کہ ماہ مئی ۱۹۳۵ء کا اورنٹیل کالج میگزین پہنچا۔ اس میں پروفیسر وحید مرزا صاحب کا مضمون مع فاضل مُدیر کے ضمیمے کے دیدہ افروز و سبق آموز ہوا۔ جو کچھ میں مزید مواد جمع کر سکا پیش کرتا ہوں۔ اس موقع پر مشہور مصرع[1] بدلنا ہوگا۔ ع نقاشِ نقشِ اول بہتر کشید از من

قصائدِ مُطہّرؔ کا نسخہ | تقطیع اوسط ۹×۶۔ شعر فی صفحہ ۱۷ صفحات ۳۲۸۔ اشعار کم و بیش ۵۳۷۶ اوّل و آخر ناقص۔ خط جلی۔ خطاطی کی شان لئے ہوئے۔ دوسرا صفحہ پورا مُطلّا و مذہّب؛ باقی پر جدول طلائی لاجوردی کاغذ سمرقندی۔ اول سے ایک ورق نہیں۔ آخر سے معلوم نہیں کس قدر ناقص ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں سنہ تحریر کس طرح نظر افروز ہوتا۔ نسخے کی مجموعی حالت پر نظر کرکے یہ کہنا نادرست نہ ہوگا کہ یہ نسخہ نویں صدی ہجری کا لکھا ہوا ہے۔ صحت کے اعتبار سے عام سطح سے بلند ہے۔ اشعار پورے ہیں۔ کہیں کہیں بیاض ہے۔ نسخے پر نظرِ ثانی احتیاط سے ہوئی ہے جس کی وجہ سے بہت سے اشعار کا اضافہ ہوا ہے۔ مثلاً قصیدہ نمبر ۴۲ کے صرف سات شعر متن میں تھے۔ نظرِ ثانی میں حاشیہ پر سولہ[16] شعر کا اضافہ ہوا ہے۔ اضافہ شدہ اشعار کا خط دو قلمہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بار سے زیادہ نظرِ ثانی ہوئی ہے۔ بعض جگہ تصحیح بھی ہے۔ کلام ردیف وار مرتب ہے۔ نسخہ محفوظ ہے۔ کرم خوردہ یا آب رسیدہ نہیں۔

اوّل قصائد ہیں۔ جن کی تعداد ساٹھ[60] ہے۔ لکھنوی نسخے میں اڑتیس ہیں۔ پہلا قصیدہ وہی ہے جو لکھنوی نسخے میں اول ہے۔ قصائد کے بعد ترکیب بند ہیں جن کی تعداد اکیس[21] ہے۔ ترکیب بندوں کے درمیان میں متعدد مسمّطات ہیں۔ غالباً صحّاف کی بے احتیاطی سے مخلوط ہوئے ہیں۔ اکیسویں ترکیب بند کے ختم ہونے سے پہلے ناتمام نسخہ تمام ہو جاتا ہے۔

---

[1] نقاشِ نقشِ آخر بہتر کشد ز اوّل۔

ایک عجیب واقعہ ہے۔ ایک جگہ سے زیادہ ایسا ہوا ہے کہ دو ورق باہم ملا کر ٹھرا کر دیئے ہیں۔ وبازت اس کی شہادت ہے۔ روشنی میں دیکھنے سے اندر کی تحریر کی جھلک بھی محسوس ہوتی ہے۔ اس سے سلسلۂ کلام بھی درہم برہم ہو جاتا ہے۔ مثلاً قصیدہ ۳۰ کے آخر صفحۂ وصل پر یہ شعر ہے۔

بر رُخِ شاہد گلرنگ شراب گلگوں　　　می کشید ند ز ساقی سمن بر بسر ور

وُرق اُلٹنے پر یہ شعر سرِ صفحہ ہے۔

ندامت آرد اگر با وجودِ حکمت و شرع　　　زمامِ نفس بدستِ ہلاک بسپاریم

معلوم نہیں یہ ورق کس مصلحت سے چسپاں کر دئے گئے۔

حالاتِ مطہر حالات جس قدر پروفیسر وحید مرزا صاحب اور فاضل مُدیر نے دیدہ ریزی کے بعد فراہم کر دئے ہیں اُن پر اضافہ دشوار ہے۔ تاہم جو حالات اور معلوم ہو سکے درج ذیل ہیں۔

افسوس ہے کہ جہاں تک میں دیکھ سکا سراج عفیف اور ضیا برنی دونوں نے اپنی تاریخ میں مطہر کا ذکر نہیں کیا۔ دو مزید تذکروں میں ذکر ملا۔ ایک ریاض الشعراء واغستانی میں۔ دوسرے مجمع الفصحا سپہر میں۔ دونوں میں مظہر کے تحت حال لکھا ہے۔ چونکہ کلام مطہر کا انتخاب کیا ہے اس لئے بے تامل کہہ سکتے ہیں کہ تصحیف ہے خود تذکرہ نگاروں کی۔ ریاض الشعراء میں ہے۔

"مولانا مظہر از ایران آمدہ در گجرات توطن نمود طبع در نہایت قدرت و روانی داشتہ۔"

مجمع الفصحا میں دو جگہ ذکر ہے۔ اوّل

"مظہر گجراتی از سخن گویانِ شیریں زبان و فاضلانِ نیکو بیان ست و اصلش از ایران ست۔ ہشت ہزار بیت صاحب دیوان ست۔" دوم

"مظہر ہندی قاضی آگرہ ست و مردے آگہ۔ مداح فیروز شاہ بود۔ و مدح عین الملک نیز نمودہ بعضے او را مظہر ندکور خوانند و بعضے جُدا دانند علی ای حال بنام اُو می باشد۔"

انتخاب کلام میں دونوں جگہ مطہر کا کلام نقل کیا ہے۔ لہذا مُظہر گجراتی اور مُظہر ہندی دونوں ایک ہیں۔ میرے یہاں کے نسخہ تذکرۂ مجمع الغرائب میں فہرست میں مظہر ہے۔ اصل کتاب میں مُطہر میرے مخدوم

سید صمدانی لکھتے ہیں کہ تذکرہ ید بیضا میں میر غلام علی آزاد نے مطہر کو کڑہ کا باشندہ لکھا ہے۔ نیز یہ کہ فیروز شاہ کے یہاں قرب حاصل تھا۔ (ید بیضا میرے سامنے نہیں[1]) تعجب ہے کہ اس حال میں میر آزاد کا تذکرہ خزانۂ عامرہ مطہر کے ذکر سے کیوں فیض یاب نہ ہوا۔ تذکرۂ مذکور کا موضوع فیض یافتہ شعراء کا ذکر ہے۔ مطہر فیوض سے مالا مال تھا۔

حضرت شیخ دہلوی نے اخبار الاخیار میں مطہر کو حضرت چراغ دہلوی کا مرید خاص لکھا ہے۔ منقبت شیخ میں اس کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے۔ نیز ایک مرثیہ شیخ کی وفات پر۔

حضرت شیخ نے کلام مطہر کو کمیاب بلکہ نایاب لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ دیوانِ مطہر پیش نظر نہ ہوگا دیگر جگہ سے کلام بالانقل کیا ہوگا۔ اس وقت جو دو نسخے قصائد کے ظہور پذیر ہوئے ہیں (لکھنؤ اور مسلم یونیورسٹی میں) دونوں اس قصیدے اور مرثئے سے خالی ہیں۔ مسلم یونیورسٹی کے نسخے میں ایک قصیدہ بطور منظوم شجرۂ خواجگان چشت ہے۔ اس میں مطہر نے حضرت سرور عالم سے لے کر حضرت نظام المشائخ تک شجرے کی ترتیب کے ساتھ نام لکھے ہیں۔ اگر مطہر کو حضرت خواجہ نصیر الدین دہلوی سے بیعت تھی تو سلطان المشائخ کے بعد اُن کا نام نامی آتا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے نام کا اشارہ ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

نظام دل و دیں کہ اخلاق احمد ۔۔۔ در و تعبیہ شد چو در شیر شکر

دگر گشتۂ عشق رکنِ حقیقت ۔۔۔ کہ چوں خواجہ منصور دنازد فر

بظاہر رکن کا اشارہ رکن الدین کی طرف ہے۔ اب اشکال یہ ہوتا ہے کہ (سیر الاولیا، خزینۃ الاصفیا اور اخبار الاخیار کی شہادت کے بموجب) حضرت سلطان جی یا حضرت چراغ دہلوی کے خلفاء میں کوئی رکن الدین نہیں۔ بلکہ دوسرے سلسلوں میں بھی صرف ایک رکن الدین کا ذکر ان کتابوں میں

---

[1] معارف۔ ید بیضا کی وہ عبارت یہ ہے۔ "قاضی مطہر از اہالی شہر کڑہ است۔ عالم و فاضل و شاعر کامل بودہ و در سلک مریدانِ خاص شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی انتظام داشتہ و در خدمت فیروز شاہ با علیٰ مراتب قربت و منزلت محترم زیستہ۔ ناظم تبریزی گوید کہ شاعر شیریں ادبائے نمکیں بیانے بودہ مسودۂ اشعار او بخط قدیم در گجرات بدست مولانا محمد صوفی از تلامذہ اش بود۔ وے اورا در سلک ترتیب و ترمیم کشیدہ منتشر ساخت۔ فقط

آتا ہے اور وہ حضرت رکن الدین ملتانی ہیں جو سلسلۂ سہروردی کے شیخ ہیں۔ نہ کہ چشتیہ کے۔ پھر اُن کا نام یہاں کیوں آیا۔ اگر مظہر کو ان سے بیعت تھی تو سلسلۂ چشتیہ میں اُن کا نام کیوں آیا۔ ایک احتمال یہ ہوتا ہے کہ ان دونوں شعروں کے درمیان میں کوئی شعر چھوٹ گیا ہو جس میں حضرت چراغ دہلوی کا نام ہو لیکن یہ احتمال یوں قائم نہیں رہتا کہ خواجہ بختیار کاکی کے ذکر کے بعد حضرت گنج شکر کے نام کا شعر کاتب سے چھوٹ گیا تھا مقابلے میں حاشیہ پر اُس کا اضافہ کر دیا گیا۔ اگر یہاں بھی شعر چھوٹ گیا ہوتا تو اُس کا اضافہ کر دیا جاتا۔ بہر حال یہ اشکال حالتِ موجودہ میں ہے جس کو شیروانی کی نادانی حل نہ کر سکی۔

علاوہ تذکروں کے خود کلام مظہر کے مطالعہ سے حسب ذیل حالات معلوم ہوتے ہیں :۔

مظہر کا باپ بھی شاعر تھا۔ ہندوستان میں تھا اور شاہی خدمت میں۔ چنانچہ قصیدہ نمبر ۱ میں ہے (واضح ہو کہ نمبر اصل کتاب میں میں نے خود قائم کئے ہیں)۔

مظہر بندۂ کمتر کہ میراثِ پدر دارد
دریں درگہہ دعا گوئی دریں حضرت ثناخوانی

مظہر کے قبضے میں شاہی جاگیر تھی جہاں پانی کے اندر ایک بلند ٹیلے پر مکان تعمیر کیا تھا۔

زجودِ شاہ دستِ او گشتم برائے معاش	ہ کہ در دعاش نشستم بکنج تنہائی
میانِ آب یکے خانۂ بنا کردم	بہ پشتۂ ز بلندی چو چرخ مینائی
چو در عمارتِ آن خانۂ زراعتِ دیہ	برفت انچہ کہ بُد نقد جنس دنیائی

خاندان اور خدم وحشم کی تعداد کثیر تھی۔

ترا خویش و فرزند و خیل و تبار	فزوں از ہزار ند گر بشمری

قصیدہ نمبر ۲۳ میں ایک اور گانوں کا ذکر ہے۔ معلوم نہیں یہی تھا یا دوسرا۔

آں قدر مرحمت و تربیت ارزانی داشت	کہ یکے را نتواں کرد بعمرے مامور
خانۂ و دیہ دگر زانچہ ببایدا سباب	ہمہ فرمود براں لطف بشاشت فرمود

مذکور

خاتمہ میں کہتا ہے ؎

استمالت کنم این دیہ پریشاں شدہ را
باشد آئندہ دہد جبر بہ نقصان وکسور

قصیدہ نمبر ۲۷ میں اپنی جاگیر کا ذکر زیادہ تفصیل سے کیا ہے۔ مطلع ہے ؎

حبذا باغِ ارم بقعۂ اسلام آباد	کہ بر اسلام بنا کردنِ او میموں باد

حسنِ مطلع ؎ خاصہ بر ذاتِ خداوند ملک عین الملک	کہ بیاراست جہاں از وُ نقشِ دانش و داد

آگے چل کر لکھتا ہے ؎

اندر آں روز کہ من بر دِرِ او کردم عزم	ویں حکایت بدلِ شاہ جہاں دادم یاد
مرحمت کرد و مرا داد دریں جا دیہے	واختیارم ز پئے قرب ہمیں قریہ نہاد
ہمہ گفتند کہ دیہیست نکو اما خوط	سخت مستاکلہ و جملہ اقارب بیداد
من چو واثق بُدم از نصرتم و تائید ملک	التفاتے نہ نمودم بدل از اہلِ عناد
واں مقامِ چو ز دیوانِ قدر فرصت یافت	شکل دیگر شد و صد تعبیہ بنیاد نہاد
وانچہ واصل بدے از وے بمی کردے خط	وانچہ میکرد خط آں نیز نیارستے داد
طرفہ تر آنکہ در آں حوض کہ اُو ستے سر	رہ نمی داد کہ سازند وضو اہلِ رشاد
چسگلے داشت دراں حوض کہ می پرورد اُو	ہمچو والد کہ کند تربیت مر اولاد
چسگلے تیرہ و دریافتہ چوں الغافاں	کہ بصد حیلہ در و راہ نمی کردے باد
ہر یکے شاخ چو یک سلسلۂ از آہن	ہر یکے خار چو یک نیشترے از پولاد
غیرتے داشت بداں بیشہ ز چشم مردم	کہ چناں رشک نہ بردہ ز عروسے داماد
پاسے ببریدے اگر خار بریدے نجار	دست بشکستے اگر شاخ شکستے جلّاد
آں نہ بس بود کہ میکرد چنیں سوپہناں	سر برآورد بجائے کہ ز کفر و الحاد
مسجدے را کہ برآورد فلاں کرد خراب	واں صنم خانہ کہ بشکست شہ آں کرد آباد
من چو آں خواری دیدم و آں عزتِ کفر	طاقتم طاق شد و صبر در آمد بہ نفاد

گفتم آوخ که پسندیده به نزدیکی شهر
در دهے بود و کهوهے که بود حکم سواد

این چنین کفر بود غالب و اسلام ضعیف
چوں فلک سنگ همی بارد ازیں استبداد

خاصه آں ده که ز پهر شاه بدانشمندے
تا کند علم در و درس و عبادت بنیاد

همه شب بودم ازاں غصه در اندوه و قلق
بامداداں که سر گشت سپیدی ز سواد

آمدم بر در دیوان و در اصحابِ ملک
کردم از فتنهٔ آں کافرِ بے دیں فریاد

راستی اهلِ دواوین و امینانِ ملک
چوں نمودند دریں کار رهی را امداد

بستم آں خوط بصد سلسله در پا و پے
همچو حمدونه که بندد بستونے اقراد

بستدم آنچه برو بود ز محصولِ خطی
بگرفتم که دریں ده نبود استشهاد

هم بریں شرط ضمانے ستدم پا بر جاے
وانگهے کردم ازاں شدت و بندش آزاد

پس بتوفیق خداوند و باقبالِ ملک
هم به تنها که بخستم ز کسے اِستمداد

× × × ×

وانچه خیل و تبعش بود بروں کردم نیز
تا شود منقطع از قریهٔ من بیخ فساد

کردم آں بیشه همه صاف ز بالا و نشیب
کردم آں بتکده ناچیز ز بیخ و بنیاد

مسجد آراستم و محراب و مسلمانے چند
کردم آباد که باشند به ذکر و اوراد

ملک الشرق بدولت چو در آمد در شهر
وین حکایت بتواتر بشنید از آحاد

آفریں گفت بریں خسته و از راهِ کرم
گنج الفاظ گهربار به تحسیں بگشاد

تاجدارانه سیکے عزم سواری فرمود
سوے آں دیه بصد کوکبهٔ استعداد

سائبانے و سراپرده بر آں حوض کشید
که بپوشید بر دیباے یمن سبع شداد

بزمے آراسته کز چشمهٔ فردوسِ بریں
خوبتر زاں نتواں یافت مقامِ عباد

وندریں بزم بسے مائده کرد افراز
که فزوں آمده الوانِ نعم از اعداد

عام در داد صلاے بحواشی و خدم
چوں عجم در مه نوروز و عرب در اعیاد

الغرض چونکہ ازاں نوش ونعم فارغ شد — کاتبے کرد طلب حاذق ووافئے استاد
گفت تا بر سر آں حوض مقامے سازند — رائق و روح فزا چو ارم ذات عماد
باغ از جانب شرقیش نگارند شرف — برگ زارے ز جنوبیش نگارند فیاد
تا نشینند دریں جائگہ اصحاب علوم — بدعاگوئیِ سلطانِ جہاں خرم وشاد

قصیدۂ بالا سے حالات ذیل معلوم ہوتے ہیں :-

جاگیر اسلام آباد کے سواد میں تھی۔ مطہر کا شمار علما میں بھی تھا۔ صاحب درس تھا۔ اس کی تائید قصیدہ نمبر ۳۲ سے بھی ہوتی ہے یعنی اپنی حاضری دربار کے دو ذریعے بیان کرتا ہے ؎

سالہا آرزوئے بود کہ در حضرت شاہ
بطفیل علما ریا شعرا ریابی بار

جاگیر کے گانوں میں مدرسہ اور باغ عین الملک کے حکم سے تعمیر ہوا۔ قصیدہ نمبر ۴۲ میں ایک جگہ ۔۔۔ھ کا ذکر کرتا ہے ؎

ترا بہفصد و ہفتاد ہجر مدت عمر
چو عمر نوح نبی باد ہفصد و پنجاہ[1]

مختلف قصائد میں شعرائے ذیل کے نام لئے ہیں :-

سعدی۔ نزاری۔ کمال اصفہانی۔ جمال اصفہانی۔ بدیع الہمدانی۔ رضی نیشاپوری۔ معزی عنصری فردوسی۔ انوری۔ خاقانی۔ فرید۔ عسجدی۔ عمعق۔ سنائی۔ ہمام۔ ظہیر۔

سعدی کی شیریں کلامی۔ اور خاقانی کی بلند پروازی مسلّم ہے۔ چنانچہ قصیدہ نمبر ۵۳ میں ہے ؎

ہم الفاظ خاقانیم در بلندی — ہم آواز سعدی بہ شیریں کلامی

امیر خسرو یا حسن دہلوی کا ذکر نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن وقائع نگاری کا انداز کہتا ہے کہ امیر خسرو کا کلام پیش نظر تھا۔

ایک قصیدے میں ذیل کی علمی کتابوں کے نام لکھے ہیں :-

[1] صحیح نہ صد و پنجاہ۔

نحو اور معانی۔ مقالید و فتح۔

صرف و لغت۔ کامل اور ازہری

اخبار و آثار۔ ہر دو صحاح۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم)

تفسیر۔ کشاف زمخشری

فقہ۔ مبسوط

منطق۔ مطالع

علم کلام۔ مواقف۔ و مقاصد

حکمت۔ ابہری

وعظ و نصائح۔ کتاب سہری

اخلاق و تہذیب۔ ناصری۔ ع۔ زطب و زنار یحیا واقدی۔ کیا واقدی کی طب میں بھی کوئی کتاب تھی۔

تقلیل۔ مجموعۂ برغری

مقامات ذیل قصائد میں نظر آئے :۔

دہلی۔ فیروز آباد۔ ٹھٹھ۔ جاجنگر۔ اسلام آباد۔ نگر کوٹ۔ غازی پور۔ قصیدہ نمبر ۳۳، دیکھو۔

لیک چوں مدت حرمانست ہنوزم باقی بود والا ملک الشرق سوے غازی پور

من چو آنجا ز علائق نتوانستم رفت رفع کردم ز دعا گوئی خود چند سطور

ایک جگہ عبور گنگ کا ذکر ہے۔ ع چناں کن کہ چوں عبرہ کردی ز گنگ۔ گجرات کے کسی مقام کا نام نظر سے نہیں گزرا۔ اس سے بھی مطہر کا گجراتی ہونا مشتبہ ہو جاتا ہے۔

کلام پر تبصرہ

قصائد مطہر کا انکشاف اس پہلو سے بھی قابل قدر ہے کہ تیموری دور سے پہلے کے عہد کا کلام ہی جو اب کمیاب نایابی کی حد تک ہے۔ میرے یہاں علاوہ امیر خسرو اور خواجہ حسن دہلوی کے کلام کے عہد مذکور کے حسب ذیل شعرا کے دواوین ہیں۔

عاشق دہلوی (تلمیذ امیر خسروؒ) خواجہ مسعود بک۔ جمالی۔ بدر چاچی (مطبع نول کشوری) علاوہ اس تاریخی قدر و قیمت کے باعتبار خوبی کلام بھی قصائد مطہر فارسی ادب میں بیش بہا اضافہ ہے۔ مطہر کے کلام میں سیرابی و تازگی ہے۔ قوت مشاہدہ ہے۔ اور حقیقی شاعری۔ محض قافیہ پیمائی اور الفاظ نوردی نہیں ہے۔ مطہر کے کلام کی وقعت بہت بڑھ جاتی ہے جب ہم اُس کے پیش رو بدر چاچی کے قصائد دیکھتے ہیں۔ اُس کی اُستادی مسلّم۔ لیکن کلام میں سوائے اغلاق اشکال اور مقررہ اصطلاحوں اور مضامین کے اعادہ کی جدت و جودت (جو سرور آفریں اور دل کشا ہو) بہت ہی کم ہے۔ مطہر کے یہاں یہ جنس گرانمایہ بکثرت ہے۔ اور اُس کی یہ خصوصیت مسلّم ہے۔ والہ داغستانی نے لکھا ہے "طبع در نہایت قدرت و روانی داشتہ"۔ سپہر نے مجمع الفصحا میں یہ رائے ظاہر کی ہے۔ "از سخن گویان شیریں زبان و فاضلان نیکو بیان ست"۔ حضرت شیخ دہلوی اخبار الاخیار میں فرماتے ہیں۔ "در فضیلت و بلاغت و فصاحت از منفردان روزگار بود"۔ بت خانہ میں ہے "جز الت کلامش بمذاق سخن سنجی آں سر دفتر سخن شناسان خوش افتاد۔۔۔۔ شعرش بے تکلفانہ و سہل ممتنع است"۔

ان شہادتوں کے مقابلے میں مُلّا عبدالقادر بدایونی کی یہ رائے کیا وزن رکھتی ہے۔ "چوں مُلّائی بر شاعری غالب است نقد شعرش چندانے در بازار فضل رواج ندارد"۔ شاید اس لئے میں مُلّا صاحب کی مُلّائیت کا شاعری پر غلبہ رہا!

بڑی شہادت خود اُس کا کلام ہے۔ روانیِ کلام، بلندیِ خیال، متانت و شوکت کلام میں اُس کے قصائد مسلم الثبوت اساتذہ کے کلام سے دوش بدوش ہیں۔ شیریں بیانی، سحر آفرینی اور خوش بیانی میں بہت سے شہسواروں سے آگے ہے۔ ہم ذیل میں اُس کے کلام کا تین تاجداران قصیدہ کے کلام سے مقابلہ کرتے ہیں۔ یعنی انوری خاوری ظہیر فاریابی و سلمان ساوجی۔ انوری کا کمال روز روشن کی طرح تاباں ہے۔ ظہیر و سلمان کی بابت یہ دو قول یاد کر لو۔ ؎

دیوانِ ظہیر فاریابی   در کعبہ (کعبہ) بدزد اگر بیابی

"شعر سلمان و انار سمنان ہر جائی باشد"۔ ان کمالوں کو پیش نظر رکھ کر مقابلہ کرو۔

حُسنِ مطلع ؎ صوفی از صومعہ گو خیمہ بزن در گلزار
وقت آں نیست کہ در خانہ نشینی بیکار

اسی زمین میں سعدی کا مطلع :- اور حُسنِ مطلع ؎

بامداداں کہ تفاوت نہ کند لیل و نہار
خوش بود دامنِ صحرا و تماشائے بہار

لیکن مُظہرؔ کا مطلع، واہ! رنگِ غزل میں ڈوبا ہوا ہے۔ کیا کہنے ہیں!! ؎

انوری خاوری

دوش چوں چشمۂ خورشیدِ سپہرِ دوّار گشت از چشم نہاں در پسِ ایں پردۂ تار
روئے بنمود مہ سالِ نو از چرخ چنانک پارۂ زرّیں از روئے صحیفہ زنگار
جرمِ او گاہ پذیرندہ از انجم آرام سیرِ او گاہ نمایندہ ز ارکاں آثار
گاہے از دوریِ خورشید ہمی شد فربہ گہ ز نزدیکیِ او باز ہمی گشت نزار
پر از و بود سبک رنج ز بہری کہ فلک معنی اندر ورق روح نبی کرد نگار
مضمر اندر سخنش ہر چہ قضا را مقدور مدغم اندر قلمش ہر چہ قدر را اسرار
بود بر تختۂ او از ہمہ نوعے آیات بود در دفترِ او از ہمہ وزنے اشعار
باز بر طارمِ دیگر صنمِ سیم اندام یکفے بربطِ سعدی بدگر جامِ عقار
از تبسم لبِ شیرینِش ہمی شد خستہ وز اشارت رخِ زیباش ہمی گشت فگار
سخنش از وتد و واسطۂ موسیقی قلتش از و نہ ز زمزمۂ و موسیقار
حضرتے بود پر از طارمِ او سخت رفیع سقفِ او را نہ ستوں بود نہ دیوار بکار
ملکے ہیچ خرد عادل و بیدار درو نیک منتظر و زو یافتہ خاک استظہار
گہ تہی کرد ہمی دامنِ ابراز گوہر گاہ پُر کرد ہمی کیسۂ کاں از دینار
صحن و دہلیز و سراپردۂ او اوج و حضیض اشہب و ادہم گرد آخر او لیل و نہار

بادرا دخل نمی داد بوجہے ز دُخان　　آب را خرج نمی کرد بوجہے ز بخار

مطہر

بامداداں کہ بیفگند ہوا پردۂ قار　　شاہد صبح بہ بیند وہ بسرخی رخسار
آسماں نامۂ اعمالِ زمیں کرد سپید　　شب تو گوئی کہ گنہ بود سحر استغفار
سادہ شد چوں دلِ مومن ز ہمہ ظلمت و زنگ　　روئے مشرق کہ سیہ بود چو خالِ کفّار
باد مشکیں ز سرِ زلفِ عروسانِ بہشت　　می رسانید دمِ نافۂ آہوئے تتار
من کہ در خواب خوش از فتح گرفتم فالے　　شدم از غایتِ شادیش چو دولت بیدار
منتظر بودہ ام از غیب کہ دیدم ناگہ　　گشت طالع صنمے ہمچو سہے زیر غبار
قاصدے نزدِ من آمد ز سوئے شہر دوال　　چوں نسیمے کہ وزد صبحدماں از گلزار
نامہ در کفِ او مُہر بعنوانِ رہی　　کاتبِ نامہ امیرے ز امیرانِ کبار
مُہر آں نامہ چو بکشادم و خواندم مضمون　　دیدم از غالیہ بر گل رقمے کردہ نگار
ریختہ مشکِ سیہ بر سرِ کافورِ سپید　　راست چوں خطِ دلآویز بتاں گردِ عذار
لفظ چوں آبِ حیاتش ز سیاہی مشکل　　چوں گہر داشتہ با نورِ سحر در شبِ تار

. . . .　　. . . . .

شہر آراستہ دیدیم چو فردوسِ بریں　　کو ترے در تہ او موج زناں در بازار
مرغ و ماغ و بط و سرخاب در آں صحن کبود　　فوج در فوج رواں گشتہ چو صفہائے سوار
راست چوں لشکرِ ترکان میانِ لبِ رود　　ساحلِ آب گرفتہ سپہ بو تیمار
صحنِ او روح فزا ساحتِ او جاں پرور　　خاکِ او مشک فشاں نکہتِ او عنبر سار

ظہیر فاریابی

وزیرِ مشرق و مغرب نصیرِ دولت و دیں　　کہ با درایتِ عالیش تا ابد منصور
نشست در دل و جسمِ ملوک ہیبتِ او　　چنانکہ صولتِ مے در طبیعتِ مخمور

نه در حدیقهٔ فکرش وزید بادِ غلط — نه بر صحیفهٔ عزمش نشسته گردِ فتور

ز طول و عرض جلالت کمال وحیدرهٔ — مهندسانِ فلک معترف شده بقصور

زهی دقائق لطفت خفی چه جرم سُها — ولیک گشته چو خورشید در جهان مشهور

صریر کلک تو در کشفِ مشکلاتِ جهان — چنانکه نغمهٔ داؤد را ولے زبور

بزیر دامنِ افلاک خلقت آں مجمر — که کرده طیبِ افق را پُر از بخار و بخور

بگرد خطّهٔ اسلام حفظت آں خندق — که شیر شرزه نیابد درو مجالِ عبور

سوے حریم خلافت ترا همان آتش — نمود راه که اول کلیم را سوے طور

تو روے علی کردهٔ که رایتِ صبح — بزیر رایت او گم شود بوقت ظهور

ترا بحبلِ متین اعتصام لیس چه باک — اگر گسسته شود رشتهٔ سنین و شهور

چراغ بخت تو زاں شمع برفروخته اند — که آفتاب بپروانه خواهد از وے نور

نهال جاه تو زاں حوض یافته ست نما — که از ترشح آں حاصل آمده ست بحور

فراست تو چو افگنده نور در عالم — نماند در تتق غیب هیچ سر مستور

همای همت تو کرد گسالت گردوں را — بعجز و ضعف چو پشه شمرده بل عصفور

مطلع

ملک المشرق فلک قدر ملک عین الملک — که منیر ست بدو دیدهٔ اجرام و دهور

آنکه دارد بسخا مشرب ایّام بهار — وانکه دارد به وغا هیبت هنگام نشور

آنکه از خاک درش رشک برد باغ ارم — وانکه از فیض کفش طیره بود موج بحور

آنکه دارد حسبے تازه تر از سرو چمن — وانکه دارد نسبے پاک تر از ماء طهور

آنکه از مادرِ ایام نه زاد دست چنو — صفدرے تیغ زنے نامورے جلد جسور

آنکه از هیبت شمشیر جهاں آشوبش — لرزه در روم کند قیصر و در چین فغفور

آنکه از صاعقهٔ گرز بلا انگیزش — سنگ میداں چو سپنداں شود و گرد درو

آنکه در چنگل شاهین شکوه سیرتش — چرم عنقا بود از عجز و عنا چون عصفور

آنکه دارد ز دبیران ازل دولت تو — تا ابد بر سر اقطاع دو عالم منشور

آنکه در فضل و خرد پیش ز ارکان دول — همچو فرقانست ز توریت و ز انجیل و زبور

آن جوانبخت که در عهد جوانمردی او — قفل بر زر ننهاد دست بوستی گنجور

شهسوارے که کفش در شب تاریک نهد — نوک ناوک چو قره در پلک دیدهٔ مور

سرفرازے که بهنگام وغا پیکانش — آتش از آب برون آرد و آهن ز صخور

گر نسیم کرمش در دهن مار وزد — زهر او شهد شود همچو لعاب زنبور

کشور از سایهٔ احسانش چنانست ایمن — که بر او می نوزد هیچ سگے باد حرور

من باقبال تو امروز درین کشور هند — ق — چه در ابداع قوافی چه در انشاے بحور

چو کمالم بسپاهان چو جمالم بهری — چون بدیع از همدان چون رضی از نیشاپور

سلمان ساوجی

شد و خسرو همه با پایهٔ اقبال تو خُرد — زور رستم همه با قوت بازوے تو زور

میم نام عدوت قاف شقاوت را جرم — وے سواد قلمت عین سعادت را نور

لشکری ست چو لشکر تو همه زد و شتقات — کام یابند ز دوران تو همه سال ثغور

باشد از نسبت رایت شرف شمس و قمر — مهره با دل دشمن گهر کان وجور

نه چنان راست نهادی تو سپاهان و عراق — که کس از راهزنان ناله کند چون طنبور

یافت ترجیح بصد مرتبه بر آب حیات — خاک نعل سم اسپت که شرابیست طهور

رشحات کف دست تو اگر بیند ابر — در سر ابر نیفتد پس ازین باد غرور

هر که در دهر کشد سر ز تو چون شاخ رزان — پایمال ستم عصر شود چون انگور

قلب دین شاه فلک مرتبه محمود که اوست — بهمان سیرت محمود محامد مذکور

ملکے که در سایهٔ انصاف لوایت چون کبک — خنده بر باز خشن میزند اکنون عصفور

راے پیرت تتق ستر حندا الحرم ۔۔۔ دل پاکت نظر لطف خدا را منظور
پایۂ سلطنت از سایۂ قدرت عالی ۔۔۔ رایتِ مملکت از رایتِ رایت منصور
بوئے اخلاق تو دمساز شمالست و صبا ۔۔۔ صیت احسانِ تو انباز جنوبست و دبور
بحر را روز عطایت نتواں گفت کریم ۔۔۔ کوہ را پیش وقارت نتواں خواند صبور
عہد اقبال ترا ملک و ملائک داعی ۔۔۔ خطِ فرمان ترا چرخ و کواکب مامور
ناف مشک از اثر خلقِ تو یابد آہو ۔۔۔ نیش و نوش از غضب و لطف تو دارد زنبور

(نمونہ تشبیب) فصل دے ماہ است پیش از صبح خوان باید کشید ۔۔۔ مے بجام و میوہ ہا در نقل داں باید کشید
خرگہ چوں مہر و ماہ از دیبہ باید کرد راست ۔۔۔ خواب گاہے چوں سپہر از پرنیاں باید کشید
مجلس چوں خلد باید ساخت در ساقی و جاں ۔۔۔ حور در بازو و کوثر در میاں باید کشید
زاں لب شیریں و جام تلخ و یاقوتِ رواں ۔۔۔ نوش باید کرد و یاقوتِ رواں باید کشید
مطربِ خوش گوے ہم زانوے دل باید نشاند ۔۔۔ شاہدے چوں نوش در آغوش جاں باید کشید
شب نکوتر آید از قرابہ مے کردن بجاں ۔۔۔ زانکہ مے گنج است و گنج زر نہاں باید کشید
گنج زر داری زیادہ گنج گم کن کز جہاں ۔۔۔ ہر کہ گنجش ہست رنج بس گراں باید کشید
ہر سبک روحے کہ دارد دل گراں از روزگار ۔۔۔ گر سبک خواہد دلش رطل گراں باید کشید
وانکہ در پیرانہ سر دارد جوانی آرزو ۔۔۔ بادۂ پیرش ز ساقی جواں باید کشید
چرخِ ظالم پیشہ خونِ عالمے بر خاک ریخت ۔۔۔ تا کے ایں جور و جفایش ہر زماں باید کشید
خونِ فرزندان رز را کاسمان داده است سیر ۔۔۔ نوش باید کرد و ایں کیں از آسماں باید کشید
در چنیں مجلس کہ ما داریم گر آں شہسوار ۔۔۔ خود بیاید ہم بصد زاری عناں باید کشید
موے در شستے اوست ہندستان و طاؤس از قفا ۔۔۔ گر تو آں خواہی ضرورت جور آں باید کشید
آں مثل نشنیدۂ آنرا کہ طاؤس آرزوست ۔۔۔ ناگزیرش زحمتِ ہندوستاں باید کشید
پیش آں غنچہ لبِ شیریں زباں کز شوق او ق ۔۔۔ دہ زباں بیروں چو سوسن از دہاں باید کشید

گر کشاید گل دہن گل را دہن باید شکست — ور کشد سوسن زباں او را زباں باید کشید

دل اگر بردند خوباں جاں بہ رسم خدمتے — در جناب صاحب صاحب قراں باید کشید

نمونۂ تغزل

آں دلبری کہ نوبرِ باغِ رواں توئی — نوروزِ روزگارِ ربیعِ زماں توئی

کوثر توئی بہشت توئی بوستاں توئی — از جاں چہ بہتر است در آفاق آں توئی

دانم کہ میر مجلس شاہ جہاں توئی — کز جام لعل تست جہاں مست و جاں خراب

اے دلبری کہ کوے تو فردوس ازہر است — خط تو باغ خلد سخن آب کوثر است

سرو سہی ست قامت تو یا صنوبر است — مہر سما ست روے تو یا ماہ انور است

مشک است طیب زلف تو یا عود و عنبر است — شہد ست جام لعل تو یا شیر و شکر است

درج است در ثمینش تو یا سلک گوہر است — ماء معین است آب دہان تو یا گلاب

آنی کہ بر سمن بہ شبہ مشک سودۂ — وز ماہ عارضت خط شبگوں نمودۂ

فریاد من اگرچہ کہ شبہا شنودۂ — روزے بہ پرسش من مسکیں نبودۂ

در حسن اگرچہ صبح علم بر کشودۂ — بارے چو آفتاب یکے بر سرم بتاب

ترکیب بند

صبح چوں نمود رخ شادی ز سر باید گرفت — مجلس نو دیگر و بزمے دگر باید گرفت

ساغرے از حوض کوثر صاف تر باید کشید — دلبرے از حور عیں پاکیزہ تر باید گرفت

از لب شیرین شاہد نقل تر باید چشید — وز کف سیمین ساقی جام زر باید گرفت

عرصۂ بزم صبوح از صبحدم تا چاشتگاہ — گر زیادت نیست باری ایں قدر باید گرفت

بلبلے کز صبح مستاں را بشارت میدہد — ہم بریں شادی دہانش در شکر باید گرفت

ساعد ساقی اگر تیغے کشد چوں آفتاب — ہمچو جام از جام مے خود را سپر باید گرفت

قطرۂ کز جام مے بر خاک مجلس می چکد — نے بدست آستیں کز دیدہ بر باید گرفت

حرمت مستاں را بہ ہشیاری پدر باید شمرد — عیب یاراں را ز دلداری ہنر باید گرفت

اندہِ دنیا چو پایانے ندارد از قیاس — کارہا کوتاہ و غمہا مختصر باید گرفت

گر سگے بے خار میخواہی و خمرے بے خمار — بادۂ بر یادِ امیرے نامور باید گرفت

صفدر آفاق عین الملک کز اقبال شاہ

ہست سنجر رزم و اسکندر ظفر جمشید جاہ

ساقیا مے دہ کہ ہر دم وقتے دگر دارد ہمی — بے خبر باشد زمانے آں کو خبر دارد ہمی

زاں مئے مشکیں کہ گوئی جام جاں از فعلِ او — لون و لذت از گل و شہد و شکر دارد ہمی

در چنیں موسم کہ باد صبح و بستان بہار — آستیں پر مشک و دامن پر گہر دارد ہمی

خرم آں مستے کہ در دست باہو در کنار — مطربے در پیش و باغے در نظر دارد ہمی

مرغ اندر تابہ زن کردست و نانے در تنور — میوہ اندر نقلداں از خشک و تر دارد ہمی

چشم بر دیدار یار و سبزہ و آب روان — گوش بر نائے و دفے و صوت و سمر دارد ہمی

با مہ داں چوں برآرد بانگ زنبور از گلو — طائرے کو تاج یاقوتیں بسر دارد ہمی

مے طلب کن از نگارے کہ بر زریں قبا — جعدِ او مشکیں کمندے تا کمر دارد ہمی

سرو بالا ماہ رخسارے کہ زلف عنبرش — در دلِ پستانے بہر موئے ہنر دارد ہمی

آنکہ چشم شوخ او گوئی بدست غمزہ ہا — خنجر خونریز شاہِ بحر و بر دارد ہمی

پشتوان دین و دولت بادشاہِ شرق و غرب

آفتاب مملکت فرماں روائے شرق و غرب

(نمونہ معارف) مجرد شو از دین و دنیا قلندر — کہ راہ حقیقی ست زیبا ہر دو بہتر

جہاں چیست دانی بہ نزدیک مے دال — طلسمات ابلیس پر شور و پر شر

بظاہر عمارت بہ باطن خرابی — قبائے جہاں را نیابی تو استر

بہ نیلی است زندہ بنایست قائم — چہ بر بادِ تکیہ! چہ بر آب پیکر

زنے بے وفائیست مکارہ گیتی — باندیش تا چند کشتہ است شوہر

چہ سازی تو با او کہ با کس نہ سازد — طلاقش بِدہ یا ندار و بگذار و بگذر
بقائے جہاں راست آخر فنائے — پس آنگہ چہ کبر و منی اے برادر

. . . .

جمالیست پوشیدہ در پردۂ جاں — کہ محجوب از انست این دیدہ ابتر
اگر نیست گردی ز خود رُخ نماید — کہ چوں شب سر آید کند مہر سر بر
پس نیستی بنگری ہستیِ او — کہ ظلش گرفتست ہم بحر و ہم بر
بسودائے فقر آفتابیست پنہاں — کہ سرگشتۂ اوست نہ چرخ اخضر
دریں بحر فقر است دُرہائے معنی — بزن غوطہ برآر از قعر جوہر
ہر آنکس کہ بگزید فقر اختیاری — تو انگار او را بہ معنی تونگر
گذشتند آناں کہ زیں مُلکِ فانی — جہانِ بقا شد برایشاں مقرر

. . . .

شرابِ طہورا چہ آشاند آنکس — کہ خوردہ ست مے از لبِ لعلِ دلبر
کسے کز دو عالم گدا کرد او را — چہ دیر و چہ گنبد چہ دار و چہ منبر
عجیب طائفہ در خراباتِ عشق است — نہ ملحد نہ ترسا نہ مومن نہ کافر
بہ سازند دو نیم زسوز دل ایشاں — در آرند شان التجا بریں گر
نخواہند حور و نخواہند غلماں — نخواہند تخت و نخواہند افسر
یکے واں یکے خواں یکے گو یکے جے — قلندر قلندر قلندر قلندر

واقعہ نگاری۔ فکرِ تعمیرِ مکان کا نقشہ اور غزل

درچنیں وقت خوش و ساعتِ میمون کہ درو — ہمہ آثار سعادت ہمہ انوار و سرور
من کہ دارم نفس از حسرت و ناکامی سرد — من کہ دارم جگر از آتشِ محنت محرور
خاطرے داشتم از بہر مطر سخت خراب — کہ چگونہ کنم ایں کلبۂ احزاں معمور

خشت نایاب وخشب نادر واحجار بعید　　کار تعجیل وکفم بے زر و بازو بے زور
چوں برم محنت سقار وجفائے نجّار　　چوں کشم زحمت رازان و بلائے مزدور
خود گرفتم بنود بابت ارباب صلاح　　جائگاہے کہ کند نسبت رفعت بقصور
کم ازانم کہ بود یک دو مقامے محفوظ　　کم ازانم کہ بود چند جدارے منظور
ہم دریں فکر بدم عشرق کہ ناگاہانی　　اندر آمد ز درآں فتنۂ ایام وشہور
جام مے خوردہ وخوے کردہ وخواب آلودہ　　سر زلفینش پریشاں بر و دامن مجرور
دل ستانے کہ اگر وصف کنم خوبی او　　نہ عجیب دارم اگر نعرہ زنند اہل قبور
دیدۂ سرو برو ماہ چناں بودش روے　　دیدۂ لالہ در و مشک چناں داشت شعور
ساق و ساعد ز سمن سینہ بہ سیماب زسیم　　لب و دندانش گہر بد بر و بازوش بلور
سرو بالاش سہی سنبل گیسویش تر　　لالۂ روے طرب نرگس چشمش مخمور
شکل وشیوہ و بالا وخرام وخندہ　　ہمہ شیریں وازو خاستہ در عالم شور
دو کلہ دوختہ از دیبۂ و زربفت برآں　　استرے ساختہ قاقم بجوانشی معمور
جعد زلفینش معنبر ز مزامیر و ز مشک　　جیب و دامانش معطّر ز ریاحین و بخور

قند مکرر — مقالۂ ہذا کا اوّل حصہ ختم ہونے کے بعد شوق نے کلام مطہّر مکرر پڑھنے کا تقاضا کیا۔ اوّل سے آخر تک پڑھا۔ جو نئی باتیں ملیں حاضر ہیں۔

مزید حالات — مطہّر صاحب اولاد تھا۔ شاہی جاگیر آخر عمر تک اُس کے قبضہ میں رہی۔ ۷۳ برس کی عمر کے بعد اُس نے درخواست کی تھی کہ جاگیر اُس کے بچّوں کے نام کر دی جائے۔ جیسا کہ قصیدہ نمبر ۴ سے ثابت ہوتا ہے۔ یہ قصیدہ سلطان ابوالفتح ناصر الدین محمد شاہ تغلق کی مدح میں ہے۔ جو بیٹا تھا سلطان فیروز شاہ کا (جیسا کہ اورئنٹیل کالج میگزین کے فاضل مدیر کا بھی خیال ہے) اس بادشاہ کا پہلا جلوس ۷۹۰ھ میں ہوا۔ اور دوسرا ۷۹۱ھ میں۔ اس کی مدح میں صرف یہی ایک قصیدہ ہمیں نظر نسخے میں ہے۔ ظاہر ہے کہ دربار سے تعلق کے لحاظ سے تخت نشینی کے وقت قصیدہ پیش ہوا ہوگا۔ اسی وقت موقع تھا کہ جاگیر

کی بحالی اور اولاد کے نام منتقلی کی درخواست کی جائے۔ چنانچہ شاعر نے موقع سے نفع اٹھایا اور درخواست کی۔ جب یہ قرین قیاس ہے کہ یہ قصیدہ جلوس کے وقت پیش ہوا تو مظہرؔ کے سال پیدائش کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جو تقریباً ۱۶ سنہ ہجری ہے۔ قصائد میں صرف ایک قصیدے کا جانشین فیروز شاہ کی مدح میں ہونا اس خیال کو بھی قرین قیاس کر دیتا ہے کہ مظہرؔ تخت نشینی کے بعد زیادہ زندہ نہیں رہا ورنہ آئین شاہی کے مطابق اُس کو دوسرے مواقع پر بھی قصیدے پیش کرنے چاہیئے تھے۔ چنانچہ اپنے دوسرے ممدوحوں کی شان میں مختلف تقریبوں پر قصیدے لکھتا رہا ہے۔ معہذا دو درمیانی بادشاہ غیاث الدین تغلق ثانی اور ابو بکر شاہ کی مدح میں قصیدہ کا نہ ہونا اس پر دلالت کرتا ہے کہ ان بادشاہوں کے مختصر عہد میں شاعر زندہ نہ تھا ورنہ قصیدہ پیش کرتا۔ ان قراین سے شاعر کا زمانہ تخمینی طور پر ۱۶ سنہ ہجری سے ۹۱-۷۹۰ سنہ ہجری تک معین ہو جاتا ہے۔ حافظ شیرازی کی وفات ۹۱ سنہ ہجری میں ہے۔ ثابت ہوا کہ مظہرؔ بلبل شیراز کا ہم سفر و ہم صفیر تھا۔ جس قصیدے میں مظہرؔ نے ۷۷۰ سنہ ہجری لکھا ہے وہ تقریباً پچاس برس کی عمر میں لکھا ہوگا۔ (۱۹ سنہ جلوس فیروز شاہی میں جو اس عہد کے شباب کا وقت تھا)۔ اس قصیدے میں ایک شعر یہ بھی ہے ؎

ابنا و اقربا و تبار و تبع ہنوز
میخواہدم برنج و تعب مبتلا کنند

اس سے صاف ظاہر ہے کہ علاوہ اولاد کے مظہرؔ کا پورا کنبہ ہندوستان میں موجود تھا۔ اس صورت میں یہ کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے کہ "مظہرؔ ایران سے آیا تھا"۔

پہلے حصہ مقالہ میں ایک شعر لکھا جا چکا ہے جس میں اُس نے اپنے والد کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بھی دربار شاہی کا مدّاح اور دعا گو تھا۔ ایک اور شعر لکھا جا چکا ہے جس میں اُس نے اپنے خویش و اقارب و متعلقین کا شمار ایک ہزار لکھا ہے یہ مزید ثبوت مظہرؔ کے ہندوستانی ہونے کا ہے۔

اب قصیدے کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

مدت ہم چو دیدم اینکہ چو ہفتاد و سہ گذشت
عمر و فلک بدنیست کہ پاشتم دو تا کند

ابنا و اقربا و تبار و تبع ہنوز ۔۔۔ میخواہدم برنج و تعب مبتلا کند

درخواستم ز شاہ چو دیہے کہ شہ مرا ۔۔۔ داد ایں عطا بمرحمت او لا دوا کند

تا ہر کسے بحصۂ خود زمینے برد ۔۔۔ وز وجہ ایں معاش خود و اقربا کند

ویں خستہ با فراغ نشیند بگوشۂ ۔۔۔ حمد خدائے گوید و شہ را دعا کند

سلطانِ شرق و غرب محمد شہ آنکہ او ۔۔۔ جہد و جہاد بر صفت مصطفیٰ[3] کند

بوالفتح شاہ ناصر دنیا و دین کہ او ۔۔۔ تائید ملک و ملت و دین و دنا کند

اس قصیدے کی تشبیب میں حوائج زندگی کی تفصیل کرتا ہی جس سے آج سے سات سو برس پہلے کے تمدن پر روشنی پڑتی ہی۔ آخر عمر میں درویشانہ زندگی کے تین درجے قائم کرکے اور دو اعلیٰ اور اوسط مرتبوں کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہی :۔ مطلع قصیدہ ہی ؎

مردم چو پیر شد خرد ایں اقتضا کند
کار فضول ترک و رعونت رہا کند

. . . .

ادناش آں بود کہ بآئین صالحاں ۔۔۔ در کنج عافیت بہ قناعت بقا کند

دارد بگرد خود دہے چند از حلال ۔۔۔ تا حاجتش بقدر کفایت قضا کند

وز بہر آں کہ رنج و ریاضت ستودہ نیست ۔۔۔ پیر ضعیف را کہ خلل در قوا کند

ناچار بر طریقت حکمت بقدر وسع ۔۔۔ اصلاح حال خانہ لباس و غذا کند

محفوظ خانہ ایش بباید ز خشت و سنگ ۔۔۔ کایمن ز باد و آتش و باراں را کند

وز دزد ایمنی دہد و گربہ و سگے ۔۔۔ نتواند از برونش کہ قصد سرا کند

یک حجرہ و صفہ و یک جا میزرش[2] ۔۔۔ یک مطبخے کہ منقسمش چار جا کند

یک گوشہ کند[1] و یش دیگے گوشہ میزرش ۔۔۔ یک گوشہ دیگداں و یکے آسیا کند

---

[1] خم کلاں از گل کہ در آں غلہ نہند ۱۲ [2] میزر تہبند، چادر، شلوار وغیرہ مراد از جملہ سامان لباس ۱۲

واینچ از متاعِ خانہ و اسبابِ حاجتش | خرد و لطیف و مختصر و دیرپا کند
طشتے و آفتابہ و شمعے و کرسیش | زیلو[٥١] حجرہ و حصیر و پلنگے بپا کند
یک صحن و یک سکورہ یکے کاسہ یک قدح | با یک طبقچہ[٥٢] زسفال خطا کند
یک تابہ و دیگ مسینی کہ اندرو | گہ رشتہ گہ برنج و گہے شوربا کند
قرتو دستے و طغارے و کفچہ | با تنگ[٥٣] بیز و چمچہ کزو اعتنا کند
دستاک خرد و ہاون و سنگ و صلابہ | سنے و مجلہ کہ ازو استقا کند
صندوقے از برائے کتب طبل بہر وب | واینچ اقتضا جنس ادام انا کند
وانگہ چو فرد خانہ حکمت تمام شد | برصورتے کہ جملہ حوائج روا کند
اصلاح حال قوت و غذائے کہ درخور ست | بر راہ و رسم مطبخ دار الشفا[٥٤] کند
ہرچہ از غذا بہ وزن قلیل و قوی کثیر | از وے تنا و لے بگہ اشتہا کند
در چاشتگاہ قلیہ برنجے و روغنے | با ترشئے کہ معتدل آید غذا کند
در شامگاہ نانے و آشے ز آب گوشت | پاکیزہ و لطیف غذا در عشا کند
تا در دل و دماغ و جگر قوتے دہد | و ندر تنش بدایت و نشو و نما کند
وز سیخ و سغد[٥٥] و سریاں کباب و کشک[٥٦] | با دیجن و پنیر و قدید احتما کند
ور گوئی از لباس چہ حاجت بود ورا | کال البعید و جمعہ و جمع اکتفا کند
یک جبہ و یکے فرجے و یکے دوتائے | کز صوف و ارکلی و شامی عبا کند
با شملہ حجازی و مصری عمامہ | قرنے بس است عمر عزیزا روفا کند

ممدوح حسام الملک کی جاگیر شاہی کی آمدنی چھ لاکھ اشرفی ہے

بودش خراج سال ز دیوان بادشاہ | شش صد ہزار تنکہ سرخ از زر عیار

---

[٥١] زیلو - گلیم ١٢ [٥٢] نوعے از حلوہ ١٢ [٥٣] نوعے از غربال ١٢ [٥٤] دار الشفا کی غذاؤں کی تفصیل خصوصاً سبق آموز ہے ١٢ [٥٥] سغد و چرب زدہ ١٢ [٥٦] کشک آشے از ہریسہ کہ از گندم یا جو و شیر گوسپند راست کنند ١٢ [٥٧] مراد از طرفہ برائے آب ١٢ [٥٨] خشکہ گوشت ١٢

ایک موقع سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا اصل مشغلہ علم کی خدمت تھی اور دربارداری و شاعری ضرورۃً تھی چنانچہ قصیدہ نمبر ۳۳ میں کہتا ہے ؎

عشق من کنج و کتابے بد و مخدوم ما را — میل بر مدح و ندیمی و ملاقات حضور
گر مراعات کنم علم و عمل راست خلل — ور رعایت نہ کنم دیدہ و درم رہست نفور

قصیدہ نمبر ۳ مولانا جلال الدین رومی کی مدح میں ہے۔ اس کا ایک شعر ہے ؎

مصابیح و مشارق را چنان مستحضر الباب ست
کہ گوئی از زبان مصطفیٰ کردہ ست اصغا را

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں کمال حدیث مصابیح و مشارق کا استحضار تھا۔

ٹھٹھ کی فتح کے سلسلے میں وہاں کے دو راجاؤں کا ذکر کرتا ہے۔ ایک راؤ تماجی دوسرا راؤ جام۔ خود ٹھٹھ کو جزیرہ کہتا ہے ؎

ٹھٹھ کہ آں جزیرہ بلائیست پر کہف
دریاش یک طرف و پنج آب یک طرف

تخلص:- علاوہ مذکورالسابق اشعار کے مطہرؔ کا تخلص متعدد جگہ اور ملتا ہے۔ ملاحظہ ہو قصیدہ نمبر ۱۷ "اے مطہرؔ سخن دراز مکن"۔ قصیدہ نمبر ۲۴ "وز زبان مطہرؔ مسکیں"۔

ترکیب بند نمبر ۱ ؎ بندۂ کمترمطہرؔ را بمدح آستانت
فیض خاقانی و ذہن انوری پیوستہ یاد

قصیدہ نمبر ۱۴ ؎ مطہر در ثنا خوانی چو دُر افشانست دریا یست۔

ان تمام اشعار میں مطہر صاف لکھا ہوا ہے۔ مطہر کے ایک قصیدے کے دو شعر ہیں ؎

بہ ہندستاں سفر بسیار کردم ہر سوئے لیکن — ہوس دارم کہ یک چندے بہ بینم ملک بابل را
در آیم از حجاز اندر یمن زانجا سوے مکہ — بہ بینم مرصفا و مروہ و عرفات و بطحا را

ان اشعار سے اس کے ایرانی ہونے اور مشتاق ایران ہونے کا استدلال معلوم نہیں کس طرح

ہوسکتا ہی۔ قصیدے میں ایران یا خراسان کا مطلق ذکر نہیں ہی جس سے طرفِ بالا کا اشارہ ہو۔ یہاں بالا کا لفظ بلحاظ شرف استعمال ہونا قرینِ قیاس ہی جس کی تشریح دوسرے شعر میں ہی۔ ایک بات اور قابلِ لحاظ ہی۔ کیا مطہر کو معلوم نہ تھا کہ مکہ حجاز میں ہی۔ اگر علم تھا تو پھر حجاز سے یمن جانے اور وہاں سے مکہ جانے کی تمنا کس بنیاد پر تھی۔ "حجاز" "جہاز" کی جگہ تو نہیں لکھا گیا ہی۔

کلام کے مختلف اسالیب | (۱) ملاقاتِ احباب کا اشتیاق ؎

نبود عجیب از بہر ملاقاتِ عزیزاں　　گر موے شود بر تنِ مشتاق چو پرہا

موے بدن سے زبان کا تو کام لیا گیا تھا ؏ "اگر ہر موے من گردد زبانے" لیکن پر کا کام غالباً مطہر ہی نے لیا ہی اور بمقابلہ زبان کے زیادہ موزوں ہی۔ دیکھو پر کو بال و پر بھی کہتے ہیں۔

(۲) مبالغہ کس قدر لطیف ہے ؎

(۱) قلم کہ خطِ غبار آں چناں نبشتہ است　　کہ سطر در تہِ موے ہمی نمود اخفا

(۲) چشم روشن کہ پاے مور بدیدے　　بشبِ تیرہ در سپہر ظلمانی

ایں زماں اشترے بہ بار نہ بیند　　بر بلندی اگر (تو؟) بروانی

(۳) تشبیہ دہن و زلف

اے پردرقِ گل ز شکر ساختہ میمے　　وز مشک برآوردہ بکافور دو جیمے

(۴) تعریفِ اسپ | از اسپ و بے قرار قرار ست ملک را　　نبود قرار ملک چو گیرد قرار اسپ

شعرِ بالا اُس عہد کی زندگی کی سچی تصویر ہے۔

؎ اول زپائگاہ ہزار اسپ بادپاے　　ہر یک زتازیانِ براق اصل برق سار

مہ روے خرد موے و سیہ چشم و تیز جسم　　خوش گام و خوش لگام و سبک سیر و راہوار

اسی سلسلے میں ترکستان اور ہندوستان کا فرق ؎

در ترکِ اسپ بے حد و [illegible] آدمی　　زیں جا فرست بردہ[1] وز آنجا بیار اسپ

---

[1] تقابہ ہی میں غلامی ہے ۱۲

طلبِ اسپ | دارم امید آنکه رکابی خویش را — بخشی ز راہِ لطف یکے راہوار اسپ

تعریفِ اسپ میں دوسری جگہ کہتا ہے :-

پرندہ ہمچو دُخان و دوندہ ہمچو سیل — جہندہ ہمچو درخش و دوندہ ہمچو سحاب

سپید روے و سیہ چشم و برافراختہ یش — بلند بارگہ و نرم پوست و سخت اعصاب

بخاکِ بادیہ پروردہ - آتش آہنگے — کز آب و کاہ کفایت کند بیاد و سراب

ہماں بدست کہ بر پشتِ او نشستم راست — بہ جست تند چنانک از کمانِ تیر شتاب

ہمی دوید بہ ہامون ہمی گزشت بہ کوہ — ہمی نوشت بیاباں ہمیں بُریدِ شتاب

گہے بگام چو شیر و گہے بپویہ چو گرگ — گہے بہ تگ چو غزالے کہ بگزرد بر غاب

(۵) محبتِ مطلوب

تو مرا باش کہ تا ہر دو جہانم باشد — بے تو ام گنج دُر و تودۂ زر حاجت نیست

(۶) تشبیہِ طلوعِ صبحِ کاذب

نگر کہ صبح نخستیں نمود رایتِ خویش — بسانِ نیمۂ خنجر کہ برکشی ز قراب

(۷) تعریفِ خنجر

و انگہ ہزار خنجرِ خونریزِ مشرقی — ہر یک بسانِ صارم و صمصام و ذوالفقار

سوزندہ تر ز عشق و فروزندہ تر ز عقل — تابندہ تر ز نورِ درخشندہ تر ز نار

ہم پشت او چو ماہی و ہم رشتۂ او چو ماہ — ہم گوہرش چو مور و چو ہم پیکرش چو مار

(۸) تشبیہِ ساغر

بر سرِ دستہا چو باز سپید
ساغرِ بادہ را سوار کنید

(۹) تشبیہِ طلوعِ صبح

دیدم نشانِ صبح ز گردون تیرہ رنگ — چوں بر حصارِ سنگ سیہ برج مرمرے

یا تودۂ سپید ز کافور ساختہ — بر ساحتِ سیاہ ز پاکیزہ عنبرے

لطائف ۱۲ — نرم نرمن ۱۲

یا بر قیاس آنکہ کشاید کسے نگاہ — سیمیں دریچۂ ز سر تیرہ منظرے

گفتم مگر کہ بانگ نماز مؤذناں — بکشاد از برائے دعا از آسماں درے

یا در میانِ جنتِ فردوس جانفزائے — افگندہ جبرئیل شعاعے ز شہپرے

ہر دم میان صبح و شب از تیغ آفتاب — می رفتہ نیزہ جنگی و خونریز خنجرے

گفتی مگر کہ بر سرِ صحرائے نیلگوں — زد بر سپاہِ زنگ ز سقلاب لشکرے

یا خود سوادِ مملکت ہندوستاں تمام — بگرفت از مواکب اسلام محشرے

(۱۰) فلسفۂ محنت | خاطر آسودہ کن کہ یک شادی — بے غم بے شمار نتواں یافت

ہیچ مُل بے خمار نتواں خورد — ہیچ گل بے زخار نتواں یافت

بے زخوناب دیدہ از دلِ بحر — لولوئے شاہوار نتواں یافت

روشن است ایں کہ آب حیواں را — بے بیابانِ تار نتواں یافت

تا نہ بینی بلائے بے آبی — لذت از جوئبار نتواں یافت

تا نہ سوزی وجود از محنت — بوئے مشکِ تتار نتواں یافت

ان اشعار میں "بے زخار" اور "بے زخوناب" کی ترکیب قابل لحاظ ہے۔

(۱۱) مقصود کی بلندی۔

مرا با مال حرصے نیست من اعمال میخواہم — مرا با خلد کارے نیست من دیدار میخواہم

(۱۲) فلسفۂ آسائش | اے کہ آسائشے ہمی طلبی — زحمتے اختیار باید کرد

گنج خواہی ز رنج ناچار نیست — صید خواہی شکار باید کرد

عافیت در جہاں اگر جوئی — ترک حرص و نقار باید کرد

ہر چہ یابی ز اندک و بسیار — ہم بداں اختصار باید کرد

ہیچ ازیں گفت و گوئے نکشاید — اصل کار استکار باید کرد

روانی | کہ شد روانیِ میخواراں مصلائے کہ من دارم۔

مشکل طرحیں مظہر نے اکثر طرحیں شگفتہ اور صاف انتخاب کی ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ ایک سے زیادہ قصیدوں میں مشکل طرحوں کو بھی لیا ہے۔ وہاں بھی بیان کی روانی و شگفتگی قائم ہے۔ ایک قصیدے کی ردیف ہے "اسپ" قافیہ ہے "قرار" "رہوار" ملاحظہ ہو ؎

تا آفرید بہر غزا کردگار اسپ — شد بر جمیع جانوراں شہریار اسپ
سوگند خورد حق بشیم اسپ غازیاں — بنگر کہ در چہ پایہ رسانید کار اسپ

. . . .

فرزانہ راست یار دو م از نبرد رخش — فرزانہ راست پاسے سیم در فرار اسپ
مرکب عزیز دار کہ دارد عزیز تر — از جان خویش مرد م خنجر گذار اسپ

تصرف بعض جگہ جوش بیان میں تصرف کر جاتا ہے۔ ایک شعر ہے ؎

نہ مدح و ذم بکراین کاتبیں مائیم — کہ نیک و بد ہمہ در طیِّ نامہ بنگاریم

کراما کی جمع کراین خاصہ تصرف ہے۔

مرثیے مظہر نے مرثیے بھی لکھے ہیں۔ دو مرثیے اس مجموعہ میں ہیں۔ ایک قصیدہ نمبر ۴۶ کس کا مرثیہ ہے؟ اس کا پتہ نہیں چلتا۔ مطلع ہے ؎

زدود محنت ایں سپہر زنگاری
کدام دل کہ نہ خوں گشت از جگر خواری

حسنِ مطلع ؎

کجا بجام طرب مجلسے بنا کردند
کہ از سپہر نبارید سنگ قہاری

یہ وہی مرثیہ ہے جس کو حضرت شیخ دہلوی نے حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی کا مرثیہ لکھا ہے شیخ نے جو اشعار نقل کئے ہیں ان میں یہ شعر بھی ہے ؎

جہاں بماتم خواجہ نصیر دین محمود
ہزار گونہ فغاں کرد و نوحہ و زاری

یہ شعر اس مجموعہ کے قصیدے میں نہیں ہے۔ ممکن ہے کچھ اشعار کاتب کے قلم سے ساقط ہوگئے ہوں۔ مگر ایک مشکل ہے قصیدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو صاحبوں کا مرثیہ ہے۔ تمہیدی چار شعروں کے بعد یہ شعر آتا ہے ؎

بقیۂ سلفِ سادہ یادگارِ کرام — کہ کرد ختم خلافت بہ سلکِ دینداری

(قرینِ قیاس ہے کہ بیچ میں کچھ اشعار چھوٹے ہیں جن میں مرثیے کے ہیرو کا نام آیا ہوگا) اسی طرح چار شعروں میں صفتِ مرحوم بیان کر کے کہتا ہے ؎

دو بودہ اند یکے آفتاب و دیگر ماہ — کہ فیضِ رحمتِ شاں بود روز و شب جاری

چرا دفتاد ندانم کنوں چہ روز آمد — کہ شد ز روشنی ہر دو۔ روز و شب تاری

اسی طرح دونوں مرحوموں کے واسطے آخر تک ماتم کرتا گیا ہے۔ دعا میں کہتا ہے ؎

برحمتِ تو کہ عام است در جہاں بانی — بہ عزتِ تو کہ خاص است در جہانداری

کہ روحِ اعظم آں ہر دو پیشوائے کرام — کہ مقتدائے جہاں بودہ اند ز اختیاری

اشکال یہ پیش آتا ہے کہ اگر حضرت شیخ چراغ دہلی مطہر کے پیر تھے تو موصوف کا مرثیہ دوسرے بزرگ کے ساتھ ملا کر لکھنا اور دعا وغیرہ میں دونوں کو مساوی رکھنا آدابِ مریدی کے کہاں تک موافق ہوگا؟ ظاہر ہے کہ خلاف ہوگا!

دوسرا مرثیہ قصیدۂ منیرے ہے۔ یہ مولانا شمس الدین کے ماتم میں ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

ایں چرخِ تیرہ رنگ کہ بحریست پُر حباب — ہر دم کند بہ سیلِ اجل خانۂ خراب

ہر لحظہ بادِ ساحلِ او زیں شگفتہ باغ — سروے برد ز بیخ و چراغے برد ز تاب

ماند بہ آسیائے و ما درمیانِ او — چوں دانہا کہ سودہ شود زیرِ آسیاب

. . . .

آفت بہ دہر چیست کہ شد دہر بس حزیں — غوغا بہ شہر چیست کہ شد شہر بس مُصاب

دلہا چرا شدہ است ہمہ چاک بے صلاح — سرہا چرا شدہ است ہمہ پُر ز خاک ہم خراب

گریاں چرا است اہلِ زمیں ہر کہ خاص و عام — نالاں چرا است خلق ہمہ ہر کہ شیخ و شاب

گویی مگر کہ قبلۂ آفاق شد نہاں | دانم مگر کہ کعبۂ حاجات شد خراب
یعنی نماند خدمتِ شمس دُنا و دیں | صدر الشیوخ خواجگی آں خواجۂ مستطاب
آں ملجاء ممالک و آں منجاء ملوک | آں عمدۂ خلافت و آں زبدۂ مناب
آں خاصۂ خدائے کہ روئے مبارکش | بودے دلیل رحمت و آثار فتح باب

گُریز کی نُدرت مطلع ہے ؎

ساقی بیار جام مے سُرخ زاں بسوے | مشکیں چو تاب صبح و مصفا چو آب جوے

آگے اشعار میں شراب کی تعریف کرتے کرتے کہتا ہے۔

تیز است و تلخ و مرد شکار و گہر نما | مانند خنجر ملک الشرق تاجوے

تغزّل اس مجموعہ میں مطہر کی کوئی غزل نہیں ہے مگر بہت سے اشعار ایسے ہیں جو عمدہ غزل کے شعر ہوسکتے ہیں۔ مثلاً ترکیب بند نمبر ۲ کا بند چہارم فارسی نادر غزل کے ہم پہلو رکھا جاسکتا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

کارم از دست رفت ساماں چیست | دردم از حد گزشت درماں چیست
طشت بدنامیم ز بام افتاد | راز در دل ہنوز پنہاں چیست
محتسب گشت وکس نمی پرسد | کہ بگو جرم ایں مسلماں چیست
از من آں شوخ را بگوائے دوست | کیں ہمہ کینہ با محبّاں چیست
گر تو یوسف شدی بزیبائی | دلِ من در چہ زنخداں چیست
ور تو عیدی رخت مبارک باد | بے زری در غم تو قرباں چیست
(۴) ور نشینی بر آں کہ خوں ریزی | اینک استادہ ایم فرماں چیست
گہ زنی نیشش و گہ دہی نوشم | اگر ایں لطف می کنی آں چیست
ذرّ تو چوں شمع جمع روشن شد | با من ایں گفتنِ پریشاں چیست
من دعا گوئے حضرتِ وم آرے | کار من جز دعائے سلطاں چیست

شعر نمبر ۸ سے امیر خسرو اور سعدی شیرازی کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔

سحر حلال

اکنوں کہ ہوا معتدل و آب مصفّاست — وز سبزہ ہمہ روئے زمیں سبز چو دیباست

در دامن آفاق نہ گرد و نہ غبارست — در خلقتِ ایام نہ گرما و نہ سرماست

ہر سو کہ کنی رخ چمن و آب روانست — ہر جا کہ نہی پائے گل و سبزہ و صحراست

در دستِ ہوا حقّۂ کافور و عبیرست — در جیبِ صبا نخلخۂ عنبر ساراست

حاصل شدہ از روئے زمیں ہر چہ مرادست — واصل شدہ از دورِ زماں ہر چہ تمناست

ہنگام مے و مجلس و معشوق و مغنّی است — و ایام نشاط و طرب و عیش و تماشاست

تاخیر مکن ہیچ در آرایشِ مجلس — کاصحابِ طرب حاضر و اسباب مہیّاست

اینک دہل و دفّ و مے و چنگ و چغانہ — و اینک غزل و نقل و گل و ساغر و صہباست

خوباں ہمہ مہ روئے و حریفاں ہمہ خوشخوے — ساقی و مغنّی طرب انگیز و دل آراست

بر سبزۂ سیراب فلک لعل بساطے — وز دیبہ و زربفت بہ یاقوت محشّاست

برخیز بہ شادی کہ گہِ نوش و نشاطست — بنشیں بہ تنعّم کہ گہِ نزہت و نعماست

و آہنگ بہ مے کن کہ مہ روشن جامش — تابندہ تر از چشمۂ خورشید بجوزاست

وز دست بتِ شنگ کہ از شکل و شمائل — دلبند و دلآویز و دل آرام و دل افزاست

آں ماہ پری روئے کہ قرطیش و حمائل — بر دوش و بناگوش چو جوزا و ثریاست

شمشاد بہ گیسو و سمن در بر و بازوست — گلنار برخسار و سہی سرو ببالاست

ہر سو کہ رود آفتِ آفاق در آنسوست — ہر جا کہ بود فتنۂ عشاق در آنجاست

نقل از لبِ شیرینش و شراب از لبِ ساغر — میخواہ کہ ہمشیرۂ مے شیرۂ خرماست

ایں حاصلِ ایام حیاتست کہ گفتم — وز اعظمِ لذّات کہ در عمر موفّاست

دیگر غم و اندوہِ جہانست فراواں — خوش وقت کسے کز غم و اندوہ مبرّاست

قانع بہ قرینے شدہ خرسند بہ قوتے — نے در غم امروز نہ اندیشۂ فرداست

فارغ دل و فرخنده چنانست که گویی — منجملهٔ اصحاب یل و صفدر و لالاست
والا ملک الشرق حسام دول و دین — کاراسته بفر ملک العرش تعالاست

٢

روز شادی و خوشی وقت سماع و طرب است — نوبت نوش و نشاط است و گه نشو و نماست
گر کسے را سخنے در مے و مطرب باشد — بارے امروز درین حال که مائیم رواست
مطربا نغمه برآور که اوان طرب است — ساقیا باده بیاور که زمان صهباست
باده بر یاد ملک ده که باقبال ملک — بزم فردوس و قدح کوثر و ساقی حوراست
ملک الشرق فلک قدر ملک عین الملک — کافتاب کرم و سایهٔ الطاف خداست

٣

هر کرا شمع توئی نور بصر حاجت نیست — زلف مشکین ترا عنبر تر حاجت نیست
خسته کز لب شیرین تو باید رشحه — شربتے دیگرش از قند و شکر حاجت نیست
عید نوروز جهان طلعت زیبات خوش است — زینت صبحدم و منت خور حاجت نیست
با رخ و زلف و بناگوش و قدت مردم را — باغ و بستان و ریاحین و شجر حاجت نیست
چشم خونریز ترا غمزه پسند است سلاح — تیغ و رمحے و گرز و تیر و تبر حاجت نیست
درج دندان تو در درج عقیقین تو هست — بس بود زینت تو لعل و گهر حاجت نیست
خواجه را نیز پئے ضبط جهان رای منیر — کافی آمد و جیش و حشم حاجت نیست
صدر آفاق و زمان قطب جهان زین الدین — که معالیش پدید است خبر حاجت نیست

ترکیب بند

زمستانست و باد سرد از کهسار می آید — بگردان آتشین جامے که آتش کار می آید
فروکن پردهٔ خرگاه و چنگ آهسته تر می زن — که هر چه آهسته می گیری نوا ها زار می آید
بده در جام کافوری شرابے زعفران گون — که از بویش نسیم نافهٔ تاتار می آید
غلام آن مے لعلم که چون بر دست می گیرم — بوئے او عمر و هم از در و دیوار می آید

۱۶ قصیده

مریز آں جرعہ سے برگل کہ چوں در خاک افگندن | تو ار آساں ہمی دانی مرا دشوار می آید
سبو بر سر گرفتن کار رندانست و قلاشاں | مرا فرماے ایں خدمت ترا گر عار می آید
نشاط مے غنیمت داں کہ جمع شادمانیہا | اگرچہ اندک بود بعد از غم بسیار می آید
ندانم محتسب از من چہ میخواہد کہ ہر بارے | بقصدِ من دواں تا خانۂ خمار می آید
ہمی خواہم کہ یک و نئے کنم وحشت ولے شرمم | ازاں ریش سپید و گوشۂ دستار می آید
ملک را قصہ خواہم داد روزے از جفاے او | کہ شورے می فتد آندم کہ در بازار می آید

جہانِ جود عین الملک والا رستم ثانی
کہ رشکِ حاتم طائی ست و رغمِ معنِ شیبانی

(دیگر)

روز شد پردہ ز خرگاہِ شبا بر دارید | بادہ در ساغر ریزید و نوا بر دارید
تازہ جشنی ز جہاں تا بجہاں است کنید | بس سماعی ز زمیں تا بہ سما بر دارید
بہ نئے و بربط و طنبورہ نوا بر دارید | وز دف و نائی و دہل شور و صدا بر دارید
ہم بیک زلزلہ و زمزمہ چوں نفخۂ صور | کوہ اندوہ و غم از سینۂ ما بر دارید
ہر کہ دارد سر اندوہ ازیں مجلس سور | دست گیرید و راہ بہر خدا بر دارید
جامے از صدق و صفا بر کف اصحاب نہید | زر دلِ شاں ہمہ تزویر و ریا بر دارید

قصیدہ نمبر ۲۵ کی تشبیب دیکھو۔ قاآنی کا رنگ صاف جھلک رہا ہے ؎

اہلا و نعم عینی اے یادِ تو بہاری | کز دم عبیر بیزی وز بوے مشکباری
گلدستۂ ختائی یا شاخ ارغوانی | یا غالیہ یمانی یا نافۂ تتاری
عیسیٰ نۂ و در دل صد جاں نشستہ حاصل | مانی نۂ و بر گل صد نقش می نگاری
چوں جنیاں نۂ پیدا پنہاں رخی و پیدا | چوں عاشقانِ شیدا مدہوش و بیقراری
نقاش سطح آبی فراش رہ خیالی | لشکرکش سحابی فرماندہ بخاری

حور و پری سرشتی رضواں باغ و کشتی — دلجوئی چوں بہشتی خوشبوے چوں بہاری

ادریس ہمدمانی قیس راہبانی — برجیس بوستانی بلقیس لالہ زاری

ہر صبح چوں طبیباں آئی بر جیبیاں — وز مسکن غریباں شبہا خبر تو داری

پیک جہاں نوردی سیاح بادہ گردی — ہر جا کہ عزم کردی گوئی درآں دیاری

امروز با بدا داں مست آمدی و شاداں — خرم چو طبع رادان خوش چوں دل حواری

مشک و عبیر بیزاں گلگیر گل لالہ ریزاں — افتاں ز شوق و خیزاں چوں مردم خماری

آخر الکلام | مظہر کا کلام متانت و بلندی میں معاصرین کے برابر ہے۔ قوتِ مشاہدہ اور قدرتِ بیان، شگفتگی و روانی میں اُن سے بہت بڑھا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر مظہر کا کلام رائج و مقبول ہو گیا ہوتا تو ایک سے زیادہ اس کے معاصرین بزمِ سخن میں وہ مرتبہ بلند نہ پا سکتے جو آج اُن کو حاصل ہے۔

(در رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ ہاے جولائی و اگست ۱۹۳۵ء)

آئینہ سکندری

(ریویو)

بابو راماشنکر صاحب دہلوی نے پچھلے سال انگلینڈ کا سفر کیا تھا اس سال اُن کا سفرنامہ شائع ہوا ہے۔ ہم کو بابو صاحب کے حالات سے سوائے اس سفرنامہ سے دریافت شدہ حالات کے بالکل واقفیت نہ تھی۔ اس سفرنامہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بابو صاحب ایک لایق انگریزی داں خوش طبع ہوشیار شاعرانہ خیالات کے جنٹلمین ہیں۔ اس سفرنامے کی زبان خوب دلچسپ ہے اور یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ جو اجنبی الفاظ انگریزی استعمال کیے گئے ہیں اُن کی تشریح کر دی گئی ہے۔ یہ سفرنامہ دلچسپ واقعات سے لامال

ہے۔ اور انتخاب کرکے وہ واقعات درج کئے گئے ہیں جن کے دیکھنے سے ہندوستانیوں کو عبرت اور غیرت
دونوں حاصل ہوں۔ اس سفرنامہ کے دو حصے ہیں۔ پہلے میں تو سفر کے واقعات عمارت وغیرہ کا مذکور
ہے۔ دوسرے حصہ میں خاص کر انڈین اور کانونیل ایگزیبشن کا ذکر ہے اور کچھ تھوڑے سے حصہ میں اُن
رقعوں کا حال ہے جو مصنف کے پاس نوتہ کے طور پر جلسوں میں شریک ہونے کے لئے آئے تھے۔ بعد
اس فہرست کے چند جلسوں کا بیان ہے۔ ۱۸ و ۱۹ صفحہ پر ایک واقعہ کا ذکر ہے جو مصنف کو اس وجہ سے
پیش آیا تھا کہ وہ فرنچ نہیں سمجھتے تھے اور انگریزی سے کام بہ دقت تمام نکلا۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا
ہے کہ جو لوگ یورپ کا سفر کرنا چاہتے ہیں اُن کو فرنچ سیکھنا بھی ضروری ہے۔ لندن کے حالات میں چارنگ
کراس اور ہائڈ پارک کے حالات پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ فحش ہے کہ الامان۔ مصنف کی
یہ رائے نہایت صائب ہے کہ "میری خواہش ہے کہ میرے اس بیان سے آپ بخوبی سمجھ جائیں کہ جو ان
ہندوستانیوں کو (جو برسوں سے تحصیل علوم کے لئے یہاں ہیں یا بہت سے امتحانات وغیرہ دینے
کے لئے آئیں گے) اُن کا بہت سے موقعوں پر امتحان کیا جائے گا"۔

اس سفرنامہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یورپ میں وہ صفت جس کو ہم ایشیائی بے حیائی
اور بے شرمی سے تعبیر کرتے ہیں نہایت کثرت سے پائی جاتی ہے۔ جہاں علوم نے اہل یورپ کو دنیا
کی قوموں کا سرتاج خزائن قدرت کا مالک بنا دیا ہے وہاں اُن علوم کی بدولت مذکورۂ بالا صفتوں
میں بھی وہ صفائی اور تراش خراش ہوئی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اگر بنظر انصاف دیکھا جائے تو ہندوستان
کے وہ شہر جو اس معاملہ میں بدنام ہیں بے حیائی میں عشر عشیر بھی اُس درجہ پر نہیں پہنچے جس درجہ میں
لندن سے شائستہ شہر میں یہ صفتِ مذموم پائی جاتی ہے۔ بھلا ہندوستان میں یہ کہاں ہے کہ ہوٹل میں جا کر
ایک اجنبی آدمی بیٹھے اور نوجوان حسین عورت خود اپنی زبان سے اپنے حسن اپنے بناؤ سنگار کی تعریف
کرکے اُس اجنبی کو اپنی طرف مائل کرے اور پھر ایسی سر ہو کہ کپڑے چھٹانا مشکل ہو جائیں۔ بابو صاحب لکھتے
ہیں کہ اگر کوئی جنٹلمین وہاں کی اعلیٰ درجہ کی لیڈیوں کے جوبن اُن کے حسن اُن کے بناؤ کی خود اُن سے
یا اُن کے بزرگوں سے تعریف کرے تو وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ بے حیائی یورپ کے چال

چلن پر ایک بہت بڑا داغ ہی مگر اُس کے ساتھ ہی ہوس آف پارلیمنٹ، ویسٹ منسٹر ایبے اور اور بہت
سی عمارتوں کے حالات پڑھ کر اُن لوگوں کے علوم کی کثرت، فنون کی افراط، صنعت و دولت کے حالات
دیکھ کر شرم آجاتی ہی اور بے اختیار یہ کہنے کو جی چاہتا ہی کہ اگر اُن میں صرف ایک عیب بے حیائی ہی تو ہم میں صدہا عیوب کاہلی سستی،
غلامی خوشامد وغیرہ وغیرہ بھرے ہوئے ہیں۔ حق یہ ہی کہ یورپ کے حالات دیکھ کر خدا یاد آتا ہی اور یہ خیال پیدا ہوتا ہی کہ
آیا ہم بھی انسان ہیں یا نہیں! کیا اہلِ یورپ کے وہی دل و دماغ ہیں جو ہمارے ہیں؟ آیا اُن میں وہی صفات ودیعت
رکھے گئے ہیں جو ہم میں ہیں؟ اُس وقت دل کو سخت پیچ و تاب ہوتا ہی کہ اہلِ یورپ وہی ہیں جو ہم ہیں۔ فطرت نے جس فیاضی سے
اُن میں صفات ودیعت رکھے ہیں اُسی کشادہ دلی سے ہم کو بھی عطا فرمائے ہیں۔ مگر فرق صرف اتنا ہے کہ
وہ اُن صفات سے کام لیتے ہیں اور ہم اُن کو تلف کرتے ہیں۔ صفحہ ۶۴ و ۶۵ میں مصنف نے انگریزی
نظم کا جو ایک نوجوان حسین عورت نے گائی تھی فارسی میں خوب ترجمہ کیا ہی اور اُس وقت عجیب لطف
آتا ہی جب ایک نظر انگریزی نظم کا شعر دیکھا جائے اور پھر فارسی نظم اُس کے ترجمہ کا شعر۔ صفحہ ۷۳ کا واقعہ
بھی عجیب موثر ہی۔ لکھا ہی کہ میں ایک جگہ راستہ بھول گیا ایک شخص سے جو میلے کچیلے کپڑے پہنے کھڑا تھا
اُس نے نہ صرف راستہ بتایا بلکہ خود جا کر منزل مقصود پر پہنچا آیا اور جب بابو صاحب نے اُس کو ۵ر انعام
میں دیئے تو اُس نے کیا بلا کے الفاظ کہے جو دل کے اُس طرف جا کر چھدتے ہیں۔ "آپ ہندوستانی ہیں
اور ہندوستان کا دارومدار انگلستان پر ہی۔ سب انگریزوں کا فرض ہی کہ ہندوستانیوں کی مدد کریں۔
میں چونکہ انگریز ہوں چاہے کتنا غریب ہوں اس فرض سے بری نہیں۔ میں آپ کے ہمراہ روپیہ کے
لالچ سے نہیں آیا تھا بلکہ اپنا فرض ادا کرنے آیا تھا۔" اللہ اکبر ایک ادنیٰ آدمی کے یہ خیالات عالی۔ اہلِ
لندن کی ایک یہ صفت بھی انوکھی سی معلوم ہوتی ہی کہ اپنے ہمسایہ سے بالکل اجنبی رہتے ہیں۔ بابو صاحب
صفحہ ۸۳ میں لکھتے ہیں "لندن بھر میں کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جس کی صاحب سلامت تو کیا معنی جو اپنے
ہمسایہ کے نام سے بھی واقف ہو گو چاہے مدت سے برابر رہتا ہو" صفحہ ۸۴ میں سطر میں نہ معلوم کیا رہ گیا
ہی جس کی جگہ خالی ہی اور مطلب ندارد۔ صفحہ ۸۵ میں خوب تشبیہ دی ہی کہ ہندوستانی انگلش لیڈیوں میں
ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے گوپیوں میں کنہیا۔ حصہ دوم میں نمائش کا حال دیکھ کر دل بے قرار ہو گیا۔

جس ملک کا حال دیکھا وہ اپنی صنعت میں بفضل خدا دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہی۔ مگر بدقسمت ہندوستان کا یہ حال ہی کہ اپنی صنعت میں تنزل کر رہا ہی۔ جو خوبیاں ہماری صنعتوں میں ہیں ہم خود اُن سے ناواقف ہیں اور غیر ملکوں میں جا کر اُن کے مبصّروں کے سامنے کھلتی ہیں۔ وہ چیزیں جو ہم کوڑیوں کے نرخ بیچتے ہیں وہ غیر ملکوں میں اشرفیوں کے مول بکتی ہیں۔ افسوس ہم میں اتنی لیاقت بھی نہیں کہ خود اپنی صنعت سے تمتع اٹھائیں۔ ممالک غیر کی چیزوں کا تو کیا ذکر ہی۔ اس حصہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہی کہ اہلِ لندن اگرچہ ہندوستانیوں سے نہایت اخلاق سے ملتے ہیں مگر ہمارے انگلو انڈین حال بھی ویسے ہی رہتے ہیں جیسے ہندوستان میں۔ چنانچہ دہلی سے جو کاریگر نمایش میں گئے تھے اُن کو اُن صاحب بہادر کے مارے جو اُن کو یہاں سے لے گئے تھے گردن اُٹھانا بات کرنا دشوار تھا۔ جہاں کسی نے بات کی اور دوسرے نے کہا میاں صاحب آتے ہوں گے یہ سُنا اور اُس بیچارہ کے ہوش گئے۔ صفحہ ۱۳۷ میں لارڈ میئر کا ذکر ہی۔ اُس میں لکھا ہی کہ اُن کو اختیارات شاہی حاصل ہیں۔ سواری ایسی تزک و احتشام سے نکلتی ہی جیسے شاہانِ اسلام کی کبھی دہلی میں نکلتی تھی اور اُن کے کھانے کو نواب عبدالرحیم خان خانان کے کھانے سے تشبیہ دی ہی مگر لکھا ہی کہ اب بھی اُن کے یہاں بیس[۲۰] باورچی نوکر ہیں مجھ کو حیرت ہی کہ کہاں وہ زور شور کہاں یہ بے نمکی کہ کل ۲۰ باورچی شاید دو سو[۲۰۰] ہوں گے اور ایک صفر چھاپہ میں رہ گیا ہوگا۔ یہ سفرنامہ ۱۴۷ صفحہ پر چھپا ہی۔ دہلی مطبع محب ہند واقع دریا گنج سے بہ قیمت عہ نقد پر مل سکتا ہے۔

جامعہ عثمانیہ کا خطبۂ افتتاحیہ

(بحیثیت نائب امیر جامعہ)

حضرات ارکان مجلسِ اعلیٰ معزز رفقا، دیگر معززین، اساتذۂ کرام اور عزیز طلبا! آج کا مبارک دن ایک تاریخی دن ہے اور غرّۂ ذی الحجہ ۱۳۳۷ھ کو اعلیٰ حضرت آصف جاہ سابع خسرو دکن خلد اللہ ملکہ کے عہد ہمایوں کا وہ علمی کارنامہ شروع ہوتا ہے جو بفضل خدا صدیوں تک یادگار رہے گا۔ اس سرزمین میں مدتہائے دراز سے رود موسیٰ جاری ہے، جامعہ عثمانیہ کا یہ چشمۂ فیض رود عیسیٰ بن کر مردہ دلوں کو زندہ کرنے اور جہالت کے مریضوں کو شفا بخشنے میں اعجاز مسیحا دکھلائے گا۔ جس طرح خلیفہ ہارون الرشید کے بیت الحکمۃ اور خواجہ نظام الملک طوسی کے بغداد و نیشاپور کے مدارس نظامیہ کا نام صدہا برس گزر جانے پر بھی آج تک روشن ہے، اسی طرح جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ اور درسگاہوں کے کارنامے صفحاتِ تاریخ کو صدیوں تک منور و درخشاں رکھیں گے۔ انشاء اللہ العزیز۔

حضرات علم بہت بڑی نعمت ہے اور اس نعمت کو بنی نوع انسان میں پھیلانا سب سے بڑا فیض ہے۔ تعلیم ملکی زبان میں ایک ایسا دلکش خواب تھا جو برسوں ہمارے ملک میں دیکھا گیا۔ مبارک عہد عثمانی کی یہ کیسی برکت ہے کہ ہم اس روح پرور خواب کی تعبیر آج اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں ؎

مہ مصر ست داغ از رشکِ مہتابے کہ من دیدم
زلیخا کور شد در حسرتِ خوابے کہ من دیدم

اعلیٰ حضرت خسرو دکن خلد اللہ ملکہ کی سرپرستی میں مجلس اعلیٰ، رفقا اور اساتذہ کا یہ مجمع اس لئے قایم ہوا ہے کہ نعمت علم کو زیادہ سہل الحصول اور سریع الفہم بنا کر (جس طرح حضور ملک معظم قیصر ہند نے اپنے شاہی پیام میں فرمایا تھا) "علم اور امید کی کرنیں غریبوں کی جھونپڑیوں تک پہنچا دیں"۔ یہ کام بہت مشکل تھا اور ہے۔ لیکن اعلیٰ حضرت کی شاہانہ سرپرستی اور توجہ سرکار عالی کے محکمۂ تعلیمات کی جانفشانی اور ارکان دارالترجمہ کی

محنت و عرق ریزی نے اس دشوار گزار مرحلہ کو اس قدر آسان کر دیا کہ آج ہمارا پہلا قافلہ بخیر و خوبی جادہ پیما ہوتا ہے۔ خدائے تعالیٰ اس کو منزل مقصود تک صحیح و سلامت پہنچائے۔ آمین!

جامعہ عثمانیہ کی آیندہ نیک نامی اور کامیابی کا زیادہ تر دار و مدار اس کے محترم اساتذہ اور عزیز طلبار کی کوششوں پر ہے۔ جامعہ عثمانیہ کے حکام نے پوری کوشش لایق اور فاضل علما کے فراہم کرنے میں کی ہے۔ اور منشورِ خسروی نے علوم ظاہری کے ساتھ علم دین اور اخلاقیات کو لازم قرار دیا ہے۔ لہٰذا یہ توقع بالکل بجا ہے کہ ہمارے استادوں کی تعلیم میں علوم جدیدہ کی وسعت اور نئے اعلیٰ اصول تعلیم کے دوش بدوش قدیم استادوں کی شفقت و دل سوزی اور متانت و وقار کا جلوہ ہمیشہ نمایاں رہے گا اور ہمارے عزیز طلبار کی پیشانیوں میں مستعدی اور ہوشیاری کے ساتھ ساتھ ادب و سعادت کا نور ہمیشہ تاباں رہے گا جو تعلیم قدیم کا سرمایۂ ناز ہے۔ اور اس طرح جامعہ عثمانیہ کی تعلیم قدیم و جدید دونوں تعلیموں کی برکتوں اور خوبیوں کا مجموعہ ہوگی اور اس کے شاندار نتائج چار دانگ عالم میں اپنا کوسِ عظمت بجائیں گے۔ ؎

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است
تو بدیں آرزو مرا برساں

اب میں دعا کرتا ہوں کہ خداوند تعالیٰ اعلیٰ حضرت خسرو دکن میر عثمان علی خان بہادر آصف جاہ سابع کو سالہائے دراز تک صحت و قوت کے ساتھ صراط مستقیم اور تخت سلطنت پر قایم رکھے اور ان کے اعزاز و جاہ و اقبال میں روز افزوں ترقی فرمائے۔ اور خاندان شاہی کو با صد جاہ و جلال اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین ثم آمین!!

نوٹ:۔ اختصار کی فرمائش کی تعمیل اس خطبے میں ملحوظ رکھی گئی تھی۔

(پنجشنبہ غرۂ ذی الحجہ ۱۳۳۷ھ)

پیش لفظ

(مکاتیب ڈاکٹر سر اقبال مرحوم)

سنہ ۱۹۰۲ء میں منشی شمس الدین مرحوم نامور سکرٹری کی یاد فرمائی پر میں اول بار انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوا۔ حسن اتفاق یہ ہوا کہ ٹھہرایا گیا یا دشس بخیر (سر) شیخ عبد القادر کے پاس۔ یہی قیام زندگی کے ایک اہم پہلو کی آفرینش کا باعث ہوا۔ شیخ مہربان نے اردو کا نامور رسالہ مخزن جاری کر رکھا تھا جس نے انگریزی داں طبقے میں اردو ادب کا ذوق پیدا کیا اور یہ بڑی خدمت تھی۔ اسی خدمت ادبی کے سلسلے میں شیخ کی خانقاہ اردو ادب کے اہل ذوق کا مرجع بنی ہوئی تھی۔ اقبال نیرنگ۔ احمد حسن منصف، خود شیخ بہ اربعہ عناصر ذوق ادب کے وہاں جمع ہوتے۔ مجھ کو اُس صحبت میں ان احباب کو دیکھنے ملنے اور ان سے خصوصیت حاصل ہونے کا موقع ملتا رہا۔ انجمن کی مجالس میں اقبال و نیرنگ کی نظمیں سنیں اور اُن کے ترنم سے لطف اندوز ہوا۔

غرض یہ تقریب تھی سر اقبال کی ملاقات و خصوصیت کی۔ ذوق ادب نے تعلقات میں خلوص پیدا کیا۔ خط کتابت جاری رہی۔ وہ خط کتابت کیسی تھی اس کو میں نہ لکھوں گا۔ میرے نام کے خطوط جو شامل مجموعہ ہٰذا میں خود بتا دیں گے۔

یہ زمانہ اقبال کی بلند اقبالی کے آغاز کا تھا۔ ایم اے کی ڈگری لے کر کالج میں پروفیسر مقرر ہو چکے تھے۔ زمانے کے حالات کے اعتبار سے یہ بڑا امتیاز نہ تھا۔ اصل امتیاز جو آیندہ ترقی و سربلندی کی پیشین گوئی کر رہا تھا وہ اُن کا ذوقِ معرفتِ ادبی تھا جو عمیق تھا، ہمہ گیر تھا۔

اس کا راز سن لو۔ یاد کر لو نقش دل کر لو۔ اسی کے نہ ہونے سے ہماری علمی مجلسیں بے کیف ہیں آواز دہل خالی سے زیادہ ان میں اثر نہیں۔ راز یہ تھا کہ اقبال کو خوش بختی سے اپنے وطن سیالکوٹ کے کالج میں بقول سر شیخ عبد القادر "علمائے سلف کی یادگار اور اُن کے نقش قدم پر چلنے والے ایک بزرگ

مولوی سید میر حسن صاحب" کی شاگردی کی سعادت حاصل ہوئی جو بقول سر شیخ یہ خاصہ رکھتے تھے کہ جو کوئی ان سے فارسی یا عربی سیکھتا اُس کی طبیعت میں اس زبان کا صحیح ذوق پیدا کر دیتے تھے۔ اقبال نے فارسی اور عربی کی تحصیل مولوی صاحب موصوف سے کی۔ اصل بنیاد اقبال کے اردو اور فارسی ادب میں بلند پایۂ ممتاز عصر با معرفت ادیب ہونے کی یہ ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ یورپ کی صحبت و تعلیم نے سونے پر سہاگے کا کام دیا۔ مگر سونا پرانی کان کا تھا۔ آج کے تعلیم یافتہ سہاگہ ڈالتے ہیں مگر سونا کہاں۔ چلا آجاتی ہی جوہر نہیں پیدا ہوتے۔ یہ میرا تجربہ نصف صدی کے ساری ہندوستان کی سیاحی اور دورے کا ہی۔ ۱۹۰۵ء تک اقبال ہندوستان میں رہے اُس وقت تک اردو شاعری کا ذوق کارفرما رہا۔ میری ملاقاتیں جا بجا ہوتی رہیں۔ خط کتابت جاری رہی۔ اُن کے یورپ جانے کے بعد سلسلۂ مراسلت موقوف ہوگیا۔ وہاں اُن کا دوسرا جوہر مخفی جلوہ فرما ہوا یعنی فارسی شاعری جس کی صدا سے آج ایک عالم گونج رہا ہی۔ یہ جلوہ فرمائی کس طرح ہوئی اس کا حال بانگ درا کے مقدمے میں پڑھو۔ جو سر شیخ کا لکھا ہوا ہی۔

اب دیکھنا یہ ہی کہ صدائے مذکور صدا بصحرا ثابت ہوئی ہی یا صدائے حاوی یعنی یہ دیکھنا ہی کہ شور کرنے والوں میں سے کتنے جادۂ اقبال پر گام زن ہو کر اُن کے فیض سے کامیاب ہوتے اور شاعر حقیقی بن کر اقبال کی حکمت کو دنیا میں ترقی مزید دیتے ہیں۔

یہ مجموعۂ خطوط شیخ عطاء اللہ صاحب (ہماری یونیورسٹی کے استاد گرامی اکنامکس کے چیرمین) شائع کر رہی ہیں۔ میں علی گڑھ کانفرنس کی خدمت کے سلسلے میں شیخ صاحب سے اچھی طرح واقف ہوں اور اُن کی سلامت روی معاملہ فہمی کا معترف۔ میرا گمان بھی نہ تھا کہ ان میں ذوق ادبی بھی ہی بلکہ جس تعلیم سے اُن کا تعلق ہی اُس کے لحاظ سے بیگانگی کی بدگمانی تھی۔ اسی لئے مجھ کو حیرت ہوئی جب میں نے اخباروں میں اُن کا یہ اعلان دیکھا کہ وہ اقبال کے خطوط شائع کرنے کا ارادہ کر رہی ہیں۔ حیرت نے مسرت کی صورت اختیار کی اور میں نے وہ خطوط شیخ صاحب کے پاس بھیجدئے جو اقبال مرحوم کے میرے نام تھے۔ اور شیخ صاحب نے مقدمے میں لکھا ہی کہ اس سلسلے میں سب سے پہلی قسط میری ہی

خدمت کی تھی۔

شیخ صاحب نے ازراہِ کرم جو الفاظ میری نسبت لکھدئے ہیں اُن کو پڑھ کر میں شرمندگی کی وجہ سے لرزہ بر اندام ہوا۔ بہرحال شکر گزار کرم ہوں اور شیخ صاحب کی کامیابی کا دل سے آرزومند۔ خطوط پر کچھ لکھنا آیندہ جلد کی اشاعت پر ملتوی رکھا ہے اور یہی مناسب معلوم ہوا۔

(۵ رجب المرجب ۱۳۶۳ھ)
(۲۷ جون ۱۹۴۴ء)

چودھری عبدالحمید خاں صاحب

(رئیس سہاور ضلع ایٹہ)

چودھری صاحب نے بتاریخ ۷۔ رمضان المبارک (۱۳۵۵ھ) روز دوشنبہ صبح کے وقت بمقام علی گڑھ میری کوٹھی حبیب منزل میں رحلت کی۔ مہینہ مبارک، دن بابرکت وقت پُر سعادت۔ اخیر تین دن میں جو حالت مرض کی قوت اور جسم کی کمزوری کی تھی اُس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روح دوشنبہ کے انتظار میں بصد دشواری وقت گزار رہی تھی غفرلہ۔ عمر ۴۳ سال۔

چودھری عبدالحمید خاں چودھری نوراللہ خاں صاحب رئیسِ سہاور کے منجھلے فرزند تھے۔ عربی۔ فارسی کی تحصیل کی تھی۔ تھوڑی انگریزی بھی پڑھی تھی۔ اپنے خاندان میں وہ پہلے شخص تھے جنھوں نے عربی پڑھی تھی۔ فقہ کا مطالعہ وسیع تھا۔ تحقیق بھی تھی۔ چنانچہ فقہ میں کتاب کنز الآخرۃ نظم میں لکھ کر شائع کی تھی۔ کتاب کا حجم ۱۵۹ صفحات ہے۔ عبادات، معاملات اور فرائض کے ضروری مسائل اُس میں ہیں۔ مفصل حاشیے دئے ہیں جن سے ناظم کی وسعتِ نظر اور تحقیق کا پتہ لگتا ہے۔ بڑی سند یہ ہے کہ مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی مرحوم نے اُس کو دیکھا اور پسند فرمایا تھا۔ چودھری صاحب سے مولانائے مغفور کو دلی اُنس تھا۔ کنز الآخرۃ کے دیباچے میں لکھا ہے کہ اُن کے اُستاد مولوی امیر حسن صاحب سہسوانی نے (جو مولوی تراب علی

صاحب فرنگی محلی کے شاگرد تھے) طالب علمی کے زمانہ میں مسائلِ فقہ یاد رکھنے کی یہ تدبیر بتائی تھی کہ مسائل ترجمہ کرکے اردو میں نظم کئے جائیں۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ چودھری صاحب شرح وقایہ اور مشکوٰۃ شریف پڑھتے تھے۔ اس کتاب کی اشاعت اپنی والدہ مرحومہ کے ایصالِ ثواب کے لئے کی ہے۔ خاندانِ مجددی میں شاہ عبدالغفور خاں صاحب مرحوم مغفور شاہ جہاں پوری کے مُرید تھے پیر کے پیارے تھے۔

طالب علمی سے فارغ ہوکر چودھری صاحب کے دو شوق رہے۔ شکار اور شطرنج۔ ایک لطیفہ یاد آیا۔ ہمایوں بادشاہ سے ایک روز اُس کے ایک مشہور امیر نے کہا کہ تین شینوں میں مجھ سے کوئی بازی نہیں لے جاسکتا۔ شعر۔ شکار۔ شمشیر بادشاہ نے مُسکرا کر کہا" ایک شین اور بڑھالو۔ شطاحی (عیاری)

چودھری صاحب نے ان دونوں شینوں میں پوری مہارت پیدا کی تھی۔ اُن کی طبیعت ابتدا سے معاملہ فہم، سلامت پسند واقع ہوئی تھی۔ اُن کے والد مرحوم مقروض ہوگئے تھے۔ سودی قرضہ، ریاست خطرے میں آگئی تھی۔ میرے عزیز دوست نے اپنے والد کی حیات میں کوشش کرکے ریاست کورٹ کرائی (حالانکہ اُس زمانہ میں ریاست کا کورٹ ہونا سخت دشوار تھا) خود منیجری کی اور پوری جانفشانی کے بعد کل قرضہ ادا کرکے ریاست واگزاشت کرالی۔ اس کے بعد بھی اُن کے والد نے ریاست اُن ہی کے اہتمام میں رکھی۔

والد کے انتقال کے بعد ریاست ورثا میں بہت کشادہ دلی اور حق رسی کے ساتھ تقسیم کردی۔ تین بھائی تھے ایک بہن۔ سب سے اوّل پوری جمعبندی بہن کے سامنے رکھ دی کہ جو جائداد پسند کریں لے لیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس کے بعد بڑے بھائی کو اُن کے مصارف زیادہ ہونے کی وجہ سے اپنے حصہ میں سے کم کرکے زیادہ حصہ دیا۔ بڑے بھائی کا انتقال ہوا تو اُن کی پوری جائداد جس میں زائد حصۂ جائداد بھی شامل تھا اُن کے ورثا میں تقسیم کردی۔ بھتیجوں کے ساتھ بھتیجی کو بھی حصہ دیا۔

اپنی ریاست کا انتظام اس خوبی سے کیا کہ آمدنی سے خرچ ہمیشہ کم رکھا۔ پس انداز سے جائداد میں اضافہ کیا۔ بعض عزیزوں کو بے سود روپیہ دے کر ان کا سودی قرضہ ادا کیا۔ عزیزوں اور رعایا کے پورے غمخوار اور پشت پناہ تھے۔ بعض حالات میں اُن کا عزم حیرت خیز تھا۔ دوسروں کے لئے اپنے آپ کو خطرے

میں ڈال دیتے تھے۔ ایک مقدمۂ قتل میں ایک عزیز کی پوری ایک لاکھ روپیہ کی ضمانت کر دی تھی۔ نتیجہ یہ کہ رعایا بلا امتیازِ مذہب و ملّت ان پر فدا تھی۔ بہت سے بیکاروں کو زمین دے کر، دکانیں دے کر، باغات دے کر باکار بنا دیا تھا۔

عادتیں بہت سادہ تھیں۔ کھانے اور لباس وغیرہ میں کوئی تکلف نہ تھا۔ نئی روشنی سے اتنے دور تھے کہ انیسویں بیسویں صدیاں گویا اُن کے لئے دنیا میں آئی ہی نہ تھیں۔ دین کے پورے پابند، معاملات میں محتاط، لغویات سے یکسو۔

علاوہ عزیز بھائی ہونے کے میرے اُن سے دوستانہ تعلقات بھی تھے جو چھپن برس قائم رہے۔ رسمی نہیں۔ سچے دلی تعلقات۔ اور دیکھو اس چھپن برس میں چھپن منٹ بھی ایسے نہیں آئے کہ اُن تعلقات میں ذرا بھی فرق آیا ہو۔

میرے حیدرآباد جانے پر جو نظم لکھی تھی اُن کی قلبی محبت کی شان ہے۔ فرماتے ہیں:-

تو اے نسیم چو پیچی بہ زلفِ مشکینش — سلامِ شوق رساں از حمیدِ مسکینش
پیامِ ما پس ازاں بے وفا بگوش گزار — کہ بے تو حالِ دلِ زارِ ماست زار و نزار
فراقِ روئے تو جانم بہ قیدِ غم افگند — الا کہ نیست مرا سودمند وعظ نہ پند
تو محوِ دیدِ گل و بلبل و بہارِ چمن — مرا رسید کنوں بے تو دست تا دامن
تو در حریمِ دکن بزمِ عیش آرائی — مرا خیالِ جمالِ تو کرد صحرائی
ترا خوش ست تماشائے شمع و پروانہ — مرا بس ست خرابات و دشت و ویرانہ

حیف کہ دستِ اجل نے ایسے عزیز دوست اور بھائی کو جدا کر دیا۔ رضینا بقضاء اللہ۔ آنکھوں سے دور سہی دل سے دور رہے نہ ہو سکتا ہے۔ ؎

اے ہمنفسانِ محفلِ ما — رفتید۔ ولے نہ از دلِ ما

اللھم اغفر لہ وارحمہ وادخلہ جنات النعیم

(کانفرنس گزٹ علی گڑھ مورخہ یکم دسمبر ۱۹۳۶ء)

شیخ محمد بن طاہر گجراتی

خاک ہندوستان میں جو نامور علمائے دین پیدا ہوئے ہیں اُن میں شیخ محمد بن طاہر رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔ شیخ ممدوح اس ملک کے اُن معدودے چند علماء میں سے ہیں جن کی قسمت میں فن حدیث کی خدمت اور احیاءِ سنۃ کی سعادت لکھی تھی۔ مغلیہ سلطنت جہاں اور بہت سی برکتیں لائی تھی وہاں حدیث وسنۃ کا رواج بھی تھا۔ اکبری و جہانگیری عہد میں شیخ محمد بن طاہر اور شیخ عبدالحق دہلوی یہ رحمت کا چشمہ اس کے سرچشمہ (ملک عرب) سے لائے اور فیض سے دلوں کو شاد و شاداب فرمایا۔ شیخ نورالحق محترم باپ کے ارجمند فرزند تھے۔

مصنف کنزالعمال نے اگرچہ عمر عرب میں بسر کی لیکن تھے اسی ملک کے فرزند اور یہیں کے دامن فیض کے تربیت یافتہ۔ امام ربانی حضرت مجدد الف ثانی نے طریقہ مجددیہ رائج فرمایا جس میں تمام ترقی کا دار و مدار اتباع سنت پر ہی۔

مغلیہ سلطنت کا آفتاب لب بام آپہنچا تھا کہ ایک اور آفتاب علم طالع ہوا۔ شاہ ولی اللہ صاحب مرحوم ملک عرب کو گئے اور چشمۂ رحمت کا صاف اور خالص آب حیات دل سے لگا کر لائے شاہ صاحب کا فیض تھا کہ دریا بن کر ملک میں پھیلا۔ سرد دلوں کی خشک کشت زار سرسبز ہو کر لہلہانے لگی۔ کون ہے جو شاہ عبدالعزیز صاحب کے نام سے نا آشنا ہو۔ مولانا اسمٰعیل صاحب اور مولانا سید احمد صاحب کی کوششیں اظہر من الشمس ہیں۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔

عہد اکبری الحاد اور دہریت کے لئے بدنام ہی۔ لیکن نگاہوں سے احیاءِ سنۃ کی وہ برکتیں نہاں ہیں جو شیخ محمد بن طاہر کی کوششوں سے ظہور میں آئیں۔ ان الحسنات یذھبن السیئات (نیکیاں برائیوں کو محو کر دیتی ہیں) کیا عجب ہے کہ اس عہد کی آزادیوں کی تلافی سعادت سے ہو گئی ہو۔ آگے چل کر تم پڑھوگے کہ اس کوشش میں شیخ کا ہاتھ بادشاہ نے بھی بٹایا تھا۔

ولادت ونسب

شیخ محمد بن طاہر قوم کے بوہرے تھے اور پٹن (گجرات) میں پیدا ہوئے۔ سنہ ولادت نظر سے نہیں گزرا بوہرہ قوم آج بھی تمول کے لحاظ سے مشہور ہی۔ اس قوم کو چونکہ تجارت سے تعلق قدیم ہی اس لیے یہ لقب ملا۔ ابتداءً یہ لوگ بت پرست تھے۔ کوئی چھ سو برس گزرے ہوں گے کہ ایک فاضل ملا علی کی ہدایت سے دولت اسلام سے مالا مال ہوئے۔ ملائے ممدوح کھنبات میں مدفون ہیں چونکہ ملا علی امامیہ تھے انھوں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔ جب احمد شاہ کا دور دورہ گجرات میں ہوا اور اسلام کو ترقی ہوئی تو علماء وقت کی تلقین سے (جو اہل سنت والجماعت تھے) بہت سے بوہرے سنّی ہوگئے۔ اختلاف عقیدہ نے اس فرقہ میں بہت سے نزاع پیدا کر دئے۔ نواب صمصام الدولہ لکھتے ہیں کہ جو بوہرے شیعہ ہیں وہ ہمیشہ امور شرعیہ میں ایک فاضل صالح کے ماتحت رہتے ہیں۔ مال کا پانچواں حصہ سادات مدینہ منورہ کے واسطے بھیجتے ہیں۔ زکوٰۃ کا روپیہ رئیس مذکور کو دیتے ہیں تاکہ محتاج بوہروں میں صرف ہو۔

تحصیل علم

شیخ محمد بن طاہر نے ابتدائے علوم کی تحصیل وطن میں کی۔ اس کے بعد حج اور تکمیل علم کے واسطے حجاز کا قصد کیا۔ وہاں خوبی قسمت نے ایک ایسے آستانہ پر پہنچایا جو علوم ظاہر و باطن کا مرجع تھا ؎

از برائے سجدۂ عشق آستانے یافتم
آستانے بود مطلوب آسمانے یافتم

یعنی حضرت شیخ علی متقیؒ[1] کی خدمت میں حاضر ہو کر شرف بیعت و تلمذ سے مشرف ہوئے۔ شیخ ممدوح اولیاء کاملین میں سے ہیں۔ کمالات باطنی کے ساتھ علوم ظاہری میں بھی باکمال تھے۔ کنز العمال اُنہی کی تصنیف ہی۔ علاوہ اس معرکۃ الآراء تصنیف کے بہت سی کتابیں تصوف میں ہیں۔ شیخ عبدالحق ان تصانیف کی نسبت فرماتے ہیں کہ ایسی تصانیف اُسی کامل کے قلم سے نکل سکتی ہیں جس کو درجہ استقامت اور مرتبہ ولایت دونوں کا کمال حاصل ہو۔

کنز العمال سیوطی کی جامع صغیر اور جمع الجوامع سے ماخوذ ہی۔ شیخ دہلوی نے لکھا ہی کہ سیوطی کی دونوں کتابوں کا کنز العمال سے مقابلہ کرو معلوم ہوتا ہی کہ مؤلف کنز العمال نے کیا کام کیا ہی۔ شیخ علی متقی اور اُن کے خلفا

---

[1] ۹۱۲ھ میں نہروالہ میں پیدا ہوئے۔ (الندوہ)

کے حالات اخبار الاخیار میں پڑھو اور دیکھو کہ وہ کیسے دامن فیض تھے جن کے سایہ میں شیخ محمد بن طاہر اور شیخ
عبدالحق محدث دہلوی سے شاگرد تربیت پاتے تھے۔ شیخ محمد بن طاہر نے شیخ ممدوح سے علم حدیث کی تحصیل
کی اور فیض باطن حاصل کیا۔

مراجعت

شیخ محمد بن طاہر جب عرب سے خزانۂ علم سے مالا مال ہو کر وطن میں آئے تو انھوں نے ان
بدعتوں کی بیخ کنی پر کمر ہمت باندھی جو ان کی قوم میں پھیلی ہوئی تھیں۔ فرقہ مہدویہ کے استیصال
میں سخت کوشش کی۔ احیار سنت کا جو جوش شیخ کے دل میں موج زن تھا اس کا اندازہ اس واقعہ سے
ہو سکے گا کہ انھوں نے عمامہ سر سے اتار کر رکھ دیا تھا اور یہ عہد کر لیا تھا کہ جب تک تشیع اور دوسری بدعتوں
کو جڑ سے اکھیڑ کر نہیں پھینک دوں گا عمامہ نہیں باندھوں گا۔ شیخ اپنی کوششوں میں سرگرم تھے کہ ۹۸۰ھ میں
خیمۂ شاہی گجرات میں پہنچا۔ بادشاہ نے شیخ سے ملاقات کی اور کہا کہ آپ کی نذر (منت) کا پورا کرنا میرے
ذمہ ہے۔ آپ عمامہ باندھیں۔ یہ کہہ کر اپنے ہاتھ سے عمامہ ان کے سر پر باندھا۔ وعدۂ شاہی اس طرح پورا ہوا
کہ خان اعظم (جو راسخ عقیدہ حنفی تھے) صوبہ دار گجرات مقرر کئے گئے۔ خان اعظم نے شیخ اجل کو پوری مدد دی
اور دونوں کوششوں سے مل کر بہت سی بدعتوں کی جڑ کاٹ دی۔ اس موقعہ پر یہ نہ کہہ اٹھنا کہ اکبر نے
تالیف قلوب کے لئے ایسا کیا ہوگا۔ کیونکہ جم غفیر شیخ کے خلاف تھا اور تالیف قلوب کی حکمت عملی دوسرا
پہلو اختیار کرنے کا مشورہ دے سکتی تھی نہ شیخ کی تائید کا۔ خان اعظم تقریباً چار برس صوبہ دار گجرات
رہے۔ اس کے بعد ان کا تبادلہ ہو گیا۔ بجائے ان کے ایک ایرانی امیر گجرات پہنچا۔

اس تبدیلی سے بوہروں میں از سر نو شورش اور شیخ کے کام میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ شیخ نے
عمامہ سر سے اتار کر پھر رکھ دیا اور فریادی بن کر دربار کو چلے۔ ہنوز آگرہ نہ پہنچے تھے کہ اجین وسارنگ پور
(مالوہ) کے درمیان بعض سیاہ باطنوں نے حملہ کر کے شہادت سے سرخرو کیا۔ یہ واقعہ ۹۸۶ھ کا ہے۔
لاش پٹن لا کر شیخ کے بزرگوں کے مقبرہ میں دفن کی گئی۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ۔

درس و تدریس

علاوہ استیصال بدعت کے شیخ نے ترویج حدیث میں بھی بہت کوشش کی طلبا کو برابر
علم حدیث پڑھاتے رہے۔ اپنے شیخ کی ہدایت کے بموجب طالب علموں کے واسطے سیاہی

اپنے ہاتھ سے تیار کرتے تھے۔ پڑھاتے وقت بھی سیاہی گھسنے کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ فرماتے تھے ایک حصہ دوسرے کام سے کیوں مانع ہو۔ دل بیار دست بکار۔

تصانیف سب سے زیادہ مشہور تصنیف مجمع بحار الانوار ہے۔ اس میں کلام مجید اور حدیث کے مشکل لغات کا حل اس انداز سے کیا ہے کہ صحاح ستہ کی شرح بھی ضمناً ہو گئی ہے۔ شیخ نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ میں نے اس کتاب کی بنیاد نہایہ ابن اثیر اور ناظرین الغریبین پر رکھی ہے۔ کتاب مذکور سنہ ۹۷۸ھ میں ختم ہوئی۔ برخلاف متاخرین شیخ، ماقل و دل کے اصول پر کاربند ہیں۔ اسی سے اُن کی تحریر میں زائد فضول الفاظ کم ملیں گے۔ علاوہ مجمع بحار الانوار کے اور تصانیف بھی ہیں۔ ایک رسالہ مغنی ہے جو فنِ رجال میں ہے۔ شیخ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ "اس کتاب میں اسماء رجال کی صرف تصحیح کی ہے۔ حال نہیں بیان کیا۔ نہایت مختصر و مفید کتاب ہے۔ مجمع بحار الانوار کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک کتاب سیر میں بھی لکھی ہے اُس کے حوالہ سے اکثر فوائد خاتمۂ کتاب مذکور میں نقل کئے ہیں۔ مجمع بحار الانوار کے خاتمہ میں ایک عالم شوق میں فرماتے ہیں کہ غرض اس تصنیف سے یہ ہے کہ "ذکر پاک میں عمر صرف ہو" دیکھو پاک روحیں تھیں پاکیزہ باتوں سے تسلی پاتی تھیں اور سرور حاصل کرتی تھیں۔ یہی پاک نیت تھی جس سے مقبولیت نصیب ہوتی تھی۔ مجمع بحار الانوار کا چشمۂ فیض آج تک جاری ہے۔ پانی کی جگہ انوار موجیں مار رہی ہیں۔

(رسالہ الندوہ لکھنو بابتہ ماہ جولائی سنہ ۱۹۰۷ء)

منشی محمد احتشام علی صاحب رئیس کاکوری

آج سے باون برس پہلے کانپور میں مولانا احمد حسن صاحب مرحوم کے مدرسے میں دستار بندی سال بہ سال بڑے اہتمام سے ہوتی تھی۔ خاکسار بھی حاضر ہوتا تھا۔ غالباً سنہ ۱۳۱۰ھ میں پہلی ملاقات منشی صاحب مرحوم سے ہوئی۔ ہم دونوں "پرانے فیشن" کے لوگ تھے۔ اس لئے واقعی "پرانے دوست" بنے نہ جدید "پرانے دوست"

ربط کے قایم ہونے، بڑھنے اور معیار پر پہنچنے کے لئے ایک زمانہ لگا۔ مگر اس عرصے میں بھی نہ صرف قایم رہا بلکہ بڑھتا رہا۔ بالآخر خلوص و محبت کے اُن مراتب پر پہنچا جو اُس عہد میں کمیاب یا شاید نایاب ہیں۔

اس طویل زمانہ میں بہت کچھ منشی صاحب کو دیکھا، میں لکھنؤ جاتا اور اکثر جاتا، ناممکن تھا کہ کسی دوسری جگہ ٹھہروں، منشی صاحب علی گڑھ تشریف لاتے تو لازماً میرے یہاں کرم فرماتے چنانچہ دیکھا منشی صاحب کے اوصاف کا نقش دل پر گہرا ہوتا گیا۔

قصبۂ کاکوری اپنے بعض اوصاف میں اودھ کے دوسرے قصبات سے ممتاز رہا ہے یہاں تک کہ عالمگیری یہ مقولہ زبان زد ہے "مدتّغان کاکوری"۔

یہ قصبہ جہاں تک میرا علم ہے اودھ کے تمام مشہور و اہم بالشان قصبات میں سب سے زیادہ لکھنؤ سے قریب ہے، نہ صرف مسافت میں بلکہ تعلقات میں بھی۔ شاہی زمانے میں عمائد کاکوری ممتاز مراتب پر سربلند و معتمد رہے۔ اخیر شاہی قافلہ انگلستان مولوی مسیح الدین خاں صاحب مرحوم کی قیادت میں گیا جو کاکوری کے نامور فرزند تھے۔

باوجود اس کمال قرب کے کمال یہ ہے کہ لکھنؤ کے خاص اثر سے ہر طرح دور بلکہ نفور رہا، تفصیل بے موقع ہوگی کاکوری میں علم تھا، درویشی تھی، دانشمندی و معاملہ فہمی تھی۔ دنیاوی مراتب کی بلندی تھی، اور اول سے تھی آخر تک رہی۔

منشی صاحب کے والد منشی امتیاز علی صاحب مرحوم اپنے عہد میں لکھنؤ کے ممتاز اور عالی مرتبہ وکلا میں تھے جن کی قانون دانی اور معاملہ فہمی کا سکّہ بیٹھا ہوا تھا۔ اُسی کے ساتھ پاکیزگیٔ اخلاق۔ باوضعی دینداری زمانہ شناسی میں با امتیاز و بلند پایہ تھے۔ حضرت مولٰنا فضل الرحمٰن قدس سرہٗ سے عقیدت و بیعت تھی۔ سرسید کی تحریک کے مردانہ حامی تھے۔ اور شاید اودھ میں اس میں مستثنیٰ تھے۔ کانفرنس کا اجلاس لکھنؤ ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ میرے محب قدیم منشی احتشام علی صاحب اسی آہنی حصارِ قصبہ کاکوری کے چشم و چراغ اور نامور اور مستحکم آئین باپ کے فرزند۔ ان کی صفات میں دونوں کا جلوہ تھا نیز لکھنؤ کی شائستگی کا لباس میں۔ کھانے میں نشست برخاست میں۔ معاشرت میں گفتگو میں پورا جلوہ شائستگی

کا نمایاں بلکہ تاباں تھا۔ لباس میں وہی انداز جاڑے اور گرمی کا تھا جو عمائد لکھنؤ کا تھا۔ جاڑوں میں شال اور
جامہ وار کے جلوے اور جو ہر نظر آتے گرمیوں میں جامدانی وغیرہ نگاہ کو تازگی بخشتی۔ یہی نہیں۔ شال۔
جواہرات۔ عطر وغیرہ کی شناخت اس کے مالہ وماعلیہ کی واقفیت اور پرکھ میں اعلیٰ دماغ تھا۔ اب بھی
خربوزے اور آم کا شوق لکھنؤ کے اجڑے گھروں سے بعض نادر نمونے شال وغیرہ کے باہر لے آتا ہے۔ جب
ایسا موقع ہوتا میں ضرور یاد آتا۔ قریباً ہر سال شال کا کوئی نہ کوئی نادر نمونہ میرے واسطے خریدا جاتا درست
کرایا جاتا۔ اگر کنارہ حاشیہ وغیرہ کی ضرورت ہوتی توشہ خانہ سے نکلوا کر اضافہ کیا جاتا۔ غرض پرانا بوسیدہ
ٹکڑا نیا اور رعنا بن کر میرے سامنے آتا۔ متعدد ایسی نادر یادگاریں میرے یہاں ہیں۔

منشی صاحب کا دسترخوان قدیم مہمان نوازی۔ خوبی مذاق۔ بلند حوصلگی۔ اور لطافت کا نمونہ ہوتا
تھا۔ برسوں دیکھا لطف اٹھایا۔ ایک معیار بلند تھا جس سے کبھی نیچے نہ گرا۔ ہر کھانا دال سے لے کر بریانی
اور مزعفر تک اپنے معیار پر ہوتا۔ جس کو آپ کھا کر اندازہ کر سکتے تھے کہ اس کھانے کا معیار خوبی کیا ہے۔
دسترخوان ہمیشہ وسیع پایا۔ عزیز۔ احباب۔ طلبا صادر وارد سبھی ہوتے۔ سب کی نشست۔ مدارات یکساں
بلا فرق ہوتی۔ کھلانے میں منشی صاحب کی شگفتگی۔ لطف پروری۔ جان نوازی فرماتی۔ کھانے ہر ہر موسم
کی رعایت سے تیار ہوتے۔

خربوزے سے مناسبت نہ تھی۔ آم! یادش بخیر۔ ذوق پرکار فرما تھا۔ شوق کی انتہا نہ تھی۔ اس کے
ذکر میں لطف بلکہ استغراق تھا۔ فن میں اس کے تمام مراتب کا اندازہ۔ نقائص کے رفع کرنے کی تدابیر
خوبی بڑھانے کے وسائل۔ درختوں کی بیماریاں دور کرنے کے معالجے سب کچھ ذہن میں تھے۔ عمل
میں تھے۔ باغات کا وسیع سلسلہ تھا۔ پورا سال ہر موسم کے لحاظ سے ان کے غور و پرداخت میں ذوق
وشوق کے ساتھ بسر ہوتا موسم گرما رسول پور کے خانہ باغ میں بسر ہوتا۔ میں بھی ایک بار حاضر ہوا تھا
باغ کا ایک ایک درخت دکھایا۔ خوش ہوا مقام تھا۔

آم کھلانے کی صحبت ایک یادگار زمانہ صحبت تھی۔ احباب بے تکلف کا مجمع نادر اور چیدہ آموں
کی کثرت اور یہ کثرت کٹھوں میں بھیگتے اس مجمع کے صدر نشین منشی صاحب کا رد بکفت ترتیب سے آم کی

قاشیں سب کو پہنچائی جاتیں۔ مسلسل تراش تراش کر۔ ایک ہاتھ کی محبت و شوق کی تاثیر سے یہ قوت بارہا دیکھی کہ مجمع کا مجمع تابگلو پُر اور سیر ہو کر وہیں لوٹ جاتا۔ چلنا تو بڑی بات ہے بات کرنے کی تاب نہ ہوتی۔ کوئی اگر کچھ کہتا تو ہاتھ سے اشارہ کرتے کہ بولنے کی تاب نہیں۔ سانس لینا دشوار ہو جاتا۔ اس میں تنومند اور بڑے خورا احباب بھی ہوتے۔ نہایت نفاست یہ تھی کہ یہ بزم آرائی صرف شب میں ہوتی۔ دن میں بکھیوں کے خیال سے آم کا نام بھی زبان پر نہ آتا۔

میں نے اوپر ترتیب کا ذکر کیا تھا۔ مطلب یہ کہ آم کے اقسام پر نمبر لگے ہوئے تھے کہ پہلے کونسا تراشا جائے اس کے بعد کونسا۔ علیٰ ہذا القیاس سب سے آخر میں "رشکِ جہاں" کا نمبر آتا۔ جو مجموعہ صفات تھا۔

عادات میں منشی صاحب تکلف۔ تصنع۔ طمطراق سے بالکل صاف پاک تھے۔ اسی کے ساتھ نہایت شائستہ اور پختہ وضع۔ میں نے باون برس کی مسلسل رفاقت میں کبھی کوئی فرق کسی عادت میں نہیں پایا۔ بے تکلف مخلصانہ، صاف گوئی، کلام میں تھی۔ رائے میں پختہ بلکہ سخت تھے جو کسی رعب۔ طمع یا خاطرداری سے مرعوب و اثر پذیر نہ ہوتی۔ پبلک معاملات سے پوری دلچسپی تھی، اصول یا لا کی پوری پابندی سے۔ میں نے محمڈن کالج۔ مسلم یونیورسٹی۔ مسلم ڈپوٹیشن شملہ (اسی موقع پر پہلی بار انھوں نے اور میں نے ترکی ٹوپی پہنی۔ اس حکم کی تعمیل میں کہ شملہ میں ریل سے سب ڈپوٹیشن کے ارکان ترکی ٹوپی پہنے برآمد ہوں) ندوۃ العلما۔ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس۔ وقف کرنال۔ اور مسلم لیگ میں مسلسل اُن کے ساتھ کام کیا۔ یہی اصول اور انداز عمل پایا اور ہر موقع پر اور ہر معرکہ میں پایا۔ منشی صاحب کا جو استقلال جوان اولاد کی وفات اور بعض عظیم الشان مالی نقصانوں میں دیکھا وہ حیرت خیز اور سبق آموز تھا۔

مذہب کے سخت پابند تھے۔ نماز، روزہ، اوراد و وظائف پر پورے عزم سے ثابت قدم۔ عقائد میں مستحکم، یہ اثر تھا حضرت پیر و مرشد کے فیض کا اور منشی امتیاز علی صاحب کی تربیت کا۔

نہایت فیّاض تھے۔ عزیزوں، ملنے والوں، صادر و وارد، حاجتمندوں۔ غربا و مساکین کی خدمت میں علانیہ اور خفیہ برابر سرگرم رہتے۔ اُن کی عظیم الشان کوٹھی کا ایک حصہ گویا بورڈنگ ہاؤس تھا جو طلبا کے لئے مخصوص تھا متعدد مستقل ٹھیر کر تحصیل کرتے۔ بعض امتحانوں کے موقع پر آتے تیاری کرتے۔ امتحان دیتے

چلے جاتے۔ اور یہ سب کے سب منشی صاحب کے مہمان ہوتے۔

ایک حصہ کوٹھی کا عزیزوں۔ مہمانوں۔ دوستوں کے تصرف میں رہتا عارضی بھی مستقل بھی۔ دوستی اور دوست نوازی منشی صاحب کے اوصاف میں یوں نمایاں تھی جیسے آفتاب کی کرنیں۔ ہر موقع پر ہر معرکہ میں وہ دوستی کسوٹی پر پوری اترتی محبت پیکر مجسم بن کر سامنے آجاتی۔ بہت کچھ لکھ گیا۔ پھر بھی قلب اور قلم دونوں کہتے ہیں کہ کچھ نہیں لکھا۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت اُن پر ہو۔ ایک نمونہ تھے قدیم پاکیزہ اخلاق۔ وضعداری۔ حسن مذاق۔ شائستگی۔ دوستی اور اسلامی زندگی کا۔

باوجود کمزوری اور اعزا کی ممانعت کے اخیر سفر علی گڑھ کا مسلم یونیورسٹی کا نوکیشن اور کانفرنس کے اجلاس سالانہ میں شرکت کے لئے کیا۔ یہی سفر صبر آزما اور سفر آخرت ثابت ہوا۔ واپسی میں بریلی میں مرض کا حملہ ہوا جو پیام وفات لایا۔ عمر ۷۰ برس کی ہوئی۔ ہمیشہ تندرست رہے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

وفات منشی صاحب مرحوم ۵ ربیع الآخر سنہ ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۲ اپریل سنہ ۱۹۴۳ء روز چہارشنبہ ساڑھے ۸ بجے صبح۔

(کانفرنس گزٹ بابتہ یکم جون سنہ ۱۹۴۳ء)

دیوانِ عاشق دہلوی

(تلمیذ امیر خسرو دہلوی)

میرے مختصر کتاب خانہ میں اس دیوان کا ایک قدیم نوشتہ نسخہ ہے۔ تین ضخیم تذکرۃ الشعراء عاشق دہلوی کے ذکر سے خالی ہیں۔ دو قلمی (ریاض الشعراء والہ داغستانی، مجمع الغرائب احمد علی سندیلوی) ایک مطبوعہ (مجمع الفصحا) رضا قلی خان متخلص بہ ہدایت) دیوان خط اور کاغذ دونوں کے لحاظ سے پرانا لکھا ہوا ہے۔ مگر سنہ تحریر نہیں اس لئے کہ نسخہ ناقص ہے۔

عنوان پر درج ہے "دیوان عاشق دہلوی تلمیذ مولانا حضرت امیر خسرو دہلوی طوطی ہند" اس کے نیچے مہر ہے بخط نستعلیق خوشخط۔ اُس میں نام "عبدہ زین العابدین" درج ہے۔ تقطیع چھوٹی ۸ ½ - ۵ انچہ ہے

تعداد اوراق موجودہ ۸۲ ہی۔ اور تلمذ کا ثبوت اشعار ذیل سے ہوتا ہی ؎

عاشق ایں رنگ سخن را از کجا یافتہ است　　ایں ہمہ از چمن خسرو چیدہ گل لعل

ایک قطعہ امیر خسرو کی شان میں لکھا ہی اُس کا پہلا شعر ہی ؎

چو خسرو شاعرے از ہند برخاست　　کہ قدر شاعران اصفہان کاست

مقطع ہے ؎

ہمینش بس دلیل پیشوائی　　کہ عاشق پیرو گفتار او راست

اس دیوان کا قیاساً زیر مطالعہ مؤلف رہنا محسوس ہوتا ہی بلکہ یہ معلوم ہوتا ہی کہ بقلم مصنف لکھا ہوا ہی۔ قراین یہ ہیں:-

خط کی روش دو قسم کی ہی شفیعا اور نستعلیق۔ بسا اوقات نستعلیق میں شفیعا کا رنگ آجاتا ہی۔ ورق ۳۴ کی پوری غزل ملاحظہ ہو جو نستعلیق شفیعائی ہی۔ شعر "محتسب وش" الخ میں لفظ 'پیناسے' اور 'مستان' اور اگلے شعر میں لفظ 'می زخم' کی تحریر میں شفیعائی رنگ نمایاں ہی۔ نیز ورق ۴۷ کی پہلی پوری غزل میرے دعوی کی شاہد ہی۔ ورق ۶۷ کا چھٹا شعر ملاحظہ ہو پہلا مصرعہ نستعلیق ہی اور دوسرا مصرعہ شفیعائی۔ قلم اور روشنائی اس شعر اور اگلے شعر کی ایک ہی۔ ورق ۶۰ کا چھٹا شعر نستعلیق شفیعائی ہی۔ گویا کاتب دونوں قسم کی تحریر پر پوری قدرت رکھتا ہی عموماً بعض مصرعوں یا الفاظ کی تبدیلیاں بخط شفیعائی ہیں کہیں کہیں بعض الفاظ یا مصرعہ کی تبدیلی بخط نستعلیق بھی ہی۔

مصرعہ یا الفاظ کی تبدیلی سے مضمون میں بلندی اور چستی پیدا ہو جاتی ہی اس طرح یہ تبدیلی اصلاح ہی نہ تصحیح۔

پہلے نوشتہ کو قلم زد کرکے دوسرے الفاظ بدلنا مصنف ہی کر سکتا ہی دوسرا شخص اصلاح تو کر سکتا ہی مگر قلم زد کرنے کا حق حاصل نہیں۔ ورق ۷ ملاحظہ ہو مصرعہ "چگویم دگر مطلب نیستم" بخط شفیعائی قلم زد ہی بجائے اس کے حاشیہ پر قلم روک کر یہ مصرعہ تحریر ہی "نباشد دگر غیر ازیں مطلبم" ورق ۱۶ کی پشت پر یہ شعر بھی ملاحظہ ہو۔

در دیک چشمے کند چشم دگر را دردناک　　　ہمنشیان ایدرد دیچ دیدن مشکل ست

ثانی مصرعہ بغیر قلم زد کئے اس طرح تبدیل کیا ہے "مردم یک خانہ را در رنج دیدن مشکل ست"۔ ورق ۲۱ پر "عاشق بہشت را نہ پسند د گر بیش" کو بدل کر "عاشق بہشت را نہ پسندید براو" بنایا ہے مگر پہلا مصرعہ بھی قلم زد نہیں۔ ورق ۴۰ پر۔

خار خارے بہ دل از رشک فتادہ ست مرا　　　تا بہ طرف کلہت جائے گزیدہ گل لعل

اس شعر کا پہلا مصرعہ اس طرح بدلا ہے جو یقینی اصلاح ہے نہ تصحیح۔ دیکھو مصرعہ کتنا بلند ہوگیا۔ ع

"خار خارے بہ دل خون شدہ ام افتادہ ست"

نمونۂ کلام

زہے لبت لشکر خندہ راحت جانہا　　　گل عذار تو رشکِ گل و گلستانہا

لبت چو گاہِ تکلم گہر بیفشاند　　　شود پر از گہر آبدار دامانہا

دمیکہ سرو روانِ تو جلوہ گر گردد　　　ز چوب خشک دہد یاد سرو بستانہا

چہ فتنہ است ندانم بچاک دامانت　　　کہ چاک گشتہ کسان را از و گریبانہا

تبسمت نمکے تازہ بر جراحت ریخت　　　کہ ریختند بخاک سینہ نمکدانہا

دوائے درد دل ما نہ بدوا ئیہاست　　　چرا کشیم عبث منتے ز درمانہا

سرے کہ خاک رہ دوست گشت چوں عاشق　　　سرے ندارد با ساز و برگ سامانہا

اس شعر کے ساتھ امیر خسرو کا یہ شعر پڑھو استاد و شاگرد کی یک رنگی محسوس ہوگی۔

خسرو مست ست و مطرب تو مست یا سرخوش

ہاں بر چنیں نشاطے یک رقص عاشقانہ

آمد بہار خرم ساغر کشاں مبارک　　　دلہا ز غم سبک کرد رطل گراں مبارک

از ابر سایہ افگن شد تازہ صحن گلشن　　　کردند عندلیباں بر باغباں مبارک

مشاطۂ بہاراں رخسار گل بیاراست　　　آئینہ گشت شبنم ای بلبلاں مبارک

باراں فگند روغن اندر چراغ لالہ — شد دشت در چراغاں بر شب رواں مبارک
ساقی پیالہ در کف مطرب نشستہ با دف — خیلِ طرب زدہ صف اہلِ جہاں مبارک
بادہ غذای روح است می باعث فتوح است — ہاں ساعت صبوح است پیر مغاں مبارک
زاہد بیا بہ گلشن بر چیں ز زہد دامن — بشنو ز کوی و برزن بر می کشاں مبارک
شیخ ریا ے امروز از زہد توبہ بنمود — خرقہ بمی بیالود میخوارگاں مبارک
عاشق بتِ تو مست ست جام عیش بدست ست
بستان پیالہ از وے کن نوش جاں مبارک

قرۂ اشکبار را نازم — رگِ ابر بہار را نازم
نیست در اختیار صبر و خرد — دل بے اختیار را نازم
غنی از سیر لالہ زارم کرد — سینۂ داغدار را نازم
کار ما را بمی کشی بگذاشت — گردشِ چشم یار را نازم
خاک گردید و جز بخاک نہ ساخت
عاشق خاکسار را نازم

متفرقات

دریا کشیم و چرخ نزیبد ایاغ ما — گم گشتہ ایم و خضر نیابد سراغ ما

یکے گل چیند از بستاں یکے گلدستہ می بندد — تو اے نازک بدن جائے گل و گلدستہ ما را

برافتد چوں نقاب از ماہ رویت — نیارد دید چشم کس بسویت

دمد از ہر سر خارے گل مطلب بہ ہمت — بہ نہد ہر کہ براہ طلبت گامے چند

در دل از یاد رخت بحر تجلی موج زد — جوشش نور ست از فوارۂ مژگان ما

مکن فکر علاج و در کمالِ درد کوشش کن — کہ چوں شد درد کامل خود بخود درماں شود پیدا

عاشق از تلخیٔ غم فرہاد وار | مرگ را بر خود چہ شیریں می کنی
نامم ہر کہ بپرسد گویم | عاشقِ زارے سینہ فگارے

(رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ رمضان المبارک ۱۳۶۵ھ)

شاہی کتاب خانوں کی کتابیں

(کتاب خانہ حبیب گنج میں)

ربیع الاول سنہ حال کے "معارف" میں ایک جملہ "خطبۂ صدارت شعبۂ علوم و فنون" کے ضمن میں درج ہے "علی گڑھ بھی ایک ایسے ہی شایق ...... کا مسکن ہے، جن کے حبیب گنج میں لکھنؤ، لاہور، دلی، اور دکن کے انمول موتی ہیں"۔ اس متن کی شرح میں آج اُن کتابوں کا جائزہ لیا جاتا ہے، جو مختلف شاہی کتاب خانوں کی میرے یہاں ہیں۔

(۱) کلام اللہ المجید کے پانچ ورق بخط کوفی ۱۸۴۲ء میں جب لارڈ ایلنبرا کے عہد میں ملک سندھ کا الحاق ہوا تو وہاں کے کتاب خانے سے ایک کلام مجید کے نسخہ کے پچاس یا ساٹھ ورق مالِ غنیمت میں کلکتہ آئے۔ یہ نسخہ مختلف بادشاہوں کے کتاب خانوں میں رہ چکا تھا جن کی مہریں اور دستخط اس پر ثبت تھے منجملہ اُن کے شاہ جہاں بادشاہ کے قلم کی یہ عبارت درج تھی:

"بخط شاہ مرداں علیہ السلام بہ یک ہزار مہر طلائی ہدیہ نمودہ شد"

شاہ جہاں کی مہر بھی تھی۔ مولوی مسیح الدین خاں صاحب علوی رئیس کاکوری اس زمانے میں نواب گورنر جنرل کے میر منشی تھے مولوی صاحب موصوف نے گورنر جنرل کی اجازت سے یہ پانچ ورق بطور تبرک اپنے جد امجد کے لے لئے۔ مولوی صاحب کے خاندان سے حبیب گنج پہنچے، حالات بالا کی تصدیق بقلم

مولوی صاحب موصوف ان اوراق کے ہمراہ داخل کتاب خانہ حبیب گنج ہوئی ہی۔

(۲) حصن حصین امام جزری سنہ ۸۹۰ھ کا لکھا ہوا نسخہ وفات مصنف کے ستاون ۵۷ برس بعد کا لکھا ہوا میرک شاہ مرحوم محدث مشہور کے قلم کے حواشی، خط نسخ جید، مطلا، کاغذ سمرقندی، شاہزادہ اعظم شاہ کی پیشکش عالمگیر بادشاہ کے حضور میں سنہ ۱۱۱۷ھ م سنہ ۵ جلوس میں عالمگیر بادشاہ کے قلم کا صادثیت ہمشاہی امرا تحویلداران کتاب خانہ کی مہریں ہیں، جائزے ہیں۔

(۳) مثنوی گوے وچوگان ملّا عارفی، پوری کتاب استاد مشہور ملا میر علی کاتب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی خط بھی زمانۂ کمال خطاطی کا، بمقام ہراۃ سنہ ۹۲۶ھ میں لکھی گئی۔ اول یہ کتاب قطب شاہیوں کے کتاب خانہ میں رہی، جب عالمگیر بادشاہ نے گولکنڈہ فتح کیا تو تیموری کتاب خانہ میں داخل ہوئی، کتاب پر شاہی کتاب خانے کی جو عبارت درج ہی وہ ان بیانات کی شاہد ہی۔ گردش زمانہ سے قیمت کتاب میں جو تغیرات ہوئے، وہ عبرت افزا ہیں۔ عالمگیری کتاب خانہ کا اندراج قیمت دوہزار روپیہ ہے۔ سنہ ۱۱۹۷ھ میں دوسو دس روپے میں فروخت ہوئی، اس کے بعد سنہ ۱۲۶۴ھ میں قطب الدولہ نے ڈھائی سو روپے میں خریدی، یہاں سنہ ۱۳۲۱ھ میں ایک سو ستر روپیہ میں آئی۔

(۴) مثنوی مولانا روم سنہ ۷۱۲ھ کا لکھا ہوا نسخہ مولانا روم کی وفات سنہ ۶۷۲ھ میں ہوئی اس طرح یہ نسخہ وفات مولانا کے چالیس ۴۰ برس بعد لکھا گیا، جہاں تک علم ہی اس سے زیادہ قدیم نسخہ میونخ کے کتاب خانے میں ہی جو سنہ ۶۷۷ھ کا لکھا ہوا ہی، برٹش میوزیم کا نسخہ سنہ ۷۱۸ھ کا ہی کتاب خانہ حبیب گنج کا نسخہ عالمگیر بادشاہ کے کتاب خانے کا ہی اس پر چار مہریں بادشاہ ممدوح کی ہیں، جن میں الفاظ "محمد اورنگ زیب بادشاہ" ثبت ہیں، یہ مہریں مدور ہیں۔

(۵) لوائح مولانا جامیؒ، عنوان طلائی، لاجوردی، مطلا و مذہب، کاغذ فتی زرافشاں، حاشیہ زرافشاں، مختلف رنگ، خط استادانہ، کاتب محمد محسن الہروی، محررہ ذی قعدہ سنہ ۱۰۰۳ھ۔ لوح کتاب پر حسب ذیل عبارت درج ہی:-

"لوائح بابتہ گذرانیدہ میر معز، چہاردہم ربیع الثانی سنہ ۱۰۹۶ھ داخل کتاب خانہ سرکار عالی شد۔"

اس عبارت کے اوپر "قابل خاں خانہ زاد عالمگیر بادشاہ" کی مہر ہے۔ ایک اور اندراج سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر الامرا شائستہ خاں کے اموال کی بابت ۴۱ سنہ جلوس میں داخل ہو کر محمد باقر کی تحویل میں سپرد کی گئی۔ اس کے بعد متعدد تحویلوں اور جائزوں کی عبارتیں درج ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۹۶ھ (مطابق ۲۷ سنہ جلوس) میں امیر الامرا شائستہ خاں کو مرحمت ہوئی۔ اُن کے انتقال کے بعد ۴۱ سنہ جلوس میں مکرر داخل کتاب خانہ شاہی ہوئی۔ ایک اور اندراج سے ۲۳ سنہ جلوس میں بھی داخل کتاب خانہ شاہی ہونا واضح ہوتا ہے۔

(۶) منہاج العابدین امام غزالیؒ چھوٹی تقطیع، متن مفروش بہ طلا، خوشخط نسخ، کاغذ باریک چکنا شاہزادہ محمد معظم شاہ عالم بن عالمگیر بادشاہ غازی کے کتاب خانے کی۔ آخر میں شاہزادہ ممدوح کی مہر جو بالآخر تخت پدری پر بیٹھے۔

(۷) کلام مجید تقطیع اوسط دو صفحہ اول طلائی مینا کار، اعلیٰ نمونہ تذہیب، کاغذ گجراتی زرافشاں سورتوں کے نام مطلا، بہ خط ولایت، کاتب ابوالفتح۔ فرخ سیر بادشاہ کے کتاب خانہ کا یہ نسخہ ہے۔

(۸) شرح قصیدہ لامیۃ العجم، بخط نسخ غیر جید، بیت اللہ کے سامنے ۱۰۰۲ھ میں لکھی گئی، آخر میں عبارت درج ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ "بحکم خزانہ مولانا السید الجلیل الملک الاصیل ۔۔۔۔ مولانا سید ادریس (الفاظ بخط طلائی) بن حسن اعلی اللہ کلمتہ یہ کتاب لکھی گئی (اس کا تعلق خاندان شریف مکہ سے ہے) انقلاب زمانہ کے بعد یہ نسخہ میر غلام علی آزاد بلگرامی کے کتاب خانہ میں بھی رہا۔

(۹) دیوان خواجہ آصفی، خوشخط ایرانی قلم، جدول مطلا و مذہب، بین السطور مطلا، کاغذ دفتی حنائی رنگ، دو صفحہ اول طلائی کار لاجورد۔ عبارت ذیل اس پہ درج ہے:-

"کتب خانہ مبارک سلطان محمد صفوی ملقب بہ سلطان محمد خدا بندہ دام ملکہم وحشمتہم در سنہ ۹۴۵ قمری فقیر اسمعیل ترکان تحویلدار"

اس کتاب پر سر گور اوسلے کے بخط انگریزی دستخط ہیں۔

(۱۰) صحیح بخاری المجلد الاول، خط عرب۔ کاغذ سمرقندی۔ سنہ کتابت درج نہیں۔ آخر میں دو تحریریں ۱۱۰۱ھ کی ہیں، لوح کتاب پر طلائی شمسے میں عبارت ذیل خط نسخ شنگرفی جلی میں لکھی ہوئی ہے۔

"جلد اول صحیح بخاری بخط نسخ عرب در آخر کتاب خط حضرت شیخ المحدثین عفیف الدین گازرونی ستۃ
جلد سیاہ ترنج سرخ و جدول طلائو بستہ بابتہ فتح شیر محمد آباد المعروف بہ بیدر جمع کتاب
خانہ معمورہ عالم پناہ ابراہیم عادل شاہ خلد اللہ ملکہ شدہ - ۹ شعبان سنہ ۱۰۲۸ھ"
شیخ عفیف الدین گازرونیؒ شارحین صحیح بخاری میں سے ہیں، کشف الظنون میں ان کا اور ان کی
شرح کا ذکر ہے۔

(۱۱) مشکوٰۃ المصابیح - خط نسخ جید - کاغذ باریک چکنا - مطلا و مذہب - فہرست بخط طلائی - محشی -
سنہ [illegible]ھ میں شہر بیدر میں لکھی گئی - کاتب ابوسعید بن حسین تاجر مشہور بہ مال امیری - عبارت لوح کا
ایک حصہ محو شدہ ہے - تاہم اس قدر واضح ہے کہ یہ کتاب سلطان محمود شاہ بہمنی سلطان بیدر کی نذر کی
گئی، وفات محمود شاہ بہمنی سنہ ۹۲۴ھ (فرشتہ)

(۱۲) تفسیر جلالین، تقطیع کلاں، مطلا و مذہب، خط کلام اللہ نسخ شنگرفی خط تفسیر شکستہ تعلیق سنہ ۱۰۷۹ھ
میں رضی الدین محمد تفرشی نے دار السلطنت حیدر آباد میں بعہد تانا شاہ لکھی، اس تفسیر میں دو جگہ سلطان
ابوالحسن قطب شاہ عرف تانا شاہ کے حاشیے ہیں۔

(۱۳) مثنوی مجمع البحرین، قصہ ناظر و منظور کاتبی نیشاپوری، تقطیع خرد خوشخط، خط سمرقندی قدیم، کاغذ
سمرقندی، اس پر تین سلاطین قطب شاہی کی مہریں ہیں، ایک سلطان محمد قطب شاہ کی ؎

مہر سلیماں ز حق گشتہ میسر مرا   نقش نگیں دل شدہ صفدر حیدر مرا

مہر کے درمیان یہ الفاظ ہیں "العبد سلطان محمد قطب شاہ"

دوسری سلطان محمد ابراہیم قطب شاہ کی ؎

کسے کہ ساخت نقش نگیں مہر آں یتیم   بود سپہر کرم قطب شاہ ابراہیم

تیسری محمد قلی قطب شاہ کی اس میں درج ہے "العبد محمد قلی قطب شاہ"

(۱۴) دیوان امیر شاہی سبزواری، خوشخط نستعلیق جلی قلم - کاغذ گلابی - تقطیع اوسط - کاتب فتح جنب -
بے تاریخ کتابت - اس پر تین مہریں ہیں، ایک مربع کلاں بخط سیاہ، نواب آصف الدولہ بہادر کی - دوسری

مربع نصیر الدین حیدر کی۔ تیسری امجد علی شاہ کی (دونوں خوشخط شنگرفی) نواب آصف الدولہ کی مہر کی عبارت
"یحییٰ خاں بہادر ہزبر جنگ آصف الدولہ"۔ شاہ نصیر الدین حیدر کی مہر کی عبارت ؎

خوش ست مہر کتب خانۂ سلیمان جاہ ۔۔۔ بہر کتاب مزین چو نقش بسم اللہ"

امجد علی شاہ کی مہر ؎

تاسخ ہر مہر شد چوں شد مزین بر کتاب ۔۔۔ خاتم امجد علی شاہ زماں عالی جناب

(۱۵) بوستان شیخ سعدی شیرازی، خوشخط، جدول زرد و سرخ۔ مورخہ ۱۲۰۶ھ بے اسم کاتب شاہان اودھ کی مہریں، ایک نصیر الدین حیدر کی۔ دوسری امجد علی شاہ کی۔ تیسری واجد علی شاہ کی۔ عبارت مہر واجد علی شاہ ؎

ثابت و پر نور با داتا فروغ آفتاب ۔۔۔ خاتم واجد علی سلطان عالم بر کتاب

اس پر جالسج بیلی رزیڈنٹ لکھنؤ کے دستخط و مہر بھی ہی دستخط انگریزی ۱۸۱۰ء مہر بخط نسخ طغرائی۔

(۱۶) تاریخ فارس۔ خط جلی صاف۔ کاتب خانہ زاد بارگاہ آسمان جاہ سلطانی حسین علی۔ تاریخ کتابت ۱۲۳۰ھ رائٹ پاٹر نامی ایک سیاح پیٹر برگ سے فتح علی شاہ قاچار کے عہد میں ایران گیا۔ تین برس وہاں رہا۔ اس کا سفرنامہ ہی۔ اس میں علاوہ ایران کے روسی شہروں کا بیان بھی آگیا ہی۔

غازی الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ کے حکم سے محمد صالح نے کرشن موہن انگریزی داں کی مدد سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ دیباچہ میں لکھا ہی کہ

"ہر روز جس قدر ترجمہ کیا جاتا شاہی ملاحظہ میں پیش ہوتا۔ خود بدولت کی اصلاح کے بعد درج کتاب ہوتا اسی طرح ساری کتاب شاہی اصلاح سے مزین ہی۔"

اس نسخے پر شاہان اودھ کی چار مہریں ہیں۔ ایک نصیر الدین حیدر کی۔ دو امجد علی شاہ کی ایک لوح پر۔ ایک آخر میں۔ چوتھی واجد علی شاہ کی۔ متعدد جائزے ہیں۔

شاہی کتاب خانوں کا گوشوارہ جن میں مذکورۂ بالا کتابیں رہیں	سلاطین تیموریہ ہندوستان (سات) شاہان صفویہ ایران (ایک) شریف مکہ معظمہ (ایک)، سلاطین بہمنیہ بیدر (دو) قطب شاہی (تین)

عادل شاہی (ایک) بادشاہان اودھ (تین)

جملہ ۱۸ دو کتابیں شمار میں مکرر ہیں جو دو دو کتاب خانوں میں رہیں۔

تازہ فتوح

"شاہی نسخوں" کے سلسلے میں ایک تازہ فتوح مضمون بالا لکھنے کے بعد حاصل ہوئی۔ قدردانان معارف کی ضیافت طبع کے لئے کیفیت عرض کرتا ہوں۔

یہ مطول علامہ تفتازانی کا نسخہ ہے۔ مکمل محشّٰی اور خوشخط جلی لکھا ہوا۔ لوح کتاب پر جہانگیر بادشاہ کے ہاتھ کی یہ عبارت ہے۔ لوح کا اخیر حصہ کرم خوردہ ہے۔ جو الفاظ باقی ہیں وہ کشادہ اور جو کل یا کسی قدر کرم خوردہ ہیں وہ قیاساً قوسین کے اندر درج کئے جاتے ہیں۔

۱	مطول در علم فصاحت	(وبلاغت)
۲	بخط سید المحققین	(وسند)
۳	المدققین میر سید	(شریف)
۴	جرجانی.........	(بعد ملا)
۵	خط داخل کتابخانہ ۲۱	(ین نیانہ)
۶	مند ورگاہ الٰہی شد سلہ	(۱۰ جلوس)
۷	مطابق سنہ ۱۰۲۳ ہجری	(حررہ محمد)
۸	نور الدین جہانگیر ابن	
۹	اکبر بادشاہ غازی	

شاہی عبارت کے علاوہ تیرہ مہریں اور متعدد "عرض دیدہ" لوح اور خاتمے کے ورق پر ہیں۔ مہروں میں سے چھ شاہی امراء کی ہیں۔ شاہ جہانی۔ عالمگیری اور دارا شکوہی۔ شاہ جہانی امراء میں صادق خاں عثمان خاں ہیں۔ عالمگیری میں عبداللہ خانی۔

اس موقع پر دربار جہانگیری نے ایک مغالطہ کھایا ہے۔ آخر کتاب کی عبارت ہے: "تم الکتاب بعون اللہ الملک الوہاب علیٰ ید العبد الضعیف سید شریف یوم الجمعۃ الرابع من شہر رمضان سنۃ تسع وثلاثین وثمانمائۃ (محوطہ) سمرقند حماہا اللہ عن الآفات۔ مغالطہ یہ ہے کہ میر سید شریف جرجانی کی وفات بالاتفاق ۸۱۶ھ میں ہے۔ (دیکھو شذرات الذہب، کشف الظنون، طبقات شاہجہانی) اس طرح یہ نسخہ ان کی وفات کے تئیس۲۳ برس بعد لکھا گیا۔ کاتب کی ہمنامی نے اُن کو میر سید شریف کا مرتبہ دیا اور بادشاہ نے جرجانی کا اضافہ کرکے سند بخشدی۔ اگر علامہ جرجانی کی تاریخ وفات پیش نظر ہوتی تو غالباً یہ مغالطہ نہ ہوتا۔

میرے پاس بھی یہ نسخہ دو ندرتیں لے کر آیا تھا۔ جہانگیر بادشاہ کے ہاتھ کی عبارت، میر سید شریف جرجانی کا نوشتہ۔ تحقیق سے ایک ندرت قایم رہی۔ دوسری معدوم ٹھہری۔ خیر ایک ندرت بھی سو خوبیوں سے بڑھ کر ہے۔

(رسالہ معارف اعظم گڑھ بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۳۷ء)

تقریظ

(بر کلام محوی)

ایک وقت تھا کہ شیراز اور اصفہان کی بادبہاری فلک نما پہاڑوں کو طے کرکے ہندوستان کے میدانوں کو بھی رشک گلزار بناتی تھی۔ یہ بہاریں صدیوں تک آتی اور ہندوستان کو چمنستان بناتی رہیں۔ یہ مبالغہ نہیں واقعہ ہے۔

لوگ کہیں گے گل وبلبل شمع وپروانہ کی داستانوں میں کیا رکھا تھا۔ یہ وہ کہیں گے جو حقیقت سے بیگانہ ہیں۔ واقعات سے ناآشنا۔ ع چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند۔

ادب فارسی نے اہل ہند کے دل ودماغ کے شگفتہ کرنے، معاملہ فہم اور حقیقت سنج بنانے میں جو حصہ لیا وہ بہت بڑا حصہ لیا اُس کے آثار رنگارنگ اب بھی بہت کچھ باقی ہیں۔

عمارتوں میں تاج گنج۔ دلی کی جامع مسجد مثالاً لیہ۔ معاملہ فہمی میں ٹوڈرمل اور ابوالفضل کو لو۔ بالآخر سب

کا مجموعہ شاہان تیموریہ کو لو وہ سب کے سب فارسی ادب کے فیض یافتہ تھے جن کی ممنون ایجاد یہ عمارتیں یہ صنعتیں اور اراضی کے بندوبست وغیرہ بیسیوں ترقی انسانی کے سرچشمے تھے۔

شیر شاہ جس نے اپنی جہاں بانی کی قوت سے ایک عالم کو حیرت میں ڈالا ہو اُس کے مورخ لکھتے ہیں کہ گلستاں اور بوستاں کی اکثر حکایتیں اُس کو ازبر تھیں اور اُس کی خلوت وجلوت اور رزم و بزم کی رفیق و رہنما۔

آج کشمیر کی بہاریں دنیا کو کھینچ رہی ہیں۔ گوناگوں نفعے اُس سے حاصل کئے جا رہے ہیں۔ تاریخ دیکھو سارا کرشمہ فارسی ادب کے فیض کا ہو۔ چالیس برس کی مسلسل محنت میں سلطان زین العابدین نے کشمیر کو کشمیر بنایا۔ وہ فیض لایا تھا سمرقند و بخارا سے۔

اس کو یاد رکھنا کہ فارسی کی پشت و پناہ عربی تھی وہاں سے فیض لے کر فارسی دنیا کو فیض پہنچاتی تھی۔

آج انگلستان جو اہتمام مولانائے رومؒ کی مثنوی کی اشاعت کا کر رہا ہو وہ زندہ مثال فارسی ادب کے فیض کی ہو۔ فارسی ادب کی حیات بخشی کا نادر ثبوت وہ فضا ہو جو اس ادب کی فیض باری سے سرزمین ہند میں پیدا ہوئی۔ اس فضا کی روح پروری سے سارے مذہبی اور فرقہ داری اختلاف صلح سے بدل گئے۔ ہندو، مسلمان، شیعہ، سنّی سب کے سب ایک رنگ میں رنگ گئے۔ رنگ پوڈر کا نہیں محبت اور یکجہتی کا۔ گجراتی، مرہٹی، ہندی، بنگالی، گرمکھی وغیرہ جس زبان کو لوگے ادب فارسی کی گرمی سے اُس کی نبض میں جنبش پاؤ گے۔ آج کل کی تصانیف نہیں اُس زمانے کی تصانیف پڑھو اس رنگ بلکہ بیرنگی کا واضح ثبوت پاؤ گے۔

عارف رومؒ کی دو بیتیں برسبیل تنزل یہاں سبق آموز ہوں گی ؎

چونکہ بیرنگی اسیر رنگ شد موسی و فرعون اندر جنگ شد

چوں بہ بیرنگی رسی کان داشتی موسی و فرعون دارند آشتی

حال و ماضی پر نظر ڈال کر یہ شعر کر پڑھو۔ مرقع عبرت نگاہ کے سامنے پھر جائے گا۔

افسوس کہ دیکھتے دیکھتے اس بہار پر خزاں آگئی۔ وہ فضا بھی مٹ گئی۔ خاقانی و انوری کا درس ہے

گرمندرس ہو مٹا ہوا بر اسے نام بلکہ نام کو نہیں۔ کیوں ؟ ادبی فضا نہیں۔

نتیجہ آنکھوں کے سامنے۔ جو لوگ زمانۂ حال کو بنا گئے اُن کو آنکھیں ڈھونڈتی ہیں۔ نہیں پاتیں۔ راجہ رام موہن رائے۔ پنڈت اجودھیا ناتھ۔ سر سید احمد خاں۔ محسن الملک اور وقار الملک آج کہاں ہیں اور اُن کے نہ ہونے کو ملک شدت سے محسوس کر رہا ہی۔ اس بے کیفی کی تاریکی میں اگر کسی طرف سے روشنی آجائے تو اول حیرت اُس کے بعد مسرت ہوتی ہی۔

یقین کیجئے کہ جب مولوی مسعود علی صاحب محوی میرے مکرم کا خط آیا کہ فارسی کلام اُن کا طبع ہوا ہی اور اس کا نسخہ میرے پاس آئے گا تو مجھ کو بھی اول حیرت اُس کے بعد مسرت ہوئی۔ حیرت اُس پر کہ اب بھی زبان قلم پر فارسی کلام کے الفاظ آتے ہیں۔ مسرت اس پر کہ ابھی کچھ چنگاریاں باقی ہیں کیا عجب کہ کسی روز بھڑک اٹھیں، دلوں کو گرما دیں، خرمن جنگ و جدل کو پھونک دیں۔

اس مجموعہ کا نام "نذر عقیدت" ہی۔ اس کا افسوس ہی کہ جہاں استادان سلف کی ادبی روش میں جناب محوی محو ہیں وہاں اتلاف کلام میں بھی اُن کے قدم بہ قدم چلنا پسند کیا۔ عرفی نے ایک مجموعہ کھویا تھا تو یہ بھی کھو بیٹھے۔ نقصان یہ ہوا کہ غزل سے کلام خالی ہی۔ صدہا برس سے فارسی کا سرمایۂ ناز غزل ہی جس کو متاخرین کی نکتہ سنجی اور سحر آفرینی نے سحر حلال کا مرتبہ بخشا ہی۔ تصوف کی آمیزش نے اُس کو مثنوی و قصیدے کی صف میں جا بٹھایا ہی۔ صرف قطعات و قصائد اس مجموعے میں ہیں۔ اُن کے مطالعے سے واضح ہوتا ہی کہ اہل زبان کے انداز بیان اور طرز سخن کا گہرا مطالعہ شاعر نے کیا ہی۔ اور اس لئے فارسی ادب کا لطف اس کلام کو پڑھ کر حاصل ہوتا ہی۔

ایک خوش قسمتی محوی کی قابل رشک ہی۔ اُن کو مواقع ایسے ملے کہ جنھوں نے اُن کے کلام میں زندگی کی قوت اور واقعیت کی روح پھونک دی۔ حیدر آباد فرخندہ بنیاد میں عہد عثمانی خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ اُن کو نصیب ہوا اور متواتر ایسے موقعے آتے رہے کہ جو ادب فارسی کے فروغ کے مناسب بلکہ ہنگامہ گرم کن تھے۔ محوی نے ہر موقعہ کی مناسب نظم ادیبانہ روش سے لکھی۔ خوبی یہ کہ دنیا لغو کی پرواز سے عدم آباد نہیں بسایا بلکہ اسی دنیا میں رہ کر وہ واقعات نظم کئے جن کی حقیقی شان اور رفعت مبالغہ کی محتاج نہ تھی اور اپنے زور

طبیعت اور لطف بیان سے مبالغہ سے زیادہ دلکشی پیدا کی۔ روانی، تاثیر اور بلاغت کے نمونے دکھائے۔

آخر میں اُس یک رنگی کو پھر یاد کرو جس کی داستان میں نے آغاز کلام میں چھیڑی تھی۔ اور محوی کا یہ فقرہ پڑھو۔ اور میرے بیان کی تصدیق کرو۔

"اگر اعلیٰ حضرت خداوند نعمت بندگان عالی متعالی میر عثمان علی خان آصف ہفتم خلد اللہ عمرہٗ وسلطنتہٗ سے خسرو اقلیم سخن کی نظر تربیت و اصلاح اور عالی جناب سر مہاراجہ کرشن پرشاد یمین السلطنت دام اقبالہٗ سے کہنہ مشق سخن گو اور سخن شناس کی دل افزائیوں کا اضافہ کر لیا جائے تو میرے مختصر سرمایۂ استعداد کا سرسری اندازہ ہو جائے گا۔"

آخر میں دعا ہے کہ محوی کی محنت بار آور ہو۔ اُن کے کلام کی اہل ملک قدر کریں۔ اور اُس سے فیض کھیتی[۱] حاصل جس کا ملک آج اُسی طرح محتاج ہے جس طرح پیاسا پانی کا بھوکا روٹی کا۔

تقریظ

(برمئے دو آتشہ)

نظم کے اقسام چہارگانہ۔ غزل۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ رباعی میں قسم چہارم سب سے مختصر اور مشکل ہے۔ گویا اس رباعی کا مصرعہ چہارم ہے۔ غزل کے استاد ننو دونو۔ قصیدے کے بیسیوں۔ مثنوی کے دس بیس۔ رباعی کے پانچ سات گزرے ہیں۔ حضرت ابو سعید ابوالخیر۔ حکیم عمر خیام۔ مولانا سحابی نجفی۔ سرمد۔ ایک دو اور ہوں گے۔

یہ مطلب نہیں کہ رباعی کہنے والے اسی قدر ہیں۔ کلام استادی ہیں ہے۔ شیخ علی حزیں کی رباعیوں کا حجم ایک دیوان کے برابر ہے مگر بہت شبہ ہے کہ ان میں سے چند میں بھی سحابی نجفی کے "درہائے یتیم" کی آب و تاب ہو۔

---

[۱] یعنی اگلے ہم دموں کے فیض صحبت پر۔ ۱۲ شروانی

وجہ زیادہ مخفی نہیں۔ رباعی کا وزن مخصوص ہے۔ زبان مخصوص۔ خیال پورا ہو۔ نادر ہو۔ توحید حکمت یا عشق کا نچوڑ اس میں ہو۔ ان قیود کے ساتھ چاروں مصرعے باہم ایسے مربوط ہوں کہ ایک پھول کی چار پنکھڑیاں معلوم ہوں۔ قلم شکن یہ کہ چوتھا مصرعہ کڑی کمان کا تیر بن کر نکلے جو دل پر جا کر بیٹھے۔

خلاصہ یہ کہ ہر صنف سخن کی جان رباعی میں کھپانی پڑتی ہے۔ غزل کی تڑپ قصیدے کی متانت مثنوی کا تسلسل رباعی میں ہو۔ اس کے ساتھ رباعی کا مخصوص اختصار میدان سخن کو تنگ کر کے اشہب قلم کی کمر توڑ دیتا ہے۔ حاصل کلام عطر سخن رباعی ہے۔

نیشاپور کے میخانۂ قدیم میں ایک پیر میکدہ خیام تھا جس کے جام میں حکمت کا امتزاج ہوا۔ اس امتزاج سے نشہ دوبالا ہو کر جو رنگ لایا اُس کی جھلک اس بادۂ شیراز میں ہے ؎

از اں افیوں کہ ساقی در مئے افگند   حریفاں را نہ سر ماند و نہ دستار

ممالک ایشیا اس نشہ سے جھوم ہی رہے تھے۔ یورپ بھی جام اول میں بیخود ہو گیا۔ افلاطون کدۂ بلگرام کے خم نشیں شوکت نے اس بادۂ کہن کو تازہ روانی بخشی اور دور جدید سے آشنا کیا یعنی نیشاپوری شراب اُردو کے کیمپ میں لنڈھائی۔ اس دور جدید سے نشہ کی رسائی دوبالا ہو گئی۔ اسی مَےِ دو آتشہ پر اس وقت ایک نظر ڈالنی ہے مبادا دامنِ صدارت پر دھبہ لگے۔ اس لئے ایک شعر اول سنا دیتا ہوں ؎

نہ من تنہا دریں میخانہ مستم   جنید و شبلی و عطار شد مست

خیام غم دنیا اور مصائب زندگی کو ساغر بادہ کی مدد سے فراموش یا گوارا کرنا چاہتا ہے۔ بے ثباتی دنیا کا نقشہ ہمہ وقت پیشِ نظر ہے۔ اس لئے وہ دل لگانے کے لایق نہیں نہ اُس کی مصیبتوں کا درد سر مول لیا جا سکتا ہے۔

یہاں تک خیام و حافظ کی حد مشترک ہے مگر حافظ کے رنگ میں رندی و مستی کا غلبہ ہے۔ اس لئے غزل کے رنگ میں ترنم ریز ہیں۔ خیام کے یہاں حکمت و فلسفہ کا انبار ہے اس لئے رباعی کے وقار سے گرانبار ہیں۔ اس گرانباری نے خود رباعی کے وقار کو بڑھا دیا اور مضمون مشکل سے مشکل تر ہو گیا۔

رباعیاتِ خیام کا ترجمہ اُردو رباعی میں معلوم نہیں کس ستم ظریف نے یہ ستم ایجاد کیا۔ اوّل تو اُردو

رباعی کا میدان فارسی سے بھی زیادہ تنگ ہی۔ انیسؔ و دبیرؔ اگلوں میں اور حالیؔ پچھلوں میں ایسے ہوئے کہ اُن کی رباعیاں مطبوعِ طبائع ہوئیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ خیام کی رباعیاں ترجمہ کے لئے منتخب ہوئیں اردو میں اور رنگ ہو تو ہو مگر فلسفہ کا رنگ تو ہنوز مرہونِ بیرنگی ہی۔ غالبؔ نے ضرور اس پر قلم اٹھایا مگر وہاں شگفتگی و رنگینی ہی۔ خیام کے یہاں رنگ صوفیانہ ہی اور اسی لئے ہوئے اور یہی فلسفہ کا اصلی رنگ ہی۔

لوگ اب تک یہ نہیں سمجھے ہیں کہ نظم کا ترجمہ نظم میں کیا معنی رکھتا ہی۔ ترجمہ موزوں ہو کر نظم بے لطف نثر بن جائے یہ ظلم ہی۔ حال میں ایک ادب شناس نے غزل خسرو ترجمہ کے واسطے پیش کی ترجمہ ہوا۔ موزوں ہوا۔ مگر نہ شعر تھا نہ تغزل۔ ترجمہ نگار کو چاہیئے کہ اصل کلام میں غوّاصی کرے دُرِ مقصود کو تہ سے نکالے اپنے انداز سے سجائے۔ اور اربابِ نظر کے سامنے پیش کرے۔ جناب شوکت کے ترجمہ میں یہ مراتب ملحوظ ہیں ملاحظہ ہو۔

خیام رفتیم و زما زمانہ آشفتہ بماند با آنکہ زصد گہر یکے سفتہ بماند
  افسوس کہ صد ہزار معنے دقیق از بیخردی خلق ناگفتہ بماند

شوکت مٹنے پہ بھی ہم سے خلق آشفتہ رہی سلک گہر امید ناسفتہ رہی
  جو منہ سے کہا اُسے نہ سمجھا کوئی کہنے کی جو بات تھی وہ ناگفتہ رہی

"صد ہزار معنے دقیق" کے مقابلہ میں "کہنے کی جو بات تھی" ہر چند کہ لفظی ترجمہ نہ ہو مگر ذوقِ سلیم کہہ اُٹھے گا کہ وہی کہا کہ جو کہنا تھا۔ دوسرے مصرعہ کا ترجمہ کیا بے لاگ ہوگیا ہی۔ اس نکتہ کو نہ بھولنا کہ اداسی کی لے اصل سے ترجمہ میں بڑھ گئی ہی۔

خیام این کوزہ چو من عاشق زارے بودہ است در بند سر زلف نگارے بودہ است
  این دستہ کہ در گردنِ او مے بینی دستیست کہ بر گردن یارے بودہ است

شوکت غم ہجر کا میری طرح سہتا ہوگا مے کیسی دل کا خون بہتا ہوگا
  یہ دستہ گردن صراحی بھی کبھی ساقی کے گلے کا ہار رہتا ہوگا

شعر اول میں ترقی مضمون صاف عیاں ہی۔ عیاں راچہ بیان۔ "گلے کا ہار" کیا خوب محاورہ بندھ گیا

انگریزی ترجمہ میں یہ لطف پیدا نہ ہو سکا۔

خیام ہرچند کہ رنگ و بوے زیباست مرا — چوں لالہ رخ و چو سرو بالاست مرا
معلوم نہ شد کہ در طربخانۂ خاک — نقاش من از بہر چہ آراست مرا

شوکت شمشاد سا قد ہے پھول سا چہرا ہے — لیکن اس رنگ و بو سے حاصل کیا ہے
نقاش ازل نے اس نگارستان میں — تصویر بنا کے مجھ کو کیوں رکھا ہے

دونوں رباعیوں کے آخری مصرعوں کو باہم مقابل کرو۔ "نقاش من از بہر چہ آراست مرا"۔ "تصویر بنا کے مجھ کو کیوں رکھا ہے"۔ تصویر کے مختلف پہلوؤں پر اول غور کرو۔ پھر دیکھو گے کہ خیام کے مصرعے میں وہ پہلو نہیں ہیں۔

خیام ہر سبزہ کہ در کنار جوے رستست — گوئی ز لب فرشتہ خوے رستست
ہاں بر سر سبزہ پا بخواری ننہی — کاں سبزہ بخاک لالہ روے رستست

شوکت ہیں سب لب جو میں لعل لب کے انداز — بھیگی ہیں مسیں ہوا ہے سبزہ آغاز
اے سبز قدم گیاہ مرقد کو نہ روند — اس سبزہ پر سبزہ رنگ کرتے تھے ناز

ترجمے کے دوسرے مصرعہ میں "بھیگی ہیں مسیں" کیا لطف دے گیا ہے۔ کیسے پاکیزہ الفاظ مل گئے۔ خیام کے دوسرے مصرعہ میں "گوئی" اور "لب" لطف سخن کو دوبالا کر رہے ہیں۔ مگر "لب جو" کے لئے "بھیگنا" جیسا مناسب واقع ہوا ہے اور "سبزہ آغاز" نے جو دلآویزی پیدا کی ہے اُس سے کیفیت کلام بمراتب بلند ہو گئی ہے۔ ترجمہ کے اخیر کے دونوں مصرعوں میں بھی سبزہ کی رعایت نے رباعی کو سراپا مرقع کر دیا ہے۔ اس خصوصیت میں انگریزی ترجمہ بالکل ماند ہے۔ اگر جناب شوکت سب رباعیوں کا ترجمہ کر سکے تو کچھ شبہ نہیں کہ سرمایۂ اردو میں جواہر بیش بہا کا اضافہ ہو گا۔

تقریر جلسۂ ٹرسٹیان

(منعقدہ ۲۷؍ اکتوبر ۱۹۲۰ء بمقام اسٹریچی ہال مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

جناب صدر انجمن، معزز حاضرین، اس جلسہ میں بار بار یہ کہا گیا ہی کہ کالج میں طلبا کی اسٹرایک کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہی وہ ایک مذہبی فرض ہی "نیز یہ کہ" ہمارے دوست، دعوتِ حق، دینے کے واسطے تشریف لائے ہیں اور جس میں ذرہ برابر بھی ایمان ہی وہ ضرور ان کی دعوت قبول کرے گا۔ یہ تحریک اتنی بار مذہبی بتائی گئی کہ میں اس کو اپنا فرض محسوس کرتا ہوں کہ اس کی نسبت جو میرا خیال ہی اس کو ظاہر کروں۔ آپ اس کا یقین فرمائیں کہ میں وہی بیان کروں گا جو میرا دلی اعتقاد ہی میں نے یہ کوشش کی کہ اس جلسہ سے ایک روز پہلے علی گڑھ آجاؤں تاکہ موقع پر تمام حالات کو دیکھ کر رائے قایم کروں۔ چنانچہ میں نے بعض طلبا سے گفتگو کی۔ اُن حضرات میں سے بھی بعض سے گفتگو کی جو قوم کے لیڈر اور مذہبی رہنما ہیں۔ ان گفتگوؤں سے جو خیالات معلوم ہوئے اور جو حالات میں نے دیکھے اُن پر غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں جو اپنی تقریر میں بیان کروں گا۔

حضرات! میں علی گڑھ اس خوشی کے خیال کو لے کر آیا تھا کہ حالیہ تحریک کے اثر سے میں کالج کے طلبا میں مذہب کا وہ جلوہ دیکھوں گا جس کی تمنا برسوں سے دل میں تھی اور جو باوجود گوناگوں کوششوں کے اب تک حاصل نہ ہو سکا تھا۔ لیکن حالات دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ جن طلبا سے میں نے گفتگو کی انھوں نے کہا کہ مذہب کے لئے تمام قربانیاں جائز ہیں۔ میں نے اُن سے سوال کیا کہ آیا جس مذہب کے لئے تمام قربانیاں جائز ہیں اُس کے فرائض بھی اُن کو بتائے گئے ہیں، ان کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ہر مسلمان پر نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا فرض ہی۔ اور آیا اس کی پابندی انھوں نے کی ہی۔ اس کے جواب میں انھوں نے مجھ سے کہا کہ ہم سے یہ کہا گیا ہی کہ نماز روزہ ہوتا رہے گا اس وقت ہم کو وقتی تحریک سے نفع اٹھا لینا چاہیے۔

رات میں نے عشا کی نماز کالج کی مسجد میں جماعت کے ساتھ پڑھی - میرا خیال تھا کہ اب جب کہ مذہبی روح طلبا میں سرایت کرچکی ہے ایک دیرینہ آرزو پوری ہو گی اور کم سے کم ایک پوری صف جماعت میں طلبا کی دیکھوں گا - مگر افسوس کہ یہ آرزو پوری نہ ہوئی - جماعت صرف درمیانی دو محرابوں کے بیچ میں تھی - ان میں بھی کم از کم دس بارہ آدمی باہر تھے -

کیا حضرات! یہی جوش مذہب ہے جو طلبا میں پھیلایا جاتا ہے اور یہی دعوت حق اُن کو اور عامتہ المسلمین کو دی جاتی ہے - ہم سے کہا جاتا ہے کہ "ترک موالات" کرو - "ترک موالات" کا فتویٰ کون دیتا ہے؟ گاندھی کیا اسلام وہ مذہب ہے جس کو ہم مشرک سے سیکھیں، نہ ہمارا یہ مذہب ہے نہ ہم اس کے لئے تیار ہیں کہ اپنا مذہب مشرکین سے سیکھیں - اسلام میں فرض دو قسم کے ہیں ایک فرض عین دوسرا فرض کفایہ - فرض عین وہ ہے جو ہر عاقل بالغ مسلمان پر فرض ہے حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی بنیاد پانچ فرض بتائے ہیں جن میں نماز روزہ شامل ہیں - فرض کفایہ وہ ہے جو بعض مسلمانوں کے ادا کرنے سے سب کی طرف سے ادا ہو جاتا ہے - اب ایک تیسرا فرض اور نکلا ہے اور وہ صرف محمڈن کالج کے محدود رقبہ کے طلبا پر فرض عین ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ کالج چھوڑ دیں - اس طرح ایک نیا اسلام بنایا جاتا ہے - کیا یہ اسلام ہے کہ ہم مندروں میں جائیں اور وہاں اپنی پیشانیوں پر قشقہ لگوائیں، کبھی مسلمانوں کی یہ شان تھی کہ سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود (اُن کی شان اثر سجدہ ہے جو اُن کے چہروں سے عیاں ہے) آج یہ شان ہے کہ مسلمانوں کی پیشانیوں پر نشان قشقہ نمایاں ہو مسلمان ہندوؤں کا جنازہ اٹھاتے ہیں اور "رام رام ست ہے" کے نعرے لگاتے ہیں - کیا یہ مذہب ہے - مسجدوں میں ہندوؤں کے سوم ہوتے ہیں اور اُن کو ثواب پہنچانے کے لئے چنے پڑھے جاتے ہیں - کیا یہ مذہب ہے - مجمعوں میں "اللہ اکبر" کے نعروں کے ساتھ "گاندھی جی کی جے" پکاری جاتی ہے اب تک مسلمانوں کے کان کلمہ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" سے آشنا تھے اب یہ نیا جز پیدا ہوا ہے - یہاں تک تقریر سن کر مسٹر محمد علی، شیم شیم کہتے ہوئے ہال سے باہر جھپٹ کر چلے گئے -

حضرات! اسلام زندہ مذہب ہے اور جب تک دنیا قایم ہے اسلام بھی قایم رہے گا وہ زندگی کا ایک خاص قانون لایا ہے جس کی پابندی عملاً ہر مسلمان پر واجب ہے - کہا یہ جاتا ہے کہ "ترک موالات" کرو مگر

ہماری صورت، ہمارا طرزِ کلام، نشست و برخاست، کھانا اور پینا موالات کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہے اگر ہمارے دل میں مذہب کا سچا جذبہ ہوتا تو ناممکن تھا کہ ہم اپنی صورتیں، سیرتیں، اس کی ہدایت کے مطابق نہ رکھتے۔ اسلام نے ترک موالات ضروری بتایا ہے مگر سب سے اول اپنے نفس سے اسلام کی تعلیم ہے کہ سب سے اول اپنے نفس کو دشمن کی طرح دیکھو۔ بزرگانِ دین سوتے وقت اپنے نفس کا حساب لیتے تھے کہ آج کیا اچھا کام کیا اور کیا بُرا کام کیا۔ ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ مذہب کی آڑ میں خود ہم کو ہمارا نفس تو دھوکا نہیں دے رہا ہے اور جس کو ہم مذہب کی خدمت کہتے ہیں وہ اس کی مخالفت تو نہیں۔ ہم کو اس پر غور کرنا چاہیئے کہ اس تھوڑے سے عرصہ میں ہم نے اصول مذہب کو پامال کر دیا ہے۔

میں نے ایک محترم مقتدائے وقت سے "ترک موالات" کا اصول دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ چونکہ سب سے پہلے کالج کے طلبا میں استطاعت (قدرت) آگئی ہے لہٰذا ان پر سب سے اول ترک موالات کرنا ضروری ہوا۔ اسی لئے ہم نے اول طلبا میں تحریک ترک موالات کی جاری کی ترک موالات کے متعلق باقی چند امور ہم میں متفق علیہ ہیں اور چند میں اختلاف ہے۔

حاشا میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلام کی تعلیم تو کثرت سے یہ ہے کہ ان الذین آمنوا وعملوا الصالحٰت (وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے عمل صالح کئے) اس طرح ایمان کے ساتھ عمل صالح ہے۔ یہاں اعمال صالحہ بالائے طاق ہیں محض زبانی جوش کو انتہائے مذہب قرار دے دیا ہے پہلے ہم کو خود اسلام کے احکام کی پیروی کرنی چاہیئے۔ اس کے بعد دوسروں کا ہادی و رہنما بننا چاہیئے۔ میں کسی کی نیت پر حملہ کرنا روا نہیں سمجھتا اسی کے ساتھ یہ کہتا ہوں کہ جب مذہب کی تعلیم اس کے مطابق آپ نہیں دیتے تو یہ کہنا چھوڑ دیجئے کہ مذہب کی وجہ سے آپ یہاں آئے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ "ترک موالات" اس لئے واجب ہے کہ گاندھی کہتے ہیں مقدس مقامات پر انگریزوں کا حملہ ترک موالات کی وجہ بتائی جاتی ہے مگر یہ خیال نہیں کیا جاتا کہ ترک موالات کرنے والے خود اپنے ہاتھوں سے مقدس مساجد کی کیا توہین کر رہے ہیں۔ دہلی کی مشہور جامع مسجد میں میرے ایک مخدوم نے ایک ہندو کو منبر پر کھڑا کر دیا اور اُن سے یہ درخواست کی کہ وہ مسلمانوں کو تلقین کریں۔ ذرا سوچئے اور انصاف

کیجیے۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کفار مسجد نبوی میں داخل ہوتے تھے یہ صحیح ہے لیکن آپ نے کبھی کسی مشرک سے یہ نہیں فرمایا کہ وہ مسلمانوں کو مسجد میں آکر تلقین کرے اور وعظ سنائے۔ کیا جو لوگ مشرکوں سے ایمان و مذہب حاصل کر رہے ہیں اُن کا ایمان قایم رہا میں بالاعلان کہتا ہوں کہ وہ مسلمانوں کو تباہ کر رہے ہیں۔ میں نے مولانا عبدالباری صاحب سے بھی اس بارے میں گفتگو کی تھی۔ جب میں نے مسلمانوں کے مندروں میں جاکر اپنی پیشانیوں پر قشقہ لگوانے کا واقعہ بیان کیا تو انھوں نے اظہار ناپسندیدگی کے ساتھ متاسفانہ فرمایا کہ مجھ کو اس کا علم نہیں۔ میں نے اُن سے یہ بھی عرض کیا کہ ہندو مسلمانوں میں اتحاد ضرور ہونا چاہیے ملک اور قوم کی بہبود اس پر منحصر ہے لیکن ایک رسالہ کے ذریعہ سے آپ یہ حدود صاف صاف مقرر فرما دیں کہ یہاں تک اتحاد کی حد ہے اس سے آگے مذہب ہے۔

اتحاد پر قایم رہو مگر مذہب میں دخل نہ دو۔ میرے نزدیک کالج سے جو مطالبات کئے جاتے ہیں وہ ترک موالات میں داخل نہیں ہیں نہ ہو سکتے ہیں۔

وقت ختم ہو جانے کی وجہ سے میں اس سے زیادہ عرض نہیں کر سکتا۔

نوٹ۔ (یہ تقریر زبانی والس چانسلر مسلم یونیورسٹی مہاراجہ سر علی محمد خاں تعلقدار محمود آباد کی فرمایش پر اُس موقع پر کی گئی تھی جب کہ پورا گروہ نان کوآپریٹرز کا گاندھی کی رہنمائی میں محمڈن کالج کو نیست نابود کرنے کے عزم سے علی گڑھ آیا تھا)۔

مقدمہ وقارِ حیات

(سوانح عمری نواب وقار الدولہ وقار الملک انتصار جنگ مولوی حاجی مشتاق حسین مرحوم سابق ریونیو سکرٹری دولت آصفیہ و آنریری سکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ و مدرسۃ العلوم مسلمانانِ علی گڑھ)۔

الحمد للہ قول کا ایک دیرینہ خیال عمل پذیر ہو کر آنکھوں کے سامنے ہے۔ دیر آید درست آید کا مصداق بن کر۔ نواب **وقار الملک** مرحوم زندہ تھے تو اُن کی زندگی ہر شعبۂ عمل میں وقار آفریں رہی۔ اُن کا ہر کام کارنامہ بنا۔ بعد وفات اُن کی "حیات" ادبِ اُردو کے واسطے روح تازہ ہے اور اُس کا وقار بڑھا رہی ہے اسی لئے اُس کا نام "وقارِ حیات" رکھا گیا۔

مسلمانانِ ہند میں جدید خیالات کی عمومی اشاعت کا سہرا سر سید کے سر ہے۔ یہ صور علی گڑھ میں پھونکا گیا۔ میں نے جب ہوش سنبھالا سید احمد خاں کا نام سنا۔ کبھی تعریف سنی کبھی مذمت۔ بسا اوقات تکفیر۔ سر کا بکنا اور مرنے کے بعد کاٹا جانا ایسا مسلم واقعہ تھا جس میں چون و چرا کی مجال نہ تھی۔ میرا نشو و نما ایسے خاندان میں ہوا جو مخالف و موافق دونوں خیالوں کا مرکز تھا۔ مذہباً مخالف تعلیمی مقاصد میں موافق بلکہ مؤید اور یہ دونوں پہلو صاف صاف عیاں تھے۔ میرے محترم عم مولوی عبد الشکور خاں صاحب مرحوم سر سید کے تعلیمی خیالات کے مؤید تھے اور تا بزیست رہے۔ مذہبی خیالات کے علانیہ مخالف۔ مذہبی صداقت عجب شان رکھتی ہے۔ سر سید مرحوم کی رحلت کے بعد میں نے اُن کی نسبت چچا صاحب سے رائے پوچھی تو فرمایا "سید کی راستبازی میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں اسی کا اثر تھا کہ عدالتی فیصلوں میں انصاف کے مقابلے میں کبھی قانون کا لحاظ نہیں فرمایا"۔ تائید میں خود اپنا ایک تجربہ بیان فرمایا دوسری جانب تعصب اور خود غرضی کی بے ثباتی دیکھو۔ ایک بڑے نام نہاد پیری سے رجوع تھا نہ بھی سر سید مرحوم کی دعا پر آمین جہری سے کہتے تھے، حیات جاوید کی اشاعت پر جب میں نے سوال بالا کیا تو کہا "سید محمود بہت خوفناک آدمی ہیں ورنہ ریویو لکھ کر صداقت کا انکشاف کیا جاتا۔ سید احمد خاں نہایت خود غرض

اور بد باطن شخص تھا"۔ میں اس رائے کو اُن کے منہ سے سن کر متحیر رہ گیا! اور آج تک حیرت باقی ہے جب اظہار عقیدت اور اس رائے کا تصور بندھتا ہے انسانی باطنی کیفیت کی ایک عجیب تصویر ذہن میں پھر جاتی ہے۔

خلاصۂ کلام، سرسید مرحوم کے ذکر کے ساتھ ساتھ اُن کے رفقا کا ذکر بھی ہوتا۔ علی گڑھ میں تو مولوی سمیع اللہ خاں مرحوم اور خواجہ محمد یوسف مرحوم کا بول بالا تھا۔ محسن الملک مرحوم اور وقار الملک مرحوم خود ہرچند دور تھے مگر اُن کا ذکر بھی زبانوں سے قریب تھا بلکہ زبانوں پر تھا۔ ٹرسٹیز بل کے پیش ہونے پر رفقا کا تذکرہ بہت زیادہ بلند آوازہ رہا۔ بعض شدید مخالف ہو گئے۔ بعض شدید موافق، بعض اعتدال پسند۔ اُسی زمانے میں نواب وقار الملک مرحوم کی وہ مشہور رائے شائع ہوئی جس میں مخالفت کرتے ہوئے عمارت عدالت کی جانب اشارہ تھا۔ سرسید مرحوم نے باوجود مخالفت اس رائے کا بالاعلان احترام کیا اور صداقت پر آفریں فرمائی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وقار الملک مرحوم کی صداقت کا اثر دل نے محسوس کیا۔

سرسید مرحوم کی زندگی کے آخری دنوں میں جانشینی کا مسالہ اکثر زبانوں پر رہتا تھا۔ اس سلسلے میں نامور رفقا کے کارنامے مذکور ہوتے۔ اُن پر اظہار رائے کیا جاتا۔ میں نے دیکھا کہ مخالف و موافق دونو رائیں اُن کی صداقت کی معترف تھیں۔ مخالفت تھی تو اُن کی رائے کی سختی کے خیال سے۔

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب نے ایک بار فرمایا تھا اور خوب فرمایا تھا "محسن الملک تیل ہی تیل ہیں وقار الملک لوہا ہی لوہا جب تک دونوں نہ ملیں کالج کی مشین نہیں چل سکتی"۔

بالآخر حیدرآباد کے انقلابوں نے ان دونو کو بھی علی گڑھ پہونچا دیا۔

ایک بار سرسید مرحوم نے مجھ سے وقار الملک مرحوم کی دیانت کی تعریف فرمائی کہ سرآسمان جاہ کے ساتھ علی گڑھ آئے تو پتلون میں پیوند لگے تھے۔ اسی سلسلے میں اُن کے نامور رفیق کی نسبت فرمایا کہ جب کوٹھی بنائی تو ستر ہزار روپیہ کا فرنیچر ولایت سے آیا۔ لمپ کی چمنیوں پر مانوگرام منقوش ہو کر ولایت سے آتا تھا۔

خلاصۂ قبل اس کے کہ وقار الملک مرحوم سے نیاز حاصل ہو اُن کی دیانت و صداقت دل پر نقش ہو چکی تھی۔ سب سے اوّل نواب محسن الملک مرحوم کے یہاں ملاقات ہوئی اور اُسی موقع پر نماز مغرب ساتھ

ساتھ ادا کی۔ اس کے بعد نواب صاحب کو بہت کچھ دیکھا۔ سکرٹری شپ کے زمانے میں تعلیمی و سیاسی دونوں میدانوں میں ساتھ کام کرنے کی عزت حاصل ہوئی۔ پاس رہنے کا اتفاق ہوا۔ حیدرآباد اگر اُن کے متعلق اتنا سنا کہ اُس سے زیادہ ممکن نہیں۔ جتنا دیکھا جتنا سنا اُسی قدر دیانت وصداقت کا نقش گہرا ہوتا گیا۔ یہ اوصاف خاص نتیجہ تھے مذہبی عقیدہ کی پختگی اور فرائض مذہبی کی پابندی کے۔

سید محمود مرحوم کی سکرٹری شپ کے زمانے میں اُن کے جانشین کا انتخاب شدید ضروری ہوگیا تھا۔ کالج کے بنگلہ میں ایک بار جلسۂ شوریٰ ہوا بہت سے نامور ٹرسٹی شریک تھے۔ متوفی مسٹر بیک کا اثر کام کر رہا تھا۔ دروازے بند کرکے مشورہ کیا گیا۔ سوال ہوا جدید آنریری سکرٹری کون ہو۔ کثرت رائے نواب محسن الملک مرحوم کے حق میں تھی۔ وقارالملک مرحوم نے مولوی سمیع اللہ خاں مرحوم کا نام لیا میں نے وقارالملک کا۔ اُس وقت کی محسن الملک مرحوم کی نگاہ غلط انداز اب تک مجھ کو یاد ہے۔

خلاصۂ کلام۔ تجربہ کی مضبوط بنیاد پر میرا یہ عقیدہ ہے کہ رفقائے سرسید مرحوم میں وقارالملک صداقت و دیانت میں پایۂ بلند رکھتے تھے۔

۱۹۱۷ء میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب انڈیا کونسل کے ممبر ہوکر انگلستان تشریف لے گئے۔ اُن کی جگہ میں کانفرنس کا جنٹ سکرٹری مقرر ہوا۔ مجھ کو اب تک اقرار نہیں کہ یہ انتخاب بجا ہوا۔ اس انتخاب کے بعد میں نے کانفرنس کے مقاصد قواعد میں دیکھے ادبی پہلو میں ترقی کی گنجائش پائی اہلِ علم وقلم کو متوجہ کیا۔ ذرائع محدود تھے۔ تاہم بعض نادر نمونے پیش نظر آگئے۔ مثلاً تاریخ گجرات پر مولوی سید عبدالحی صاحب مرحوم کا رسالہ "یادِ ایام"۔ اس کو تاریخی مضامین کا نمونہ کہہ سکتے ہیں۔ یا مذہب و عقل کی بحث پر مولوی عبدالباری صاحب ندوی کا رسالہ "مذہب و عقلیات" اس نازک بحث میں قول فیصل کہ یہ رسالہ سنگ بنیاد ہے بلکہ بنیاد ہے۔

کانفرنس کا ایک مقصد مشاہیر کی حیات لکھوانا بھی ہے۔ میں نے خیال کیا کہ رفقائے سرسید مرحوم سب سے اوّل (بلحاظ اپنی قومی خدمات کے) توجہ کے مستحق ہیں۔ یہ علمی خدمت بھی ہے اور ادائے شکر بھی۔ نواب وقارالملک مرحوم کے اسلامی خصائل ملک وملت کے واسطے کامل رہنما ہیں اس لئے میں نے

رفقا میں سے اوّل حیات نگاری کے لئے منتخب کرکے کانفرنس کے سامنے پیش کیا۔ اس تجویز کو کانفرنس کے اجلاس نے بالاتفاق منظور فرمایا۔

اب سوال تھا سرمایہ، مواد تاریخی اور حیات نگاری کا سرمایہ تو واجبی ہی ملا۔ مواد وافر دستیاب ہوا۔ اس کے لئے عزیز سعید مولوی مشتاق احمد صاحب سلمۂ دلی سپاس بلکہ تحسین کے مستحق ہیں جزاہ اللہ خیراً۔ مولوی محمد امین صاحب زبیری مہتمم دفتر تاریخ بھوپال کی مدد بھی لائق شکر ہے۔ ایک معمّر بزرگ ایسے ملے جنھوں نے وقارالملک مرحوم کا شباب دیکھا تھا۔ جن ابتدائی حالات سے کاغذ ساکت تھا اُن کی زبانی معلوم ہوئے۔ اسی عرصہ میں اعلیٰ حضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ نے بکمال ذرہ نوازی اس ناچیز کو حیدرآباد طلب فرمالیا۔ یہاں کی حاضری گویا تکمیل وقارحیات کا مقدمہ تھی۔ یہاں دو صاحب ایسے ملے جنھوں نے سالہا سال وقارالملک مرحوم کی پیشی میں کام کیا تھا۔ ایک نواب عزیز جنگ دوسرے نواب لطیف یار جنگ بہادر، یہ دونوں صاحب واقفیت کے ساتھ ساتھ صاحب نظر اور صاحب الرائے بھی تھے۔ گراں بہا مدد اُن کی رہنمائی اور بیان سے ملی۔ اوّل الذکر اب مرحوموں کی فہرست میں داخل ہو چکے غفرلہٗ۔ دوسرے زندہ ہیں۔ سلامت رہیں۔ دلی سپاس قبول فرمائیں۔ صوبہ ورنگل وقارالملک مرحوم کی انتظامی کوششوں کا دارالعمل رہ چکا ہے۔ وہاں سے بھی مواد فراہم کیا گیا۔ ایک بوڑھے ہندو جو وقارالملک مرحوم کے زمانہ میں تحصیلدار رہ چکے تھے ملے۔ انھوں نے جب سُنا کہ وقارالملک کے حالات لکھے جاتے ہیں تو جوشِ عقیدت میں یہ کہہ کر سوانح نگار کے ہاتھ چومے کہ جو ہاتھ ایسے بزرگ کے حالات لکھیں وہ چومنے کے لائق ہیں اُس کے بعد باچشم پُرنم چشم دید حالات بیان کئے غرض جس مواد تاریخی پر اس حیات کی بنیاد ہے وہ تمامتر تحریری اور مستند تحریری ہے یا خود نواب صاحب مرحوم کی یادداشتوں اور محفوظ خطوط سے لیا گیا ہے۔ یا سرکاری مثلوں اور کتابوں سے بہت سا حصہ معتمد اور واقف کار اصحاب کی زبانی شہادت ہے جو عینی شاہد ہیں۔ خلاصہ یہ کہ جو مواد استعمال ہوا ہے وہ اتنا ہی معتمد ہے جو کسی سوانح عمری کا ہو سکتا ہے۔

کیسی خوش قسمتی تھی کہ حیات نگار مولوی محمد اکرام اللہ خاں صاحب ندوی سے ملے۔ مولوی صاحب قدرتاً

متین، صاحب فکر اور جفاکش واقع ہوئے ہیں۔ اسی کے ساتھ وقائع نگاری میں ملکہ رکھتے تھے۔ رسالہ الندوہ کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ عجب اتفاق ہے کہ جیسا کبھی وہ اپنے ہیرو سے بہت مشابہ ہیں۔ نواب لطیف یار جنگ بہادر نے دیکھ کر فرمایا کہ ان کا تبسم بالکل نواب صاحب مرحوم کا تبسم ہے۔

مولوی صاحب نے نہایت انہماک اور محنت سے اس کام کو انجام دیا ہے۔ حیدرآباد پہنچ کر میں نے اُن کو بھی یہاں آجانے کی زحمت دی تاکہ مواد اطمینان سے فراہم ہو سکے اسی دوران میں رمضان المبارک کا مہینہ آگیا۔ موسم نہایت گرم مئی جون کا تھا۔ مولوی صاحب صبح سے تلاشِ مقصود میں نکل جاتے شام کو واپس آتے۔ اس اثناء میں کاغذات گھنٹوں پڑھتے۔ لوگوں سے ملتے۔ ضرورت ہوتی تو میلوں پیدل چلتے۔ شام کو یہ حالت ہوتی کہ دیکھنے والوں کو رحم آتا۔ میں نے اس اندیشہ سے کہ بیمار نہ پڑ جائیں محنت کم کرنے کی فرمایش کی۔ بے سود۔ ہدایت کی بیکار، تاکید کی اب اثر ہوا اور مولوی صاحب نے سواری کی مدد لی۔ محنت و انہماک کے ساتھ مولوی صاحب کی نظر بالغ ہے تحریر بلیغ مورخانہ، واضح، مسلسل، اور فضول نویسی سے پاک۔ اُن کو یہ ملکہ حاصل ہے کہ صدہا صفحے پڑھیں، نگاہ کو ثابت قدم رکھیں کارآمد باتیں اخذ کرلیں اور بیکار باتوں سے متاثر نہ ہوں۔ اس کے بعد صورتِ واقعہ و معاملہ مورخانہ لکھ دیں۔ ایک حیات نگار ایسا ہی ہونا چاہیئے مولوی صاحب کا شکر جس قدر ادا ہو کم ہے بلکہ بہت کم، جزاہ اللہ عنا خیر الجزاء۔

غرض نہایت مستند مواد اور فاضل وقائع نگار کی کئی برس کی جانکاہ محنت کا ثمرہ وقار حیات کی شکل میں جلوہ فرما ہے۔ اہلِ خدمت اپنا کام کر چکے اب قدر اہلِ نظر کے ہاتھ ہے۔ وقار حیات کی شان بے تکلف یہ کہنے کی اجازت دیتی ہے کہ حیات جاوید کی بہترین رفیق ہے۔ یہی مرتبہ رفقا میں اُس کے ہیرو کا تھا۔ خدا کرے دوسرے رفقا کی حیات نگاری سے بزم معنوی ایسی ہی آباد ہو جیسی سرسید مرحوم کی جسمانی بزم معمور تھی۔ کانفرنس تجویز کر چکی ہے کہ وقار الملک مرحوم کے بعد نواب محسن الملک مرحوم کی حیات لکھی جائے۔ حال میں یہ خبر خوش کان میں آئی ہے کہ ایک لائق اہلِ قلم کا نوشتہ قاضی رضا حسین مرحوم کی حیات کا مسودہ کانفرنس کو ملنے والا ہے۔ یاد ہوگا کہ قاضی صاحب واحد نمایندے ہمارے سرسید مرحوم کی بزم عالی میں تھے کیا ادب اس کہنے کی اجازت دیگا کہ حیات جاوید اور وقار حیات قدیم تعلیم کے فرزندوں کی محنت کا ثمر ہیں۔ جدید

اہلِ قلم بھی اپنا عالی دماغ اس جانب مائل فرمائیں گے۔

بات میں بات پیدا ہوتی ہے۔ مسلم یونیورسٹی پر نظر ڈالو۔ مولوی سمیع اللہ خاں مرحوم نے چھپر کے نیچے اسکول کا آغاز کیا۔ سرسید مرحوم کی کوشش نے پختہ عمارتوں میں کالج کا جلوہ دکھایا۔ محسن الملک مرحوم نے چار دانگ ہندوستان کو سرسید کے جھنڈے کے نیچے جمع کر دیا۔ وقار الملک مرحوم نے محسن الملکی فتوح کو عمیق کیا مضبوط کیا۔ سطح کو عمق بخشا۔ کالج کو اس وقت چھوڑا جب وہ یونیورسٹی بن چکا تھا۔ تعلیم جدید کے جوہر دیکھنے کے لئے نگاہیں مشتاق ہیں۔ خداوند تعالیٰ مبارک فرمائے۔ اس دور کی ترقیوں کی فہرست اس سے بھی طویل ہو۔

خصائل وقار الملک ۔ مشک عطار کے تعارف کا محتاج نہیں ہوتا۔ وقار حیات اپنی داستان خود ہی سنا رہی ہے تاہم مقدمہ نگاری خلاصہ نگاری کی متقاضی ہے۔

وقار الملک مرحوم معمولی حیثیت کے شریف گھر میں پیدا ہوئے۔ مکتب کی تعلیم پائی ابتدائی کاروبار بھی محض معمولی تھے۔ ملازمت دس روپیہ ماہوار سے شروع کی۔ ترقی آہستگی سے کی تنخواہ میں بھی اور مراتب میں بھی۔ میدان عمل وسیع پایا۔ ایک وقت حیدرآباد کی سلطنت میں اصلی کارفرما اُن کی قوت تھی۔ زندگی کے کارنامے دفتر اور حکومت دونوں میں عیاں ہوئے۔ حاکم بھی رہے محکوم بھی۔ ادنیٰ محکومی ایک کنارہ پر اور حاکمی دوسرے کنارہ پر اس میدانِ عمل کے ہے۔

مسلمانوں کی سیاسی خدمت بورڈنگ ہوس کی سپرڈنٹی سے کالج کی اور لیگ کی آنریری سکرٹری شپ تک کی۔ کالج کا سکرٹری ہونا مسلمانانِ ہند کا سردار ہونا تھا۔ یہ مرتبہ اس منصب کو سرسید مرحوم سے لے کر وقار الملک مرحوم کے عہد تک رہا۔ زمانے کی ترقی کے ساتھ نزاکتیں بڑھیں نزاکتوں کے ساتھ ذمہ داری۔ کراچی میں کانفرنس کا اجلاس نواب وقار الملک مرحوم کے اقبال کی شہادت تھا جب تمام ملک کے نمایندوں نے بالاتفاق اُن کو اپنا لیڈر (سالار) تسلیم کیا۔

انہی مصروفیتوں میں فرصت ملی تو قلمی علمی خدمت بھی کی۔ نپولین کی سرگزشت اس کی یادگار ہے۔ تہذیب الاخلاق شاہد صادق ہے۔

ایک ممتاز پہلو اُن کی زندگی کا سرسید مرحوم کی رفاقت ہے۔ پہلو نہیں کارنامۂ اعظم خود مجھ سے بیان

فرمایا تھا کہ پہلی بار سرسید مرحوم سے اُس وقت ربط حاصل ہوا جب دونو مراد آباد کے قحط کے اہتمام میں یکجا ہوئے۔ سرسید مرحوم اعلیٰ افسر تھے یہ اہلکار۔ ایک نے دوسرے کو دیکھا جانا' مانا' ایک نے رفیق' دوسرے نے سردار بلکہ پیر و مرشد۔ یہ عقیدت اور اعتقاد زندگی کے ساتھ رہا جان کے ساتھ گیا ؎

با تو آں عہد کہ در وادیِ ایمن بستیم
ہمچو موسیٰ ارنی گوئے بمیقات بریم (حافظ)

اس رفاقت کا دَوران صدی کا ایک ثلث زمانہ ہے۔ اس دراز مدت میں ایک بار سے زیادہ اختلاف ہوا۔ شدید ہوا اظہار اختلاف کا لہجہ بھی مریدانہ اور عقیدتمندانہ تھا۔ اختلاف پر اصرار کے وقت بھی تحریر سے' تقریر سے' حرکات سے' سکنات سے' جوشِ عقیدت ٹپکتا تھا۔ ہر ادا ثابت کرتی تھی کہ ایک عقیدتمند مرید اپنے مرشد کی خدمت میں عرض پرداز ہے۔ مثال۔ عروجِ حیدرآباد کے زمانے میں ایک مجمع اکابر نے یہ سماں دیکھا کہ وقار الملک کی ترکی ٹوپی اُن کے ہاتھ میں ہے گھٹا ہوا سر سید کے سامنے جھکا ہے زبان سے کہہ رہے ہیں "یہ سر حاضر ہے جوتیاں ماریئے مگر عرض یہی کرونگا کہ رائے آپ کی غلط تھی"۔

سرسید مرحوم کی وفات کے بعد قریباً بیس برس زندہ رہے۔ مرشد سے بہت زیادہ مرید کو ہندوستان کے عرض و طول میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ وفاداری کی داد دیجئے کبھی مرید سے زیادہ اپنے آپ کو نہیں سمجھا۔ مرشد کا سجادہ مرشد کی طرح واجب الادب رہا بلکہ ادب آموز جوہرِ وفاداری میں وقار الملک منفرد نہ تھے محسن الملک مرحوم مولوی زین العابدین خاں مرحوم۔ برکت علی خاں مرحوم۔ خلاصہ باستثنائے قلیل سرسید مرحوم کے سارے رفیق اُن کی عقیدت و محبت جان کے ساتھ لے گئے۔ ہاں اس میں منفرد تھے کہ اختلاف کی جرارت کرتے تھے' جرارت کے بعد اظہار' اظہار پر اصرار' اصرار پر استحکام۔ اسی کے ساتھ عقیدت مستحکم۔

ان چہارگانہ خصائل میں اُن کو جب اور جہاں دیکھو گے دلیر اور مستعد پاؤ گے۔ بزدلی اور کاہلی یہ لفظ اُن کی لغاتِ زندگی میں لکھے ہی نہیں گئے۔ آخر عمر میں کمزوری ہے گھٹنوں میں درد ہے۔ تاہم بلند زینے پر چڑھتے اُترتے ہیں۔ جب عرض کی اس زحمت فرمانے کی کیا ضرورت تھی جواب دیا بلکہ دل پر لکھ دیا کہ انسان

کو اتنی محنت کا خوگر رہنا چاہیئے۔

اُن کی زندگی کی کل جس طاقت سے چل رہی تھی اور چلتی رہی وہ اُن کی مذہبی زندگی تھی۔ بچپن میں نماز کے گھر میں پابند تھے۔ بڑے ہوئے تو نماز کے پیچھے انگریزی ملازمت چھوڑی۔ عروج حیدرآباد کے دور میں شاہی اسپیشل اُن کی نماز کے واسطے روکی گئی۔ علیٰ ہذا القیاس۔ اس زندگی میں اُن کی اوّلیں سعادت یہ تھی کہ اُن کے قلب نے قوت کے ساتھ صداقتِ ایمانی کو جذب کیا اور یہ انجذاب تہہ تک پہنچا۔ اسی کا نام ہی قوتِ ایمانی قوتِ ایمانی کو لازم ہی پابندیِ ارکانِ اسلام۔ قوتِ ایمان اور پابندی ارکان کا نتیجہ تھی وہ پرعظمت زندگی جس کا کارنامہ آپ کی آنکھوں کے سامنے ہی۔ اس کارنامہ کا طرۂ امتیاز صداقت و جانفشانی تھی۔ یہی سبق تم اس شاندار زندگی سے حاصل کرسکتے ہو مگر یاد رکھو ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ (سعدی)

حیدرآباد ۲۱ نومبر ۱۹۲۵ء — محمد حبیب الرحمٰن صدر یار جنگ

مقدمہ خزینۃ المعانی

(مجموعۂ قصائد و قطعات مولانا محمد عبدالغنی خاں صاحب مرحوم المتخلص بہ غنی تلمیذ رشید حضرت مفتی محمد لطف اللہ صاحب رحمہ اللہ۔

ارباب معنی پر مخفی نہ رہے کہ "خزینۃ المعانی" نام ہی مجموعۂ قصائد کا جو تصنیف ہیں اُستاذی و مولائی مولانا عبدالغنی خاں صاحب غنی تخلّص کے غفرلہٗ۔

اہلِ غنا کا خزانہ لٹا کرتا ہی۔ جو اُن کو مبدء فیاض سے ملتا ہی دوسروں کو پہنچا دیتے ہیں۔ بخشتے ہیں اور ٹکسالی مال بخشتے ہیں۔ یہ قصائد بھی خزینۃ المعانی کا ٹکسالی مال ہیں، اہلِ نظر ملاحظہ فرمائیں۔ مشکِ عطر بیز ہی عطار نہ خاموش۔

اُستاد میرور نکتہ رس، معنی آفریں طبیعت لے کر اس عالم میں آئے تھے۔ جودتِ استعداد اور سلامت فطرۃ فضلائے عصر کو تسلیم تھی۔ استاد العلما مولٰنا لطف اللہ صاحب مغفور کا یہ مقولہ تلامذۂ خاص کی زبانوں پر رہا کہ "عبدالغنی نے گیارہ برس مجھ سے پڑھا کبھی بیجا اعتراض نہیں کیا"۔ مرحومی مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی کی ایک تحریر دستِ خاص کی میرے پاس محفوظ ہے اُس میں استعداد علمی اور حسنِ تعلیم کی تعریف کی ہے۔

فارسی سے مناسبت طبعی تھی۔ مطالعہ وسیع تھا اور عمیق۔ شاہد عدل کتاب ارمغانِ آصفی ہے۔ نثر فارسی کا ایسا ہی ذوق تھا جیسا نظم کا۔ یہ وصف کمیاب ہے، خصوصاً دورِ حاضر میں۔ بیاض نثر اُسی طرح مہیا کی تھی جس طرح نظم کی بیاض مہیا کی جاتی ہے۔ ایک یادگار میرے کتاب خانہ میں بھی ہے۔ اس میں مختلف عنوانوں پر مماثل نثریں اساتذۂ نثر کی جمع کی گئی ہیں۔

طالب علمی مولوی احمد شیر خاں، مولوی عبداللہ خاں علوی کے دادا محلہ میں مکتب پڑھایا کرتے تھے۔ یہ مکتب مولوی صاحب کے مکان سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھا۔

دہلی مرحوم کی آخری بہار جن فارسی اہلِ کمال پر نازاں تھی اُن میں علوی بھی تھے۔ صہبائی اُن کے شاگرد تھے۔ اس تقریب سے مولوی احمد شیر خاں نے دلّی کی صحبتیں اچھی طرح دیکھی تھیں۔ مکتب میں ان صحبتوں کا ذکر کرتے شاگرد سنتے۔ فارسی کے نکات بیان کرتے۔ اس طرح مولوی صاحب کے دل میں علم کا ایک ذوق پیدا ہوا۔ شوقِ طلب کا یہ عالم تھا کہ نشست کے تختت کی کیلوں کو شمار پر سبق یاد کرتے۔ جتنی کیلیں تھیں سب کی تعداد کے مطابق سبق دہرا لیتے۔ صبح کھانا کھا کر گھر سے نکلتے شام کو آتے۔ دن بھر مکتب میں رہتے۔ استاد یہ شوق دیکھ کر بے تکلف نہ کہتے "لڑکے تو نے تو تسلی (تحصیل) تمام کر لی"۔ جب فارسی کی اوپر کی کتابیں پڑھنے لگے تو حسبِ حال اُستاد کی تقریریں مطالب ہوتے ساتھ ہی کہتے کہ اس سے زیادہ کا سمجھنا عربی جاننے پر منحصر ہے۔ اس سے عربی کا شوق پیدا ہوا۔ مگر وطن میں اس کے پورے ہونے کا سامان نہ تھا۔ بالآخر گھر چھوڑا۔ فرغل اوڑھے ہوئے ایک بغل میں کتابیں دوسری میں ایک جوڑا کپڑوں کا لئے گھر سے بے اطلاع نکل کھڑے ہوئے۔ زادِ راہ یہ تھا کہ بڑی بہن نے چھپا کر دو روپیہ دیدئے تھے۔ یہ واقعہ

علامۂ قوشجی شارح چغمینی کے واقعہ سے کس قدر مناسب ہے۔ علامۂ مہر وح بھی گھر سے چھپکر طالب علمی کے لئے نکلے تھے۔ بہن نے اپنا زیور کتابوں میں چھپا کر رکھ دیا تھا۔

غرض پیادہ پا فرخ آباد پہنچے۔ وہاں نواب عبدالعزیز خاں صاحب مرحوم عزیزہ (حافظ رحمت خاں مرحوم والیِ روہیلکھنڈ کے گھرانے کے چشم وچراغ) وکالت کرتے تھے۔ مفتی عنایت احمد صاحب مغفور کے ارشد تلامذہ میں سے تھے ان سے عربی شروع کی صرف کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔ شوق بلند تر آستانہ کا متقاضی تھا۔ فرخ آباد سے پیادہ پا کانپور پہنچے۔ شوق نے کہا ع

آستانے یود مطلوب آسمانے یافتم

مدرسۂ فیض عام مولانا سید حسین شاہ صاحب واصف بخاری اور مولانا لطف اللہ صاحب کے فیوض تدریس سے رشک بخارا و شیراز بنا ہوا تھا۔ حافظ برخوردار مہتمم تھے۔ رہنے کو تو ایک تکونا مختصر حجرہ مسجد میں ملا مگر شوق نے حسب حوصلہ سامان کمال پا لیا۔ پورے انہماک سے تحصیل علم میں مصروف ہوگئے۔ مولانا سید حسین شاہ صاحب سے سبق شروع ہوگیا۔ مدرسہ جاتے تو راستہ میں شرح مأتہ عامل ہدایۃ النحو زبانی پڑھتے جاتے اس طرح یہ وقت بھی ضائع نہ ہوتا۔ کاش یہ واقعہ آج کل کے فیشن ایبل طلبا کے کان تک پہنچ جاتا۔

ابتدائی زمانہ میں مہینوں ایک وقت چنے کھا کر بسر کی۔ مسجد کے نیچے بھڑبھونجے کی دکان تھی شام کو اندھیرا ہو جاتا تو رومال میں دو پیسے باندھ کر چپکے سے دوکان میں پھینک کر آگے بڑھ جاتے۔ بھڑبھونجا چنے تول کر باندھ رکھتا۔ واپسی میں چلتے چلتے رومال لے لیتے۔ عرصہ تک کسی کو پتہ نہ چلا کہ کیا اور کہاں کھاتے ہیں۔ مولانا سید حسین شاہ صاحب کے ایک مخلص تحصیل کے جمعدار تھے انھوں نے اپنی پنج سالہ بچی کی تعلیم کے لئے معلم کی فرمائش کی سید صاحب نے اُن کو باصرار مقرر فرما دیا۔ معاوضۂ تعلیم ایک وقت کا کھانا ٹھیرا اس شرط پہ کہ مکان پر کھانے نہ جائیں گے کھانا قیام گاہ پر آجائے۔

لطیفہ۔ ایک روز جمعدار نے روغنی روٹیاں بھیجیں۔ حجرہ میں بعض اور طلبا کے ساتھ مل کر بیٹھے کھا رہے تھے۔ اُستاد تشریف لے آئے۔ دیکھ کر برجستہ فرمایا ؎

دور دورہ مولوی عبدالغنی   رات دن کھاتے ہیں روٹی روغنی

یہ شعر کچھ ایسے انداز شفقت سے فرمایا تھا کہ شاگرد کو آخر عہد تک یاد رہا۔ پڑھتے تھے اور لطف حاصل کرتے تھے۔

جو فرغل گھر سے ساتھ لائے تھے ایک سال کے بعد جاڑے کے مقابلہ کی تاب اُس میں نہ رہی صرف چادر رفیق رہی۔ کتنی سرد راتیں شوق کی پشت گرمی سے اس چادر میں بسر ہوئیں، خدا تعالیٰ بہتر جانتا ہے۔ درس میں جب بدن سردی سے کانپتا تو جابجا نوچتے کہ کانپنا موقوف ہو اور پاس بیٹھنے والوں پر راز نہ کھل جائے۔

الغرض۔ چندہی روز میں ابتدا انتہا کی خبر دینے لگی۔ ایک روز آواز آئی مولوی عبدالغنی۔ یہ اُستاد کی آواز تھی، گھبر گئے کہ نام کے ساتھ مولوی کا لفظ تھا۔ یہ ابتدائی کتابیں پڑھتے تھے۔ نہ روئے ماندن نہ پائے رفتن دوسری آواز آئی۔ اب توقف محال تھا۔ حاضر ہو گئے۔ معلوم ہوا حاضری بجا تھی ایک روز جرأت کرکے عرض کی "اُس دن مولوی کے ساتھ یاد فرمایا گیا" فرمایا "ہاں تم مولوی ہو جاؤ گے"

چند روز کے بعد شاہ صاحب بھوپال تشریف لے گئے۔ سبق مولٰنا محمد لطف اللہ صاحب سے ہونے لگے۔ اسی آستانۂ مبارک سے خلعتِ کمال کا ملنا مقدر و مقرر تھا۔

مولٰنا سید حسین شاہ صاحب بہت ذی وجاہت تھے۔ قوی سرد ممالک کے تھے۔ مزاج میں شان اور دبدبہ تھا جس کا اثر تلامذہ اور حاضرین پر پڑتا۔ نشست برخاست گفتگو بہت باوقار اور شائستہ تھی۔ مزاج شگفتہ تھا۔ خانہ داری کے تعلقات سے بالکل بے تعلق تھے۔ صحیح اُردو خصوصاً تذکیر تانیث کی صحت کا بہت خیال رکھتے تھے۔ مدرسہ کے سلسلہ میں جو دعوتیں ہوتیں اُن میں کبھی شرکت نہ فرماتے۔ فارسی نظم ونثر پر پوری قدرت تھی۔ نثر میں کتاب خلعۃ الہنود یادگار رہی۔ نظم کا نمونہ ؎

زاہد ہوائے آں قدرِ عنائی کند
ایں سفلہ رو بہ عالمِ بالائی کند

عبدالرحمٰن خاں صاحب مرحوم (مالک مطبع نظامی) کا زہد اس شعر کو سن کر کانپ کانپ جاتا۔

حاصل کلام۔ اُستاد مرحوم کی شانِ طلبِ علم یہ تھی کہ سوائے علم کے کوئی شے مطلوب نہ تھی۔ فرماتے تھے سبق سے فارغ ہو کر سب سے مقدم فکر یہ ہوتی کہ اُستاد کی تقریر کے الفاظ ذہن میں نقش ہو جائیں نقش

ایسا گہرا ہو کہ مٹائے نہ مٹے۔ ذہن میں تقریر کا بار بار اعادہ فرماتے۔ قلم سے لکھتے۔ ہم سبقوں سے مذاکرہ کرتے۔ ان مدارج سے فارغ ہو لیتے تب دوسرے مشاغل کی جانب متوجہ ہوتے۔

انہی ایام کا واقعہ ہے کہ میرزا دبیر مرحوم واردِ کانپور ہوئے۔ مجالس کی شہرت سے فضائے شہر گونج اٹھی۔ جا بجا یہی چرچا تھا اور یہی تذکرہ طلبا کو عام اجازت ہو گئی کہ جس کا دل چاہے جمال کمال سے آنکھیں روشن کرلے۔ مولوی صاحب نے بھی ارادہ کیا۔ طالب علمی کی مصروفیت نے فرصت نہ دی۔ آخر عمر تک میرزا دبیر کے نہ دیکھنے کا افسوس رہا۔

الشئی بالشئی یذکر۔ امام یحییٰ مصمودی راوی موطّا کا واقعہ اس واقعہ سے کس قدر ملتا جلتا ہوا ہے! امام ممدوح مدینہ طیبہ میں حضرت امام مالکؒ کی خدمت میں حاضر تھے۔ غل ہوا کہ ہاتھی آیا ہے۔ حجاز میں فیل! سارا درس خالی ہو گیا۔ یہ بدستور بیٹھے رہے۔

شیخ محترم نے فرمایا یحییٰ "اندلس (اسپین) میں ہاتھی نہیں ہوتا تم بھی دیکھ آؤ"۔ ادب سے عرض کی اندلس سے آپ کو دیکھنے حاضر ہوا ہوں ہاتھی دیکھنے نہیں آیا"۔ غرض نہ اٹھے نہ ہاتھی دیکھا۔ آج طلبا کی کتنی راتیں تھیٹر دیکھنے میں صرف ہوتی ہیں۔ اس کا جواب شاید بورڈنگ ہوسوں کے رجسٹر بھی نہ دے سکیں گے۔

الحاصل۔ توجہ کی یکسوئی اور اہتمام طلب مولانا کی طلب علم کا طرۂ امتیاز تھا جب استاد علامہ علی گڑھ تشریف لے آئے تو یہ بھی ہمرکاب تھے۔ جامع مسجد کے حجرے میں قیام ہوا۔ اس مسجد کے بلند مناروں کے دروازے جو کواڑوں سے محفوظ ہیں۔ حجروں کا کام دیتے تھے۔ جب کواڑ بند ہو جائیں تو اندر بیٹھنے والے کو دنیا و ما فیہا سے بے خبری ہو جاتی ہے۔ یہ خصوصیت تھی جس کی وجہ سے وہ حجرے شائق مطالعہ طلبا کے محبوب تھے۔ خالی ہوتے ہی پہلے درخواستیں استاد کی خدمت میں پیش ہو جاتی تھیں۔ مولانا کو بھی ان میں سے ایک حجرہ ملا تھا۔ وہاں کے مطالعہ کی محویت کا ذوق آخر عمر تک یاد رہا۔

ایک واقعہ بیان کر کے یہ حصہ ختم کر دیتا ہے۔ ابتدا گھر سے نکل جانے کے بعد دو برس تک گھر والوں کو پتہ نہ چلا کہ کہاں ہیں۔ جب کانپور کا قیام معلوم ہوا تو والد وہاں پہنچے۔ استاد سے ملے طلبا میں دیکھ کر پہچانا۔ کوشش طلب دیکھ کر خوش ہوئے۔ چند روز کے لئے گھر لے آئے کہ اعزہ مطمئن ہو جائیں۔ جب سب سے

ل کر کان پور جانے لگے تو والدۂ ماجدہ نے کان کی چاندی کی بالیاں اُتار کر دیں کہ ان کو خرچ کرنا جب بڑھ کر کماؤ تو سونے کی بالیاں اُن کے بدلے میں بنوا دینا۔ مولانا کو موقع نہ ملا کہ اس فرمائش کی تعمیل کرتے۔ والدہ کا انتقال ہو گیا۔ مدت کے بعد خواب میں دیکھا کہ سونے کی بالیاں کانوں میں پہنے ہیں۔ پوچھا یہ بالیاں کہاں سے آئیں۔ جواب دیا جو بالیاں تم کو دی تھیں اُن کے بدلے میں یہ یہاں ملی ہیں۔

نثر نگاری | مولانا نے نثر نگاری میں نظم کی دلکشی پیدا کر دی تھی۔ علامہ شبلی نے جب ارمغانِ آصفی کا دیباچہ دیکھا تو بہت محظوظ ہوئے۔ بوقتِ ملاقات اس کے یہ فقرے مثل چیدہ اشعار کے زبانی سنائے:۔

"از گراں مائگی نقد روایات ہمسنگ ذہبی و ابن حجر ست، و در میزانِ اعتدال رواۃ از سُبکی گراں پلہ تر۔"

کلام میں متانت ہے، خیالات میں دقّت اور علو۔ دل و دماغ مضامین علمیہ سے معمور تھے۔ اساتذہ کے کلام کا تتبع تام تھا۔ یہی لوازمہ ہے قصیدہ کا۔ قصائد کا مطالعہ میرے کلام کی تصدیق کرے گا۔ نمونہ ملاحظہ ہو:۔

دی دمِ صبح بدیدم کہ چو شمعِ ایمن — از سوادِ افق افروخت بیاضِ روشن
طالعش را ز فلک کوکبۂ ارزانی — کہ کواکب شدہ از وخیرہ برنگِ ارزن
مہر از شب چو در آمد بکنارش گفتم — بط کشیدست بخود بیضہ کہ دادست عن
یا مگر دایۂ چینی ست کہ شیرش خوردست — طفل ہندی کہ بزاد از شکم زنگی زن
راحت انگیز و طرب خیز چو صبحِ امید — یا پسِ شامِ غریبی چہ مہے، صبحِ وطن
یا بہارے ہست کہ از عنبرِ سارا گل شد — چوں فرو ریخت ز نافِ شب گل مشکِ ختن
خواب می آمد و بادِ سحری خوش میرفت — دل سکون داشت از ین آمدن و زاں رفتن
میر و دیا دکہ آید بہ چمن ابرِ بہار — ابر آید کہ رود آب بہر جوئے چمن
باد بر آتشِ گل و لالہ دامان زدن ست — ابر بر خاکِ چمن غرقۂ آب افشاندن
باد می خیزد و بیزد ہمہ جا مشکِ تتار — ابر بنشیند و ریزد ہمہ سو درِّ عدن
ابر بکشاد چو از خدمتِ گلزار کمر — آب از موج زہر جو بکمر زد دامن

ازگل و لاله و نسرین سبد گل چین شد   بام و دیوار و در و عرصهٔ کوی و برزن
خرم و تازه و شاداب و شگفته همه جا   چه لباتین چه صحارا چه تلال و چه دمن
سبز همچون فلک از سبزهٔ خودرو کهسار   سرخ چون نار خلیل از گلِ نازان گلشن
دامنِ دشت ز گلگشت گریبانِ عروس   روے صحرا ز ریاحین همگی پشتِ چمن
کوه انداخته یک چادر کاهی بر دوش   دشت پوشیده یکے حلهٔ حمرا بیدن
نامیه وخت دگر بر تنِ گلزار امروز   از حریر سمن و اطلسِ گل پیراهن
سرو را ز آبیه وان ست قبا سیمابی   لاله را کرته گلابی ست ز شبنم بر تن
باغ شاداب و شگفته چو بهشت علیا   نخل چون سدره و طوبیٰ بزمین سایه فگن
نخلبند چمنِ خلد به پیرامنِ باغ   خار چیں بند و گوید که چمن پیراهن
گردن و دست عروس ست تو گوئی هر شاخ   بس که با غنچه و گل آمده دست و گردن
قوتِ نامیه از تارِ عروقِ اشجار   میکند جامهٔ خورشید رفو چون درزن
مشعل لاله و گلنار شد از بادِ خزان   همچو شمع شجرهٔ وادیِ ایمن ایمن
لالهٔ آل میانِ گلِ مهتاب بود   شمع تابندهٔ ناهید به قندیلِ پرن
در شقایق گلِ مهتاب شگفته باشد   ماه و پروین که گرفت ست شفق پیراهن
لالهٔ هندوی سیه مست که سازد در عید   کاسه لبریز گلال از لقم و از روین
شاخِ شب بوی شگفته به سفالِ ریحان   صورتِ شمع شبافروز نهاده به لگن
هر کجا چشم کشائی همه نرگس بینی   هر کجا گوش دهی مرغ نوا زد ارغن
هر کجا بو طلبی نکهتِ آرا شب بوست   هر کجا ذائقه جوئی گل حلوا بدهن
هر کجا پای نهی مخمل سبزه فرش ست   هر کجا دست برآری پر واز گل دامن
طارم تاک نماید فلک و کاهکشان   تاک از خوشهٔ انگور چو پروین و پرن

اخلاق | مولانا کے اخلاق، کلام، نشست و برخاست غرض جملہ حرکات و سکنات مہذب و باوقار تھے۔ محسوس ہوتا

تھا کہ اخلاق ناصری اور اخلاق جلالی کے عمیق مطالعہ کے بعد عمل پیرا ہونے کی کوشش کی ہے اور سعی عمل نے اوصاف کو ملکہ اور طبیعت ثانیہ بنا دیا ہے۔ شان علمی میں بھی بہی وقار اور تعمق تھا۔ آخر تک میں نے دیکھا کہ فیض تربیت اور قوتِ مطالعہ سے جو دقّت نظر حاصل کی تھی اُس کی حفاظت میں اہتمام بلیغ فرماتے تھے۔ سرسری مطالعہ اور سبک مطالب و مضامین سے بہت اجتناب تھا۔ نظر میں بلندی اور سیرچشمی تھی۔ طرز ماند و بود با قاعدہ اور شائستہ تھا۔ لباس وثاقت اور صفائی کی شان لئے ہوئے ہوتا تھا۔ مزاج میں شگفتگی تھی، عبوست نہ تھی۔ مہذب مزاح پسند تھا، ذوقِ ادب پورا تھا، اساتذہ کے کلام میں جہاں تناسب الفاظ بندھ گئے تھے، بہت پسند آتے تھے۔ اس سلسلۂ درس میں ذوق ادب تمام اساتذۂ کرام کو رہا ہے۔

معاملہ فہمی | عقل معاش نہایت سلیم تھی، معاملہ فہمی سے پورا حصہ پایا تھا۔ عدالت میں بعض مقدمات لڑانے پڑے تو اس خوبی سے اہتمام کیا کہ اہلِ نظر مان گئے۔ پنڈت اجودھیا ناتھ، الہ آباد کا نامور وکیل، قابلیت کا لوہا مانے ہوئے تھا۔ ہبۂ مرض الموت کی اس مقدمہ میں بحث تھی، میں نے دیکھا کہ برسوں تک اس مسئلہ میں مشورہ کرنے اہل معاملہ مولٰنا کی خدمت میں آیا کرتے تھے۔

خانہ داری سلیقہ اور ستھرائی کے ساتھ تھی۔ اولاد کی تعلیم و تربیت میں اہتمام بلیغ تھا۔ اس طرح پرورش کی کہ بلند نظری پیدا ہو، دنائت اور پست خیالی سے دور رہیں۔

طرز تعلیم | طرز تعلیم استادانہ تھا۔ درس کے وقت شان وقار ہیبت زا ہوتی تھی۔ جو قواعد تعلیم اساتذہ سے ملے تھے اُن پر پورا عمل تھا۔ فرماتے تھے کہ شاگرد کو استاد کی توجہ سے فیض پہنچتا ہے۔ درس کے وقت شاگرد کو سامنے بٹھانا چاہیئے۔ مطالعہ اور صحت عبارت پر بہت توجہ رہتی تھی۔ لغزش پر ناخوش ہوتے، مکرر لغزش ہوتی تو نفریں فرماتے۔ فرماتے تھے کہ طالب علم کو اس سے بہت نفع ہوتا ہے کہ فراغ سبق کے بعد مطالب کتاب پر وقتاً فوقتاً غور کرے۔ اُستاد کی تقریر پیش نظر رکھے، سوچے کہ اعتراض کیا تھا اور جواب کیا۔ مطالب کتاب کو اپنی عبارت میں قلمبند کرنے پر زیادہ زور دیتے تھے۔ اس سے مطالب ذہن نشین ہوجاتے ہیں۔ مختصر المعانی کے بیسیوں صفحے میں نے فارسی میں لکھے تھے جن پر زبان اور مطالب دونوں کے لحاظ

سے باقاعدہ اصلاح فرمائی جاتی تھی۔

میں اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہوں کہ ایسے نکتہ سنج اُستاد سے استفادہ کا موقع ملا۔ ۱۳۰۰ھ میں مولنٰنا بھیکن پور تشریف لائے۔ میں شرح جامی اور شرح تہذیب اور فقہ میں منیۃ المصلی اور کنز الدقائق اس وقت پڑھ چکا تھا۔ قطبی مع میر مولانا سے شروع کی۔ پھر مختصر المعانی۔ یہ دونوں کتابیں پورے اہتمام سے پڑھائیں۔ مطالعہ، روک ٹوک، تاکید، زجر و توبیخ، بحث و مباحثہ، فارسی ترجمہ، یہ تمام مدارج طے ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ ان دونوں کتابوں سے استعداد کو پورا نفع پہنچا۔ میں نے مولنٰنا سے منطق میں قطبی مع میر، ملا حسن، حمداللہ، حکمت میں ہدیہ سعیدیہ ومیبذی، اصول میں نورالانوار، توضیح تلویح تا مقدمات اربعہ، معانی میں مختصر المعانی فقہ میں شرح وقایہ اور ہدایہ (کتاب الرہن تک) عقائد میں شرح عقائد نسفی، حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح، تفسیر میں جلالین اور تفسیر بیضاوی (سورۂ فاتحہ وابتدائے سورۂ بقرہ)۔

جو حاصل ہوا فیض استاد سے جو رہ گیا اپنے قصور استعداد سے۔ مولانا نے قریباً تمام علوم اُستادالعلما مولانا محمد لطف اللہ علیہ رحمۃ اللہ سے پڑھے تھے۔ اُستاد کا ادب نمونۂ سعادت تھا۔ سعادتِ خدمت تمام تلامذہ سے زیادہ حاصل ہوئی۔ زندگی بسر یوں ہوئی اور آخرت کا آغاز اس طرح ہوا کہ استاد سے آٹھ روز بعد وفات پائی اور جوار میں دفن ہوئے۔ اسکنہما اللہ تعالیٰ فی جوار رحمۃ بحرمۃ سید المرسلین الذی ارسلہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ اجمعین۔

مرض الموت کا ایک واقعہ عجیب ہے، اور تلمذ کے تعلق روحانی پر شاہد عدل۔ اُستاذ کی رحلت عرفہ کے دن عصر کے وقت ہوئی، تلمیذ پر مرض الموت تسلط تام پا چکا تھا، غفلت طاری تھی۔ رحلت اُستاد کی خبر باحتیاط تمام مخفی رکھی گئی، کان بے خبر رہے جان بے خبر نہ تھی۔ بہت بے چین تھے۔ شب کو غذا نہیں کھائی۔ اعزہ نے کہا کہ آج آپ اس قدر بے چین کیوں ہیں، غذا بھی نہیں ہوئی، ضعف زیادہ ہوجائیگا فرمایا ہم غذا کیا کھائیں ساری دنیا بے چین ہے۔ پوچھا کیوں؟ فرمایا مولنٰنا نے رحلت فرمائی۔ تردید شدید کی، بے سود۔ صبح کو بسلسلۂ تردید ایک عزیز نے کہا کہ مولنٰنا کی مزاج پرسی کو گیا تھا، الحمدللہ مزاج اچھا ہے۔ فرمایا بکتے ہو۔ الحق سے

بے واسطۂ گوش و لب از راہِ دل و چشم
بسیار سخن بود کہ گفتیم و شنیدیم

حیدرآباد (دکن) ۲۳ محرم الحرام ۱۳۴۳ھ

محمد حبیب الرحمٰن

گزارش

(متعلق کتاب الحج مؤلفہ مولانا سید محمد سلیمان اشرف صاحب بہاری صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی)

حسب ارشاد نبوی اسلام جن پانچ ستونوں پر قائم ہے اُن میں سے ایک حج بھی ہے۔ اُس کے ادا کرنے کے بڑے بڑے فضائل ہیں نہ کرنے پر نہایت شدید وعید۔ تمام عمر میں صرف ایک مرتبہ یہ فرض ادا کرنا ہوتا ہے۔ اس سے واضح ہوگا کہ حج کا سفر کس قدر مہتم بالشان سفر ہے۔ خدانخواستہ اگر اس سفر میں آداب و فرائض کا اہتمام نہ ہوا تو گویا ساری عمر کی محنت برباد ہوئی، ثواب واجر سے محرومی جداگانہ اس کے علاوہ دوسرے فرائض مثلاً نماز و روزہ ایسے ہیں کہ انسان اُن کو دوسروں کو ادا کرتے دیکھتا رہتا ہے۔ مع ہٰذا چونکہ نماز ہر روز ادا ہوتی ہے روزے ہر سال آتے ہیں اس لئے اُن کے مسائل بھی بہت کچھ علم و عمل میں ہیں۔ ایک ان فرائض کے ادا کرنے میں یہ سہولت بھی ہے کہ گھر پر ادا ہوتے ہیں۔ برخلاف حج کے کہ وہ عمر میں اکثر ایک ہی مرتبہ ادا کیا جاتا ہے۔ اس لئے اُس کے مسائل کا چرچا اور علم بہت کم ہوتا ہے۔ اس بے علمی کے ساتھ سفر کی صعوبت اور مصروفی ایسی ہوتی ہے کہ مسئلہ معلوم بھی ہو تو اس کا ذہن میں رہنا اور اُس پر عمل ہونا آسان نہیں۔

سفر کا تجربہ بتاتا ہے کہ بہت کم لوگ ضروری مسائل سے واقف ہوتے ہیں۔ جو لوگ لکھے پڑھے نہیں وہ ایک طرف اچھے لکھے پڑھے بھی ضروری مسائل سے واقف نہیں ہوتے۔ حرمین محترمین میں پہنچ کر ایسے لوگوں کے ہاتھ میں پڑجاتے ہیں جو اکثر بے علم اور اس لئے صحیح مسائل سے کم واقف

ہوتے ہیں۔ حجاج اپنے آپ کو اُن کی سپرد کردیتے ہیں اور جو وہ بتاتے جاتے ہیں اُس پر عمل
کرتے جاتے ہیں۔ اس لئے ایسے عام فہم رسالوں کی شدید ضرورت ہے جن میں ضروری مسائل
حج و زیارت بیان کئے گئے ہوں۔ علمائے کرام نے وقتاً فوقتاً اس جانب توجہ فرمائی ہے۔ میرے
ساتھ سفرِ حج میں ایک سے زیادہ ایسے رسالے تھے۔ فقہ کی کتابیں بھی تھیں۔ تاہم تجربہ ہوا کہ مسائل
کا اُن رسالوں سے اور کتابوں سے عین وقت پر معلوم ہونا آسان نہیں۔ عموماً رسالوں میں مسائل
حج متفرق طور پر لکھدیئے گئے ہیں۔ عبارت کی صفائی و شگفتگی پر کم لحاظ کیا گیا ہے مع ہذا اُن کے بیان
میں وہ ذوق نہیں جو سفرِ حج کا رکن اعظم ہے۔ پس ان رسالوں اور کتابوں کے ہوتے ہوئے بھی
ایسے رسالے کی ضرورت تھی جو شگفتہ و پاکیزہ، ذوق آفریں، شوق افزا بیان و عبارت میں ترتیب
و تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہو۔ اور ترتیب ایسی ہو کہ ہر موقع کا مسئلہ وقت پر بہ آسانی نکل سکے۔ میرے
سفرِ حج کے وقت محبی فی اللہ فضائل پناہ مولانا سید سلیمان اشرف صاحب نے غایت کرم سے
رسالۂ ہذا کا مسودہ بطور زادِ راہ میرے ساتھ کردیا تھا۔ میں نے اُس کو حرزِ بازو بنایا اور برابر زیر
مطالعہ رکھا۔ میں صاف اقرار کرتا ہوں کہ یہ رسالہ ساتھ نہ ہوتا تو بہت سے مسائل معلوم ہی
نہ ہوتے یا دقّت سے ملتے اور یہ دقّت سفر کی دقتوں میں ایک اور دقّت کا اضافہ کرتی۔ آسانی
اس سے سمجھو کہ بعض دوسرے رسالوں میں دعائیں ایسی ایسی طویل تھیں کہ اُن کا یاد کرنا اور پڑھنا
دشوار بلکہ بعض وقت شاید غیر ممکن ہوتا مثلاً طواف کی دعائیں کہ ایک طواف میں متعدد دعائیں
پڑھنی ہوتی ہیں اور مختصر دعاؤں کی گنجائش بھی اس وقت میں دقّت سے نکلتی ہے۔ بہرحال اس
رسالے نے مجھ کو بہت کچھ بصیرت اور سہولت بخشی۔ اللہ تعالیٰ مؤلف عالی مرتبہ کو جزائے خیر بخشے
اُس وقت تک یہ رسالہ صرف مسائل حج تک مرتب ہوا تھا۔ زیارت مدینہ طیبہ کے مسائل قلمبند نہ ہوئے
تھے۔ اس لئے میں نے حضرت شیخ دہلوی قدس سرہٗ کی کتاب جذب القلوب سے استفادہ کیا۔
اب مولانا نے مسائل زیارت شریف کو بھی اضافہ فرماکر رسالہ مکمل فرمادیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حرمین
محترمین کے ضروری حالات، قابل زیارت مقامات کی تفصیل بھی درج فرمادی ہے تاکہ مزید بصیرت

وتعلق حاصل ہو۔

ابھی آپ دیکھیں گے کہ غیر ضروری مسائل درج نہیں کئے۔ ضروری مسائل مرتب ابواب اور نہایت سلیس وصاف بیان میں ایسے دلکش اور شوق آفریں انداز سے تحریر فرمائے گئے ہیں کہ ہر موقع کا مسالہ فوراً نکل آئے گا۔ پڑھنے پر بے دقّت سمجھ میں آجائے گا۔ اسی کے ساتھ دل میں ایک کیفیت شوق و نیاز پیدا کر دے گا۔ اب اس کے آگے اللہ کا نام اور اُس کا فضل اور اُس کے حبیب پاک کا کرم درکار ہی۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ جب عاجز بندہ شوق سے ادائے ارکان وآداب کرے گا فضل وکرم کی اُمید واثق ہی۔

مسائل کی صحت کا پورا اطمینان اس سے ہو سکتا ہی کہ مستند فقہ کی کتابوں کی اصل عبارتیں حوالہ کے ساتھ درج فرما دی گئی ہیں۔ ان عبارتوں کا اور دعاؤں کا سلیس ترجمہ بھی فرما دیا ہے۔ دعاؤں کا ترجمہ اُن کے اثر و نیاز میں مددگار ہوگا۔

اے عازمانِ حج، مولنا اپنا فرض ادا فرما چکے اب تمہارا کام ہی کہ عمل کی کوشش کرو اور دارین کی فلاح حاصل۔[۱]

اللہ تعالیٰ یہ سعی مشکور فرمائے۔ حضرت مؤلف کو جزائے خیر بخشے اور جس ذات گرامی نے عامۂ مسلمین کی حج کی مقبولی کی فکر فرمائی ہی اُس کا اور اُس کے رفقاء کا سفر حج (جو اس سال مع الخیر والعافیہ انشاء اللہ تعالیٰ ہونے والا ہے) مقبول ومبرور ہو۔ آمین یا رب العالمین بجاہ حبیبك سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ اجمعین۔

حبیب گنج:
۲۸ رمضان المبارک ۱۳۴۶ھ

نیازمند
حبیب الرحمن خاں (صدر یار جنگ)

---

[۱] یہ کتاب نہایت عمدہ اور صحیح چھپی ہوئی مولوی حاجی محمد مقتدی خاں شروانی پرنٹنگ پریس علی گڑھ کے پتہ پر مل سکتی ہے۔

اصلاح معاشرت

گزشتہ صدی کا ایک سبق آموز واقعہ

(تقریر جو فروری ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں کانفرنس کے شعبۂ اصلاح معاشرت کے جلسہ میں کی گئی)۔

آج سے سو برس اُدھر کا زمانہ جو تاریکی و جہالت کا دور مانا جاتا ہے، اُس میں بھی ایک اجلاس شعبۂ **اصلاح معاشرت** کا ہوا تھا اسی علی گڑھ کے ضلع میں بھیکن پور کے قلعہ کے صحن میں ایک خیمہ کے نیچے۔ اُس کی روئداد خالی از دلچسپی نہ ہوگی۔

محمد خان زماں خاں صاحب مرحوم (میرے جد امجد) **شاہ عبدالعزیز** صاحب محدث دہلوی کے مرید تھے۔ ایک بار رسوم شادی و غم کے متعلق خاں صاحب ممدوح نے ایک استفتا مرتب فرمایا جس میں چھتیس سوال شادی و غم کی رسوم مروجۂ خاندان شروانی کی بابت درج تھے۔ یہ استفتا جواب کے لئے شاہ **محمد اسحٰق** صاحب محدث دہلوی کی خدمت میں مولوی سید ابو محمد صاحب جلیسری کی معرفت (جو شاہ صاحب کے شاگرد تھے) پیش کیا گیا۔ شاہ صاحب نے چار سوال کا اضافہ فرما کر جواب تحریر فرمایا۔

اب یہ فتویٰ بھیکن پور آیا۔ دادا صاحب نے اپنے بڑے بھائی حاجی **محمد داؤد خاں** صاحب مرحوم کو دکھایا جو سردار خاندان تھے۔ بڑے بھائی نے دیکھ کر فرمایا منجھلے میاں فتویٰ آیا ہی تو اس پر عمل ہونا چاہئے۔ خاندان کے سرگروہ پٹھانوں کو طلب کرو۔ اُن کو دکھاؤ چنانچہ اجلاس طلب ہوا۔ پٹھانوں نے فتوے سے اظہار عقیدت کیا۔ اس پر حاجی **محمد داؤد خاں** صاحب نے فرمایا کہ عقیدت ہے تو اس پر عمل کرو۔ اُس زمانہ میں خاندان شروانی میں مثل دیگر خاندانوں کے رسوم کا شادی و غمی میں ایک طوفان برپا تھا۔ مثلاً شادی میں ناچ رنگ، آتشبازی آرائش وغیرہ ساری رسمیں جاری تھیں، علیٰ ہذا القیاس۔

عمل کا ارشاد سن کر مزید بحث ہوئی۔ قرار یہ پایا کہ اس جلسہ کے بعد جو شادی ہو اُس میں فتوے کے مطابق اصلاح جاری ہو جائے۔ معلوم ہوا کہ اُس کے بعد پہلی شادی الہ وردی خاں رئیس چھرہ کے یہاں ہونے والی تھی۔ اُن سے فرمائش ہوئی کہ اصلاح پر پہلا قدم وہ اٹھائیں اور خلاف شرع تمام رسوم ترک کر دیں۔ وہ سن کر گھبرا گئے اور کہا داؤد خاں جی سارا خاندان بگڑ جائے گا اور مجھ کو چھوڑ دے گا۔ فرمایا ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اس سے ہمت ہوئی اور کمربستہ ہو گئے چنانچہ شادی سے قبل اعلان کیا کہ میرے یہاں شادی میں کوئی رسم خلاف شرع نہ ہوگی، نہ ناچ رنگ نہ آتشبازی اور نہ کوئی اور ایسی رسم۔

اس پر سارا خاندان بگڑا اور اعلان کیا کہ ہم اس شادی میں شریک نہ ہوں گے جو بزم ماتم بنے۔ حاجی محمد داؤد خاں صاحب نے اعلان کیا کہ ہم شریک ہوں گے۔ اس پر خاندان کی جہالت کا جوش کم ہوا۔ شادی ہوئی رسوم بد موقوف۔ اسی کا رواج سارے خاندان میں ہو گیا۔ اس واقعہ کو سو برس سے زائد زمانہ گزر چکا۔ شروانی خاندان کی مردم شماری کم و بیش دو ہزار ہے۔ قریباً دو سَو میل مربع کے رقبہ میں پھیلا ہوا ہے۔

اس تمام خاندان میں سَو برس کے عرصۂ دراز میں ایک شادی کا واقعہ بیان نہیں کیا جا سکتا جس میں ناچ ہوا ہو، آتشبازی چلی ہو یا اور کوئی خلاف شرع رسم ہوئی ہو۔ آج تک سارے خاندان میں پیدائش سے لے کر وفات تک ساری رسمیں اُسی طریقہ پر جاری ہیں جو اُس وقت اللہ کے بندوں نے جاری فرمایا تھا۔

یہ تھی اُس زمانہ کے شعبۂ اصلاح کے ایک اجلاس کی روئداد اور اُس کے نتائج۔

(کانفرنس گزٹ مورخہ ۱۶/ اپریل ۱۹۴۳ء)

مقدمہ وقائع عالمگیر

(مرتبہ خان بہادر چودھری نبی احمد صاحب سندیلوی ایم۔آر۔اے۔ایس ریٹائرڈ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولس)

"وقائع عالمگیر" اُن کوششوں میں سے ایک کوشش ہے جو اس زمانے میں ربطہ ردِ عمل اُن کوششوں کے جو عالمگیر بادشاہ کو بدنام و رسوا کرنے کی کی جا رہی ہیں) اس بادشاہ کی اصلی تصویر پر ریشے کار لانے کی ہو رہی ہیں۔ مثالاً علامہ شبلی مرحوم نے اُس زور قلم کے ساتھ جو اُن کا حصہ تھا اس میدان کو طے کیا "مضامین عالمگیر" یادگار ہیں۔

نواب میرزا یار جنگ نے "عالمگیر پر ایک نظر" لکھ کر حق انصاف ادا کیا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی یہ رسالہ بھی ہے جسے چودھری نبی احمد صاحب نے لکھا ہے۔

اصل کتاب پر کچھ لکھنے سے پہلے خود چودھری صاحب کی بابت دو ایک باتیں لکھ دینا بصیرت افروز ہوگا۔ موصوف پولس کے محکمہ میں ملازم ہیں جو اپنی نوعیت کار کے لحاظ سے اُس دماغی شگفتگی سے بیر رکھتا ہے جو ایک تاریخی مضمون لکھنے کے لئے درکار ہے۔ آسانی سے کہا جا سکتا کہ ہر کلیہ استثنا رکھتا ہے۔ یہ کہنا صحیح ہوگا تاہم صرف اس قدر کہہ دینا ایک دوسری حقیقت کا پردہ دار ہو جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ "وقائع عالمگیر" کے مؤلف میں بعض اُن اوصاف نے ظہور کیا ہے۔ جو ہمارے قصبات کی آب و ہوا میں صدیوں تک پرورش پاتے رہے تھے یہی وہ قصبات تھے جہاں امیر خسرو، ابوالفضل، فیضی، نصرت خاں ورا و رہزاروں نامور پیدا ہوئے جنھوں نے ہندوستان کے علمی، اخلاقی، سیاسی زندگی کو خونِ جگر سے سینچا اور پروان چڑھایا۔

ایک قصبے کی خصوصیات کیا تھیں، شہری شرفا کے جو خاندان ضروریات معاش سے فارغ کر دیئے جاتے تھے۔ علمی درسگاہیں، خانقاہیں، کتاب خانے، صنعت و حرفت، اس نظم کے مجموعی اثر سے ایک زندگی پیدا ہو جاتی تھی جو شہروں کے اثرات سے شکستہ ہو جانے والے دماغوں کو تازگی بخشتی رہتی تھی اور ملک اُس کی برکت سے سدابہار رہتا تھا۔ اپنی خاص نوعیت کے اعتبار سے قصبات اُن آفتوں سے بھی محفوظ رہتے تھے جو دارالسلطنت اور بڑے بڑے شہروں میں انقلاب کے ہاتھوں نازل ہوتی رہتی تھیں۔

اس طرح قصبات کی زندگی پوری قوت کے ساتھ صدیوں تک ملکی زندگی میں قلب کا کام کرتی رہی جو افسوس ہے کہ آج قلب بے حرکت ہے۔ آثار پیش نظر۔

"پورب" جو شاہجہاں کا "شیراز" تھا اُس کے مردم خیز علم آفریں قصبات میں سے ایک سندیلہ بھی تھا جس کا طرۂ امتیاز غالباً سلامت فہم تھی۔ اس سلامتی فہم کی اخیر یادگار مولوی حمد اللہ شارح "مسلم العلوم" تھے۔

قصبۂ مذکور کے ایک فرزند مؤلف "وقائع عالمگیر" ہیں۔ سلامت روی اس تالیف کا جوہر ہے۔

"وقائع عالمگیر" میں کوشش کی گئی ہے کہ خود بادشاہ عالمگیر کی تحریروں سے اُن کی تصویر ناظرین کتاب کی آنکھوں کے سامنے پیش کر دی جائے اور اُن کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنی نگاہ سے دیکھ کر رائے قائم کریں۔ ظاہر ہے کہ ایسی رائے کس قدر صحیح ہوگی۔

مختلف اجزا کی ایسی ترتیب جس سے مدعا کی صورت آنکھوں میں پھر جائے مؤلف کے خوبی مذاق کی شاہد عدل ہے۔

عالمگیر بادشاہ کی مختلف تحریروں سے اُن کی زندگی کے مختلف پہلو نمایاں کئے گئے ہیں۔ دعویٰ اتنا ہی کیا ہے جتنا تحریر سے ثابت ہو سکے یہ شاید سچی تفتیش کا ایک دلچسپ نمونہ ہے۔ تحریروں کا مفہوم واقعات سے واضح کیا ہے۔

جن اشخاص یا مقامات کا ذکر اُن تحریروں میں آگیا ہے اُن کی مختصر تفصیل حاشیوں میں کر دی ہے جو بجائے خود ایک دلچسپی رکھتے ہیں۔ عالمگیری ہند وامرا کی بصیرت افروز طویل فہرست شامل کی ہے اور ایک بہت اہم اصل فارسی فرمان عالمگیری کی نقل درج کی ہے جو بنارس کے ایک پوجاری کے قبضے میں ہے اور جو گویا بے تعصبی و روا داری کی پکی سند ہے۔ ایک بار خود میں نے جنگم باڑے میں وہاں کے جنگم کی مہربانی سے عالمگیری اصلی فرامین دیکھے تھے جو مثل فرمان بالا مجسم شہادت وسعت مشرب کے ہیں۔

بہر حال چودھری صاحب نے اپنے ذوق سلیم کی مدد سے تاریخی ذوق رکھنے والے اصحاب کے لئے ایک صحت بخش ضیافت مہیا فرمائی ہے جس کی نسبت یہ اُمید بیجا نہیں کہ اہل ملک شکر کے ساتھ اس سے فیضیاب ہوں گے۔ پہلی مرتبہ کے مطبوعہ نسخوں کا کامیابی سے شائع ہو کر دوبارہ طبع کا سامان ہونا بجائے خود مقبولیت کی علامت بلکہ دلالت ہے۔ اللھم زد فزد۔

خاکسار
محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی (صدر یار جنگ)

حبیب گنج ضلع علی گڑھ
۱۲ مارچ ۱۹۳۰ء

تحریر

در بارہ

مدرسۂ قومی

سرسید مرحوم کے آخری زمانۂ حیات میں یہ تحریک ہوئی تھی کہ مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے نمونہ پر مسلمانوں کے اور مدارس بھی جاری ہونے چاہئیں۔ اس تحریک کے پہلے محرک پروفیسر مارسین تھے جو آخر تک اس کے روحِ رواں بھی رہے۔ اس تحریک کی تائید میں مختلف مقامات پر چھوٹے چھوٹے مدرسے قائم ہوئے جن میں سے بعض بڑھ کر اب کالج کے درجہ تک پہونچے ہوئے ہیں۔

اسی تحریک کی تائید میں خود علی گڑھ کے قرب و جوار میں چار مدرسے قائم ہوئے۔

(۱) تقریباً بارہ میل کے فاصلہ پر قصبۂ جلالی سادات میں۔

(۲) تقریباً انیس ۱۹ میل کے فاصلے پر قصبۂ سکندرہ راؤ میں۔

(۳) تقریباً چھبیس ۲۶ میل کے فاصلہ پر قصبۂ چھرہ میں۔ یہ تینوں مدرسے خود ضلع علی گڑھ میں تھے۔

(۴) تقریباً چھبیس ۲۶ میل کے فاصلہ پر قصبۂ مارہرہ ضلع ایٹہ میں۔

یہ چاروں مدرسے مڈل اسکول تھے۔ چھرہ کا مدرسہ جس کا تعلق خاندان شروانی سے تھا ان سب میں ممتاز تھا۔ اس کا افتتاح اگست ۱۸۹۷ء میں ہوا تھا۔ مولوی حبیب الرحمن خاں صاحب (نواب صدر یار جنگ) اس کے پہلے سکرٹری تھے۔ صدر کوئی خاص صاحب نہ تھے۔ ایک عمدہ وسیع بورڈنگ ہاؤس تھا جس کے وسط میں مدرسہ کی خوبصورت اور سبک عمارت تھی۔ انگریزی کے ساتھ عربی کی بھی تعلیم ہوتی تھی۔ انگریزی کی مڈل کی جماعت کے ساتھ فارسی

میں گلستان بوستاں تک اور عربی میں شرح تہذیب، قدوری اور ترجمۂ کلام مجید تک ہوتی تھی۔ عربی کے مدرس اوّل و دوئم مفتی لطف اللہ رحمۃ اللہ کے ارشد شاگرد تھے۔ مدرسۃ العلوم کے نمونے پر دار المطالعہ اور کئی قسم کی سوسائٹیاں قائم تھیں اور مدرسہ کی شہرت ہندوستان سے باہر اسلامی و غیر اسلامی ممالک تک پہونچ گئی تھی۔ سید صاحب مرحوم کو بھی اس کے قیام اور ترقی پذیری سے بہت خوشی تھی۔ پروفیسر ما ریسن اور پرنسپل بیک اکثر اس کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ اس کا سالانہ خرچ صرف اٹھارہ سو روپیہ (ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار) تھا۔ ہیڈ ماسٹر کی تنخواہ چالیس اور ہیڈ مولوی کی پچیس روپیہ تھی اور طالب علموں کا خرچ اول نمبر کی خوراک کے ساتھ فی کس سات۔ آٹھ روپیہ ماہوار ہوتا تھا۔ مسٹر صابر علی خاں شروانی ایم اے ایل ایل بی سابق ڈپٹی کلکٹر، مسٹر عباس خاں شروانی بی اے، مسٹر نثار احمد خاں شروانی بی اے ایل ایل بی جو اس وقت اس صوبہ کی حکومت میں وزیر زراعت ہیں اور مسٹر تصدق احمد خاں شروانی مرحوم (جن کی شہرت ہندوستان کی سیاست میں محتاج بیان نہیں) خان بہادر عبد المقیت خاں صاحب چیرمین میونسپل بورڈ علی گڑھ مولوی حاجی عبید الرحمٰن خاں صاحب ٹریزرو قائم مقام وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی اسی مدرسہ کے تعلیم و تربیت یافتہ تھے۔ راقم الحروف نے بھی مدرسۃ العلوم کی طالب علمی کے زمانہ میں وہاں کی تعطیلات کلاں کے دوران میں جا جاکر عربی کی تحصیل اسی شروانی اسکول چھرہ میں کی تھی۔

افسوس ہے کہ چند سال تک ایسی کامیابی اور فائدہ رسانی کے ساتھ چل کر عہدۂ سکرٹری شپ کے انتخاب کے نزاعات کی نذر ہوکر بند ہوگیا۔ اور اب کھنڈر رہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہ تحریر ۱۲ ر شعبان ۱۳۱۳ھ کو بمقام بہیرہ ایک شادی کے موقع پر اصحاب خاندان کے سامنے پڑھی گئی تھی ؎

از نقش و نگار سے در و دیوار شکستہ
آثار پدید است صنادید عجم را

محمد مقتدیٰ خاں شروانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بزرگان و برادران من! جب کوئی شخص کسی مجمع میں گفتگو کرنے کے واسطے کھڑا ہوتا ہے تو اہل جلسہ کی آنکھیں بیتابی سے اُس کی طرف اُٹھتی ہیں اور ہر ایک اپنے دل میں سوال کرتا ہے کہ دیکھئے کیا بیان ہو۔ لیکن اے حضرات جو کوئی شہ وانی پٹھانوں کے جلسہ میں تقریر کرنے کھڑا ہوگا اگر وہ خاندانی حالات سے بحث کرنا چاہتا ہو تو سوائے غم و اندوہ کے افسانوں کے کیا کہے گا اور اُس سے یہ امید ہرگز نہ رکھنی چاہیئے کہ وہ کوئی فرحت انگیز اور دل کی خوش کرنے والی تقریر کرے گا۔ پس میں جب آپ کی خدمت میں کھڑا ہوا ہوں تو سوائے خاندانی دُکھڑا رونے اور اہل خاندان کی مصیبت بیان کرنے کے آپ کی خدمت میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔ اس کی مثال بعینہ ایسی ہی جیسی عشرۂ محرم کی مجالس۔ وہ مجلس اگرچہ کیسی ہی آراستہ ہوا و رسامان بزم کیسا ہی دل آویز ہو لیکن جو لوگ اُس میں آئیں گے وہ سوا اس کے کہ اپنے رومال تر اور آنکھیں سرخ لے کر اٹھیں کیا کریں گے اور اُس محفل کے ممبر پر بیٹھنے والے سے یہ توقع رکھنا کہ وہ کوئی ایسی نقل بیان کرے گا جس سے سننے والوں کے پیٹ میں ہنستے ہنستے بل پڑ پڑ جائیں خلاف انسانیت ہے صاحبو! کبھی ہم بھی ہنستے تھے اور ہمارے مرحوم بزرگ زندہ دلی کی جیتی جاگتی تصویریں تھیں اور چلتی پھرتی مورتیں۔ مگر حیف کہ اب وہ زمانہ گیا اور خاندان کی اس اُجڑی حالت اور بگڑی حیثیت میں ہنسنا کھلا بھی نہیں معلوم ہوتا ہے

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی　　　اب کسی بات پر نہیں آتی

تو حضرات! میری تقریر کا موضوع تو آپ کو معلوم ہو گیا کہ کیا ہے مگر مجھ کو حیرت ہو کہ میں کونسی بگڑی حالت بیان کروں کیونکہ جس حالت کو دیکھئے وہی بگڑی ہوئی ہو اور جس پہلو پر نظر ڈالئے بیکل ہو ے

کیا پوچھتے ہو ہمدم اس جسم ناتواں کی　　　رگ رگ میں نیش غم ہی کہئے کہاں کہاں کی

لیکن نہیں مجکو حیران نہ رہنا چاہیے۔ ہماری بگڑی حالت ہماری صورتوں سے ہمارے گھروں سے ہماری شادی بیاہ کی مجلسوں سے ہماری عیدسے بقرعید سے غرضکہ ہر بات سے بالکل عیاں ہے۔

اور عیاں کو بیان کی کچھ حاجت نہیں۔ شادیوں کے جلسے اور عید بقرعید کے تیوہار ایسی افسردگی اور اُداسی سے گزر جاتے ہیں کہ ہم کو معلوم بھی نہیں ہوتا کہ کوئی خوشی کا موقع آیا تھا۔ اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ پہلے ہمارے یہی دیہات کچھ ایسے دلچسپ تھے کہ وہ لوگ جن کے دل دلّی اور لکھنؤ کی صحبتوں کے مزے اٹھائے ہوتے تھے وہ یہاں آکر تسکین پاتے تھے اور اُن کو یہ خاک مانوس معلوم ہوتی تھی۔ جن مشائخ علما اور حکما کے قدموں کی برکت اس سرزمین کو نصیب ہوئی ہو اگر اُن کی فہرست لکھی جائے تو اُس کو پڑھ کر ہمارا دل فخر سے اُچھلنے لگے۔ مگر افسوس کہ اب آثار اچھے نہیں اور ہر طرف سناٹا چھاتا جاتا ہے اور سناٹا نہ ہو تو کیا ہو۔ جب عدالتیں اور سرائیں شب و روز پٹھانوں کے دم قدم سے آباد رہیں تو اُن کے مکان کس کے دم سے آباد نظر آئیں۔

عید بقرعید شادی بیاہ میں خوشی اور چہل پہل کیسے ہو؟ یہ سارے جلوے ہیں آپس کے میل جول کے باہمی محبت و ارتباط کے اور دلوں کے انبساط کے۔ یہاں آپس کی کشمکش اور نفسانیت سے یہ عالم ہے کہ دنیا ہم پر تنگ ہو رہی ہے اور ہم خود اپنی جانوں سے بیزار بیٹھے ہیں پھر کیسی خوشی اور کہاں کا ولولہ۔

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی   تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

خاندان کے نوجوان جن پر خاندان کی زندگی منحصر ہے جس ناگفتہ بہ حالت میں ہیں وہ سب پر ظاہر ہے۔ افسوس ہم کو کھلے ہوئے طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جوں جوں نئی نسلیں آتی اور سنبھلتی جاتی ہیں اُسی قدر لیاقت کا معیار گھٹتا جاتا ہے جو نوجوان ہوشیار ہوتے اور اپنی دنیاوی حالت سنبھالتے ہیں۔ سب سے اول جو چیز اُن کی نگاہ کے سامنے آتی ہے وہ اپنے عزیزوں سے لڑائی اور اپنے بیگانوں سے خصومت ہوتی ہے۔ جس خاندان کی کل کی زندگی اس نسل پر موقوف ہو اُس کو آج ہی مردہ سمجھ لینا چاہیئے اور کل جو لوگ یہاں آئیں گے وہ زندوں سے ملتے نہیں۔ بلکہ مُردوں پر فاتحہ پڑھنے آئیں گے۔ اے شروانی نسل کے نام لینے والو کیا زندگی اسی کا نام ہے کہ ہم جب تک جئیں اپنے عزیزوں سے اور بیگانوں سے بیزار رہیں۔ کول ایٹہ کے راستوں کی خاک ہمارے سروں پر ہو۔ لُو چلتی ہو یا مُوسلا دھار پانی برستا ہو مگر ہم ہوں کہ بادیہ نوردی میں پریشان ہوں حالانکہ جانو بھی ایسی

حالت میں کسی سایہ میں سکھ پالیتے ہیں۔ گھر میں بچّے بیمار ہوں ماں کی جان پر بنی ہوا ور ہم کہاں ہوں علی گڑھ اور ہم کو کہاں خبر پہونچے؟ الہ آباد جب صبح کو آنکھ کھلے تو کوئی نکوئی ایسی منحوس خبر کانوں میں پہونچے جس سے کلیجہ چھد کر رہ جائے۔ اور جب ہم بستر پر رات کو لیٹیں تو گھنٹوں فکر اور تشویش نیند کو پاس نہ آنے دے۔ اللہ اکبر! کیا اچھی گذران ہی اور کیسی عمدہ زندگی ہی حیف ہی اس زندگی پر اور افسوس ہی اس جینے پر۔ ہمارے اس جینے سے جانوروں کی زندگی بہتر ہی کہ آخر وہ خدا کی مخلوق کھانے پینے سوتے جاگنے کا تو آرام پاتے ہیں۔ یہاں یہ بھی نہیں۔ اب غور طلب یہ امر ہی کہ یہ ساری مصیبت ہم پر کہاں سے آئی۔ خدا نے ہم کو سب سے بڑی نعمت تو یہ دی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں ہم کو پیدا کیا۔ اور پھر ایسا خاندان دیا جو صدیوں سے معزز ہی۔ پشت پناہی کو عزیز دئے۔ کھانے کو ریاستیں دیں جائدادیں دیں عقل دی ہوش دیا۔ سلطنت نے ہم کو امن دئے کونسل میں حصّہ ضلع کے انتظاموں میں شرکت۔ دربار میں کرسی۔ ایکٹ اسلحہ سے استثنا یہ سب کچھ ہم کو سرکار نے دیا ہی اور اگر ہم اس سے زیادہ لایق ثابت ہوں تو بہت کچھ دینے کو تیار ہے۔ ہمارے بزرگوں نے ہم کو ذلت و خواری ورثہ میں نہیں پہنچائی خدا اُن کو جنت میں اعلیٰ مدارج دے جب وہ دنیا سے گئے تو خاندان کا نام روشن جائدادیں وسیع قرض سے پاک گھر بھرا پُرا چھوڑا۔ یہ سب شامت ہمارے اعمال کی بدولت ہی۔ اور ہم نے خود یہ بدبختی اپنے سر پر بُلائی ہی جو کچھ خدا نے بخشا سلطنت نے دیا مورثوں نے چھوڑا (خواہ دولت تھی خواہ عقل خواہ عزت) وہ سب ہم نے اپنے عزیزوں اور یگانوں کی بربادی اور اپنی تباہی میں صرف کی۔ اور ایسے خاندان کا انجام وہی ہوتا ہی جو ہم نے دیکھا اور ابھی کیا دیکھا ہے جو آیندہ دیکھیں گے ابھی تو کچھ لفافہ درست ہی جس روز یہ لفافہ بھی خدانخواستہ نہ رہا تو اسے میرے عزیزو ہم اور آپ دنیا کو بہت سخت مقام پائیں گے۔

ہاں حضرات! جب یہ شامت اعمال ہمارے ہاتھوں سے ہمارے سروں پر آئی ہی تو ہمیں کو اس کا چارہ کار سوچنا چاہئے اور اس پر عمل کرنا ضرور ہی اب علاج کیا ہی؟ اس میں بحث ہی بعض پرانے تجربہ کار لوگ جن کی دوربین آنکھوں کے سامنے پچاس برس گذشتہ کا زمانہ ہی یہ فرماتے ہیں کہ

اول تمام برادری میں اتفاق قایم ہوا ور کل جھگڑے جو عدالتوں میں دائر ہیں یا تھے پنچایت سے
طے ہوں اور باہم یہ عہد ہو جائے کہ آیندہ نہ جھگڑیں گے جب یہ سب کچھ ہو لے تو پھر مدرسہ بنے یا
بچوں کی تعلیم کا سلسلہ جاری ہو۔ یہ تدبیر عمدہ ہی مگر مجھ کو اس میں شبہ ہی کہ یہ تدبیر سرسبز بھی ہونے والی
ہی یا نہیں۔ پنچایت کا اصول ہی باہمی اعتماد او راعتبار جب تک ایک خاندان کے افراد کو ایک
دوسرے پر اطمینان نہ ہو اُس وقت تک اپنے نیک و بد کو ایک دوسرے کے اختیار میں نہیں دے
سکتے او راُن میں پنچایت کا سلسلہ قائم نہیں ہو سکتا جو ہمارے مقدمات حکام کی کوشش سے پنچایت
میں آتے ہیں اُن کی نسبت تجربہ سے معلوم ہوتا ہی کہ اہل معاملہ اغیار کو پنچ بمقابلہ اپنے یگانوں
کے زیادہ خوشی سے بناتے ہیں۔ یہ تجربہ سبق دیتا ہی کہ ہم میں آپس کا اعتبار جاتا رہا ہی۔ اس کے
اسباب جو کچھ ہوں۔ غرض جب سب مدعی ہیں یا سمجھے جاتے ہیں تو پنچ کون ہوا ور پنچ نیاؤ کہاں سے
آئے۔ ایک یہ رائے ہے کہ تعلیم کے ذریعہ سے قوم کے خیالات بدلے جائیں۔ اور اس طرح پھر وہ
اوصاف اہل خاندان میں پیدا ہوں جو ہمارے بزرگوں کے سبب فلاح تھے۔ بعض لوگ یہ کہہ اُٹھتے
ہیں کہ ہمارے بزرگ کیا مدرسوں میں پڑھے تھے۔ یہ صحیح ہی کہ ہمارے بزرگ مدرسوں میں نہیں پڑھے
تھے لیکن اُس زمانہ میں خاندان کی قوت مجموعی قایم تھی اور اُس دباؤ کے اثر سے خاندان کے
ہر فرد میں وہ اوصاف پیدا ہوتے تھے جو صدیوں سے خاندان میں چلے آتے تھے۔ اس مجموعی
قوت کا اصل اصول یہ تھا کہ اُس زمانہ میں بیرونی تعلقات کے ذرائع آسان نہ تھے اور خاندان کے
خیالات اس وجہ سے ایک خاص دائرہ میں محدود تھے۔ وہ یا اپنے بزرگوں کو دیکھتے تھے یا بزرگوں
سے بزرگوں کے حالات سنتے تھے میں اگلے زمانہ کے ایسے بزرگوں کے حالات سے واقف ہوں
جنھوں نے پیرانہ سالی میں کاسگنج دیکھا تھا اور وہ حیران تھے کہ اللہ اکبر دنیا میں ایسے بڑے شہر بھی
ہوتے ہیں اور پھر کاسگنج بھی آج کا کاسگنج نہ تھا اگلے زمانہ کا کاسگنج تھا جس کے بازار میں چھپر پڑے تھے۔
اسی یکسوئی کا یہ نتیجہ تھا کہ اُن بزرگوں کو خاندانی حالات اور روایات ہم سے بہت زیادہ ازبر تھیں
اور خاندان کی ہر ایک نقل و حرکت کو بہت غور اور دلچسپی سے دیکھتے تھے۔ دوسرا نتیجہ اس کا یہ تھا

کہ ہر ایک احتیاج کے وقت سربرآوردہ اصحاب خاندان کی طرف اہل خاندان رجوع کرتے تھے اور خاندان کا مجموعی رعب قایم تھا۔ اسی رعب کا یہ اثر تھا کہ شادی وغمی میں جو خلاف شرع و فضول رسوم تھیں وہ ایک لخت موقوف ہوگئیں۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ رسمیں یونہیں موقوف ہوگئیں! آپ کسی ایک چھوٹی سی رسم کو موقوف کرنے کا تذکرہ کیجیے پھر دیکھیے کہ کیا قیامت برپا ہوتی ہے۔ اس سے آپ قیاس کرسکیں گے کہ کتنے زبردست رعب واثر نے اُن بڑی مضبوط و کہنہ رسموں کو غارت کیا تھا۔ اب زمانہ نے پلٹا کھایا اور بیرونی تعلقات آسانی سے قایم ہونے لگے۔ وہ خاندانی اثر جو ان برکتوں کا سرچشمہ تھا اُس کا بڑا حصہ تو عدالتوں کے قبضے میں گیا، کچھ مہاجنوں کو ملا، کچھ وکیل لے اُڑے، خاندان اور اہل خاندان کے قبضے میں کچھ بھی نہ رہا اور کچھ رہا بھی تو وہ کافی نہیں۔ غرض تو جو بات ہمارے بزرگوں کو حاصل تھی وہ اُس تربیت کی وجہ سے تھی جو پشت در پشت سے چلی آتی تھی۔ اور وہ تربیت قایم تھی۔ مجموعی اثر کے زیر سایہ اب وہ نہ تربیت ہے نہ اثر ہے تو بدون تعلیم وہ بات حاصل نہیں ہوسکتی۔ اب تعلیم کی دو صورتیں ہیں۔ بعض صاحبوں کی یہ رائے ہے کہ حلقۂ برادری میں مدرسہ قایم نہ کیا جائے۔ بلکہ کسی صدر مقام پر جہاں مدرسہ قایم ہو ایک مکان بنایا جائے، لڑکے رہیں اُس مکان میں پڑھیں مدرسہ میں۔ اُن کی یہ رائے اول اس دلیل سے ہے کہ جیسی عمدہ تعلیم بڑے مدرسوں میں حاصل ہوگی ویسی چھوٹے چھوٹے مدرسوں سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ دوسری قوی وجہ اُن کے خیال میں یہ ہے کہ خاندان کے موجودہ خیالات اور حالات پر غور کریں تو یہ ممکن نہیں کہ مدرسہ بن سکے اور چل سکے لہذا ایسی تحریک پر یہ اثر پیدا کریں گے کہ خاندان کا روپیہ بے فائدہ صرف ہوگا اور جو تحریک خاندان میں لڑکوں کے باہر بھیجنے کی پیدا ہوگئی ہے وہ رُک جائے گی۔ لیکن کثرت سے اہل برادری کی یہ رائے ہے کہ حلقۂ برادری میں مدرسہ قایم ہو اور اُس میں بچّوں کی ابتدائی تعلیم کا بندوبست کیا جائے اور جب لڑکے اس تعلیم کو ختم کرلیں تو باہر مدارس میں تکمیل کے واسطے بھیجے جائیں۔ اسی فریق کا ہمراے میں بھی ہوں اس لئے میں چاہتا ہوں کہ اس رائے کے دلائل آپ کے سامنے بیان کروں۔

میرے خیال میں اوّل یہ طے ہونا چاہیئے کہ تعلیم سے مقصود کیا ہے؟ ہم نے اپنے ذہن میں تعلیم کا مقصد یہ قرار دیا ہے کہ اُن میں پھر باہمی ہمدردی اولوالعزمی اور راستبازی پیدا ہو اور پھر وہ اپنے باپوں کے سپوت ہوں۔ اسی کے ساتھ خاندانی صفات قایم رہیں۔ اور اسی ضمن میں اُن کو تعلیم کے اس سے کمتر درجہ کے فوائد بھی مثل ملازمت وغیرہ نصیب ہوں۔ ان مقاصد کے حصول کے واسطے ضرور ہے کہ قوم کے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دی جائے۔ میں نے ایک تجربہ کار سے اس بارہ میں بحث کی تھی انہوں نے یہ کہا کہ اگر تم دس لڑکے اعلیٰ تعلیم تک پہنچانا چاہتے ہو تو سَو لڑکوں کی تعلیم کا بندوبست کرو تب اس میں سے دس لڑکے ایسے نکلیں گے جو اعلیٰ تعلیم تک پہنچیں۔ ہمارے پاس جو سرمایہ ہے اُس سے سَو لڑکے ہم شہر میں نہیں پڑھا سکتے لیکن حلقۂ برادری میں اُس سے سو لڑکوں کی تعلیم کا انتظام کر سکتے ہیں۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ ہم اول اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم دلوالیں اُس کے بعد انگریزی پڑھائیں اور اس طرح اُس ہلاکت سے اُن کو بچائیں جن میں اکثر انگریزی طلبا پڑتے جاتے ہیں۔ میں نے دہلی میں کانفرنس کے جلسہ میں اپنے کانوں سے ایک ممبر کانفرنس کو یہ کہتے سُنا کہ پنجاب کے ایک شہر میں مولوی نورالدین صاحب نے انگریزی اسکول کے طلبہ سے نماز کی بابت پوچھا تو معلوم ہوا کہ اُن کو الحمد بھی یاد نہ تھی۔ خود سید صاحب نے اس طوفان بے تمیزی کو تسلیم کیا ہے۔ جب یہ عالم ہے تو کس طرح ہم اپنے لخت جگر بچوں کو آگ میں جھونک دیں؟ پس ضرور ہے کہ ہم اول اپنے بچوں کو ضروری تعلیم دینی دلوائیں، تب مدرسوں میں بھرتی کریں اور اس واسطے ضرور ہے کہ ابتدائی تعلیم کا بندوبست اپنے ہاتھوں میں رکھیں اور اگر لایق مدرس بہم پہنچیں تو ابتدائی تعلیم کا اُسی خوبی سے بندوبست ہو سکتا ہے جیسا بڑے اسکولوں میں۔ اس سے آپ سمجھ سکیں گے کہ حلقۂ برادری میں مدرسہ قایم ہونا زیادہ ضروری ہے۔ ایک رائے بھی ہے کہ انجمن اپنے سرمایہ سے اُن طلبۂ برادری کو وظائف دے جو باہر مدرسوں میں پڑھ رہے ہیں۔ یہ صورت بیشک قابل ہمدردی ہے لیکن ہمارا سرمایہ اتنا کافی نہیں کہ ہم دو کام ایک وقت میں جاری کر سکیں۔ جب ایک کام سے فراغت حاصل ہولے تو دوسرا کام شروع کریں۔ غرض ہم نے اسی خیال کی بناپر قلعہ چھرہ میں مدرسہ بنانا شروع کیا ہے۔ اگرچہ گذشتہ فروری میں بمقام علی گڑھ

کمیٹی نے بعد بحث بسیار بکثرت رائے یہ طے کیا تھا کہ قلعہ چھرہ میں مدرسہ بنایا جاوے مگر اب تک بعض صاحبوں کو اُس مقام کے انتخاب میں حجت ہے۔ صاحبو بات یہ ہی کہ عرصہ تک یہ امر زیر بحث رہا کہ مدرسہ کس مقام میں بنایا جائے۔ اور مختلف دیہات کے نام لئے گئے مگر اُن مقامات میں سے کسی ایک کے انتخاب کرنے میں اس بات کا سخت اندیشہ رہا کہ وہاں مدرسہ قایم کرنے میں خیالات کا مجتمع رہنا اور یکساں ساعی ہونا ممکن نہ ہوگا۔ اور بدوں اتفاق کامل یہ کام ہرگز جاری نہیں ہوسکتا انھیں اسباب سے قلعہ چھرہ پسند کیا گیا کہ وہ کسی زبردست فریق کے حلقۂ اثر میں نہیں مع ہٰذا قصبہ ہونے کی وجہ سے ضروریات روزمرہ بہ آسانی بہم پہنچ سکیں گی۔ خدا کا شکر ہی کہ مدرسہ کے ارکان اس وقت تک بہت سرگرمی سے تعمیر مدرسہ میں مصروف ہیں۔ تمام خاندان کو محمد سلیمان خاں صاحب کا ممنون ہونا چاہئے کہ انھوں نے اپنے تمام اوقات کو اور آرام کو اس پر وقف کر دیا ہے۔ دوسری جگہ یقیناً ایسا مہتمم نہ ملتا۔ اس وقت تک مبلغ چار ہزار روپیہ چندۂ تعمیر میں تحریر ہو چکے ہیں مبلغ تین ہزار روپیہ تعمیر مدرسہ میں صرف ہو چکے ہیں ۲۲ کمرہ بورڈنگ ہوس کے مع پختہ غلام گردش تیار ہو چکے ہیں صرف اُن کا پٹنا باقی ہے۔ مدرسہ یعنی پڑھنے کے مکان کی بنیاد ایک گز اونچی ہو چکی ہی اور تین جانب کی پختہ دیوار احاطہ تیار ہو چکی ہی۔ اگر قوم نے مدد جاری رکھی تو انشاء اللہ تعالیٰ برسات تک ضروری کام ختم ہو جائے گا۔ اور سات آٹھ مہینے میں ہمارے نور نظر اُس میدان میں مجتمع نظر آنے لگیں گے۔ اب ایک امر باقی رہتا ہی اُس کا مجھ کو عرض کرنا ضروری ہی۔ وہ یہ کہ مدرسہ کی حالت تعمیر دیکھ کر اب یہ تو لوگوں کو یقین ہونے لگا ہی کہ مدرسہ بن جائے گا۔ مگر اب تک اُس میں قومی شبہات ہیں کہ آیا وہ چل بھی سکے گا؟ میرے خیال میں یہ صورت چندہ چلنے والی نہیں جیسے اب دو دو اور چار چار روپیہ جمع کئے جاتے ہیں۔ یہ روپیہ جس دقت سے وصول ہو رہا ہی اُس کو میں خوب جانتا ہوں۔ اور اس تجربہ کی روسے میں بھی مدرسہ چلنے سے مایوس ہوں۔ مدرسہ کے چلنے اور قایم رہنے کی صورت ایک ہی اور صرف ایک۔ اور وہ یہ کہ ارباب ہمم جتنا سالانہ چندہ مقرر کریں اُتنی آمدنی کی زمین بنام مدرسہ وقف کر دیں یہ صورت بظاہر شاید مشکل معلوم ہو لیکن مشکل

نہیں میں یہ جانتا ہوں کہ ہر ریاست اور ہر گاؤں میں خاکروب اور چماروں تک کے واسطے معافیات مقرر ہیں اور برابر پشتوں سے اُن کے قبضہ میں چلی آرہی ہیں اور غالباً چلی جائیں گی میرے دوست اور بھائی مولوی محمد یونس خاں صاحب نے بیان کیا کہ صرف قصبہ دتاولی میں بارہ سو روپیہ سال آمدنی کی اراضی معافی میں ہے۔ اسی طرح اگر تمام برادری کی معافیوں کا حساب کیا جائے تو ہزاروں روپیہ سال کی نکلیں گی۔ پس کیا اے میرے بزرگو وہ ہمارا مدرسہ جس میں ہمارے بچے آدمیت سیکھنے اور انسانیت حاصل کرنے جائیں گے اتنی دستگیری اور اتنی امداد کا بھی مستحق نہ ہوگا جس قدر ادنیٰ اہل خدمت بھنگی اور چمار ہیں! نہیں نہیں، ہوگا اور ضرور ہوگا جب میں ان باتوں پر خیال کرتا ہوں تو میرا دل بڑھتا ہے اور امید اپنی دلآویز صورت دکھاتی ہے۔ اے نسل شروانی اگر تیری رگوں میں کوئی قطرہ اُس خون کا باقی ہے جو ہمارے مربّی افغانستان کے پہاڑوں سے لائے تھے اور جس کے جوش نے ہندوستان میں اُن کا نام روشن کیا تو دنیا میں اس ذلت و خواری سے بسر کرنا گوارا مت کر اور اگر کوئی شمہ اُس کا اب نہیں رہا تو جس قدر جلد زمین پھٹے اور ہم اُس میں سما جائیں اسی قدر بہتر ہے کیونکہ جو نسل اپنے بزرگوں کے نام کو ڈبونے والی اور خاندان کی نیک نامی کو کھونے والی ہو وہ جتنی جلد دنیا سے غارت ہو مناسب ہے۔ والسلام

خاندان کی بی بیوں میں دو قابل نمونہ ہستیاں

دار دہمہ چیز آدمی زاد
افسوس کہ خرمی ندارد

(۱)

بتاریخ سیزدہم ذی قعدہ ۱۳۱۰ھ روز چہارشنبہ وقت ساعت دہم صباح والدہ برادرم حمید اللہ خاں[۱] سہا ورایں سرائے فانی را پدرود کردند۔ ذات ایشاں بعض صفات داشت کہ موجب امتیاز ایں لاقران

---

[۱] نوٹ صفحہ ۴۶۰ پر ملاحظہ ہو

بود۔ قلب ایشاں رقیق واقع شدہ بود بادنے سببے گریہ برایشاں مستولی گشتے۔ دختراں یتیم مرحوم علی احمد خاں راچوں فرزنداں خود پروردند۔ بر مزاج ایشاں خشم غالب بود۔ بوقوع ادنیٰ ناملائم از جا رفتے۔ اما دل از کینہ صاف بود چنداں کہ دیگراں را بحالت غیظ زجر می کردند ہماں قدر بحالت فرو شدن آں خود را ملامت میکردند۔ وردا کہ صبیۂ خود را ناکتخدا گزاشتند۔ چہ حسرتہا کہ بعالم پاس ازیں رہ گذر خوردہ باشند۔ اللھم اغفر لھا وادخلھا روضات النعیم۔

(۲)

آج ۲۱ رجب المرجب ۱۳۱۲ھ روز پنجشنبہ آخر شب کو جناب پھوپی اماں[۲] نے تخمیناً ستر برس کے سن میں رحلت فرمائی۔ قریباً ایک سال عارضۂ بواسیر میں مبتلا رہ کر اس ہستی ناپائدار کو چھوڑا۔ جناب مرحومہ دینی و دنیوی حیثیتوں سے ممتاز بین الاقران تہیں۔ اگر دینی حیثیت سے دیکھئے تو حجن تھیں اور حافظ کلام پاک، تہجد گزار اور صبح کو نو بجے تک برابر تلاوت اور اوراد و وظائف میں مصروف رہتیں۔ اپنے متوسلین کے حق میں مثل ایک مربی کے تھیں اور ان سے غایت شفقت کا برتاؤ کرتیں۔ متعدد بے وسیلہ لڑکیوں کو پرورش کرکے اُن کی خانہ آبادی کردی۔ اخلاق نہایت وسیع تھے اور وسعت کے ساتھ ساتھ ہمدردی بھی تھی۔ دنیاوی معاملات میں عقل نہایت معاملہ فہم اور سلیم تھی۔ خانہ داری کا سلیقہ ایک قابل نمونہ حیثیت کا تھا۔ علاوہ اپنے گھر کے دوسرے گھروں کا انتظام سالہا سال فرمایا اپنی جائداد کے انتظام میں بھی اُن کا ایک خاص حصہ تھا۔ اُن کے دفن ہونے سے بھیکن پور کی ایک ثلث عظمت اور ہمارے خاندان کی عورتوں کی سرداری خاک میں مل گئی۔ فقط

---

[۱] اہلیہ جناب چودھری نور اللہ خاں صاحب مرحوم رئیس سہاور ضلع ایٹہ جن کا حال صفحہ ۴۹ پر ہے۔ مرحومہ کا نام جمال النساء تھا

[۲] اہلیہ عنایت اللہ خاں صاحب مرحوم رئیس بھیکن پور جو نواب محمد فضل اللہ خاں مرحوم کے حقیقی چچا تھے اور سید صاحب مرحوم کے رفقا اور علی گڑھ کالج کے معاونین میں سابقین اولین کے طبقہ میں تھے۔

محمد مقتدیٰ خاں شروانی

نامۂ ذوالقدر منشی غلام غوث صاحب بیخبر الہ آبادی

در آخر سال ۱۸۹۰ء برائے شرکت سالانہ جلسہ علی گڑھ کانفرنس حاضر الہ آباد شدم۔ شوق ملاقات ذوالقدر منشی غلام غوث خاں بیخبر برآں آورد کہ بعد مشورہ سید اکبر حسین صاحب اکبر الہ آبادی خطے بخدمت شان نگاشتم۔ و بعد اظہار شوق لقا از وقت ملاقات استفسار کردم بجواب آن بیخبر با خبر از وقت ملاقات خبر داد۔ اکنوں بعد مرور پنجاہ سال نقل ہر دو نامہ شامل ایں کتاب می نمایم تا یادگارے ماند۔

(مراسلۂ اولیٰ)

مسند آرائے اریکۂ سخنوری مربع نشیں چار بالش ہنر پروری یادگار سلف افتخار خلف غیاث الکلام مولائی و مولی الانام جناب منشی غلام غوث خاں صاحب بیخبر یارب از نیازمندی ایں ناچیز باخبر باد۔ سالے چند گزشتہ کہ در رسالۂ عود ہندی غزل فارسی جناب کہ مصرعے ازاں اینست۔ ع

"چشم کہ باز شد ز خواب فتنہ از و بچار سوست"

مشام جانم را رشک طبلۂ عطار فرمودہ بود۔ من و یزداں کہ از اں روز آرزومند لقائے سامی بودہ ام لیکن طالعم یاور نبود کہ تا ایندم از شرف ملازمت محروم ماندم۔ بارے اکنوں ایزد بندہ نواز را سپاس گزارم کہ خاک ایں دیار اصفہان نشار را کحل دیدۂ ارادتم فرمود۔ تقاضائے شوق بے سروپا آں بود کہ علی الفور پا از سر ساختہ حاضر بزم سامی شدمے۔ اما خیال ہرج اوقات گرامی سدِّ راہم گردید۔ اگر از اوقات فرصت آگاہم فرمایند پابوسی را ذریعہ سربلندی خود سازم۔ فقط
(او آخر دسمبر ۱۸۹۰ء زمانہ اجلاس سالانہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدۂ الہ آباد)

(مکتوب منشی غلام غوث خاں صاحب بیخبر مرحوم الہ آبادی کہ بجواب مراسلۂ من نوشتند)

فقیر نوازا من نہ آنم کہ بزرگان با عز و شاں مشتاق دیدنم شوند۔ اشتیاق سامی از اقتضائے اخلاق گرامی ست۔ فقیر دو وقت فرصت دارم یکے از ساعت چہار تا وقت مغرب۔ دوئیں از ہشت ساعت شب تا ساعت یازدہ۔ آں برائے ملاقات اجمالیست و ایں برائے مجالست طولانی ہر وقت کہ خواہند قدم رنجہ فرمایند۔

۵ براہ دوستیہا ہر کہ بے منت قدم ساید
بہر گامے کہ بردارد از و پائے زمیں چشمے

(مراسلۂ ثانیہ)

جناب منشی صاحب ذوالمراتب العلیہ والمناقب السنیہ دامت رافتہم ۔ تسلیم پزیرا باد ۔ فرایاد خاطر فرحی مآثر بودہ باشد کہ بماہ دسمبر گزشتہ حاضر کاشانہ بازینت وشان گشتہ بودم ۔ ودراثنائے محاورت التماس نمودہ بودم کہ اگر پارۂ از کلام بلاغت نظام عنایت فرمایند آں قند پارسی برائے من موجب شکر وبرائے یاران وطنم بہینہ ہدیہ باشد ۔ بپاسخش عطائے آں را محول بآن فرمودہ بودند کہ بوقت دیگر نامہ بطلب آں بخدمت سامی فرستم ۔ بعد مراجعت از الہ آباد بسبب تحصیل انگریزی مدتے از وطن دور ماندم ومن از یں فرصتے نیافتم کہ دریں خصوص متصدع خدمت شوم ۔ اکنوں ایں نامہ نیاز روانہ می کنم ۔ اگر چیزوی از کلام فصاحت التیام ارسال فرمایند واز اعتدال مزاج ہمایوں آگاہی بخشند مرا ممنون التفات ومرہون اعطاف فرمودہ باشند ۔

(جواب ایں نامہ نیا مد ۔ حبیب الرحمٰن)

متعلق وفات ہمشیرۂ مرحومہ خورد غفرلہا

در قید غمم خاطر آزاد کجائی
تنگ ست دلم قوت فریاد کجائی
کو ہمنفسے تا نفسے شاد برآرم
مجنوں تو کجا رفتی و فرہاد کجائی

وہ وقت مجھ کو رہ رہ کر یاد آتا ہے جب سہاور کا سوار یہ خبر لے کر آیا تھا کہ چھوٹی بو بو کے لڑکا[1] ہوا بندو قین سر ہو رہی تھیں اور ہر چہرہ سے اندرونی مسرت کی جھلک چمک رہی تھی ۔ میرا دل بھی خوش تھا لیکن یہ خیال کہ دنیا کی خوشی شربت کا سا گھونٹ ہے گلے سے اترا اور کچھ نہیں اُس کی کیفیت کو دبا رہی تھی ۔

---

[1] نواب صدر یار جنگ بہادر کی دو بہنیں تھیں دونوں ان سے چھوٹی ۔ چھوٹی بہن محمودہ بیگم جن کا انتقال (باقی نوٹ برصفحہ ۴۶۶)

وہ بچہ اپنے دادا کے گھر میں پہلا پوتا اپنے نانا کا پہلا نواسا ہے (خدا اُس کو عمر دراز و سعادت نصیب فرمائے) دادی اور نانی نے خوب خوشیاں منائیں۔ رت جگے ہوئے چھوچک بڑی دھوم سے گیا۔ غرض یہ کسی کو بھی خیال نہ تھا کہ بچے کی ماں کی صحت کیسی ہے۔ شاید تمام خردمند اس بات کو فرض سمجھیں گے کہ ولادت کے بعد ہر ماں کو سکون اور آرام دینا چاہیئے خصوصاً اُن کو جو خلقتہً ضعیف ہوں۔ لیکن وہاں اُسی مکان میں جس میں بچہ اور اُس کی ماں رہتی تھی دیہاتی بدتمیز عورتوں نے اپنے گلے پھاڑ کے دھماچوکڑی مچائی ساری رات نہ خود سوئیں نہ کسی کو سونے دیا اور اس وحشت کو دیکھئے کہ اسی کا نام "رت جگا" رکھا ہے بہت سی راتیں اسی جوشش جہالت میں بسر ہو گئیں۔ میں باوجودیکہ مرد ہوں اور خوب جانتا ہوں کہ کبھی زچہ نہ بنوں گا مگر ان نامعقول حرکتوں کو سن سن کر گھبرا اُٹھتا ہوں نازک دل مریضوں پر جو گزرتی ہوگی اُس کو وہی بیچاری جانیں۔ خدا جانے ہماری عورتوں کے ناتربیت یافتہ ہونے نے کتنے مظلوموں کو جان سے کھویا ہے اور اُن کی وحشت نے کیا کیا بلائیں اُن بیچاریوں پر نازل کی ہیں جو قدرتاً اُن کی حفاظت میں رکھی گئی ہیں۔ مرد بھی جانتے ہیں کہ "ساس" اور "نند" خانگی زبان میں کیسے مہیب لفظ ہیں جو ستم رسیدہ دل ساس اور نندوں کے ہاتھوں سے زخمی ہو رہے ہیں وہ تو شاید ان لفظوں کو سنتے ہی تھرا اُٹھتے ہوں گے۔ بہت کم ساسیں دنیا میں ایسی ہوں گی جو ایک وقت میں بہو رہی ہوں لیکن رونے کے لائق یہ بات ہے کہ جو تکلیفیں اور آفتیں اُن پر ماتحتی کے دنوں میں گزرتی ہیں بجائے اس کے کہ وہ بااختیار ہونے پر اُن کو ہمدردی اور رحمدلی کا سبق سکھائیں وہ اپنی بہوؤں کے واسطے بھی "ساس" بنجاتی ہیں۔ یہ سب کچھ ہے مگر عورتیں ان باتوں کی جوابدہ نہیں ہیں۔ اگر قیامت کو نامہائے اعمال میرے سپرد ہو جائیں تو میں عورتوں کے اعمال ناموں سے اُن سب جرموں کو کاٹ دوں اور کس کے نامۂ اعمال میں لکھ دوں؟ مردوں کے۔ کیا عجب ہے جو احکم الحاکمین کا عدل بھی ایسا ہی حکم صادر فرمائے۔ مرد کہتے ہیں کہ عورتیں ہمارا کہنا نہیں مانتیں اُن کی دنیا نرالی ہے لاکھ سمجھاؤ ایک نہیں سنتیں۔ یہ سچ ہے کہ خودرائی کے زمانہ میں مردوں کے کہنے کو عورتیں رسم و رواج کے متعلق خیال میں نہیں لاتی ہیں مگر ہم یہ پوچھتے ہیں کہ یہ خودرائی اور "تریاہٹ" اُن میں کہاں سے آئی؟ کوئی متعصب اور رواج کا شیدا یہ کہنے کی جرأت

ہرگز نہیں کرسکتا کہ عورتوں کے خمیر میں کوتہ اندیشی اور ضد ڈالدی گئی ہے کیونکہ ہر مذہب اور ملت میں صدہا عورتیں ایسی گزری ہیں جن کی روشن خیالی اور پاک نفسی کی نظیر مردوں کے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ جب خلقی اور طبعی نہیں تو بالضرور اکتسابی اور عادی ہے۔ شادی سے پہلے شرفا کی لڑکیاں سوائے اپنی گھر کی چار دیواری اور ماں بہن باپ بھائی (آسودہ گھروں میں ماما اصیلوں) کے نہ کسی کو دیکھتی ہیں اور نہ کسی سے ملتی۔ شادی ہونے پر جب ہم اُن کے چال چلن کو جانچتے ہیں تو بدمزاجی اور ضد کی صاف جھلک نظر آتی ہے اور جس قدر اُن کی عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے اُسی قدر رواج کی سرگرم طرفدار بنتی جاتی ہیں۔ ہم کو اس تفتیش میں کہ یہ عادت انھوں نے کہاں سیکھی اُن کے ماں باپ کے گھر کی طرف پھرنا چاہیے، اس واسطے کہ سُسرال کی چوکھٹ پر تو قدم رکھتے ہی ہم نے اُن میں یہ عادت نقش فی الحجر کی مثل دیکھی ہے۔ کیا ہماری قوم کے ماباپوں کے سب بچے ناہموار اُٹھے ہیں؟ نہیں بیٹے تو ہمیشہ انہیں گھروں سے نیک نام اور عمدہ صفات کے پیدا ہوئے ہیں۔ یہ جواب پاکر فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر بیٹیوں پر کیا پتھر پڑگئے! بیٹے علی العموم شائستہ اور بیٹیاں بالکل ناہموار!! اس کا کیا باعث ہے؟ اگر تعصب ہماری عقل کو سلب نہ کرلے تو صاف ظاہر ہے کہ جس چیز نے لڑکوں میں صفات عمدہ پیدا کردئیے ہیں اُس سے لڑکیوں کو اُن کے مربیوں نے محروم رکھا۔ وہ چیز کیا ہے؟ تعلیم وہ تعلیم جو خدا کی نعمت ہے؛ وہ تعلیم جو اللہ کی رحمت ہے؛ وہ تعلیم جس کے نور سے دنیا میں روشنی پھیلی ہے۔ افسوس ہزار افسوس صد ہزار افسوس اوہام اور تعصبات کے پھندے میں پھنس کر ہم ایسی بیش بہا دولت ایسے انمول جواہرات سے اپنی لخت جگر بیٹیوں کو محروم رکھتے ہیں۔ جب ہم نے (یعنی مردوں نے) اُن کو جاہل رکھا ہے تو جتنی خرابیاں اور دشواریاں اُن کے ہاتھوں سے پیدا ہوں گی اُن کے ذمہ دار ہم ہیں (یعنی مرد) نہ عورتیں ممکن ہے کہ اس رائے کے مخالفوں کو یہ شبہ پیدا ہو کہ جب ہم عورتوں کو تعلیم یافتہ بنائیں اور اُن سے وہ غلطیاں سرزد ہوں جن کے کھٹکے سے ہم اُن کو تربیت یافتہ نہیں بناتے تو اُن غلطیوں کی بلا بھی ہمارے سر پر پڑے گی۔ نہ ہم اُن کو تعلیم دیتے نہ وہ یہ غلطیاں کرتیں۔ اس کا جواب بہت ظاہر ہے۔ جاہل لڑکیوں میں نیک و بد کا تمیز ہی نہیں ہوتا اگر وہ کوئی برائی کرتی ہیں تو بدنیتی سے نہیں

کرتیں، بلکہ بے سمجھی سے کرتی ہیں۔ اور چونکہ ہم نے نیک و بد پہچاننے کا مادہ اُن میں پیدا نہیں ہونے دیا یا
بالفاظ دیگر اُس کے پیدا ہونے کے اسباب مہیا نہیں کئے لہذا اُن کی لغزشوں کے ہم ذمہ دار ہیں اور
صرف ہم۔ تعلیم یافتہ عورتوں کو اچھی چیز اچھی اور بری چیز بری معلوم ہوتی ہے۔ اب اگر وہ اپنے واسطے
بُری بات کو پسند کرلیں تو یہ اُن کی شامت ہے نہ ہمارا قصور۔ اس واسطے اُس کا وبال اُن کے
سر پڑے گا نہ ہمارے سر۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ہم اندھیری رات میں اپنے کسی بچے کو گھر
سے باہر کہیں بھیجیں، راستہ میں غار پڑے ہوں وہ بیچارا بچہ اگر کسی گڈھے میں گر کر چوٹ کھائے تو ہر شخص
یہی کہے گا کہ کیسا بدتمیز باپ تھا جس نے اپنے بچے کو یوں بے سروسامان گھر سے نکال کر ہلاک کر ڈالا لیکن
اگر ہم اُس بچے کو ایک تیز روشن لالٹین دے دیں اور کہدیں کہ بیٹا راستہ خراب ہے سنبھل کر نکلنا
اور پھر وہ کسی غار میں جا رہے تو سب یہی کہیں گے کہ آنکھوں کا پورا تھا جو لالٹین کے ہوتے گڈھا نہ
سوجھا۔ علم چراغ ہے۔ مخدوش راستہ دنیا ہے اور اندھیری رات ہماری عمر۔ عورتوں کے تعلیم کے
مسئلہ پر ایک دوسرے پہلو سے بحث کی جاسکتی ہے۔ جو لوگ تعلیم نسواں کے مخالف ہیں ہم اُن سے یہ استفسار
کرتے ہیں کہ ہماری عورتوں میں خود رائی، کوتہ اندیشی، حُبِ رواج، اور مثل ان کے اور صفات ذمیمہ
ہیں یا نہیں۔ جواب پیرایہ نفی میں تو بالضرور نہ ہوگا کیونکہ وہ خود ہمیشہ ان بری صفتوں کا خمیازہ اُٹھا کر
روتے جھینکتے رہتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ "تریا ہٹ" وغیرہ کلمے زبان زد ہو رہے ہیں۔ جب وہ تسلیم
کریں گے کہ ہاں اُن میں یہ بری عادتیں پائی جاتی ہیں تو اب دو صورتیں ہیں یا ان عادات پر دکھیا
عورتوں کی طرح صبر کریں یا مردانہ وار اُن کے ازالہ کی کوشش کی جائے۔ صبر کرنا اپنے اوپر ظلم
کرنا ہے کیونکہ جاہل عورتوں سے کبھی امورِ خانہ داری میں راحت نصیب نہیں ہوسکتی ہے۔ گھر کا انتظام
سلیقہ کے ساتھ درست نہیں ہوسکتا۔ سلیقہ شعاری کے صرف یہ معنی نہیں ہیں کہ گھر کی چاردیواری
میں جو چیزیں ڈالدی جائیں اُن کی حفاظت کرسکیں یا باورچی خانہ کے برتن صاف رہیں یا اور مثل ان
کے خفیف جزوی امور کا سرانجام کرسکیں۔ ہندوستانیوں میں جب کسی بیوی کی سلیقہ شعاری کی مدح
سرائی ہوتی ہے تو انہیں ناچیز جزئیات سے بحث کی جاتی ہے۔ افسوس اُن کو معلوم نہیں کہ خانہ داری

کے محاورہ میں "راحت" اور "سلیقہ" کے کیا معنی ہیں۔ اگر یورپین لیڈیز کے اطوار کو وہ صاف دلی اور
انصاف سے دیکھ سکیں تو وہ سمجھ جائیں کہ بیویاں اپنے شوہر کو کیا آرام دے سکتی ہیں اور اُن کے
سلیقہ سے گھر پر کیا برکتیں نازل ہوتی ہیں۔ صبر کرنا اپنے معصوم بچوں پر بے رحمی ہے۔ جو مائیں تربیت
یافتہ نہیں وہ اپنے بچوں کی صحت اپنے اوہام کی پیروی میں تباہ کر دیتی ہیں۔ جو مرض ہے آسیب کا خلش ہے گنڈے اور
جھاڑ پھونک کے پھندے میں پھنس رہے ہیں۔ یہ ایک عام عقیدہ عورتوں کا ہے کہ بچوں کا علاج طبیب یا ڈاکٹر
نہیں کر سکتے، جو خاک بلا کسی نے بتائی بچہ کے منہ میں ٹھونس دی۔ جو تریاق صحت کے مفید ایجاد ہوئے ہیں اُن
سے سخت خائف ہیں۔ دانت نکلنے پر نشتر نہیں لگانے دیتیں۔ چیچک کے ٹیکے کا نام سن کر دم فنا ہوتا ہے۔ کھانے
میں اعتدال یا مضر و مفید کی تمیز نہیں۔ لباس کے متعلق تو ہندوستان کے مرد بھی ناواقف ہیں تا بزنان
چہ رسد۔ جو مائیں تربیت یافتہ نہیں وہ اپنے بچوں کی تربیت نہیں کر سکتیں۔ اگر ہم کسی انگریز کے سات
آٹھ برس کے معصوم بچے اور کسی ہندوستانی بچے کا موازنہ کریں تو صاف ظاہر ہو جائے گا کہ پہلے کے دماغ
میں کتنی کارآمد معلومات جمع ہیں اور کس طرح اُس کا دماغ تعلیم و تربیت کا اثر قبول کرنے پر آمادہ ہے۔
اور پچھلے کے دل میں کتنے اوہام فراہم ہیں اور کیسے کیسے عاداتِ ذمیمہ کا تخم بو دیا گیا ہے۔ صبر کرنا خود
بیچاری عورتوں پر ظلم کرنا ہے اس لئے کہ جہالت کی بدولت وہ کمالاتِ انسانیہ سے بالکل محروم
رہ جاتی اُن کے دماغی جوہر بالکل افسردہ ہو کر کملا جاتے ہیں۔ اگر صبر کرنا مناسب نہیں تو ازالہ کی کوشش
کرنی چاہئے ہم اپنے مخالفوں سے پوچھتے ہیں کہ انسان کو شائستہ بنانے کے واسطے سوائے تعلیم کے اور
کون سی تدبیر ہے۔ دنیا کو جب سے پیدا ہوئی ہے اور جتنی قومیں شائستہ ہوئی ہیں سب تعلیم و تربیت سے
اور غالباً قیامت تک بھی کوئی اور ذریعہ سوائے علم کے ایجاد نہ ہو گا۔ ہمارے مخالف دوست عورتوں
کے شائستہ بنا لینے کے لئے کوئی منتر ایجاد کر لیتے تو بہت آسانی ہو جاتی ہا!! (غیر شائع شدہ)

(بقیہ نوٹ صفحہ ۴۶۲) فروری سنہ ۱۹۳۲ء میں ہوا۔ چھوٹی مسعودہ بیگم مرحومہ چودھری نور اللہ خاں صاحب مرحوم رئیس بھادر کے بڑے صاحبزادہ
چودھری عزیز اللہ خاں صاحب مرحوم سے منسوب تھیں۔ جس لڑکے کی پیدائش کا اس مضمون میں ذکر ہو یہ خان بہادر چودھری احمد اللہ
خاں (عرف "ننھے میاں") ہیں جو نواب صاحب کے بڑے خویش اور ماشاء اللہ خود صاحب اولاد ہیں سلمہم اللہ تعالیٰ۔ ننھے میاں کی ولادت
کے چند ماہ بعد ہی ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ غفرلہا۔ ولادت "ننھے میاں" سلمہ بریع الآخر ۱۳۴۰ھ مطابق دسمبر ۱۹۲۱ء۔
(محمد مقتدیٰ خاں شروانی)

خازن الدولہ وضیاء السلطنت

خاندان قاچاریہ کے چشم و چراغ فتح علی شاہ قاچار کے حرم خانہ کی تاریخ اُن کے نورنظر شاہزادہ عضدالدولہ نے لکھی ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے نہایت دلچسپ حالات ایک شاہی حرم کے آئین و ضبط و انتظام کے معلوم ہوتے ہیں عموماً ایشیائی سلطنتوں کی نسبت بے اصول اور غیر منتظم ہونے کا گمان کیا جاتا ہے لیکن ایسی زبردست شہادتیں ایسے گمان کو بدگمانی ثابت کرتی ہیں۔ بے اصول سلاطین کا حرم خانہ سب سے زیادہ ابتری کی مثال ہونی چاہیے۔ جب ہم ایسے مشکل موقع کو آئین وضوابط میں جکڑا ہوا پاتے ہیں تو دوسرے محکموں کے با اصول دیا اسلوب ہونے کا قیاس شاید غلط نہ ٹھہرے۔ البتہ جو سلاطین خود لاأبالی ہیں اُن کو ہم اعتراض سے نہیں بچا سکتے۔

تاریخ مذکور کا ایک مقام ہم علی گڑھ منتھلی کے ناظرین کی دلچسپی کے واسطے ترجمہ کرتے ہیں۔ اس زمانے میں تعلیم نسواں کا زبانی چرچا ہم میں بہت ہو رہا ہے۔ اگرچہ نتیجہ مثل اور بہت سی ہماری تجویزوں کے ہیچ ہے تاہم تعلیم نسواں سے یک گونہ دلچسپی ضرور ہو چلی ہے۔ دوسرے غلامی کا مسئلہ اکثر زیر بحث رہتا ہے اور اس کے نام کے ساتھ انواع و اقسام کے مصائب کا تصور ذہن کے سامنے آجاتا ہے جن کی نسبت گمان ہے کہ وہ اُن بے زبانوں پر نازل ہوتی تھیں۔ اور کس راحت و قدر کے ساتھ اُن کی زندگی بسر ہوتی تھی۔

خازن الدولہ

خازن الدولہ منجملہ اُن مستورات کے تھی جن کا پایۂ اعتبار بلند تھا۔ مرحومہ مہد علیا (حرم محترم آقا محمد خان) کی وفات کے بعد حضرت خاقانی (فتح علی شاہ) نے تمام بیگمات قاچاریہ وغیرہ کو ہدایت کی کہ بجائے مہد علیا کے حرم خانہ سلطنت میں تم منجملہ اپنے ایک کو مقتدر اور رئیس منتخب کرو تاکہ باقی تمام بیگمات اُس کی ہدایت پر کاربند رہیں۔ اور جو نقد و جنس مقرری مہد علیا کے ذریعے سے تم کو ملتا تھا وہ اُس کے ذریعہ سے تم کو ملے۔ سب نے مشورہ کر کے کہا کہ یہ ممکن نہیں کہ ہم اپنے ہم چشموں میں سے ایک کو رئیس بنا کر اُس کی اطاعت کریں۔ البتہ اگر مہد علیا کی کنیزکوں میں سے کسی کو بجائے اُن کے مقرر کر دیا

جائے تو بلحاظ احترام مرحومہ کے ہم کو اُس کی اطاعت میں کوئی دریغ نہ ہوگا۔ اور حرم خانۂ مبارک کا اختیار اُس کے ہاتھ میں رہے گا۔ گلبدن باجی کو مہد علیا کی کنیزوں میں سے انتخاب کرکے اس منصب پر مقرر کیا۔ جو کچھ نقد و جنس و جواہر وغیرہ صندوق خانہ مبارک میں تھے وہ اُس کے تصرف میں دئے گئے۔ اور جو قانون عہد مہد علیا میں تھا وہی رائج رہا۔ مواجب، لباس، انعام و بخشش جو کچھ جس کسی کو ملتا تھا اُسی کے توسط سے ملتا۔ صندوق دار اُس کا خطاب ہوا۔ اُس کی مہر پر حسب ذیل شعر کندہ تھا:

ع معتبر در ممالک ایران — قبض صندوقدار شاہ جہاں

اس مہر کا اعتبار اس درجہ تھا کہ اگر کروڑ روپے تجار وغیرہ سے طلب کئے جاتے تو وہ بے تردد حوالہ کر دیتے تھے۔ صندوقدار کے اقتدار کا یہ عالم تھا کہ کوئی عورت خواہ وہ حرم شاہی ہوتی یا کوئی بڑھیا، یا کنیز، بغیر اُس کی اجازت کے نہ حرم سے باہر جا سکتی تھی نہ اندر آسکتی تھی۔ جب کوئی عورت اندر آنا چاہتی تھی تو صندوقدار ایک بڑے یاقوت کی انگشتری اپنے خواجہ سرا آقا الماس کے ہاتھ بھیج دیتی تھی جو اندر کی ڈیوڑھی میں آقا یعقوب گرجی کو دکھائی جاتی وہ اُس کو دیکھ کر دربانوں کو دکھاتا اور وہ فوراً جانے کی اجازت دے دیتے۔ جب کوئی باہر جانا چاہتی تو صندوقدار کی زمرد کلاں کی انگشتری دکھائی جاتی۔ گرمیوں کے موسم میں جبکہ اہل حرم مختلف ییلاقوں (سرد مقامات) کو چلی جاتی تھیں صندوقدار حرم خانہ میں موجود رہتی اور تمام اہتمام اُن سب کے محلوں کا رکھتی۔ اُس کا انتظام عقل و دانائی اور خوبی دیکھ کر خاقان مرحوم (فتح علی شاہ) نے اُس کو بیگمات میں داخل کر لیا۔ اور خازن الدولہ کا لقب عطا کیا۔

شاہزادہ بہاؤالدولہ اور سیف اللہ میرزا اُس کے بطن سے تھے۔ صندوق خانہ کے متعلق جس قدر عملہ منشیوں اور کنیزکوں کا خازن الدولہ کی ماتحتی میں تھا اگر اُس کی تفصیل کی جائے تو ہزار صفحے بھی کافی نہ ہوں گے میرزا مریم (جو صالح طہرانی کی اولاد سے تھی جن کی یادگار مدرسہ و دیگر عمارات مشہور ہیں) خازن الدولہ کی مستوفیہ (افسر خزانہ) تھی۔ میرزا پری سیما۔ میرزا فلک تاز اور دیگر چند نفر اُس کی محررہ تھیں۔ اگر نفر ہائے ہمایوں میں حضرت خاقانی کسی کو خادمانِ حرم وغیرہ میں سے ایک انگشتری عنایت

کرتے، یا کوئی اور چیز عطا ہوتی تو ضیاء السلطنت خازن الدولہ کو لکھ بھیجتی کہ فلاں ساعت میں فلاں جواہر فلاں خانم کو مرحمت ہوا۔ میرزا مریم اور باقی محرر اُس کو درج کاغذات کر لیتی تھیں۔ نقد و جنس و جواہر وغیرہ جو خزانہ حرم سے نکلتا، خزانہ میں جمع ہوتا، ناممکن تھا کہ خازن الدولہ کے دفتر میں درج نہ ہو۔ خداوند تعالیٰ نے حافظہ اور ہوش اُس کو اتنا قوی دیا تھا کہ جس وقت جو چیز حضرت خاقانی طلب فرماتے فوراً حاضر کرتی۔ جس قدر اشرفیاں اُس کے ہاتھ پر رکھ دی جاتیں یا سر بمہر تھیلی دیتے تو وہ قیاس سے ان کی مقدار بتا دیتی تھی، اور جب شمار ہوتا تو اُس کے اندازے میں دو سو تین سو اشرفیوں میں سے دو تین کا فرق نکلتا۔ جواہرات کو تھوڑے سے غور میں بخوبی پرکھ لیتی تھی۔ اُس کا وزن، اُس کی قیمت ایسی ٹھیک جانچ دیتی تھی کہ استاد جوہری پرکھ کر اور تول کر اس کی جانچ کی تائید کرتے۔ بغیر طلب بادشاہ کے حضور میں نہیں جاتی تھی۔ ہمہ وقت اپنے عملہ کے ساتھ صندوق خانہ کے محاسبہ اور اہل حرم کے کاروبار کے سرانجام میں مصروف رہتی تھی۔ جشن نوروز سے دو مہینہ پیشتر ضرور تھا کہ جشن مذکور کے متعلق کل خلعت تیار کر کے اور بقچوں میں باندھ کر خسرو خاں خواجہ سرا کے ہمراہ حضرت خاقانی کے ملاحظہ میں پیش کر دئے جاتے تھے۔ بقچہ پر سرنامہ میرزا مریم کے قلم کا ہوتا تھا۔ خلعت اس انتظام کے ساتھ روانہ کئے جاتے تھے کہ ہر صوبہ کے صدر مقام میں سب تحویل آفتاب میں پہنچ جائیں۔ اور حاکم صوبہ وقت تحویل اُسی خلعت کو پہنے ہو۔

بعض بانوانِ حرم محترم ایسی تھیں کہ خازن الدولہ جب اُن کے یہاں جاتی تھی تو بے اجازت بیٹھ نہیں سکتی تھی لیکن جب وہ اپنے دیوان خانے میں ہوتی (جو مہد علیا محل نشیمن تھا) تو اُس سے بالاتر کوئی بیگم نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ اُس موقع پر تمام بیگمات نہایت ادب اور عاجزی سے عرض مطلب کر کے جواب حاصل کرتی تھیں۔ جس قدر نذر وغیرہ عید نوروز یا دوسرے موقعوں پر دربار میں آتی ممکن نہ تھا کہ اُس میں سے آب لیموں کا ایک شیشہ یا تمباکو کا ایک کیسہ بدون اجازت و تقسیم و تعیین خازن الدولہ کے کوئی لے سکے۔ یہاں تک کہ شاہزادوں کو بھی وہی تقسیم کرتی تھی۔ لیکن باوجود اتنے اعتبار کے غالباً اس نے دس تومان سے زائد نقد یا جنس بدون عرض و اجازت شہریاری اور اندراج دفتر میرزا مریم کے کسی کو عطا

نہ کی ہو گی۔

ضیار السلطنۃ

شاہ بیگم خانم ملقّب بہ لقب ضیار السلطنت حضرت خاقانی کی لخت جگر تھی۔ اُس کی والدہ مریم خانم طائفہ بنی اسرائیل سے تھی۔ مہد علیا نے اُس کو پرورش کیا تھا۔ وفات مہد علیا کے بعد کل جواہرات و اسباب تجمل ضیار السلطنۃ کو عطا ہوا۔ اُس کا تمام کارخانہ (طویلہ۔ فراش خانہ وغیرہ) دائرہ حرم خانہ سے علیحدہ تھا۔ معزز معزز آدمی اُس کی سرکار میں ملازم تھے منجملہ اُن کے شعبان علی خاں اُس کا وزیر اُس زمانہ کے سرداروں میں نہایت معزز تھا۔ خاقان مرحوم کو ضیار السلطنۃ سے بیحد محبت تھی۔ تحریروں تقریروں میں یگانہ روزگار تھی بمقتضاء الاسماء تتنزل من السماء (نام آسمان سے نازل ہوا کرتے ہیں) اُس کا لقب اُس کے حسن بے نظیر و جمال کا ایک نمونہ تھا۔ احکام خاقانی کے جو دستخط ہوتے تھے اُس کے قلم سے ہوتے تھے خصوصاً محرمانہ نوشتے جس کسی کو لکھے جاتے تھے اُس کے ہاتھ کے ہوتے خط نسخ خوب لکھتی تھی۔ کلام مجید، کتب ادعیہ اور زیارات کے متعدد نسخے اُس نے اپنے ہاتھ سے لکھے تھے۔ عموماً اُس کے بھائی اُس کا احترام کرتے تھے۔ ولیعہد مرحوم نے اُس کی شان میں کہا تھا:

ے اے ضیار السلطنۃ روحی فداک   صد گریباں کردم از ہجر تو چاک

خاقانِ مرحوم فرماتے ہیں۔

تو نہ چشم من ضیار السلطنہ   یک شبہ ہجر تو برما یک سنہ

جشن میلاد خاقانی کے موقعہ پر ہر سال بادشاہ۔ اہل حرم اور کل شاہزادے اور شاہزادیاں ضیار السلطنت کے مہمان ہوتے تھے۔ ایک عمدہ جواہر ہر سال اس موقعہ پر ضیار السلطنت کو مرحمت ہوتا تھا۔ ایک رقم معین اُس کی تحویل میں رہتی تھی۔ جس کو شاہزادے وغیرہ بوقت ضرورت قرض لے کر صرف کرتے تھے۔ ہمیشہ سفر و حضر میں حاضر خدمت حضرت خاقانی رہتی تھی۔ اگرچہ اُس کی سفارش و شفاعت بے شبہ قابل قبول تھی لیکن بمقتضائے احتیاط کبھی کسی کی سفارش نہیں کرتی تھی۔ عہد خاقان مرحوم میں بہت سے لوگوں نے اُس کے نکاح کی تمنا کی۔ لیکن اُس نے قبول نہیں

کیا۔ بعد رحلت خاقان ۲۷ برس کے سن میں حاجی میرزا مسعود وزیر خارجہ کے ساتھ اُس نے اپنی شادی کی۔ جس رات کو وہ حرم خانہ سے رخصت ہوئی تھی شاہنشاہ مرحوم محمد شاہ رخصت کرنے آئے تھے تمام شاہزادے وزیر خارجہ کے مکان تک اظہار احترام کے لئے اُس کے ساتھ ساتھ گئے۔ جس وقت کہ مرحوم حاجی میرزا آقاسی اور میر مہدی امام جمعہ عقد نکاح کے واسطے آئے تو خود ضیاء السلطنت نے پردے میں سے اُن کی فراج پرسی کی۔ حاجی میرزا نے یہ بھی کہا کہ چونکہ تم کو عرفان کا دعویٰ ہے اور حاجی میرزا مسعود کی طرف سے وکیل بن کر آئے ہو لہذا میرے وکیل میرزا نصراللہ صدر الممالک ہوں گے جو سالک طریقت ہیں۔ صاحب طبع موزوں تھی اور اشعار لطیف لکھتی تھی۔۔

(رسالہ علی گڑھ منتھلی بابتہ ماہ مئی ۱۹۰۳ء)

برقی روشنی

شب[1] کو برقی روشنی حبیب منزل علی گڑھ میں آئی۔ اول نماز مغرب با جماعت ہوئی۔ امام حافظ عبدالقیوم تھے۔ (خویش حاجی ملا احمد) بعد نماز مغرب آیہ مبارکہ "اللہ ولی الذین آمنوا یخرجھم من الظلمٰت الی النور" پڑھ کر میں نے سوئچ دبایا۔ جس وقت زبان سے الفاظ مبارک "الی النور" نکلے کوٹھی روشن ہوگئی۔ الحمد للہ۔ اس کے بعد حافظ موصوف نے بلحن عرب آیہ مبارکہ "اللہ نور السمٰوٰت والارض" الخ تلاوت کی۔ تلاوت ختم ہونے پر آنکس کریم سے حاضرین کی مدارات ہوئی۔ اصحاب ذیل تشریف فرما تھے۔ حافظ عبدالقیوم صاحب۔ مولانا سید سلیمان اشرف صاحب۔ خان بہادر مولوی سید زین الدین صاحب مولوی اکرام اللہ خاں صاحب۔ مولوی ندیم احمد صاحب مجددی۔ مولوی محمد مقتدی خاں صاحب۔ حافظ غلام غوث خاں صاحب۔ مولوی عبدالحمید خاں۔

(غیر شائع شدہ)

---

[1] شب مابین ۲۵ و ۲۶ صفر المظفر ۱۳۵۴ھ مطابق ۲۹ و ۳۰ مئی ۱۹۳۵ء)۔ محمد مقتدی خاں شروانی

جارج پی شور

اگست سنہ حال کے "زمانہ" میں جو مقالہ بہ عنوان "یورپینوں کی خدمات ادب اردو" شائع ہوا ہے اس میں جارج پی شور کا بھی ذکر ہے جو ۱۲۶۱ھ میں تھے ایک شعر بھی بطور نمونہ دیا ہے۔ لکھا ہے کہ آپ نے دو دیوان بھی مرتب کئے تھے لیکن اب ایک کا بھی پتہ نہیں - دیوان کی نایابی کا ذکر پڑھ کر خیال آیا کہ میرے کتاب خانے میں دیوان شور ہے۔ نکال دیکھا۔ اسی سلسلہ میں منشی عبدالکریم دہلوی کا تذکرہ شعرائے ہند اور لالہ سری رام دہلوی کا تذکرہ خم خانہ جاوید دیکھا ثابت ہوا کہ دو یورپین "شور" تخلص شاعر یکے بعد دیگرے ہوئے ہیں۔ ایک وہ جن کا تذکرہ شعراء اردو میں اور تذکرہ خم خانہ جاوید میں ہے۔ دوسرے وہ جن کا دیوان فارسی میرے یہاں ہے۔

شور نمبر اوّل

یہ وہی ہیں جن کا ذکر "زمانہ" کے مقالہ پیش نظر میں ہے۔ منشی عبدالکریم اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "جارج پیش تخلص شور ایک صاحب رہنے والے کوئل (حال علی گڑھ) کے ماموں بھانجہ کے محلہ کے طبع مستقیم اور ذہن سلیم رکھتے ہیں۔ جن ایام میں کہ مشاعرہ ۱۲۶۱ء ہجری میں ہوا تھا اُن کے خطوط میرے پاس مع غزل طرح کے واسطے درج مشاعرہ آیا کرتے تھے۔ اُن خطوط سے قوت و استعداد ذہن اور طبیعت کی بھی واضح ہوتی رہتی فارسی عبارت بہت اچھی لکھتے ہیں۔ مذہب میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہیں۔ ملاقات خطی میری اُن کی ۱۲۶۱ء ہجری میں ہوئی یہ اشعار انھوں نے کوئل سے میرے پاس ڈاک میں روانہ کئے تھے۔ اسی کا ایک شعر مقالہ "زمانہ" میں نقل کیا گیا ہے۔

غزل

کس شمع رو کی دل سے مرے دل کو راہ تھی — اٹھتے تھے منہ سے شعلے نکلتی ایک آہ تھی

آنکھوں سے روتے روتے جو آتا تھا خون سیاہ — نظروں میں اپنی کس کی وہ زلفِ سیاہ تھی

کشور میں عشق کے ترے عاشق کے دم کے ساتھ — ایک فوج اشک اور علم دار آہ تھی

عاجز تھا اپنی جان سے ایسا ترا مریض — دیکھے سے جس کی حالتِ عیسیٰ تباہ تھی

بس بے یہ بیخودی کہ خودی سے بھلا دیا — ورنہ یہ زیست مرگ کی اپنے گواہ تھی

دیر و حرم میں تو نہ دے ترجیح زاہدا — جس طرف سر جھکا دیا بس سجدہ گاہ تھی

میری وفا و تیری جفا کی جہاں میں شوخ — سرگرم قتل آہ یہ کس کی نگاہ تھی

خوناب غم جو شورؔ تو پیتا تھا رات دن — چاہ ذقن کی کس کے ترے دل کو چاہ تھی

ان کا ذکر تذکرۂ خمخانہ جاوید میں بھی ہے۔

"شورؔ مسٹر جارج پیش شور معروف بہ شور صاحب غدر سے قریب ۴۰ سال قبل ان کے بزرگ نواح دہلی میں آئے تھے اور اسلامی طرز معاشرت اختیار کر لیا تھا۔ گو مذہباً عیسائی رہے۔ شور صاحب اوائل مشق سخن مرزا رحیم بیگ ساکن میرٹھ سے مشورہ کرتے رہے۔ پھر قطب الدین مشیر دہلوی اور ان کے بیٹے میاں غلام دستگیر سے اصلاح لے کر تتمہ استادی حاصل کیا۔ ہر چند پور ضلع میرٹھ اور علی گڑھ میں چند دیہات ان کی ملکیت تھی معاش کی طرف سے بے فکر اور بڑے زندہ دل یار باش خلیق اور متواضع تھے چنانچہ ان کی اکثر ٹھمریاں اور ہولیاں مشہور ہیں۔ اردو میں صاحب تصانیف کثیر گزرے ہیں۔ چار پانچ دیوان اپنی زندگی ہی میں چھپوا کر شائع کر دئے تھے۔ ہر دیوان جناب داغؔ دہلوی کی ہم طرح غزلوں سے معمور ہے ۱۸۸۴ء میں ۷۰ سال کے قریب عمر پا کر انتقال کیا۔"

حالات کے بعد ۲۵ شعر انتخاب میں دئے ہیں۔ ان میں سے حسب ذیل چند شعر ہم یہاں نقل کرتے ہیں جن سے انداز سخن کا اندازہ ہو سکے گا۔ کلام صاف برجستہ ہے۔ بعض اشعار قابل داد ہیں۔

چشموں سے اشک کو دُرِ یکتا بنا دیا — بخت جگر کو لعل کا ٹکڑا بنا دیا

جاتی نہیں ہے اس کی کسک عمر بھر کبھی — ہر دم کھٹکتی رہتی ہے دل پر نظر کی چوٹ

ہم نے انگریزی تو پوشاک میں دیکھی نہ سنی — کوٹ پتلون پہ ہیں سرخ کلاہیں کیونکر

یہ بڑا دن ہے کھلا پھر درِ میخانہ نہ ہے — کہ نیا دور نیا شیشہ ہو پیمانہ نیا ہے

کہا جو میں نے وفا کر تو ہنس کے فرمایا — جفا کو چھوڑ دیں ہم آپ کی وفا کے لئے

نمک ایسا نہ حسن ایسا زباں ایسی نہ آنکھ ایسی — غنیمت اور اقلیموں سے ہے ہندوستاں پھر بھی
اگرچہ داغ بھی مشہور ہیں شیریں کلامی میں — مگر تم شور ہو کر شور ہو شیریں زباں پھر بھی

شور نمبر ۲

یہ وہ ہیں جن کا دیوان میرے یہاں ہے۔ ٹائٹل پر لکھا ہے "گلشن فرنگ المعروف بہ دیوان شور فارسی" چکیدۂ قلم پر زور یعنی جالبج پیش صاحب متخلص بہ شور شیریں کلام۔

دیوانِ ہذا ۱۸۹۰ء میں بمقام میرٹھ مطبع شگوفہ فیض میں چھپا ہے۔ شور نمبر ۲ ۱۸۹۰ء میں زندہ تھے، جیسا کہ اس تاریخ طبع دیوان سے معلوم ہوتا ہے۔ "دیوان فارسی شور دام افضالہٗ" ۱۸۹۰ء ایک تاریخ خود شور نے اپنے اس دیوان کی لکھی ہے۔ "چہ بے نظیر سخن" ۱۸۹۰ء۔

یہ دیوان چھوٹی تقطیع کے ۱۱۴ صفحوں پر چھپا ہے۔ ردیف وار مرتب ہے۔ غزلوں کے بعد رباعیات۔ کلام صاف بے عیب ہے بہت سے اشعار لطف انگیز و ذوق آفریں بھی ہیں جن سے شاعر کی پختہ مشقی اور ذوق سلیم کا پتہ لگتا ہے۔

ہم دو تین غزلیں نمونہ کے طور پر یہاں نقل کرتے ہیں۔

خزاں کردی بہار من چہ کردی — بگو اے گلعذار من چہ کردی
بگو با جان زار من چہ کردی — کجا بردی قرار من چہ کردی
گرفتم بودہ رشک مسیحا — بدرد انتظار من چہ کردی (علاج)
گرآلودی بخونم دست و پارا — بجان دل فگار من چہ کردی
چرا بردی صبا از کوچہ یار — ترحم با غبار من چہ کردی (سخنہا)
قرار دوستی با غیر دادی — بجانِ بے قرار من چہ کردی
پریشاں کردہ زلفِ و تارا — پریشانی بکار من چہ کردی (نصیبِ روزگار)
نیاوردی یکے گل بر مزارم — چہ کردی گلعذار من چہ کردی
نکردی یک نظر سوئے دل شور — نگار من بکار من چہ کردی

برائے زیب بدن نیلگوں قبا داری — نہاں بہ پردۂ شب صبح دلکشا داری

زمن گریزی و در بزم غیر جا داری — نہاں زمن بہ کسے وعدۂ وفا داری

سیاہ چساں نہ کنی روزگار مردم را — لب مسی زدہ و چشم سرمہ سا داری

خدنگ غمزہ و تیغ ادا و خنجر ناز — بقتل جانِ غریباں چہا چہا داری

ازاں دمے کہ مرا کشتۂ تو خاموشی — خدا غلط نہ کند فکر خوں بہا داری

فدائے جور تو باشم کہ خوش ادائے ہست — سرم بریدی و ہم دعوئ وفا داری

چہ کافری کہ بوقتِ نماز ہم اے شور
بدل خیالِ بت و بر زباں خدا داری

طبیبِ من جزاک اللہ خیرا — کہن دردے بدرماں تازہ کردی

بخون زد غوطہا از رشک یاقوت — تو چوں رنگِ لب ازیاں تازہ کردی

صبا از زلف او بوئے رساندی — دماغ ایں پریشاں تازہ کردی

نوید وصل دادی زندہ باشی — تنِ افسردہ را جاں تازہ کردی

تو کردی شور شاداں روحِ مجنوں
کہ شورِ ایں بیاباں تازہ کردی

(رسالہ زمانہ کانپور بابتہ ماہ اکتوبر ۱۹۴۳ء)

محشرِ خیال

میں نے "محشرِ خیال" کو پڑھا۔ بار بار دیکھا، دونوں دیکھا، اس پر بکثرت نوٹ کئے۔ میری ناقص فہم اس کا پتہ لگانے سے قاصر رہی کہ کیا خوبیاں اس کتاب میں تھیں جنھوں نے اس کو اس مرتبہ پر پہنچایا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے ایم اے کے طلبا کے درس میں داخل ہے۔ میں نے رائے قائم کرنے میں ان تحریروں سے مدد چاہی جو کتاب کے اول میں "عرض ناشر" اور "شعلۂ مستعجلہ" کے عنوان سے درج ہیں۔ مگر افسوس کوئی مدد نہ ملی۔

یہ پڑھا کہ "اہل قلم نے اس کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا" اور "نوجوانوں نے مصنف کی طرز نگارش اور زاویۂ فکر کو اپنے رجحانات کے مطابق پایا" یہ نہ معلوم ہوا کہ یہ اہل قلم کون تھے اور انھوں نے کس خوبی سے متاثر ہو کر "اپنی توجہ کا مرکز بنایا"۔ اسی تحریر میں اصل نکتہ قلم سے تراوش کر گیا ہے۔ جہاں ناشر نے صاف لکھدیا ہے کہ "میرے لئے یہ کفایت ہے کہ وہ سجاد مرحوم کا لکھا ہوا ہے"۔ یہ بھی لکھا ہے کہ "سجاد جوان مرے" شعلۂ مستعجلہ (جو سجاد مرحوم کی طرز تحریر کا حقیقی خطاب ہو سکتا ہے) میں لکھا ہے کہ "سجاد نے پیشتر مضامین علی گڑھ میگزین میں اشاعت کے لئے بھیجے۔ جو بزرگ آج ادب کے آسمان پر مہروماہ بن کر چمک رہے ہیں ان کی شہرت سب سے پہلے میگزین ہی کے ذریعہ سے ہوئی۔ چنانچہ شاعروں میں، فانی، جگر، اصغر، سہیل، عظمت اللہ خاں، اور نثر نگاروں میں، سجاد انصاری، سجاد حیدر، اور رشید صدیقی کا نام لیا جا سکتا ہے"۔ یہ بھی لکھا ہے کہ "سجاد کا وار صرف صوفی فلسفی اور زاہد خشک ہی پر نہیں وہ مذہب و اخلاق پر بھی چوٹیں کیا کرتے تھے"۔ ان ہی چند لفظوں میں پورا ریویو "محشرِ خیال" پر آجاتا ہے۔ سجاد مرحوم کی جوان مرگی (اللہ کی رحمت ان پر) باعث ہوئی کہ ان کے نصب العین، خیال اور ادب دونوں کو پختگی کسی معنی پر قائم ہونے کا موقع نہ ملا۔ فانی اصغر وغیرہ نامور ادیب بھی اگر خدانخواستہ جوان مرگ ہو جاتے تو وہ بھی ترقی و پختگی کے ان مراتب کو حاصل نہ کر سکتے جو انھوں نے برسوں کی جاں کاہی کے بعد بالآخر حاصل کئے اور جن کی وجہ سے آج سرمایۂ ناز ادیب ہیں۔ علی گڑھ میگزین کی جو بھی

عزت کی جائے بہر حال اُردو کے اعلیٰ میگزینوں میں نہ تھا۔ اس میں مضامین کی اشاعت کسی بلندی خیال یا پاکیزگی ادب کی ضامن نہیں ہوسکتی۔

سخت قابل افسوس اور خطرناک یہ پہلو ہے کہ سجاد فلسفہ، اخلاق، مذہب، سب ہی سے بیزار ہیں فارسی ادب کی عظمت کا ایک فقرے میں بخیال خود خاتمہ کر دیا ہے۔ گویا ان کے یہاں کوئی اصول زندگی نہیں، بے اصول زندگی محبوب و مقبول ہے۔ ان کے یہاں تین محبوب ہیں۔ عورت کا شباب، بشرطیکہ وہ عفت و عصمت کی گندگی سے پاک و صاف ہو۔ ایک غرق شباب قحبہ جو کسی کمرے پر داد عیش پرستی دے رہی ہو وفا اور پابندی سے سخت بیزار ہو، کمال نسوانی کا بہترین اور محبوب ترین نمونہ ہے۔ اُس کی تعریف میں اُن کے تمام مضامین رطب اللسان اور گلریز ہیں۔ اگر حسین و جوان نکاح کرکے عصمت و عفت کی زندگی بسر کرے تو وہ خارج از بحث بلکہ ننگ نسوانیت ہے۔

دوسرا محبوب "معصیت لطیف" ہے۔ مگر باوجود پوری کاوش کے مجکو پتہ نہ لگا کہ ان لفظوں کا اصلی مفہوم مضمون نگار کے یہاں کیا ہے۔ پڑھنے والا جس گناہ کا لطف لینا چاہے اُس کو لطیف قرار دے لے۔

تیسرا محبوب ان کا، شیطان اور شیطنت ہے۔ اول سے آخر تک شیطان اور شیطنت کو سراہا ہے۔ خلاصۂ کائنات قرار دیا ہے۔ بلکہ پیدائش عالم کی اصلی حکمت۔

اس کے مقابلہ میں انبیاء کرام، ملائکہ مقربین، بلکہ اُن کے ڈراما "روز جزا" کا خدا بھی پست و بے وقعت ہیں۔ حضرت جبریل اور دوسرے مقرب فرشتوں کی جس طرح اس ڈرامے میں شیطان کے مقابلے میں تضحیک کی گئی ہے اس کو پڑھ کر ڈراما نگار کی فہم و دانش پر سخت تاسف ہو سکتا ہے۔

مذہب کے استخفاف سے "محشر خیال" اول سے آخر تک بھرا ہوا ہے۔ مضامین 'زلیخا'، 'روز جزا' وغیرہ میں جس طرح مضامین قرآنی کے مقابلے میں کم فہمی، جسارت اور خیرہ چشمی کا ارتکاب ہے، قابل صد نفرین ہے۔

میں نے مذہبی بحث پر تین مسلم علما کی رائے بھی احتیاطاً حاصل کی ہے۔ ناظم صاحب دینیات مسلم یونیورسٹی، صدر شعبہ دینیات یونیورسٹی۔ اور مولوی سید فضل احمد (شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد) تینوں میرے خیال سے متفق ہیں۔ اُن کی رائے شامل مسل ہے۔ یہ نکتہ بھی قابل نگارش ہے کہ ڈراما نگاری کا کمال ان

دو لفظوں میں ہے۔ "نقل کا الاصل"۔ اس کے لیے ضرور ہی کہ ڈراما نگار اپنے موضوع کا پورا نقشہ اوّل دماغ میں قائم کرے۔ سجاد مرحوم نے جو سرسری اور سطحی خاکہ قیامت کا کھینچا ہے وہ ان کے خیال کی بے مائگی کا کھلا ہوا ثبوت ہے۔

بہرحال میری رائے میں "محشر خیال" میں نہ ادب ہے اور نہ لٹریچر کی کوئی اعلیٰ خوبی اور نہ تخیل اور نصب العین کی۔ اس طرح یہ کتاب مسلم یونیورسٹی کے اعلیٰ درس میں رہنے کا اپنی کسی خوبی کے لحاظ سے حق نہیں رکھتی ہی۔ اُس کے اوصاف خود اُس کے قدردانوں نے دو تین لفظوں میں بیان فرما دئے ہیں۔ "شعلہ مستعجلہ" "تلملاتے اور جگمگاتے" بس یہی پوری تعریف "محشر خیال" کی ہی۔ رات کو جگنو جگمگاتے تلملاتے تھوڑی دیر میں شعلہ مستعجلہ کی مانند گل اور خاموش ساتھ تاریکی اور اندھیرا۔

یہاں اگر یہ نہ کہا جائے تو میرا بیان ناقص ہی گا کہ اس زمانے میں فلم اُس کے ڈراما نگاری کے انداز اور زیر ہدایت قلم نشریات نے جو تباہ کن اثر ادب اور لٹریچر پر ڈالا ہی وہ تباہی کا ایک مہیب طوفان ہی جو ادب اور لٹریچر کی خوبیوں اور صفات کو غرق آب و برباد کر رہا ہی۔ اُس کی قوت تباہی میں برقی جاذبیت اُس بے دریغ سرمایہ کی ہی جو اُس کے ساتھ ساتھ موجزن ہی۔ ایسا ہی کچھ حال جدید تصا بہاے تعلیم کا ہی جس کا تجربہ مجھ کو اپنے اسکول کی تعلیم کے زمانے ۱۸۸۶ء سے ہے۔ اس میں "کل جدید لذیذ" جلوہ فرما اور زرپاش و زرریز ہی۔ اگر تفصیل مطلوب ہو تو شامل مسل نسخہ "محشر خیال" واپس عنایت ہو اپنے ہر خیال کی تائید میں اُس کے مضامین کے اقتباسات نقل کر کے حاضر کروں گا۔ اسی سلسلہ میں میں نے یہ بھی سنا ہے کہ زنانہ نصاب میں بعض حصے قابل اعتراض ہیں۔ اگر ایک کمیٹی مقرر ہو کر کل نصاب پر نظر ڈال لے تو بہتر ہو۔

حسب ذیل کاغذات شامل مسل ہذا ہیں (۱) رائے علمار کرام محولہ بالا (۲) خط مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی جو باعث ہوا میرے مطالعۂ "محشر خیال" کا (۳) نیز موصوف کا دوسرا خط جو میرے استدعائے تشریح مزید پر آیا (۴) چوتھا خط رشید احمد صاحب صدیقی میر شعبۂ ادب کا جو میرے اُس نیاز نامہ کے جواب میں ہی جس میں میں نے اپنے مکرم دوست سے "محشر خیال" پر رائے قائم کرنے میں مدد چاہی تھی (۵) اشتہار "محشر خیال" جس کا طمطراق قابل دید ہی۔ ظاہر ہی کہ یہ تحریریں فی الوقت بصیغۂ راز ہیں۔

(اخبار صدق لکھنؤ ۱۹۴۴ء)

نوٹ:- الحمدللہ اس تحریر و تحریک کے اثر سے رسالۂ "محشر خیال" مسلم یونیورسٹی کے کورس سے خارج کر دیا گیا۔ (حبیب الرحمٰن صدر یار جنگ)

(ابن مسعود، علقمہ، اسود، شرجیل، مسروق، شریح، ابراہیم، حماد، محمد، ابو یوسف) رحمہم اللہ اور خطیب بغدادی، محمد بن اسحاق، محمد بن جریر طبری اور شہر بغداد کے حالات میں نہایت دلچسپ کتاب ہے۔ ۱۰/

علمائے سلف نہایت مقبول تصنیف (جو عربی کی مستند ترین تاریخی کتابوں کے تقریباً چھ ہزار صفحات کے عمیق مطالعہ کا نتیجہ ہے) اس کتاب سے ایک نظر میں معلوم ہو سکتا ہے کہ اپنے عروج کے زمانہ میں مسلمانوں کے اندر علم کا کس قدر ذوق تھا اور مسلمان علمار کی پبلک اور پرائیویٹ زندگی کی کیا کیفیت تھی۔ مختصر یہ ہے کہ ایسی کتاب دنیا کی کسی زبان میں آج تک نہیں لکھی گئی۔ عصر/

نابینا علمار علمائے سلف کے سلسلہ میں یہ رسالہ ان مسلمان علمار کے حالات میں ہے جنھوں نے سر کی آنکھوں سے محروم ہونے کے باوجود علم کے نور سے نہ صرف اپنے بلکہ دوسروں کے دل و دماغ کو منور کیا۔ دنیا کی ہر زبان میں ایسے رسالے بہت کم ہیں۔ اردو زبان میں یہ سب سے پہلا اور اب تک واحد رسالہ ہے۔ ۴/

استاذ العلمار حضرت مفتی محمد لطف اللہ صاحب مرحوم کے سوانح جن کے ضمن میں ان کے استاذ مفتی عنایت احمد صاحب شہید اور استاذ الاستاذ مولوی بزرگ علی صاحب مرحوم کے کچھ مختصر حالات اور مفتی صاحب مرحوم کے جلیل شاگردوں کے تذکار بھی شامل ہیں۔ اس رسالہ سے اب سے پہلے زمانہ کے اساتذہ اور تلامذہ کے طریق افادہ و استفادہ پر عمدہ روشنی پڑتی ہے۔ تعلیم قدیم و جدید دونوں سے تعلق رکھنے والوں کے لیے یکساں سبق آموز ہے۔ ۶/

فقہ حنفی فقہ حنفی کی تاریخی حقیقت سے مورخانہ و محدثانہ بحث ہے اور جس میں نیز حضرت ابو حنیفہ امام اعظم رضی اللہ عنہ اور ان کے دو نامور شاگردوں امام ابو یوسف اور امام محمد اور بعض دیگر اساطین فقہ حنفی حضرت عبداللہ ابن مسعود، علقمہ بن قیس، مسروق الہمدانی، اسود النخعی، عمرو بن شرجیل، شریح القاضی، ابراہیم النخعی، حماد بن ابی سلیمان رضی اللہ عنہم کے حالات سے بھی تعارف ہے۔ ۸/

تذکرہ بابر ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کی بنیاد رکھنے والے شاہ ظہیر الدین بابر غازی کے نہایت دلچسپ حالات جو اخلاقی اور تاریخی دونوں حیثیتوں سے نہایت دلچسپ اور

ملنے کا پتہ - محمد مقتدی خاں شروانی، شروانی پریس، بک ڈپو، علی گڑھ

قابل مطالعہ ہیں۔

حالاتِ حزیںؔ ۔ مشہور نازک خیال شاعر علی حزیںؔ پر ایک پر مغز تبصرہ صرف حزیں کے دلچسپ حالات بیان کئے گئے ہیں بلکہ اس کی شاعرانہ حیثیت پر بحث کر کے منتخب کلام بھی پیش کیا گیا ہے۔ ۶/

۴۔ اخلاق و آداب

اسلامی اخلاق ۔ مضمون اخلاق پر دل نشین بحث کرنے کے بعد اچھے اور برے اخلاق کے متعلق کثیر التعداد حدیثوں کا اردو ترجمہ دیا ہے اور اخلاق جیسے خشک مضمون کو شگفتہ بنانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ بڑوں اور بچوں کے لئے یکساں مفید ہے۔ عصہ/

نقشِ وفا ۔ حقوق و فرائض زوجین کے متعلق نہایت بیش بہا صالح و مفید ہدایات دستور العمل بنانے کے قابل ہیں۔ عصہ/

۵۔ متفرق

سرسید کی یاد ۔ سرسید کی تعلیمی جد و جہد کا ذکر نہایت دلچسپ و محققانہ پیرایہ میں کیا گیا ہے۔ ۳/

عرضِ اخلاص ۔ ایک تقریر جس میں بتایا گیا ہے کہ [illegible] ہن لڑکیاں ضرورت زمانہ کے مطابق ضرور عمدہ تعلیم پائیں۔ مگر اس طرح کہ شعائر اسلام پر نہایت پختگی کے ساتھ قائم رہیں اور سادہ اسلامی معاشرت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ ۴/

مسلمانوں کی تعلیم قدیم ۔ بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کی قدیم تعلیم کا نصب العین کیا تھا۔ ۴/

برقِ تجلی ۔ حسن و عشق ان مشہور دو نگار دو ہستیوں کی زندگی پہ بہترین تبصرہ۔ ۶/

تعلیم اسلام کا اثر عمر و صحت پر ۔ صدہا بزرگانِ دین کی عمروں کا حال بتا کر یہ قطعی نتیجہ نکالا ہے کہ تعلیمات اسلام کی کما حقہٗ پابندی قیام صحت و درازی حیات کا باعث ہوتی ہے۔ عصہ/

خطبۂ صدارت ۔ اورنٹیل کانفرنس۔ زبان اردو کی مکمل و دلچسپ تاریخ۔ ۴/

(مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں ضمیرالدین قریشی بی اے پرنٹر نے چھاپی اور مولوی حاجی محمد مقتدیٰ خاں صاحب شروانی نے شروانی پرنٹنگ پریس سے شائع کی)

(کتابوں کے ملنے کا پتہ۔ محمد مقتدیٰ خاں شروانی شروانی پریس بکڈپو علی گڑھ)